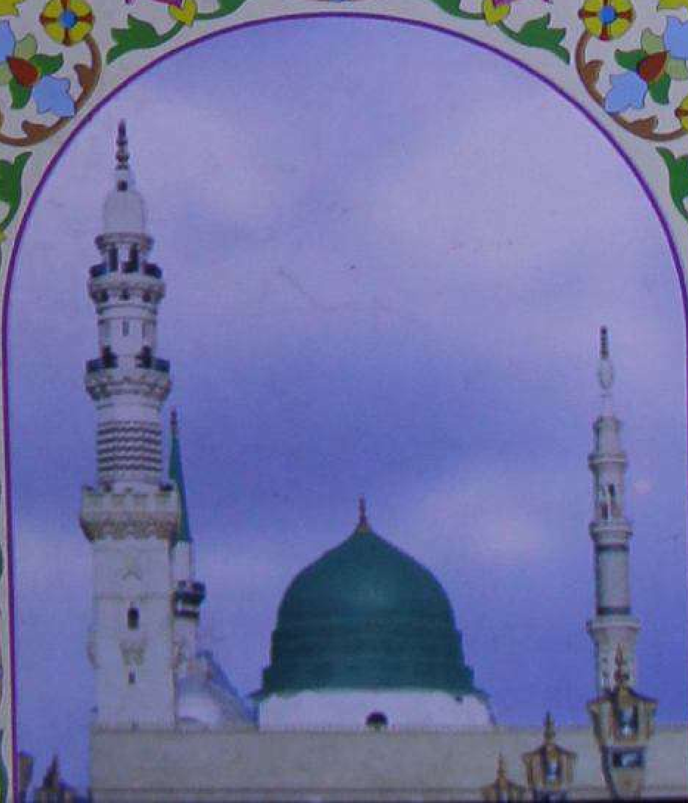


علامہ سید محمد بن علوی مالکی مدظلہ العالی کی نئی تصنیف منہج السلف

کا اُردو ترجمہ

مسلکِ سلفِ صالحین



مکہ معظمہ کے عظیم اور شہرہ آفاق عالم
علامہ سید محمد بن علوی مالکی مدظلہ العالی کی نئی تصنیف منہج السلف
کا اردو ترجمہ

مسلکِ سلفِ صالحین

صفاتِ باری تعالیٰ، فضائلِ اہلِ بیت، میت کے پاس قرآن پاک کا پڑھنا، روضۂ اقدس کی زیارت کیلئے سفر کرنا، حیاتِ انبیاء علیہم السلام، فضائل سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، کثرتِ عبادت، رکعاتِ تراویح، دعا کیلئے ہاتھ اٹھانا اور منہ پر ہاتھ پھیرنا، بدعت و سنت، محفلِ میلاد، محفلِ معراج شریف اور دعوائے اجتہاد وغیرہ مسائل پر فاضلانہ گفتگو

ترجمہ

مولانا علامہ محمد اکرام اللہ زاہد
اُستاذ
(جامعہ اسلامیہ لاہور)

ناشر
فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب : منهج السلف في فهم النصوص بين النظرية والتطبيق

: مسلک سلف صالحین (اُردو ترجمہ)

تصنیف : حضرت علامہ سید محمد بن علوی مالکی مدظلہ العالی

ترجمہ وتصحیح : مولانا محمد اکرام اللہ زاہد

تحریک : مولانا مفتی محمد خان قادری

کتابت : المدد کمپوزنگ سنٹر، لاہور

مطبع : رومی پبلیکیشنز اینڈ پرنٹرز، لاہور

الطبع الاوّل: شعبان ۱۴۲۱ھ / نومبر ۲۰۰۰ء

قیمت : -/160 روپے

ناشر

فرید بک سٹال، 38-اُردو بازار، لاہور، پاکستان

فون نمبر 042-7312173 ، فیکس نمبر 092-042-7224899

ای۔میل نمبر faridbooks@hotmail.com

فہرست

مسلک سلف الصالحین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ابتدائیہ

جُوں جُوں وقت گزر رہا ہے امتِ مسلمہ عقائد و اعمال میں زوال کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا ایک اہم سبب کتاب و سُنّت کے وسیع مطالعہ کا نہ ہونا بھی ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ نہ اپنا مطالعہ و تحقیق ہے اور نہ ہی کسی صاحبِ تحقیق کی بات ماننے کے لیے تیار ہیں حالانکہ قرآن مجید میں باری تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لاتعلمون۔ تو اہلِ ذکر سے پوچھ لیا کرو اگر تمہیں علم نہ ہو۔

اگر ہم اپنے بزرگوں کی بات مان لیتے جو ہم سے کہیں زیادہ صاحبِ تقویٰ بھی ہیں اور صاحبِ مطالعہ بھی تو ہم میں اختلاف و انتشار معدوم ہو جاتا، ہمیں اس بات کا احساس کیوں نہیں ہو رہا کہ ہم امام اعظمؒ، امام مالک، غوث اعظمؒ اور داتا علی ہجویری جیسے لوگ کہاں سے لائیں، آج بھی اگر ہمیں یہ احساس ہو جائے تو بگڑی بن سکتی ہے۔ ہمارے اندر جتنے بھی اختلافات ہیں، ہمیں دیکھنا چاہیے صحابہ سے آج تک امت نے ان میں سے کس کو اپنایا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

لا تجتمع امتی علی ضلالۃ۔ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی۔

اگر ہم اس بات کو سامنے رکھیں تو نئے نئے فتنوں کا فی الفور قلع قمع ہو جائے۔ بدعت و شرک کے فتووں کے رٹ سننے میں نہ آئے اور نہ ہی کسی مسلمان کو کافر و مشرک اور گستاخ قرار دیا جائے۔

ضرورت تھی اس بات کی کہ کوئی صاحبِ علم اس موضوع پر قلم اٹھائے اور واضح کرے کہ ان اختلافی مسائل میں اسلاف کی آراء کیا تھیں؟ اللہ تعالیٰ دنیائے اسلام کے عظیم محقق شیخ ڈاکٹر محمد علوی مالکی دامت برکاتہم العالیہ کو جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے بڑی محنت شاقہ سے اس موضوع پر ضخیم کتاب "منہج السلف فی فهم النصوص" تحریر فرمائی جس میں انہوں نے صفاتِ باری تعالیٰ سے لے کر مسئلہ بدعت تک بڑی تفصیل سے لکھا اور نہایت ہی عمدہ تحقیق کے ساتھ اسلاف صحابہ، تابعین اور مفسرین و محدثین کی آراء نقل کیں۔ اس اہم و مفید کتاب کو اردو خواں طبقہ کے لیے اردو زبان میں منتقل کرنا بھی ضروری تھا تاکہ برِ صغیر کے مسلمان بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ ہمارے ممتاز فاضل مولانا محمد اکرام اللہ زاہد استاذ جامعہ اسلامیہ لاہور نے اس ذمہ داری کو احسن انداز میں نبھاتے ہوئے اسے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ کسی زبان کو دوسری زبان میں لانا کس قدر محنت طلب کام ہے، یہ اصحابِ علم سے مخفی نہیں۔ اس سے پہلے مولانا موصوف نے عظیم محدث شیخ محمود سعید ممدوح کی کتاب رفع المنارہ کے حصہ توسل کا ترجمہ بھی کیا جو "احادیث توسل پر اعتراضات کا علمی محاکمہ" کے نام سے حجاز پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے علم و کام میں مزید برکتیں عطا فرمائے تاکہ امتِ مسلمہ ان سے خوب فیض یاب ہوتی رہے۔ اس ترجمہ کو "مسلک سلف صالحین" کے نام سے سید محسن اعجاز مدیر فرید بک سٹال لاہور شائع کرنے کی سعادت پا رہے ہیں۔ یاد رہے یہ مکتبہ بحمد اللہ متعدد اہلِ علم کی کتب کی اشاعت کر کے اسلام کی خدمت کا فریضہ نبھا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے وہ مصنف، مترجم اور طابع کی اس خدمت کو اپنی بارگاہ قدس میں قبول فرمائے، اسے ہم سب کے لیے مفید بنائے اور امتِ مسلمہ کو راہِ اعتدال اپنانے کی توفیق دے۔

دعاگو : **محمد خان قادری**

خادم کاروانِ اسلام، شادمان، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ الْفَاتِحِ الْخَاتِمِ السَّابِقِ نَاصِرِ الْحَقِّ بِالْحَقِّ وَالْھَادِیْ اِلَی الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَمَنْ دَعَا بِدَعْوَتِہٖ وَسَارَ عَلٰی طَرِیْقَتِہٖ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ۔

اَمَّا بَعْدُ: فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ فِیْ کِتَابِہِ الْعَزِیْزِ:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ (آل عمران: ۱۹) — بے شک اللہ کے یہاں اسلام ہی دین ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ۔

اللہ تعالیٰ جل مجدہ الکریم نے اس آیہ کریمہ میں بیان فرمایا کہ یقیناً معتبر اور قابل اعتماد دین وہی ہے' جو لوگوں کے تمام تر احوال و امور کو منظم اور درست کرے

اور ان کی معیشت کی اصلاح کرے اور لامحالہ ان صفات کا حامل یہی آخری اسلامی دین ہے جو اپنے شمول و عموم کی بنا پر بے شمار محاسن' بیشتر فضائل اور ایسے ایسے عمدہ آثار اور پر مغز اسرار کے ساتھ تمام احکام اور کمالات انسانیہ کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے' جو ہر ایک عقل سلیم اور فطرت مستقیم رکھنے والے کو اسی دین پر کامل اعتماد رکھنے' اسی کے اصول کو زیب حیات بنانے اور اسی کے نور سے ہدایت حاصل کرنے پر برانگیختہ کر دیتے ہیں۔

جو شخص بھی عقل سلیم اور نور بصیرت کا حامل ہے۔ اس کا تعلق اس دین حنیف کے ساتھ انتہائی مضبوط ہے' محض اس لیے کہ یہ دین متین محاسن جلیلہ اور فضائل جمیلہ کا گہوارہ ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسی دین ربانی کے ذریعے ان پڑھ عربوں کو جہالت سے علم' فرقہ واریت سے اتحاد' گمنامی سے شہرت' بے شعوری سے صحیح فکر و تدبر کی شاہراہ پر گامزن کیا اور ان کو خوف و ہراس کی بجائے امن و سلامتی' عداوت کی بجائے محبت' کمزوری کی بجائے قوت' ذلت و رسوائی کی بجائے عزت و ناموری' فقر و تنگ دستی کی بجائے خوشحالی و بالادستی' طبعی جور و جفا اور سنگ دلی کی بجائے نرمی و رحم دلی اور ویرانی اور بد انتظامی کی بجائے تہذیب و تمدن اور شہریت کے اصول فراہم کیے۔

کیا خوب کہا ہے ؎

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اِنَّ دِيْنَ مُحَمَّدٍ
وَكِتَابَهٗ اَقْوٰى وَاَقْوَمُ قِيْلًا
لَا تَذْكُرُوا الْكُتُبَ السَّوَالِفَ عِنْدَهٗ
طَلَعَ الصَّبَاحُ فَاَطْفِئِ الْقِنْدِيْلَا

"اللہ سب سے بڑا ہے' یقیناً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اور کتاب سب سے مضبوط اور ہدایات میں پختہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کتب سابقہ کا ذکر

نہ کرو' اس لیے کہ صبح روشن ہو جائے تو چراغ (ستارے) گل ہو جاتے ہیں۔"

اللہ اکبر! کیا شان حکمت ہے اس شریعت اسلامی کی جس نے ان کو اخوت کی تسبیح میں پرو کر رکھ دیا اور ان کے دلوں میں الفت کاملہ کے دریا موجزن کر دیئے' تو وہ ایک عالی ہمت' عظیم القوۃ اور وسیع سلطنت کی حامل امت بن گئی' جن میں عالم اسلام کی آبیاری کے لیے علم' سیاست اور ادب کے اساتذہ اور اختراعی اور تطبیقی فنون کے ایسے ایسے ائمہ پیدا ہوئے' جن کا قلم لکھتا تو پیروی کی جاتی' ان کی تلوار بے نیام ہوتی تو ہیبت طاری ہو جاتی اور ان کی غیر متزلزل آراء کے ایسے پرچم عالم وجود کی بلندیوں پر لہرا رہے ہیں جن کے نیچے عدل و انصاف اور امن و سلامتی کا بحر بے کراں جاری ہے۔

ابھی تو کچھ عرصہ قبل وہ دور جاہلیت میں جہالت' گمراہی اور بے شعوری کے شاہکار تھے' تو ایک ایمان کے منادی نے یہ صدا بلند کی کہ "اپنے حقیقی پروردگار پر ایمان لے آؤ۔" تو وہ ایمان لائے اور انہوں نے اپنی زندگی کے اطوار کو ہر زاویے سے خوب پرکھا اور اپنے دستور و منشور میں خاصہ غور و فکر کیا' جہاں کہیں انہیں کوئی خلل نظر آیا تو اس کی اصلاح کی' کوئی کجی نظر آئی تو اس کو درست کیا اور انہوں نے بے ہودگی کو سنجیدگی سے' سست روی کو محنت سے' مصیبت کو سعادت سے' خوابیدگی کو بیداری سے' باہمی دشمنی کو خیر خواہی اور اخوت سے اور فرقہ واریت کو اتحاد اور جوانمردی سے بدل دیا۔ اور انہوں نے بزرگی اور سرداری کا علم تھام لیا اور وہ بہترین امت بن گئی جو لوگوں کے ملیے نکالی گئی' کہ وہ امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور ایمان باللہ کے نقارے بجاتے رہیں' اس اصلاح اور راست روی سے ان کا مقصود محض اللہ جل جلالہ کی رضا کا حاصل کرنا ہے۔

یہ سب کچھ دین اسلام کی فضیلت و برتری' اس کے عمدہ حقائق اور محکم اصولوں کا نتیجہ ہے جن کو پس و پیش سے باطل کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا کیونکہ ان کا

نزول حکمت والے اور قابل ستائش اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہ ان کے کتاب اللہ کے ساتھ تمسک' اللہ کی راہ میں اتحاد' اللہ کی رضا کے لیے رشتہ اخوت اور باہمی تفریق کنندہ اختلافات اور بغض و عداوت کو جنم دینے اور اتحاد کو پارہ پارہ کر دینے والی جنگ و جدال کی خوب بیخ کنی کا خلاصہ ہے۔ بلکہ یہ ہمہ گیری' محبت اور مودت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان عالیشان کو قبول کر لینے کی دلیل ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا۔ (آل عمران: ۱۰۳)	اور اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لو سب مل کر اور آپس میں پھٹ نہ جانا اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو جب تم میں بیر تھا اس نے تمہارے دلوں میں ملاپ کر دیا تو اس کے فضل سے تم آپس میں بھائی ہو گئے۔

یہ آیت کریمہ دعوت اسلامیہ کی بنیاد اور لب لباب ہے' اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہی دعوت و رسالت لے کر تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کے اذن سے دلوں میں جمعیت اور الفت کاملہ کو پیدا کیا اور حقیقت میں اللہ ہی الفت کا پیدا کرنے والا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ۔ (الانفال: ٦٣)	اگر تم زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتے ان کے دل نہ ملا سکتے لیکن اللہ نے ان کے دل ملا دیئے۔

تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی نے اپنی قدرت و ارادہ کے ساتھ انہیں یہ توفیق بخشی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک واسطہ کی حیثیت سے ہیں اور وہ اس مقصد کی تحقیق کا دروازہ ہیں' جنہوں نے دلوں کو جمع فرمایا اور جس کی تکمیل کا سہرا آپ ﷺ کے سر

رہا، وہ یہی دلوں میں تالیف کا جذبہ اور باہمی اتحاد ہی تو ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی حدیث میں یوں وارد ہے:

یامعشر الانصار الم آتکم ضُلّالاً فهداکم الله تعالی وعالة فاغناکم الله واعداءً فالف بین قلوبکم، وفی روایه: متفرقین فالفکم الله؟ قالوا: بلی یارسول الله، الله ورسوله اَمَنّ وافضل۔

(سبل الہدیٰ والرشاد: ج ۵، ص ۴۰۳)

اے گروہ انصار! کیا میں تمہارے پاس نہیں آیا کہ تم گمراہ تھے اور اللہ نے تمہیں ہدایت دی، تم محتاج تھے اور اللہ نے تمہیں غنی کیا اور تم آپس میں دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی، اور ایک روایت میں یوں ہے: کہ تم فرقہ فرقہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے تم میں محبت پیدا کر دی؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں یارسول اللہ، اللہ اور اس کا رسول ہی سب سے زیادہ احسان اور فضل والا ہے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ ہستی ہیں جنہوں نے تاوصال تفریق پرستوں کے اتحاد، امت کی ہدایت، مشکلات کے حل، ظلمت سے نجات اور جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ سرانجام دیا اور یہی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان عالیشان کا مقصود ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔

(آل عمران: ۱۰۳)

اور اللہ کی رسی مضبوط تھام لو سب مل کر اور آپس میں پھٹ نہ جانا اور اللہ کا احسان اپنے اوپر یاد کرو۔

اللہ کی رسی اور نعمت خداوندی

بعض اہل تفسیر فرماتے ہیں کہ "واعتصموا بحبل الله جمیعا" میں

حبل اللہ سے مراد اسلام' صراط مستقیم اور مضبوط گرہ اور ولا تفرقوا واذکرو نعمۃ اللہ علیکم۔" میں نعمۃ اللہ سے مراد دین ہے۔

بعض مفسرین نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ واذکروا نعمۃ اللہ علیکم میں نعمۃ اللہ سے مراد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ قول دیگر اقوال کے معارض نہیں' کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صاحب رسالت ہیں اور رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے۔ تو اللہ کی نعمت اسلام' دین اور صراط مستقیم ہے' بلکہ ہر وہ اللہ کی نعمت ہے جو آپ ﷺ لے کر تشریف لائے۔

کون ہے وہ ذات جو دین لے کر آئی ---؟

کون ہے وہ ذات جو اسلام لے کر آئی ---؟

کون ہے وہ ہستی جو رسالت لے کر آئی ---؟

لامحالہ وہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی ہے تو جس نے کہا کہ نعمۃ اللہ سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ہیں تو اس کا یہ کہنا مشہور قول کے معارض و مخالف نہیں ہوگا۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ کی نعمت اسلام ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام لے کر آئے اور یہ گفتگو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کے مطابق ہے جو آپ ﷺ نے گروہ انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

الم تکونوا اشتاتا فجمعکم اللہ بی...؟ الم تکونوا ضُلّالاً فھداکم اللہ بی...؟	کیا تم متفرق نہ تھے تو اللہ نے تمہیں میرے ذریعے اکٹھا کر دیا؟ اور کیا تم گمراہ نہیں تھے تو اللہ نے تمہیں میرے ذریعے ہدایت بخشی۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جس نے آپ ﷺ کے ذریعے ان کو

جمع کیا اور آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ میں سب کو بیک صف کر دیا اور وہی ذات ہے جس نے ان کو رشد و ہدایت کی عظیم دولت سے نوازا اور اسی نے ہی ان کے دلوں کو باہمی الفت کاملہ کا گہوارہ بنا دیا اور جہاں تک وعظ و نصیحت، نعمت و فضل، اور فضیلت والوں کی نسبت بیان کرنے کا تعلق ہے، اور مزید بر آں جس کا بھی ذکر کرنا لوگوں پر ضروری ہے، وہ ان کے لیے واضح کر دیا گیا کہ آپ ﷺ اس باب میں محض واسطہ اور سبب کی حیثیت سے ہیں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ:

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ--- ای اذکروا محمد بن عبدالله۔ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ۔ بمحمد فَاَصْبَحْتُمْ بنعمته۔ بمحمد واصبحتم بنعمته۔ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا---؟ بمحمد صلى الله تعالى عليه وآله وسلم۔

اور اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمت کو یاد کرو یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بن عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) کو یاد کرو۔ جب تم آپس میں دشمن تھے تو اللہ تعالیٰ نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی، تو تم اس نعمت یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ بھائی بھائی ہو گئے اور تم جہنم کے کنارے پر تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اس سے بچا لیا۔

یہ تفسیر یعنی "فانقذکم منها بمحمد" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارکہ کی طرف منسوب ہے جہاں آپ ﷺ نے لوگوں کو اپنا نعمت و فضل اور رحمت ہونا یاد دلایا۔

الدر المنثور فی التفسیر الماثور (۲/ ٦١) میں ہے کہ طستی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نافع بن ازرق نے ان سے پوچھا کہ مجھے اللہ

تعالیٰ کے اس فرمان "وکنتم علی شفا حفرہ من النار" کے بارے میں کچھ بتائیے' توانہوں نے فرمایا کہ

انقذکم اللہ بمحمد صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم۔	اللہ تعالیٰ نے تمہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بچالیا۔

ہو سکتا ہے یہ سوال پیدا ہو کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی امت پر رحمت و شفقت تو حدیث میں واضح ہے' اور یہ کیسے ہے کہ آپ ﷺ نے جہنم سے بچایا کیونکہ وہ اس میں واسطہ ہیں؟ تو اس سلسلے میں حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی مکمل رہنمائی فرماتا ہے جو صحیح مسلم کتاب الفضائل جلد نمبر ۴ میں جلی قلم سے مرقوم ہے کہ:

مثلی ومثلکم کمثل رجل او قد نارا فجعل الجنادب والفراش یقعن فیھا وھو یذبھن عنھا وانا آخذ بحجزکم عن النار وانتم تفلتون من یدی۔	میری اور تمہاری مثل اس شخص کی مانند ہے جس نے آگ جلائی' تو ٹڈیاں اور پروانے اس میں گرنے لگے اور وہ انہیں آگ سے دور ہٹاتا ہے۔ اسی طرح میں بھی تم کو دوزخ سے دور ہٹاتا ہوں اور تم میرے ہاتھ سے چھوٹتے ہو۔

امام حاکم نے اس حدیث کو نقل کر کے صحیح قرار دیا کہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من خرج من الجماعہ قید شبر فقد خلع ربقہ الاسلام من عنقہ حتی یراجعہ ومن مات ولیس علیہ امام جماعہ فان موتتہ میتہ جاھلیہ۔	جو شخص بالشت بھر بھی جماعت سے نکل گیا' تحقیق اس نے اپنی گردن سے اسلام کا پٹہ اتار دیا' یہاں تک کہ وہ رجوع کرے اور جو اس حالت میں مر گیا کہ جماعت کے امام کی پیروی میں نہ تھا' تو یقیناً اس کی موت

جاہلیت کی موت ہے۔

علامہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "و کنتم علی شفا حفرہ من النار" کے تحت سدی سے یہ روایت کی ہے:

کنتم علی طرف النار من مات منکم وقع فی النار فبعث اللہ محمدا صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم فاستنقذکم بہ من تلک الحفرہ۔	تم جہنم کے کنارے پر تھے جو بھی تم میں مرا جہنم میں گیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان کے ذریعے تم کو اس ناری گڑھے سے بچالیا۔

اسلام کی بہار

اسلام آیا تو لوگوں کو باہمی الفت و محبت اور یکجہتی کا درس دیا اور تفرقہ بازی' اختلاف اور دشمنی سے منع کیا اور یہ واضح کیا کہ کسی امت میں جب اختلاف رونما ہوتا ہے تو وہ ان کے درمیان شیطان کے داخل ہونے کا راستہ ہوتا ہے۔ العیاذ باللہ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تفرقہ بازی' اختلاف' تعصب اور اس طرح کی جو بھی وبا لوگوں میں پیدا ہو' وہ ہر طرح کے فتنہ' مصیبت اور شر کا سبب ہے اور اسی سے ہی حسد' بغض' جہالت' عناد' جھگڑا' قطع رحمی اور نافرمانی جیسی بری بیماریاں جنم لیتی ہیں اور متعدد احادیث مبارکہ میں تفرقہ بازی کی مذمت اور یکجہتی اور محبت کا نورانی درس وارد ہے۔

جیسا کہ صحیح مسلم میں سہیل بن ابو صالح کی حدیث ہے جو انہوں نے اپنے والد سے' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان اللہ یرضی لکم ثلاثا' ویسخط لکم ثلاثا' یرضی	بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے تین امور پر راضی ہوتا ہے اور تین امور پر ناراض۔

لکم ان تعبدوہ ولا تشرکوا بہ شیا' وان تعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا' وان تناصحوا من ولاہ اللہ امرکم' ویسخط لکم ثلاثا: قیل وقال' وکثرۃ السوال' واضاعۃ المال۔

راضی ان امور پر ہوتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ' اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور فرقہ فرقہ نہ ہو جاؤ' اور اللہ نے جو تمہارا امیر بنایا ہے اس سے نصیحت حاصل کرو' اور ان تین امور پر ناراض ہوتا ہے: چہ مگوئی' بے جا کثرت سوال اور فضول خرچی۔

اور لوگوں کے اتحاد و اتفاق کے وقت لغزش کی بجائے راست روی اور پاکدامنی دامن گیر ہوتی ہے' جیساکہ متعدد احادیث میں یہی بات وارد ہے اور جس چیز کالوگوں پر خوف کیا گیا' وہ افتراق اور اختلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ جل مجدہ الکریم نے بھی انہیں اتحاد و اتفاق کی نعمت عظیمہ یاد دلائی' جس کے ذریعے اسلام نے انہیں یکجا کیا اور فرمایا:

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ اِخْوَانًا...

اور اللہ تعالیٰ کی نعمت اپنے اوپر یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی' اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے۔

شان نزول

(ا) یہ آیت مبارکہ قبیلہ اوس و خزرج کی شان میں نازل ہوئی۔ دور جاہلیت میں ان کے مابین بے شمار جنگیں ہوئی تھیں اور وہ سخت عداوت' بغض و حسد اور انتہا درجہ کی کینہ پروری کا شکار رہ چکے تھے' اسی سبب سے ان میں جنگ و جدال کا معرکہ برسوں جاری رہتا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو تعلیمات اسلامیہ سے روشناس کرایا' تو ان میں

سے جو حلقہ اسلام میں داخل ہوئے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دامن محبت کو وسعت دیتے ہوئے آپس میں بھائی بھائی بن گئے' اور اللہ کی خوشنودی میں اکٹھے ہو گئے اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے معاون بن گئے۔ اس واقعی حقیقت کی وضاحت اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے یوں فرمائی:

هُوَ الَّذِیٓ اَیَّدَكَ بِنَصۡرِهٖ وَبِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیۡنَهُمۡ

وہی ہے جس نے تمہیں زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا اور ان کے دلوں میں میل کر دیا۔ اگر تم زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتے ان کے دل نہ ملا سکتے' لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ملا دیئے۔

اور وہ کفر کی وجہ سے جہنم کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بچا لیا کہ ان کو ایمان کی ہدایت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی اس کا ان پر احسان جتایا' جس روز آپ ﷺ نے حنین کا مال غنیمت تقسیم فرمایا تو آپ ﷺ نے تقسیم میں باذن الٰہی دوسروں کو ان پر فضیلت دی تو بعض نے ناراضگی کا اظہار کیا تو حضور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یوں مخاطب فرمایا:

"اے گروہ انصار! کیا میں نے تمہیں گمراہ نہیں پایا تھا تو تمہیں اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے ہدایت بخشی' اور تم جدا جدا تھے تو اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تم میں محبت ڈال دی' اور تم محتاج تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں میرے ذریعے غنی کر دیا۔"

جب آپ ﷺ نے اتنا فرمایا تو انہوں نے عرض کی:

اللہ ورسولہ امن۔ اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ احسان کرنے والا ہے۔

(۴) محمد بن اسحاق بن یسار وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ

یہ آیت کریمہ قبیلہ اوس و خزرج کی شان میں نازل ہوئی۔ ہوا یوں کہ ایک یہودی شخص اوس و خزرج کے سرداروں کے پاس سے گزرا' تو اسے ان کا یہ اتفاق و اتحاد نہ بھایا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کو یہ کہہ کر بھیجا کہ ان میں بیٹھ کر ان کے مابین ہونے والی یوم بعاث کی جنگ اور دیگر جنگوں کا ذکر چھیڑ دے' تو اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کا یہ حربہ کامیاب ہوا کہ وہ ابھی تذکرہ ختم نہ کرنے پایا تھا کہ قوم کے افراد برانگیختہ ہو گئے' اور ایک دوسرے پر ملامت کرتے کرتے بکھر گئے اور اپنے اپنے ذاتی شعار سنبھال لیے اور اسلحہ تھام لیا اور ایک دوسرے کو جنگ کی دھمکیاں دینے لگے۔

جونہی یہ خبر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپ ﷺ فوراً ان کے پاس تشریف لائے اور ان کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے لگے اور فرمایا:

ابدعوی الجاهلیه وانا بین اظهرکم---؟	کیا ہیں یہ جہالت کے دعوے اور میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔

اور یہی آیہ کریمہ "والف بین قلوبهم" تلاوت فرمائی جس سے انہیں اپنے اپنے موقف پر سخت ندامت ہوئی اور فوراً صلح کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے' آپس میں معانقہ کیا اور ہتھیار پھینک دیئے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

(۳) حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیہ مقدمہ ان کے حق میں اس وقت نازل ہوئی جب وہ مسئلہ افک میں منتشر ہوئے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بلاشبہ آج ہمیں ایسے کلمات رقم کرنے کی سخت حاجت ہے جو لوگوں میں اتحاد و یگانگت کا دائمی جذبہ بیدار کریں اور ہمیں اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم صفوف اسلامیہ کو وحدت کی لڑائی میں پرو دیں' چاہے نوجوان ہوں' علماء ہوں یا طلباء۔ اس امر سے لوگوں میں مسائل خلافیہ کا ہونا منع نہیں ہو گا بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ عداوت' بغض اور ملت اسلامیہ سے روگردانی کا خاتمہ ہو جائے۔ جہاں تک مسائل

خلافیہ کا تعلق ہے' وہ عہد صحابہ میں بھی چند مسائل میں واقع ہوا۔ جن سے بطور مثال ایک مسئلہ بنو قریظہ کا آپ کے سامنے ہے' جب صحابہ کو یہ حکم دیا گیا کہ "نماز عصر نہ پڑھیں مگر بنو قریظہ میں۔" لیکن وہ ابھی راستے میں ہی تھے تو دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ نے غروب آفتاب کے خوف سے نماز پڑھ لی اور دوسرے گروہ نے اتنی موخر کی کہ بنو قریظہ میں پہنچ کر پڑھی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقین کو صحیح قرار دیا اور دونوں کے عمل سے راضی ہوئے' اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک فریق نے مسئلہ کو صحیح زاویے سے دیکھا تھا۔

لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافی امور کے سبب ہم مصائب عظیمہ میں مبتلا ہیں جن کو ہم سنتے ہیں' اور ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جو ان چھوٹے امور پر فسق و بدعت اور کفر وغیرہ تک کے آوازے کستے ہیں حالانکہ یہ امور اتنی بڑی بے دھڑک زبان درازی کے حامل نہیں ہوتے اور ان مسائل کو ایک استحالہ بنا دیتے ہیں جس سے وہ دشمنان اسلام خوش ہوتے ہیں جو ہمیں شکار کرنے اور ہر جانب سے ہماری گرفت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور ان کے ساتھ ان کے غیر مشروط وفادار پیروکاروں کی کوششیں بھی شامل ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہم آراء میں ہونے والے اختلافات کے فرق واضح کریں جو دراصل نص کو سمجھنے میں اختلاف کا نتیجہ ہے۔ یہ صرف اس صورت میں ہے جب شریعت میں کوئی ایسی نص قطعی موجود نہ ہو جو مفہوم کو ایک نقطہ پر مرکوز کرے اور اس کے علاوہ اصحاب رائے میں ہونے والے اختلافات کے درمیان بھی فرق کرنا ضروری ہے جو بغض و عداوت اور کفر و فسق تک مصائب کا باعث بنتے ہیں۔

یہ امر قطعاً قابل انکار نہیں کہ امور اجتہادیہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان بھی اختلاف ہوتا رہا جیسے یہی مسئلہ بنو قریظہ ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان عالیشان "لا یصلین احد کم الا فی بنی قریظہ" کو سمجھنے میں

صحابہ کا اختلاف ہو گیا اور اسی طرح مسئلہ عزل کے بارے میں صحابہ کا قول ہے "کنا نعزل والوحی ینزل۔" (ہم نزول وحی کے دور میں عزل کیا کرتے تھے) مزید بر آں صحابہ کے درمیان یہ واقع ہونے والا اختلاف مشہور ہے کہ ایک شخص نے حالت جنابت میں تیمم کرنے کے بعد جانور کی طرح اپنے جسم کو مٹی میں لوٹایا تاکہ جسم پاک ہو جائے' جبکہ دوسرے شخص نے فقط تیمم پر اکتفا کیا اور نماز پڑھ لی۔ جب یہ دونوں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں داخل ہوئے اور واقعہ کی خبر دی تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمم کرنے والے کی تائید کی اور مٹی میں جسم لوٹانے والے سے فرمایا:

انما یکفیک ان تفعل هکذا وهکذا۔ بے شک تمہیں ایسے ہی کرلینا کافی تھا۔

اور ساتھ ہی آپ ﷺ نے اپنے دست اقدس زمین پر مار کر صحیح طریقہ اس پر واضح کر دیا اور اس کو نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔

اس طرح کے بے شمار شواہد کتب سنن واحادیث میں موجود ہیں' جو اس امر کو بدر کامل کی طرح واضح کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم حضور علیہ الصلوۃ والتسلیم کی حیات ظاہری میں بھی اختلاف واجتہاد کیا کرتے تھے' لیکن یہ اختلاف اور اجتہاد ادب کے دائرہ میں محصور اور مقام و مرتبہ اور محبت و یگانگت کے تحفظ کا ضامن تھا' جیسا کہ صحابہ کی سیرت اور امت کے ائمہ کے کردار سے واضح ہے۔

یہ مختلف موضوعات اور متفاوت مقامات میں ہونے والی ان تمام تر علمی بحثوں کا ماحاصل ہے جن میں سے بعض عقیدہ کے موضوع سے خاص ہیں' بعض کتاب و سنت کے موضوع سے' بعض حدیث اور علوم حدیث اور بعض ثقافت اسلامیہ کے عنوان سے خاص ہیں۔ جو مقصد واحد کے تحت جمع ہو جاتی ہیں اور وہ ہے اسلام کے طرز اعتدال کی وضاحت جس میں اعتدال کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا ہے اور

ایک عقلمند کو یہ کیسے زیب دیتا ہے کہ وہ ان مسائل کی آڑ میں لوگوں سے ترش روی اختیار کرے؟ اور یہ کیسے مناسب ہے کہ ہم سیرت نگاروں کے بعض احکام یا بعض متنازع فیہ عقائد ظاہرہ کے قبول یا ترک کے حوالے سے عوام الناس کو اصل اعتقاد میں ہی صحیح' فاسد' ایمانی یا کفری کی تقسیم میں جدا جدا کریں۔

میں نے اپنے والد گرامی رحمتہ اللہ علیہ سے ایک انتہائی معنی خیز جملہ سنا ہے جو انہوں نے ایک مجلس میں کہا' صورت حال یہ ہوئی کہ بعض طلباء نے آپ کو حرم نبوی میں ایک مراقبہ کرنے والے اور ایک نمازی کے درمیان ہونے والے ہلکے سے جھگڑے کی خبر دی کہ مراقبہ کرنے والے نے اس شخص کی صبح کے بعد نماز پر انکار کیا اور اسے خلاف سنت' ناجائز اور بدعت قرار دیا اور اس شخص نے نماز ترک کرنے سے انکار کر دیا۔ یوں ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا اور اصل مسئلہ سے ہمیں آگاہی نہیں۔ لیکن حقیقت مسئلہ سے جس شخصیت نے ہمیں روشناس کرایا وہ میرے والد گرامی رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ اور وہ واقعہ کے شاہد ہیں۔ انہوں نے کہا: "اگر یہ مراقبہ کرنے والا عقلمند اور ذہین طالب علم ہوتا تو اس مسئلہ میں اس کو شرح صدر حاصل ہوتا' اور نہ ہی انکار اور ممانعت پر زور دیتا' کیونکہ اس بات کا علم ہوتا کہ یہاں اس مسئلہ میں متعدد نصوص اور احادیث موجود ہیں جن میں علماء کے اپنے اپنے اجتہادات اور استنباطات ہیں۔ اگر وہ ان کا درس سن لیتا اور ادراک کر لیتا تو ضرور لوگوں سے معذرت کرتا اور ان کے لیے کوئی بہتر راہ عمل پیش کرتا۔"

بلاشبہ ایک عالم دین کا علم و فکر جب وسیع ہوتا ہے' تو اس کو قلبی اور صدری وسعت بھی نصیب ہو جاتی ہے۔

میں نے اپنے استاذ گرامی شیخ حسن یمانی کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "طالب علم کی فقاہت اور مذاہب میں نظر و تحقیق جب زیادہ ہو جاتی ہے تو لوگوں پر اس کا انکار کم ہو جاتا ہے۔"

اور میں نے اپنے شیخ، شیخ حسن مشاط کو (ہمارے ایک طالب علم بھائی کو یہ کہتے ہوئے سنا جو ایک عام آدمی کے کسی فعل میں تنقید کر رہا تھا)

"کیا تم اس مذہب کو جانتے ہو؟
کیا تم اس کے مذہب میں اس مسئلہ کا حکم جانتے ہو؟
کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے مذہب میں اس مسئلہ کی کیا دلیل ہے؟
کیا تم جانتے ہو کہ مخالف کی دلیل کیا ہے؟
اور کیا تم جانتے ہو کہ اس کی دلیل کا کیا جواب ہے؟"

اور اسی طرح میں نے اپنے شیخ، شیخ محمد نور یوسف کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "اکثر مسائل و مصائب کا طوفان اس لیے برپا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام میں وہ لوگ پیش پیش ہیں جو اس کے اہل نہیں۔"

اور اسی طرح ہی مسجد حرام میں علم و حکمت کی آبیاری کرنے والے ہمارے مشائخ کرام کا موقف ہے اور اسی راہ اعتدال پر ہمارے شیوخ، شیخ محمد عربی تبانی، شیخ محمد یحییٰ امان، شیخ السید اسحٰق غروز اور شیخ السید محمد امین کتبی وغیرہم گامزن ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جو وسعت علم، عمدہ فکر، جوہر عقل و دانش، باریک بینی اور انشراح صدر جیسی صفات کے حامل ہیں اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غیرت عظیمہ کے شاہکار ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں پر رحمت و شفقت کے جذبہ سے معمور ہیں۔ بالخصوص ان جہلاء اور گنہ گاروں کے ساتھ جو سیاست شرعیہ، حکمت و دانائی اور وعظ و نصیحت کے زیادہ محتاج ہیں اور سب کے ساتھ نہایت انکساری سے پیش آتے ہیں (رضی اللہ عنہم) اللہ تعالیٰ و سبحانہ جل جلالہ ہمیں ان سب حضرات کا ادب کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وصلى الله على سيدنا ومولانا محمد وآله وصحبه وسلم

پہلا باب

عقیدہ کا بیان

باب العقیدہ

تمام تر حمد و ستائش کے لائق اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک کی ذات ہے کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا کمال ہی کمال ذاتی ہے جو ہر طرح کی حدود سے پاک اور قیودات سے آزاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا جو بھی کسی صفت سے متصف ہے یعنی علم، حیات، سمع و بصر اور کلام وغیرہ حتیٰ کہ وجود کی صفت بھی، یہ سب صفات اسی کی عطا کردہ ہیں اور وہی ذات سبحانہ حقیقت میں معطی ہے اور وہی ذات ان کی مالک اور ان میں حقیقی تصرف کرنے والی ہے۔ الغرض موجودات میں جو بھی کمال پایا جاتا ہے، وہ دراصل اللہ سبحانہ، کا ہی کمال ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔

ایک قوم اس طرح گمراہ ہوئی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کو بعض مخلوق کی طرف منسوب کر دیا اور ان کو ارباب بنا لیا، اور اسی طرح وہ ان میں تاثیر ذاتی یا علم ذاتی یا حلت و حرمت کے حق شرعی کے معتقد ہوئے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ان کی

نقاب کشائی یوں فرمائی:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔(التوبہ: ۳۱)
انہوں نے اپنے پادریوں اور جوگیوں کو اللہ کے سوا خدا بنالیا۔

حالانکہ وہ ان کی عبادت کرنے کے قائل نہیں تھے۔ بات اتنی تھی کہ وہ ان کے لیے حرام کو حلال کرتے تو یہ اس کو حلال جانتے اور وہ حلال کو ان پر حرام کرتے تو یہ اسے حرام سمجھتے' جیساکہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

جو خالق کو مخلوق کی صفت سے متصف کرے وہ مشرک ہے اور وہ اس شخص کی مانند ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ طول' عرض اور بلندی والا جسم ہے۔ اور وہ بھی مشرک ہے جو اللہ کی طرف اتحاد بالخلق یا حلول کو منسوب کرے اور نا سمجھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ہر موجود جسم ہے چاہے اس کا تعلق جمادات سے ہو' ہوا سے یا نور سے یا کسی اور سے۔ اور بیشک یہ اوہام باطلہ ہیں اور دلائل اس کی تردید کرتے ہیں۔ عقل ودلیل جس اعتقاد کی پختگی کا تقاضا کرتے ہیں اور رسل کرام علیہم السلام جو تحقیق لائے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کی ذات حوادث کی مشابہت سے پاک ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کو جسم تصور کرتے ہوئے اس کی عبادت کرتا ہے' اس میں اور پتھر' لکڑی یا دھات کے بت کی پرستش کرنے والے میں کوئی فرق نہیں۔ حق پرستوں کا اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں کہ جسمیت کا قائل اپنے پروردگار سے جاہل ہے اور کافر ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ جو اللہ کی طرف منسوب ہے مثلاً آنا' اترنا' اور قصد فرمانا (مجئی و نزول و استواء) تو یہ بدیہی امر ہے کہ یہ اجساد کا نزول نہیں اور نہ ہی اجساد کا مجئی اور استواء ہے۔ بلاشبہ یہ ایسے امور ہیں جو شبہ و امثال سے پاک ذات کے لائق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ۔(حم السجدۃ: ۱۱)
پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا اور وہ دھواں تھا۔

اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ۔ (الاعراف: ۵۴)

بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے پھر عرش پر استواء فرمایا جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔

پس واضح ہوا کہ استواء تخلیق ارض و سما کے بعد ہے کیونکہ "ثم" کا یہی تقاضا ہے اور وہ فعل الٰہی ہے جو مخلوق سے ہر طرح کی مشابہت سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا عرش پر استواء فرمانا

فرمان باری تعالیٰ ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی۔ (طٰہٰ: ۵)

وہ بڑی مہر والا اس نے استواء فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔

اللہ تعالیٰ سبحانہ کے اس ارشاد گرامی کے بارے میں ہمارا وہی موقف ہے جو سلف صالحین کا ہے کہ ہمارا اللہ پر، اللہ کے کلام پر اور اللہ کی مراد پر پختہ ایمان ہے جس میں کسی طرح کی کیفیت، تمثیل اور تعطیل کی کوئی مداخلت نہیں۔ اس کی شان بے نیازی ہے:

لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔ (الشوریٰ: ۱۱)

اس جیسا کوئی نہیں اور وہی سنتا دیکھتا ہے۔

یہی اسلاف کا عقیدہ ہے اور ضروری ہے کہ کتاب و سنت میں وارد ہونے والی نصوص کو بغیر کسی کمی و بیشی کے تسلیم کر لیا جائے اور یہی ایمان کا تقاضا ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں اور نہ ہی کسی مجتہد کو روا ہے کہ اس پر زیادتی کرے، کیونکہ عقیدہ میں اجتہاد کو مداخلت نہیں۔ اب جو بھی اس نص پر کوئی الفاظ زائد بیان کرے گا وہ اس کی اپنی خاص سمجھ ہو گی جو نص پر زائد ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کے فرمان (استوی) پر لفظ

(ذات) کی زیادتی کرنا اور کہنا (استوی بذاتہ) یا لفظ (حقیقۃ) کی زیادتی کرتے ہوئے کہنا کہ (استوی) یعنی (استقر بذاتہ علی العرش حقیقۃ) یا لفظ (فوق) کی زیادتی کرتے ہوئے کہنا کہ (استوی ای جلس فوق عرشہ بذاتہ حقیقۃ) یہ سب کا سب نص وارد پر زیادتی اور صفات باری تعالیٰ میں اجتہاد ہے جو اس باب میں متروک ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ صفت استواء پر کسی طرح کے اجتہاد اور استنباط کے ساتھ زیادتی کرنا صحیح نہیں بلکہ جو نص میں وارد ہے اسی پر بغیر کسی کمی و بیشی کے اکتفا کرنا ضروری ہے کیونکہ اس موضوع میں عقل و نظر کی کوئی مداخلت نہیں۔ بیشک عقل کا موقف اپنی جگہ قابل تسلیم ہے اور ایمان اس پر ہے جو سلف صالحین سے مروی ہے جیسا کہ کبار ائمہ سلف سے حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد گرامی ہے:

امنت باللہ وبما جاء عن	میرا اللہ پر اور جو اللہ کی طرف سے آیا
اللہ علی مراد اللہ من غیر	ہے اس پر اور اللہ کی مراد پر بغیر کسی تشبیہ'
تشبیہ ولا تعطیل ولا تمثیل ولا	تعطیل اور مثل و کیفیت کے ایمان ہے۔
تکییف لیس کمثلہ شیئی	اس جیسا کوئی نہیں اور وہی سنتا دیکھتا ہے۔
وھوالسمیع البصیر۔	

امام الحرمین رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ عزوجل کی کسی صفت میں اجتہاد کر کے مفہوم متعین کرنا منع ہے کیونکہ اس باب میں عقل یا سماعت کے ذریعے امر قطعی تک رسائی نہیں ہو سکتی اور محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ ظواہر کی تخصیص یا ترک غیر قطعی دلیل یعنی خبرواحد اور قیاس کے ساتھ صحیح تو ہے لیکن جو غیر قطعی دلیل کے ساتھ ترک کیا جائے گا' وہ کیسے قطعی(ا) ہو سکتا ہے؟

(ا) اس مسئلہ کی مزید تحقیق کے لیے امام سبکی کی "التعلیق علی السیف الصقیل فی الرد علی ابن زفیل: ص ۵۸" کا مطالعہ کریں۔

صفات باری تعالیٰ میں خلاصہ کلام

صفات الٰہیہ میں خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی تمام تر صفات ذاتی، ازلی اور ابدی ہیں۔ صفت علم ہو یا قدرت و ارادہ، بہر حال سب کی سب ازلی صفات ہیں اور قبل از تخلیق ثابت ہیں اور زمان و مکان کی حدود سے پاک اور مبرا ہیں۔

قاعدہ ہے کہ فعل جب اللہ سبحانہ کی طرف منسوب ہو تو زمانہ سے خالی ہو جاتا ہے کیونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ زمان سے پاک ہے۔ اسی طرح جب ظرف باری تعالیٰ جل جلالہ کی طرف منسوب ہو تو وہ ظرفیت سے خالی ہو جاتی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ظرفیت سے بھی پاک ہے اور نہ ہی یہ اس ذات سبحانہ کے شایان شان ہے اور اس کا معنی وہی ہو گا جو مثل و تشبیہ سے پاک اور منزہ ذات حق سبحانہ کے لائق ہو گا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ   کیا تم اس سے نڈر ہو گئے جس کی سلطنت آسمان میں ہے۔ (الملک: ۱۶)

اس فرمان الٰہی میں "فی" کی نسبت اللہ عزوجل کی طرف ہے تو اس سے ظرفیت زائل ہو گئی اور یہی حال "علی" اور "مع" کا ہے --- فافہم۔

جسم کا نزول اور آنا، وہ انتقال ہے جو اجسام کو لائق ہے اور جس ذات کا جسم نہیں اس کا ایسا نزول محال ہے جو اجسام کے ساتھ معروف ہے۔ تو بلاشبہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا نزول فرمانا بھی انتقال اور مثل سے ایسے ہی پاک ہے جیسے اس کی ذات مثل و شبہ سے پاک اور بہت بلند و بالا ہے۔

اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کسی کو اس میں اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان عالیشان:

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۔(الفتح: ١٠) ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

میں "ید" سے مراد عضو معلومہ نہیں۔ اسی طرح ہی "ساق" (پنڈلی) اور "اصبع" (انگلی) وغیرہ کا مسئلہ ہے۔ یہ ایسے اعضاء نہیں جو ہمارے ہاں معروف ہیں۔ تو ایسے ہی یہ کہنا بھی ضروری ہو گا کہ اللہ تعالیٰ و سبحانہ کا نزول 'مجئی اور استواء وہ نہیں جو اجسام میں معروف ہے۔

جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے نزول 'مجئی اور استواء جسمانی ثابت کرے 'جو اجسام کو لازم ہے 'وہ شخص گمراہ ہے اور اہل حق کا اللہ تعالیٰ کے ایسے نزول 'مجئی اور استواء پر ایمان ہے جو اجسام کی صفات اور حدوث کی سمتوں سے پاک ہے اور انہوں نے ایسے نزول اور مجئی جسمانی کا انکار کیا ہے جو ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف انتقال سے معروف ہے اور اللہ رب العزت کے عرش پر استواء فرمانے پر ایمان رکھا ہے کیونکہ جو استواء اجسام سے معروف ہے وہ کیف ہے یعنی اس کی کوئی کیفیت ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے استواء کی کوئی کیفیت نہیں۔

یہی وہ سلف صالحین کا صحیح طریقہ ہے جس پر خیار امت مسلمہ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کا ایمان تھا۔

ہم بھی اللہ عزوجل کی مراد پر اور جو اس کی طرف سے آیا 'اس پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور اس پر بھی پختہ ایمان ہے جو رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آیا۔ اور وہ قطعی طور پر وہی ہے جو جسمیت سے پاک ذات کے لائق اور شایان شان ہے۔ محض خیالات 'تصورات اور اوہام کی بنیاد پر ہمارا ایمان نہیں۔

لہٰذا ہر وہ امر جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی بلند و بالا ذات کے تصور سے تیرے دل میں اضطراب پیدا کرے وہ تباہ کن ہے اور اللہ سبحانہ کی ذات اس کے خلاف ہے۔

کسی انسان کے لیے روا نہیں کہ وہ اس بلند و برتر ذات کے تصور میں ایسا غلط رستہ اختیار کرے جس میں خالق کو مخلوق پر قیاس کیا جائے 'باوجودیکہ اس کو علم ہے کہ

وہ ذات ایسی مقدس اور منزہ ہے جس کی کوئی مثل نہیں۔

کلام باری تعالیٰ جل جلالہ حق ہے' اور وہ قدیم اور غیر مخلوق ہے۔ جو شخص کلام اللہ کے حادث ہونے کا گمان کرے اور صفت حدوث میں حوادث کے ساتھ مشترک کرے' وہ گمراہ ہے اور سلف صالحین کے مذہب کے خلاف ہے۔ مسئلہ خلق قرآن کا فتنہ بھی کھڑا ہوا تھا جس کا علم ابن ابی داؤد نے اٹھایا تھا۔ ارباب عقل و دانش پر مخفی نہیں کہ حضرت امام احمد رحمتہ اللہ علیہ کو اسی جرم میں کوڑے مارے گئے کہ وہ قرآن (کلام اللہ) کے مخلوق ہونے پر اتفاق کریں لیکن آپ کی زبان تھی یا حق کی ترجمان' جس نے ایسے کٹھن مراحل میں بھی یہ کہنا گوارہ نہیں کیا اور حق و صواب کے رستے پر ثابت قدم رہے' خواہ ان کو اللہ تعالیٰ کے رستے میں طرح طرح کے عذاب سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ کے رستے میں جہاد کرنے والوں کے لیے آپ کا یہ کارنامہ ایک بہترین نمونہ اور مثال ہے۔(۱)

صفات باری تعالیٰ میں آخری کلمات

اس بحث میں نصوص واردہ کے ضمن میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ نصوص قرآن و سنت میں اس لیے وارد نہیں کہ کسی ذات سے متعلق صفات میں سے کسی ایسی صفت کو ثابت کیا جائے' جس کو اعضا کی صفات کہا جاسکے اور نہ ہی اس کی خبر دینے کے لیے کہ یہ صفت ہے۔ لامحالہ جو بھی ذکر آیا اور جو صفات اس پر مرتب ہوتی ہے مثلاً قہر' غلبہ' ربوبیت' تملک' رحمت و شفقت' تخلیق اور ایجاد وغیرہ' یہ تمام تر ایسے معانی ہیں جن میں جسمیت و جرمیت سے متعلق اعضا کو قطعاً کوئی مداخلت نہیں۔

استقرائی طور پر ہم پر واضح ہوا ہے کہ اگر ہم ایسی تمام نصوص کو جمع کرنا چاہیں جو اس حقیقت استقرائیہ کو واضح کرے' تو ہمیں ایک خاص رسالہ یا خاص بحث رقم کرنے

(۱) اس بحث کی تفصیل کے لیے مصنف کی ۱۴۱۷ھ میں شائع ہونے والی کتاب "ھو اللہ" کا مطالعہ کریں۔

کی ضرورت ہوگی لیکن یہاں ہم صرف بعض امثلہ اور شواہد نقل کرنے پر اکتفا کریں گے جن میں سب سے پہلے ہم استواء کی مثال زیر بحث لائیں گے جو تمام مشاکل و مصائب کی اصل ہے اور اس کے گرد ہی اختلاف، جھگڑا اور ردو مردود کی چکی گردش کر رہی ہے۔ تو ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں۔

استواء (قصد کرنا)

قرآن حکیم میں وارده آیات استواء میں سب سے زیادہ مشہور یہ ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔(طٰہٰ: ۵)

وہ بڑی مہروالا اس نے عرش پر استوا فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔

اس باب میں اور بھی آیات وارد ہیں، جن کو ہم الگ الگ ذکر کرکے ہر آیت سے متعلق اس قدر کلام ضرور کریں گے جتنا اس مختصر بحث کا تقاضا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ جل جلالہ سے ہم دعاگو ہیں کہ ہمیں نفع بخش علم کے ذریعے مستفید فرمائے اور ہمیں رشد و ہدایت اور حق وصواب کا دامن تھامے رکھنے کی کامل توفیق مرحمت فرمائے۔

(ا) فرمان خداوندی ہے:

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى۔(طٰہٰ: ۵)

وہ بڑی مہروالا اس نے عرش پر استواء فرمایا جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔

اس کے بعد وارد ہونے والے فرمان الٰہی پر غور کریں:

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى۔ (طٰہٰ: ۶،۷)

اس کا ہے جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں اور جو کچھ ان کے بیچ میں اور جو کچھ اس گیلی مٹی کے نیچے ہے اور اگر تو بات پکار کر کہے تو وہ تو بھید کو جانتا ہے اور اسے جو اس سے بھی زیادہ چھپا ہے۔

کیا صحیح ہے ان لوگوں کا کہنا جو استواء کو ایک قضیہ بنا کر اپنی گفتگو کا مدار اسی کو ہی

سمجھتے ہیں' تاکہ مذاہب و افکار میں موازنہ کیا جائے اور لوگوں کو سلفیہ' خلفیہ' حلولیہ' جہویہ' معطلہ اور حشویہ جیسے فرقوں میں تقسیم کیا جائے؟

کیا ان کا یہ قول صحیح ہے کہ یہ آیت استواء کے اثبات کے لیے نازل ہوئی ہے اور اس امر کی خبر دینے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر استواء فرمایا؟ جبکہ ائمہ کا یہ قول ہے کہ اس آیہ کریمہ کا مقصود ان امور کا اثبات ہے جو استواء کی صفت پر مرتب ہوتے ہیں مثلاً تملک اور تصرف۔ یہی معنی حقیقت کے قریب تر ہے جس کو عقل و فکر سے کام لینے والے مخلص بندوں کی عقول بھی تسلیم کرتی ہیں' کیونکہ ایک بادشاہ اپنی سلطنت میں نہ حکم نافذ کر سکتا ہے نہ تصرف' نہ امر و نہی کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے' نہ ہی کوئی کام کرنے کی استطاعت رکھتا ہے اور نہ ہی کوئی اسے قبول کرتا ہے' مگر جب وہ اپنی قوت و طاقت اور رعب و دبدبے کے ساتھ مملکت پر غالب آجاتا ہے۔

یہی وہ غلبہ ہے جس کو جلوس علی العرش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب خطاب اس معنی میں ہوگا تو عوام و خواص اسے بخوبی سمجھ جائیں گے اور مخلوق میں سے کوئی بھی جاہل نہیں رہے گا کہ یقیناً جلوس علی العرش کا معنی حکم کے نفاذ پر غالب آنا اور امور سلطنت کا متولی ہونا ہے۔ قرآن کریم تو جمیع مخلوق کو مخاطب کرتا ہے لیکن ان کی عقول میں تفاوت ہے اور ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق اخذ کر لیتا ہے۔

جب تمہیں یہ معلوم ہو گیا تو جان لو کہ یہ آیہ مقدسہ اسی معنی کے بیان کے لیے نازل ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ جل شانہ اس کی مراد بہتر جانتے ہیں۔ ہم لوگوں پر اپنی اس فہم کو لازم نہیں کرتے جیسا کہ ہم نے بھی غیر کی فہم کو ترک کر دیا' مگر وہ فہم لازم ہے جو سینہ نبوت سے آئے اس پر ہم یہی کہیں گے "سمعنا واطعنا وامنا وصدقنا" جب اللہ تعالیٰ کی دلیل آجائے تو عقل کی پرواز باطل ہو جاتی ہے۔ یہاں کچھ ایسی نصوص ملتی ہیں جن سے عقل منقطع ہو جاتی ہے اور بڑی وسیع اور آزاد سوچیں بھی ان کے بلند و بالا فلک کے سایہ تلے ہی محو گردش رہتی ہیں۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے

ہیں جس نے معاملہ میں وسعت رکھی۔ اگر کوئی عقلمند اور زیرک انسان قرآن کریم میں وارد ہونے والی تمام آیات استواء میں غور و فکر کرے تو تمام نصوص میں وضاحت کے ساتھ اسی حقیقت کو ظاہر پائے گا۔

(۲) سورہ اعراف میں اللہ جل شانہ کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔	بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے پھر عرش پر استواء فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔

پھر اس کے بعد ارشاد ہوا:

يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ۔ (الاعراف: ۵۴)	رات دن کو ایک دوسرے سے ڈھانکتا ہے کہ جلد اس کے پیچھے لگا آتا ہے اور سورج اور چاند اور تاروں کو بنایا سب اس کے حکم کے ماتحت ہیں۔

استواء کا ذکر تخلیق و ایجاد اور امور کونیہ کی تدبیر میں تصرف کے درمیان آیا ہے۔ امور کونیہ سے مراد لیل و نہار، شمس و قمر اور ستارے ہیں اور ان میں تصرف یہ کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔

(۳) سورہ یونس کی آیہ کریمہ میں اس حقیقت کا اظہار واضح ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔	بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے، پھر عرش پر استواء فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس صفت پر مرتب ہونے والے حقائق کونیہ اور آیات عظیمہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ (یونس: ۳)	کام کی تدبیر فرماتا ہے۔ کوئی سفارشی نہیں مگر اس کی اجازت کے بعد۔

(۴) سورہ رعد میں بھی امر بالکل اسی طرح ہے۔ جب اللہ تعالیٰ جل وعلا نے فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ	اللہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے کہ تم دیکھو پھر عرش پر استواء فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔

تو اس کے بعد اس صفت پر مرتب ہونے والے عظیم حقائق کونیہ کو بیان کرتے ہوئے یوں فرمایا:

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى (الرعد: ۲)	اور سورج اور چاند کو مسخر کیا۔ ہر ایک ایک ٹھہرائے ہوئے وعدہ تک چلتا ہے۔

(۵) قرآن کریم کا یہ عظیم مقصود اسی طرح ہی سورۃ السجدہ میں بھی وارد ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ کا فرمان عالی شان ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ	اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے چھ دن میں بنائے' پھر عرش پر استواء فرمایا۔

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان حقائق ایمانیہ کا تذکرہ فرمایا' جن کا لحاظ رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (السجدة: ۴)	اس سے چھوٹ کر تمہارا کوئی حمایتی ہے اور نہ سفارشی تو کیا تم دھیان نہیں کرتے۔

(۶) اور یہی مقصود اللہ سبحانہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى	وہی ہے جس نے آسمان اور زمین چھ دن میں پیدا کئے پھر عرش پر استواء فرمایا جیسا

عَلَى الْعَرْشِ۔ اس کی شان کے لائق ...

پھر اللہ جل مجدہ الکریم نے ان حقائق علمیہ کا بیان فرمایا جو اس صفت پر مرتب ہوتے ہیں۔ ان پر ایمان رکھنا اور تسلیم کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ اس صفت استواء کے لوازمات ہیں، جس کا مفہوم تخلیق و تدبیر کے امور میں کامل قدرت اور تصرف ہے۔ اور وہ یہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا۔

جانتا ہے جو زمین کے اندر جاتا ہے اور جو اس سے باہر نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے۔

(الحدید: ۴)

(۷) یہی کلام سورہ فرقان کی آیہ کریمہ میں بھی جاری ہے، جس کی ابتدا تخلیق ارض و سما کے ذکر سے ہوئی تاکہ انسان کو امور وجودیہ میں غور و فکر کرنے پر تنبیہ کی جائے۔ تو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا:

الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ۔

جس نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دن میں بنائے پھر عرش پر استوا فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔

پھر اس کے بعد یوں ذکر فرمایا:

الرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا۔

وہ بڑی مہر والا، تو کسی جاننے والے سے اس کی تعریف پوچھ۔

(الفرقان: ۵۹)

(۸) یہی مقصود عظیم اللہ تبارک و تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ۔

پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا اور وہ دھواں تھا۔

یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے آسمان پر استوا فرمانے کی خبر دینا مقصود نہیں اور نہ ہی

اس فعل الٰہی کے وقت کا تعین کرنا مقصود ہے جو لفظ "ثم" سے مرتب ہوتا ہے۔

پوری آیت سے اس کا مقصود واضح ہو جاتا ہے جو کہ ارض و سما میں کامل قدرت و تصرف ہے اور یہی معنیٰ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان عالیشان سے حاصل ہوتا ہے:

فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ. (حم السجدة: ۱۱)

تو اس سے اور زمین سے فرمایا کہ دونوں حاضر ہو خوشی سے چاہے ناخوشی سے۔ دونوں نے عرض کی کہ ہم رغبت کے ساتھ حاضر ہوئے۔

دعوت فکر

اب اس معنیٰ کو بنظر ایمان دیکھو جو عظمت و جلالت کا حامل، مقام الوہیت و ربوبیت کے لائق اور اللہ تعالیٰ جل جلالہ کے اسماء و صفات کا حلول و حدوث اور مماثلت و مشابہت سے پاک اور منزہ ہونے کا غماز ہے۔

کیا اب بھی کسی کا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے آسمانوں پر استواء فرمانے کے بیان کے لیے نازل ہوئی ہے؟ وہ کون سا کمال ہے، وہ کون سا جلال اور جمال ہے جو اسی صفت استواء الی السماء کے اثبات سے حاصل ہوتا ہے؟

اور کیا اس کے بعد صحیح ہوگا کہ کوئی اس صفت استواء کی تفسیر یوں کرے کہ اس سے مراد حقیقی اور ذاتی جلوس ہے اور وہ استقرار تام ہے جو لغوی طور پر "جلس یجلس بمعنی استقر یستقر" سے حاصل ہوتا ہے؟

دست قدرت

بہر حال مسئلہ ید (ہاتھ) درج ذیل پانچ نصوص میں وارد ہے:

(۱) بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ۔ (المائدہ: ۶۴) — بلکہ اس کے ہاتھ کشادہ ہیں۔

(۲) لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ۔ (ص: ۲) — جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔

(۳) يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔ (الفتح: ۱۰) — ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

(۴) بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ۔ (یٰسین: ۸۳) — اس کے ہاتھ ہر چیز کا قبضہ ہے۔

(۵) بِيَدِكَ الْخَيْرُ۔ (آل عمران: ۲۶) — ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے۔

ان آیات مبارکہ میں بھی سابقہ تحلیل و تطبیق پورے کی پوری جاری ہوگی۔ تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس فرمان "بل یداہ مبسوطتان" کے بارے میں ہمارا یہ کہنا نہایت مناسب ہوگا کہ یہ آیہ مقدسہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھوں کو ثابت کرنے کے لیے نازل نہیں ہوئی' کیونکہ اثبات یدین کے مسئلے کو فقط اس حیثیت سے کہ دو ہاتھ ہیں' اللہ جل شانہ کے کمال یا جلال سے کوئی علاقہ نہیں۔ چہ جائیکہ اس ہاتھ کے حقیقی یا غیر حقیقی ہونے پر کلام کیا جائے' اگرچہ ہم کیفیت سے جاہل ہونے کا اقرار ہی کریں' کیونکہ کیفیت کا بیان کرنا صریح کفر ہے۔ واضح ہوا کہ یدین بحیثیت دو ہاتھ کے اثبات کو کمال یا جلال الٰہی میں کوئی مداخلت نہیں' اور نہ ہی اس کے اعتقاد پر ایمان یا یقین کی زیادتی مرتب ہوتی ہے' بلکہ اس مسئلہ میں اگر تصور وسیع ہو جائے اور مخصوص حد سے تجاوز کر جائے تو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن جو معنی ثمرات ایمان کی زیادتی' یقین

کی تقویت اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یاس و امید کے غلبے کی پاسداری کرتا ہے وہ جود و عطا، کرم و سخا اور فضل الٰہی ہے۔

یہی وہ معنی ہے جس کا بیان اللہ سبحانہ نے اس کے بعد یوں فرمایا:

بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ — بلکہ اس کے ہاتھ کشادہ ہیں عطا فرماتا ہے جیسے چاہے۔

اس لیے اہل زبان "ہاتھ کی لمبائی" کو کرم و بخشش سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

فلان يده طويلة: — فلاں کا ہاتھ لمبا ہے۔

اس سے مراد فلاں کا فیاض اور سخی ہونا ہے نہ کہ طول حقیقی، کیونکہ حقیقی لمبائی نہ ہو تو اس وصف سے کمال میں کوئی فائدہ ہے نہ جمال میں۔

مثال کے طور پر عربوں کا ایک اور مقولہ:

فلان يده مخروقة: — فلاں کا ہاتھ پھٹا ہوا ہے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کچھ بھی ذخیرہ نہیں کرتا، بلکہ خرچ کر دیتا ہے۔ حضور سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا سیدہ زینب بنت جحش کے بارے میں ارشاد گرامی ہے:

اَسْرَعُكُنَّ لُحُوقًا بِيْ اَطْوَلُكُنَّ يَدًا۔ — تم میں سے میرے ساتھ لاحق ہونے میں زیادہ جلدی کرنے والی وہ ہے جس کے ہاتھ سب سے بڑے ہیں۔

تو تمام ازواج مطہرات اپنے اپنے ہاتھوں کی لمبائی ظاہر کرنے لگیں کیونکہ ان کے ذہن میں طول حسی حقیقی مراد تھا جبکہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے رستے میں سب سے زیادہ احسان کرنے والی اور بھلائی کے کاموں میں دوسروں کی مدد کرنے والی ہے۔ اس فرمان عالیشان سے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا اشارہ سیدہ زینب بنت جحش کی طرف تھا۔ کیونکہ ان امور میں سبقت لے جانے کا شرف انہی کا حصہ تھا۔

یہی بحث اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں جاری ہوتی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۔(الفتح: ۱۰)	وہ جو تمہاری بیعت کرتے ہیں وہ تو اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔

تو ہم کہیں گے کہ یہ آیہ کریمہ بھی یہ خبر دینے کے لیے نازل نہیں ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے اور اس کا ہاتھ بیعت کرنے والے صحابہ کے ہاتھوں پر ہے بلکہ یہ آیت ایک ایسے قضیہ کے بیان کے لیے نازل ہوئی جو اس سے کہیں بڑا ہے اور ایک عظیم مسئلہ سے خبردار کرنے کے لیے۔ سنو! وہ اس بیعت کی تاکید اور امور بیعت کی تعظیم ہے اور اس بیعت کی قدر و منزلت اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ وابستگی کی خبر دینا ہے اور یہ آیت حلقہ بیعت میں منسلک ہونے والے حضرات کو قوت بہم پہنچاتی ہے اور ان کے فعل کی توثیق کرتی ہے۔ اس لیے آیہ کریمہ کی ابتداء بیعت سے ہوئی ہے "ان الذين يبايعونك انما يبايعون الله يد الله فوق ايديهم" پھر "انما يبايعون الله" سے تنبیہ کی گئی کہ یہ بیعت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ پھر اس کے بیعت کی عظمت و برکت واضح کرنے کے لیے "يد الله فوق ايديهم" فرمایا، تاکہ یہ معنی ان کے افہام و اذہان کے قریب تر ہو جائے۔ پھر اس کے بعد بیعت کے حوالے سے مسئلہ ید پر مرتب ہونے والے امور کا بیان فرمایا یعنی بیعت سے عہد و میثاق کی انتہائی پاسداری کرنا اور خیانت نہ کرنا اور جو خیانت کرے گا وہ اللہ تعالیٰ سے خیانت کرے گا۔ اسی بیان کے لیے اللہ تعالیٰ نے بعد میں فرمایا:

وَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۔	تو جس نے عہد توڑا اس نے اپنے برے عہد کو توڑا۔

میں دوبارہ سابقہ گفتگو کی تاکید کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ بے شک مسئلہ ید، اس کا اثبات اور جو اوہام اس مسئلہ کے ضمن میں ہیں، وہ اس آیہ مقدمہ کا مقصود نہیں،

ورنہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے' اللہ وہ ہے جس کی آنکھ ہے' وہ اللہ ہے جس کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں' وہ اللہ ہے جو عرش پر بیٹھا ہے یا وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں پر قصد فرمایا' لہٰذا غور و فکر سے کام لینا ضروری ہے۔ یہ ان صفات معنویہ کے علاوہ ہیں جن کا تعلق اعضا سے نہیں کیونکہ صفات معنویہ سے متعلق آیات طیبات طریقہ اخبار پر ہی نازل ہوئی ہیں۔ جیسے یہ فرمان خداوندی ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَاۤءُ الْحُسْنٰى یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔(الحشر: ۲۲'۲۳'۲۴)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہر نہاں و عیاں کا جاننے والا۔ وہی ہے بڑا مہربان رحمت والا۔ وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہ نہایت پاک سلامتی دینے والا۔ امان بخشنے والا' حفاظت فرمانے والا' عزت والا' عظمت والا' تکبر والا' اللہ کو پاکی ہے ان کے شرک سے۔ وہی ہے اللہ بنانے والا' پیدا کرنے والا' ہر ایک کو صورت دینے والا' اسی کے ہیں سب اچھے نام اس کی پاکی بولتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہی عزت و حکمت والا ہے۔

تو یہ صفات آیہ مقدسہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کی صفات سے متعلق خبر دینے کے لیے وارد ہوئیں جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ۔

جان لو بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

اور بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور متعدد آیات کے آخری حصے اسی معنی پر مشتمل ہیں جیسے:

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ۔ اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ۔ اور اللہ تعالیٰ غالب ہے انتقام لینے والا ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہی غالب اور حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا معزز بندہ

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۔(الحجرات: ۱۳)

اے لوگو ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شاخیں اور قبیلے کیا کہ آپس میں پہچان رکھو۔ بے شک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی اس آیت کریمہ کا شان نزول یوں ذکر کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: کہ فتح مکہ کے روز حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی تو عتاب بن اسید بن ابو العیص نے کہا: تمام تعریفیں اللہ کی ہیں جس نے میرے والد کو موت دی کہ انہوں نے یہ دن نہیں دیکھا' حارث بن ہشام نے کہا: کہ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو اس غراب اسود (کالا کوا) کے علاوہ کوئی موذن نہیں ملا' سہیل بن عمرو نے یوں کہا: کہ اگر اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہوتا تو اس کا رنگ ہی بدل

دیتا' ابو سفیان نے کہا: کہ میں اس ڈر سے کچھ بھی نہیں کہوں گا کہ کہیں آسمانوں کا رب اس کی خبر نہ دے دے۔ تو جبریل امین علیہ السلام حضور نبی اکرم علیہ الصلوۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سب کی باتوں کی خبر دی۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ان کو بلایا اور ان باتوں کے متعلق پوچھا تو انہوں نے اقرار کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ جل شانہ نے یہ آیہ کریمہ نازل فرمائی جس میں ان کو محض نسب اور کثرت مال کے سبب فخر کرنے پر اور فقراء کو گھٹیا سمجھنے پر زجر و توبیخ کی گئی' اور واضح کیا گیا کہ عزت و عظمت کا دارومدار تقویٰ پر ہے۔ سب کے سب آدم اور حوا (علیہما السلام) کی اولاد ہیں۔ اس ناتے سے کسی کو کوئی فضیلت نہیں' ہاں فضیلت تقویٰ کی بنا پر ہے۔

جامع ترمذی میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

یاایها الناس ان الله قد اذهب عنكم عيبه الجاهليه وتعاظمها بابائها فالناس رجلان: رجل برتقي كريم على الله' وفاجر شقي هين على الله' والناس بنو آدم' وخلق الله آدم من تراب' قال الله تعالى: يا ايها الناس انا خلقناكم من ذكر وانثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اكرمكم عندالله

اے لوگو! بیشک اللہ تعالیٰ نے تم سے زمانہ جاہلیت کے عیوب اور محض آباء و اجداد کے حوالے سے بڑائی ظاہر کرنے کو دور کر دیا ہے۔ پس لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ نیکوکار اور متقی شخص اللہ کے ہاں معزز و مکرم ہے اور فاسق و فاجر اور بدبخت شخص اللہ کے ہاں ذلیل ہے۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں شاخیں اور

اتقاکم۔(تفسیر القرطبی: ۱۶/ ۲۲۳) قبیلے کیا کہ آپس میں پہچان رکھو بے شک اللہ کے ہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔

علامہ ابن کثیر اللہ تعالیٰ کے فرمان "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" کے تحت رقمطراز ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ہاں تقویٰ کی بنیاد پر فضیلت حاصل کر سکتے ہو نہ کہ حسب و نسب کے حوالے سے اور اس مفہوم پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی احادیث وارد ہیں' پھر چند احادیث کو ذکر کیا:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای الناس اکرم؟ قال: اکرمهم عنداللہ اتقاهم' قالوا: لیس عن هذا نسالک' قال: فاکرم الناس یوسف' نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن نبی اللہ ابن خلیل اللہ' قالوا: لیس عن هذا نسالک قال فعن معادن العرب تسالوننی؟ قالوا: نعم قال فخیارکم فی الجاهلیه خیارکم فی الاسلام اذا فقهوا۔ (رواہ البخاری)

رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا: لوگوں میں سے کون معزز ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے ہاں وہ معزز ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اس بارے میں ہمارا سوال نہیں ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں میں سے زیادہ معزز یوسف (علیہ السلام) ہیں جو اللہ کے نبی ہیں' ان کا باپ اور دادا بھی اللہ کے نبی ہیں اور پردادا اللہ کا خلیل ہے۔ انہوں نے عرض کیا: ہمارا سوال اس بارے میں بھی نہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ قبائل عرب کے بارے میں تم پوچھنا چاہتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: زمانہ جاہلیت میں برگزیدہ لوگ اسلام میں بھی برگزیدہ ہیں جب

وہ فقاہت سے کام لیں۔

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله لا ينظر الى صوركم واموالكم ولكن ينظر الى قلوبكم واعمالكم۔ (رواہ مسلم)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا لیکن تمہارے دلوں اور اعمالوں کو دیکھتا ہے۔

(۳) حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ان النبى صلى الله عليه وسلم قال له: انظر فانك لست بخير من احمر ولا اسود الا ان تفضله بتقوى الله۔ (تفرد بہ احمد رحمۃ اللہ علیہ)	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ دیکھ بے شک تو کسی سرخ سے بہتر ہے نہ سیاہ سے، مگر اس صورت میں کہ تو تقویٰ کے ذریعے اللہ کے ہاں فضیلت حاصل کر لے۔

(۴)۲ حضرت حبیب بن خراش عصری سے مروی ہے:

انه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: المسلمون اخوة لا فضل لاحد على احد الا بالتقوى۔ (رواہ الطبرانی)	انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے ساتھ۔

(۵) حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كلكم بنو آدم	"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی

وآدم خلق من التراب' ولينتهين قوم يفخرون بابائهم اوليكونن اهون على الله تعالى من الجعلان- رواه البزار' ثم قال لا نعرفه عن حذيفة الا من هذا الوجه۔
(تفسیر ابن کثیر: ۴ / ۳۳۳)

سے پیدا کیے گئے اور ایک قوم نے اپنے آباء و اجداد پر فخر کرتے ہوئے انتہا کر دی یا وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں چیتھڑوں سے بھی ذلیل ہو گئے۔" اس کو بزار نے روایت کیا' پھر کہا کہ اس روایت کو ہم حذیفہ سے صرف اسی طریق سے جانتے ہیں۔

حقائق واضح ہیں

ان حقائق ثابتہ اور نصوص قطعیہ کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا اور لغت عربیہ سے ادنیٰ سی معرفت رکھنے والا بھی ان کے فہم معنی میں اختلاف نہیں رکھتا لیکن بعض لوگ ان نصوص کے سہارے اپنی اندھی عقل' بری سوچ اور قلبی نحوست کو اجاگر کرتے ہوئے اہل بیت اطہار پر دھاوا بول دیتے ہیں اور ان نصوص کے ضمن میں تنقید' نقص' حقارت اور بغض کو ظاہر کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں' اس لیے کہ ان کا مقصود ثابت ہو جائے' یعنی اہل بیت کے ساتھ ان کا صدری حسد' بغض اور کینہ فروغ پائے۔ حالانکہ حقوق' واجبات اور فضائل کی حد بندی میں' اور خصائص و کمالات کے تحفظ میں ادلہ شرعیہ بغیر کسی تعارض اور تناقض کے محفوظ اور مضبوط ہیں۔ ہر ایک یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ قانون شریعت میں سب برابر ہیں۔ سید و غیر سید' عالم و جاہل اور عربی و عجمی میں کوئی فرق نہیں۔ یہ سب کچھ صحیح ہے' لیکن اہل بیت' اہل علم اور اہل فضل و کمال کے حقوق کا تحفظ اور ان کی شرافت و کرامت کا اقرار

لازم ہے۔

آل بیت نبوت اور قرآن

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا۔

اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ اے نبی کے گھر والو کہ تم سے ہر ناپاکی دور فرما دے اور تمہیں پاک کر کے خوب ستھرا کر دے۔

(الاحزاب: ۳۳)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت رقمطراز ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اے آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ تم سے برائی اور بے حیائی کو دور کرے اور گناہوں سے پیدا ہونے والی سیاہی سے تمہیں مکمل طور پر پاک رکھے۔"

ابو زید سے مروی ہے کہ یہاں "رجس" سے مراد شیطان ہے۔

امام طبری نے اپنی سند کے ساتھ سعید بن قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا" میں اہل بیت نبوت ہی مراد ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کی برائی سے پاک کیا اور اپنی رحمت کے ساتھ خاص کیا۔

ابن عطیہ فرماتے ہیں کہ "رجس" کا اطلاق گناہ، عذاب، نجاسات اور نقائص پر برابر ہوتا ہے، تو اللہ جل شانہ نے یہ تمام چیزیں اہل بیت اطہار سے دور کر دیں۔

امام نووی "رجس" کے معنی میں شک، عذاب اور گناہ کا منقول ہونا بیان فرماتے ہیں۔ علامہ ازہری کہتے ہیں کہ ہر ناپسندیدہ چیز کو "رجس" کہتے ہیں چاہے اس کا تعلق عمل سے ہو یا غیر سے۔

اہل بیت کون ہیں؟

مذکورہ آیت کے حوالے سے اہل بیت میں مفسرین کا اختلاف ہے:

(۱) مفسرین کے ایک طبقہ کی رائے یہ ہے کہ اہل بیت سے مراد اہل عبا ہیں یعنی وہ نفوس قدسیہ جو چادر مبارک کے نیچے جمع تھے اور وہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، علی المرتضیٰ، فاطمۃ الزہراء، حسن اور حسین رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔

(۲) اور ایک طبقہ کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ازواج مطہرات ہیں۔

(۳) جمہور مفسرین کا موقف یہ ہے کہ اس آیت میں اہل بیت سے مراد فریقین (اہل عبا و ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں کیونکہ اہل بیت کا مفہوم دونوں کو شامل ہے اور دیگر تمام دلائل بھی اسی پر شاہد ہیں۔

ابن عطیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہی معنی ظاہر ہے اور ازواج مطہرات کسی صورت میں اس سے خارج نہیں ہو سکتیں تو اہل بیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج، بیٹیاں اور ان کی اولاد اور شوہر داخل ہیں۔

علامہ محقق شیخ احمد بن حجر ہیتمیؒ فرماتے ہیں: حاصل یہ ہے کہ اہل بیت سکنی (گھر میں بسنے والے) اس آیت میں داخل ہیں کیونکہ وہی اس کے مخاطب ہیں۔ اور اہل بیت نسبی کا خاص مراد ہونا مخفی ہے۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے جن امور کی وضاحت فرمائی ہے، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں اہل بیت سے وہی مراد ہیں جو عام ہو اہل بیت سکنی جیسے ازواج مطہرات اور اہل بیت نسبی جیسے اہل عبا اور اہل بیت نسبی میں سارے بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب داخل ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے متعدد طرق سے مروی ہے جن سے بعض کی سند حسن ہے: کہ "میں ان اہل بیت میں سے ہوں جن سے اللہ تعالیٰ نے رجس (پلیدی) کو دور کیا اور کامل طور پر پاک کر دیا۔" تو اہل بیت نسب آیت میں اہل بیت سکنی کی طرح ہی مراد ہے۔ اس سلسلے میں

امام مسلم نے زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ "جب ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی بیویاں اہل بیت میں داخل ہیں؟ تو انہوں نے کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اہل بیت سے ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت پر صدقہ حرام ہے جس کا اشارہ اس طرف ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اہل بیت سکنی سے ہیں جو کرامات اور خصوصیات کے ساتھ دوسروں سے ممتاز ہیں' نہ کہ اہل بیت نسب سے' یہ وہی لوگ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔(الصواعق المحرقہ: ۲۲۲)

اہل عباء کی فضیلت

اہل عباء آل بیت نبوت کی اصل ہیں اور ان سے مراد سید اعظم نبی اکرم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم' سیدتنا حضرت فاطمۃ الزہرا' ان کے شوہر علی المرتضیٰ اور دونوں بیٹے حسن اور حسین رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں۔ عباء سے مراد وہ مبارک چادر ہے جس کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے سمیت ان پر وسیع کیا اور اس سے سب کو ڈھانپ لیا اور وہ تمام اس کے نیچے چھپ گئے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا حسن و حسین کو ساتھ لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ میں ایک ہانڈی تھی جس میں گرم کھانا تھا' حتیٰ کہ آپ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اسے آپ ﷺ کے سامنے رکھا تو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا: "این ابو الحسن ؟" (ابو الحسن کہاں ہیں؟) سیدہ نے عرض کیا کہ گھر میں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا' پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم' علی المرتضیٰ' سیدہ فاطمہ' حسن اور حسین رضی اللہ عنہم اکٹھے بیٹھ کر کھانے لگے۔ ام سلمہ کہتی ہیں: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بلایا حالانکہ آج سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دعوت دیئے بغیر کبھی کھانا تناول

نہ فرماتے' بشرطیکہ میں وہاں موجود ہوں لیکن آج مجھے آپ ﷺ نے دعوت نہ دی۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے ان پر کپڑا ڈال دیا اور یوں دعا کی:

اللھم عاد من عاداھم ووال من والاھم۔(مسند ابو یعلی)	اے اللہ جو ان سے عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت رکھ اور جو ان سے پیار کرے اس سے تو بھی پیار کر۔

اس روایت کے بارے میں حافظ ہیثمی نے مجمع الزوائد (۹/ ۲۶۴) میں ذکر کیا ہے کہ اس کی سند جید ہے۔

(۲) ابو عمار شداد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں واثلہ بن اسقع کے پاس آیا۔ ان کے پاس لوگ بیٹھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کر رہے تھے' جب وہ چلے گئے تو وہ مجھ سے مخاطب ہوئے کہ میں تجھے اس بات کی خبر نہ دوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دیکھی۔ میں نے کہا: ہاں' تو انہوں نے کہا کہ میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور حضرت علی کا پوچھا' انہوں نے کہا کہ وہ حسن و حسین سمیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔ تو میں ان کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور حسن و حسین بھی آپ کے ساتھ تھے۔ ہر ایک نے آپ کا دست مبارک پکڑ رکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لائے تو علی اور فاطمہ کو قریب کیا اور حسن و حسین کو بھی ایک ایک ران پر بٹھالیا۔ پھر سب پر اپنی چادر اوڑھ دی' پھر یہی آیت تلاوت کی: "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا" اور یوں دعا فرمائی:

اللھم ھولاء اھل بیت واھل بیت احق۔	اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں اور میرے اہل بیت سب سے زیادہ حقدار ہیں۔

اسے امام احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور ابو یعلی نے ذرا اختصار کے ساتھ روایت کیا اور یہ اضافہ کیا:

الیک لاالی النار۔ تیری رحمت کے حقدار ہیں نہ کہ دوزخ کے۔

حافظ ہیثمی مجمع الزوائد (۹ / ۲۶۳) میں کہتے ہیں کہ اس روایت میں محمد بن مصعب ضعیف الحدیث اور حافظہ میں کمزور ہیں، لیکن صالح شخص ہیں۔

(۳) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ یہ آیہ کریمہ "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا" پانچ نفوس کے بارے میں نازل ہوئی یعنی میرے، علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے حق میں نازل ہوئی۔ اسے محدث بزار نے روایت کیا۔

(۴) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ فاطمہ کی رخصتی کے بعد چالیس روز علی الصبح حضرت علی کے پاس آتے اور یوں فرماتے:

السلام علیکم اھل البیت ورحمہ اللہ وبرکاتہ "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔"

(الطبرانی)

(۵) سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چھ ماہ یہ معمول رہا کہ جب نماز فجر کے لیے نکلتے تو سیدہ فاطمہ کے دروازے سے یہ کہتے ہوئے گزرتے:

الصلوٰۃ یااھل البیت۔ اے گھر والو نماز کا وقت ہو گیا۔

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم

تطھیرا۔

امام ترمذی نے اس کو روایت کیا اور کہا کہ یہ حدیث اس طریق سے "حسن" ہے۔ (جامع الترمذی، حدیث: ۳۲۰۶)

(۶) حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے سترہ ماہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب آپ ﷺ اپنے کاشانہ نبوت سے نکلتے تو سیدہ فاطمہ کے دروازے پر آکر یوں فرماتے:

الصلوٰۃ رحمکم اللہ۔ اللہ تم پر رحم فرمائے نماز کی تیاری کرو۔

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔ (رواہ الطبرانی)

مجمع الزوائد (۹ / ۲۶۷) میں ہے کہ اس روایت میں عمر بن شیب المسلی ہے جو کہ ضعیف ہے۔

(۷) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سیدہ فاطمہ کچھ کھانا لے کر اپنے والد مکرم حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی جبکہ آپ ﷺ اپنے بستر پر تشریف فرما تھے۔ تو حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ اپنے بیٹوں اور چچازاد کو بلا کر لاؤ۔

ام سلمہ فرماتی ہیں کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ان سب پر چادر اوڑھادی اور یوں دعا کی:

اللھم ھولاء اھل بیتی وحامتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیرا۔

ام سلمہ عرض کرتی ہیں کہ یارسول اللہ ﷺ میں بھی ان خوش بختوں میں شامل ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہو اور یہی بہتر ہے۔ (الطبرانی والترمذی)

صاحب ترمذی نے اس کو روایت کرنے کے ساتھ حدیث حسن بھی کہا ہے۔

(۸) ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبح صبح ایک ایسی چادر اوڑھ کر نکلے جس پر سیاہ بالوں سے نقش و نگار کیا ہوا تھا تو حسن بن علی آئے ' ان کو آپ ﷺ نے چادر میں داخل کر لیا پھر حسین آئے وہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ داخل ہو گئے پھر سیدہ فاطمہ تشریف لائیں تو ان کو بھی آپ نے دامن رحمت میں جگہ دی ' پھر علی المرتضیٰ آئے ان کو بھی چادر میں داخل فرمالیا پھر قرآن حکیم کی یہ آیہ مقدسہ تلاوت فرمائی: "انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا۔"

(صحیح مسلم باب فضائل اہل بیت النبی ﷺ ۴/۱۵۰۱)

نسبت رسول ﷺ کا احترام

(۱) امام محمد بن اسماعیل بخاری حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کرتے ہیں کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ارقبوا محمدا صلی اللہ علیہ وسلم فی اھل بیتہ۔	اہل بیت اطہار کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کالحاظ کیا کرو۔

(البخاری)

(۲) انہی نے نقل کیا ' حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لقرابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احب الی ان اصل من قرابتی۔(البخاری)	قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت مجھے اپنی قرابت سے صلہ رحمی سے کہیں زیادہ پسند ہے۔

(۳) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

احبوا اللہ لما یغذوکم بہ من نعمہ واحبونی بحب اللہ واحبوا اھل بیتی لحبی۔
(جامع ترمذی' المستدرک للحاکم: ۳ / ۱۵۰)

اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اس لیے کہ وہ تمہیں اپنی گراں قدر نعمتوں سے نوازتا ہے' اور اللہ کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے لیے میرے اہل بیت سے محبت کرو۔

(۴) طبرانی نے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو لوگوں سے یوں کہتے ہوئے سنا' جب انہوں نے ام کلثوم بنت علی بن ابو طالب سے نکاح کیا: کیا تم مجھے مبارک باد نہیں دو گے؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

ینقطع یوم القیامہ کل سبب ونسب الا سببی ونسبی۔
(طبرانی اوسط اور کبیر' مجمع الزوائد: ۹ / ۱۷۳)

روز قیامت ہر سبب اور نسب منقطع ہو جائے گا علاوہ میرے سبب اور نسب کے۔

(۵) امام احمد نے اپنی مسند میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انی تارک فیکم خلیفتین: کتاب اللہ ممدود ما بین السماء والارض--- او ما بین السما الی الارض--- وعترتی اھل بیتی وانھما لن یتفرقا حتی یردا علی الحوض۔
(مسند امام احمد: ۵ / ۱۸۲)

میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں' ایک اللہ کی کتاب ہے جو زمین و آسمان کے علوم و معارف کو گھیرے ہوئے ہے' اور ایک میرے اہل بیت۔ یہ دونوں ہرگز جدا جدا نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ یہ دونوں مجھے حوض کوثر پر آملیں گے۔

حافظ ہیثمی (مجمع الزوائد: ۹ / ۱۶۲) میں کہتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے۔

(۶) امام حاکم نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لا یبغضنا اھل البیت احد الا ادخلہ اللہ النار۔ (مستدرک: ۳/ ۱۵۰)	قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کوئی بھی ہم اہل بیت سے بغض نہ رکھے ورنہ اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں دھکیل دے گا۔

امام حاکم فرماتے ہیں' یہ حدیث شرط مسلم پر ہے لیکن شیخین نے اسے نقل نہیں کیا اور حافظ ذہبی نے اس سے سکوت کیا ہے۔

(۷) ابو یعلی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خیرکم خیرکم لاھلی من بعدی۔	میرے بعد تم میں سے بہترین لوگ میرے اہل بیت ہیں۔

حافظ ہیثمی نے ابو یعلی کی اس روایت کو (مجمع الزوائد: ۹/ ۱۷۴) میں نقل کیا اور کہا کہ اس کے رجال ثقہ ہیں۔

(۸) امام حاکم اس روایت کو نقل کرکے اسے صحیح قرار دیتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے باب کعبہ کو تھام کر کہا: جو مجھے پہچانتا ہے وہ تو پہچانتا ہی ہے اور جو نہیں جانتا وہ سن لے۔ میں ابوذر ہوں' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

الا ان مثل اھل بیتی فیکم مثل سفینہ نوح من قومہ' من رکبھا نجا ومن تخلف عنھا غرق۔ (مستدرک: ۳/ ۱۵۰)	خبردار! میرے اہل بیت کی مثال تم میں سفینہ نوح کی مانند ہے' جو اس میں سوار ہوگیا' نجات پاگیا اور جو پیچھے رہ گیا غرق ہوگیا۔

امت مسلمہ کے نام رسول اللہ ﷺ کا پیغام

امام مسلم نے اپنی صحیح میں یزید بن حیان سے روایت کیا ہے کہ میں ' حصین بن سبرہ اور عمر بن مسلم تینوں زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے۔ جب ہم نے ان سے نشست کی تو حصین نے انہیں کہا کہ اے زید! آپ کو بڑی سعادتیں میسر ہوئی ہیں کہ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی' آپ کی مبارک گفتگو سماعت کی' آپ کی معیت میں غزوات میں شریک ہوئے اور آپ کے پیچھے نمازیں پڑھنے کا شرف تم نے حاصل کیا البتہ بے شمار اعزاز و اکرام آپ کو نصیب ہوئے' تو ہمیں بھی سناؤ جو تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زبان سے سننے کی سعادت حاصل کی' تو حضرت زید نے کہا: کہ اللہ جل جلالہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد و ثنا کی اور کچھ وعظ و نصیحت کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا ایھا الناس' فانما انا بشر یوشک ان یاتی رسول ربی فاجیبه وانا تارک فیکم ثقلین: اولھما کتاب اللہ فیه الھدی والنور' فخذوا بکتاب اللہ واستمسکوا به۔	خبردار! اے لوگو! بے شک میں بشر ہوں۔ قریب ہے کہ میرے پروردگار کا قاصد آئے اور میں اس کو لبیک کہہ دوں اور میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب جو نور ہدایت کا سرچشمہ ہے' تو تم اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھام لو۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ پر استقامت کے لیے خوب برانگیختہ کیا اور اس میں رغبت دلائی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

واھل بیتی اذکرکم اللہ فی اھل بیتی' اذکرکم اللہ فی	اور میرے اہل بیت' میں تم کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا

اھل بیتی۔	ہوں' میں تم کو اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں۔

علامہ صبان "اسعاف الراغبین" میں رقمطراز ہیں کہ "اذکرکم اللہ فی اھل بیتی" کا معنی ہے:

احذرکم اللہ فی شان اھل بیتی۔	میں تمہیں اہل بیت کی شان کے بارے میں اللہ سے ڈراتا ہوں۔

علامہ ابن علان "شرح ریاض الصالحین" میں حدیث مذکورہ پر یوں تبصرہ فرماتے ہیں کہ آخری جملہ کے تکرار میں اہل بیت اطہار کے ساتھ محبت و مودت اور ان کی شان میں تعظیم و تکریم بجالانے پر تاکید ہے۔ تو اس کا تعلق واجب موکد کے قبیلے سے ہے جو برانگیختہ کرنے کی صورت میں مطلوب ہوتا ہے۔

"الاسعاف" میں امام احمد کی روایت کے لفظ یوں ہیں:

انی اوشک ان ادعی فاجیب وانی تارک فیکم الثقلین: کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض' وعترتی اھل بیتی' وان اللطف الخبیر اخبرنی انھما لن یتفرقا حتی یردا علی الحوض یوم القیامہ' فانظروا فیما تخلفونی فیھما۔	قریب ہے کہ مجھے بلاوا آئے اور میں خالق حقیقی سے جاملوں' میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں' اللہ کی کتاب جو آسمانوں سے زمین تک لمبی رسی ہے' اور میری عزت یعنی اہل بیت' بیشک لطیف اور خبیر اللہ نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ہرگز جدا نہیں ہوں گی یہاں تک کہ مجھے قیامت کے دن حوض پر ملیں گے' لہٰذا تم اس معاملہ میں محتاط رہو کہیں ان دونوں کے بارے میں مجھے چھوڑ نہ دینا۔

شارح صحیح مسلم امام نووی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "حبل ممدود" سے

مراد اللہ کا عہد ہے یا وہ سبب جو اللہ تعالیٰ کی رحمت و رضا تک پہنچا دے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے الفاظ یوں ہیں:

ایھا الناس قد ترکت فیکم ما ان اخذتم بہ لن تضلوا: کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی۔

اے لوگو! میں تم میں جو چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم اس کو مضبوطی سے تھامے رکھو تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے' ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری عترت یعنی اہل بیت۔

حضور سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان "ان اخذتم بہ" کا مفہوم یہ ہے کہ ان دونوں کے تمام تر مناسبات کو اپنا لینا' کتاب اللہ کے احکام پر استقامت اختیار کرنا' اس کے حلال کردہ کو حلال اور حرام کردہ کو حرام سمجھنا اور اہل بیت کے ساتھ محبت و مودت کا حق ادا کر دینا جو دراصل ان کی عظیم نسبت کا تقاضا ہے' ان کی عظمت و بزرگی کی پاسداری اور اعزاز و اکرام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھنا یہ ان سب کا برابر حق ہے۔

اہل بیت اور علماء اسلام

دور قدیم سے ہی متعدد علماء اسلام نے اہل بیت اطہار کے شرعی حقوق و واجبات کے مسئلہ میں نہایت اہتمام کیا ہے' جن میں سے اکثر نے انصاف کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا جبکہ کچھ حضرات نے بالکل اس مسئلے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور بعض نے اس موضوع میں انتہائی درجے کا غلو کیا لیکن اس سلسلے میں علوم و فنون کے جمیع ائمہ کے موقف انتہائی حسین اور اعمال قابل تحسین ہیں۔

ان میں شیخ ابن تیمیہ کا نام بھی قابل ذکر ہے اس لیے کہ اہل بیت کی فضیلت میں ان کی ایک مستقل کتاب ہے' جو کئی اسلامی ممالک میں متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ انہوں نے اس مسئلہ کو نہایت منصفانہ طور پر نبھایا اور کتاب اللہ میں اہل بیت کی

طہارت پر وارد ہونے والے الفاظ کے معانی کی تفسیر کا حق ادا کر دیا اور اہل بیت اطہار کے ساتھ محبت اور وابستگی کے وجوب پر دلائل قلمبند فرمائے۔ اس موضوع میں ان کے متعدد شاگرد بھی انہی کے پیروکار ہیں، جیسے علامہ ابن قیم اور ابن عبدالہادی وغیرہ۔

حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اہل بیت اطہار کی فضیلت و شرافت میں رسالہ رقم فرمایا اور اسی طرح امام سخاوی، حافظ ذہبی اور علامہ ابن حجر وغیرہ کی کتب بھی زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ ان سب حضرات نے اہل بیت کی افضلیت پر سیر حاصل بحث کی، جیساکہ سنن و آثار میں نصوص وارد ہیں، اور آیات و احادیث کے معانی میں مفسرین اور شارحین کا مفہوم اس پر بھی مزید ہے۔

حالانکہ چند مسائل کے اپنانے میں اختلاف ہوا جس کا دارومدار "آل" کے معنی پر ہے، جس کا نقطہ انتہا یہ تھا کہ ساری امت مسلمہ خصوصیات میں شامل ہے لیکن تقویٰ کا التزام شرط ہے۔

اس موضوع پر مزید تسکین خاطر کے لیے مندرجہ ذیل کتب کا مطالعہ نہایت مفید ہے:

(۱) علامہ شیخ یوسف بن اسماعیل نبہانی کی کتاب "الشرف المؤبد لآل محمد" جو چودہویں صدی ہجری میں منصہ شہود پر آئی۔

(۲) استاذ العلماء فاضل جلیل ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی کی کتاب "علموا اولادکم محبہ آل بیت النبی ﷺ" جو اسی صدی ہجری کے آغاز میں شائع ہوئی۔

(۳) استاذ العلماء السید عبدالوہاب بن علی حسنی سلفی کی کتاب "اھل البیت النبوی" جو اس موضوع میں کسی سے کم نہیں۔

ابن تیمیہ اور اہل بیت

شیخ ابن تیمیہ کا ایک رسالہ خاص اہل بیت کی فضیلت میں ہے جس کا پہلے تذکرہ ہوا۔ شیخ ابو تراب اس کے مقدمہ میں یوں رقمطراز ہیں: کہ شیخ ابن تیمیہ کا یہ رسالہ نادر الوجود ہے۔ مجھے یہ اپنے خصوصی رسائل کی الماری سے ملا۔ اس کا حجم کم تھا لیکن جلیل القدر اس لیے کہ وہ اس موضوع کے تمام تر اطراف کو ہر زاویے سے اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ جیسے شیخ ابن تیمیہ کی عادت ہے کہ جب کسی مسئلہ میں کلام کرتے ہیں تو ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر محسوس ہوتا ہے جس کے ساحل تک رسائی حاصل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں رہتی۔

یہ رسالہ سلف صالحین کے مذہب کے بیان پر مشتمل ہے جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے اور ایمان کے صرف ایک شعبہ میں مکمل گفتگو کی گئی ہے' جس کا تعلق قلبی اعمال سے ہے اور وہ اہل بیت نبوت کی محبت ہے۔ جیسا کہ اس پر قرآن و حدیث کی نصوص دلالت کرتی ہیں اور انہوں نے اس رسالہ میں کماحقہ وضاحت کی ہے۔ ان کا مزید کلام (الفتاویٰ الکبریٰ: ج ۳' ص ۵۴) میں ہے جو (العقیدہ الواسطیہ) کے حوالے سے ملاحظہ ہو:

اہل سنت و جماعت کے اصول سے ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے انتہائی عقیدت و محبت رکھتے ہیں' اور ان کے مقام و مرتبہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کا پورا پورا لحاظ کرتے ہیں' جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر خم کے موقع پر فرمائی:

اذکرکم اللہ فی اہل بیتی۔ میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں۔

حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے چچا عباس سے فرمایا' جب ایک قریشی کی

شکایت کی گئی کہ اس نے ہاشمی پر ستم کیا ہے:

والذی نفسی بیدہ لا یومنون حتی یحبوکم للہ ولقرابتی۔	قسم ہے اس ذات بابرکات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ وہ ایماندار نہیں یہاں تک کہ وہ اللہ سے اور میری قرابت سے محبت کریں۔

اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے مزید فرمایا:

ان اللہ اصطفی بنی اسماعیل واصطفی من اسماعیل کنانہ ومن کنانہ قریشا واصطفی من قریش بنی ہاشم۔	بے شک اللہ تعالیٰ نے بنو اسماعیل کو منتخب فرمایا اور بنو اسماعیل سے کنانہ' کنانہ سے قریش اور قریش سے بنو ہاشم کو پسند فرمایا۔

شیخ ابن تیمیہ (الفتاویٰ الکبریٰ: ۳/۴۰۷) میں تفصیلاً رقم کرتے ہیں جو کہ (الوصیۃ الکبریٰ: ۲۹۷) میں ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کے کچھ امتیازی حقوق ہیں جن کی رعایت کرنا ضروری ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے خمس اور فئی کے مال میں ان کا حق رکھا ہے' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کے ساتھ ساتھ ان پر بھی درود بھیجنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یوں کہنے کا فرمایا:

اللھم صل علی محمد وعلی ال محمد کما صلیت علی ال ابراھیم انک حمید مجید وبارک علی محمد وعلی ال محمد کما بارکت	اے اللہ درود بھیج محمد ﷺ پر اور آل محمد پر جیسے تو نے درود بھیجا آل ابراہیم پر' بے شک تو ہی حمد اور بزرگی والا ہے اور برکتیں نازل فرما محمد ﷺ پر اور آل محمد پر جیسے تو نے برکتیں نازل فرمائیں۔

علی ابراهیم انک حمید مجید۔	آل ابراہیم پر' بے شک تو ہی حمد اور بزرگی والا ہے۔

حضرت امام شافعی' امام احمد بن حنبل اور دیگر اکثر علماء رحمتہ اللہ علیہم کا قول ہے کہ "آل محمد ﷺ وہ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔" اس پر دلیل حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کا یہ فرمان عالیشان ہے:

ان الصدقه لاتحل لمحمد ولالال محمد۔	بیشک صدقہ نہ محمد (ﷺ) کیلئے حلال ہے اور نہ ہی آل محمد کیلئے۔

اور اللہ تعالی نے قرآن حکیم میں فرمایا:

انما یرید الله لیذهب عنکم الرجس اهل البیت ویطهرکم تطهیرا۔	اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ اپنے نبی کے گھر والو کہ تم سے ہر ناپاکی دور فرما دے اور تمہیں پاک کر کے صاف ستھرا کر دے۔

(الاحزاب: ۳۳)

اور اللہ تعالی جل جلالہ نے ان پر صدقہ حرام فرمایا کیونکہ وہ لوگوں کی میل کچیل ہے اور مسانید و سنن میں وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے فرمایا جب آپ کے پاس شکایت آئی کہ ایک قوم نے ان پر زیادتی کی:

والذی نفسی بیده لا یدخلون الجنه حتی یحبوکم من اجلی۔	قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ وہ جنت میں نہیں جائیں گے یہاں تک کہ وہ میری وجہ سے تم سے پیار کریں۔

اور یہ حدیث "صحیح" میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ان الله اصطفی..." یہ پوری حدیث اوپر مذکور ہے۔

شیخ ابن تیمیہ نے (درجات المتقین ص ۱۴۹) میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ

احبوا اللہ لما یغذوکم من نعمہ واحبونی لحب اللہ، واحبوا اھل بیتی لحبی۔	تم اللہ سے محبت کرو اس لیے کہ وہ تمہیں اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے اور مجھ سے محبت کرو اللہ کی محبت کیلئے اور میری محبت کیلئے میرے اہل بیت سے محبت کرو۔

شیخ ابن تیمیہ (اقتضاء الصراط: ص ۷۳) میں کہتے ہیں:

الحجہ قائمہ بالحدیث۔	دلیل حدیث سے ثابت ہو گئی۔

اور اسی کتاب کے صفحہ ۸۹ پر رقمطراز ہیں کہ عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کی طرف دیکھو، جب آپ دفتری امور کا آغاز فرماتے تو ابتداء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت سے فرماتے۔

فضل اور عدل میں تعارض نہیں

ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی اپنی کتاب "علموا اولادکم محبہ ال بیت النبی" میں فرماتے ہیں:

جب اہل بیت کا کوئی فرد تجھے تکلیف پہنچائے تو تو کیا کرے گا؟

ہاں! ایسی صورت میں تو کیا کرے گا؟

کیا یہاں کوئی الگ سماوی قوانین ہیں جو اہل بیت کے ساتھ معاملہ کرنے میں خاص ہیں، جب ان میں کوئی کسی ایسے فرد پر ظلم کرے جو اہل بیت کے زمرہ میں داخل نہیں۔

یقیناً شریعت ایک ہے، تمام لوگ آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے ہیں۔ تو سب اللہ تعالیٰ عزوجل کی بارگاہ میں برابر ہیں۔

بے شک لوگوں کو شریعت اسلامیہ میں کوئی فضیلت حاصل نہیں مگر تقویٰ

ہے۔ اور اہل بیت کے لیے ہماری مودت و محبت کا وجوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم کی خاطر ہے' اور قرآن حکیم میں وارد اس فرمان عالیشان کی محض اطاعت ہے:

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى ۔(الشوریٰ: ۲۳)	تم فرماؤ میں اس پر تم سے کچھ اجرت نہیں مانگتا مگر قرابت کی محبت۔

اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رابطہ ایمان اور تقویٰ کے ناطے سے ہے۔ اسلام میں ایسی عنصریت کو کوئی دخل نہیں جس سے عدالت کے میزان پر دھبہ آئے' نہ ہی ایسی محسوبیت ہے جس سے قانون الٰہی تذبذب کا شکار ہو' اور ایسے امر کی طرف متوجہ کرے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہ فرمایا ہو۔ اس بابرکت ذات نے ارض و سما کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا اور اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا' اور ہمیں اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے حکم فرمایا:

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۔(الرحمٰن: ۹)	اور انصاف کے ساتھ تول قائم کرو اور وزن نہ گھٹاؤ۔

اور ہم پر واضح فرمایا:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۔(الحجرات: ۱۳)	بیشک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔

فضل عدل سے بہتر ہے

عدل لامحالہ ایک شرعی قانون ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور رخ بھی سامنے آتا ہے جو کسی امر کو اس بنیادی قانون سے بری تو نہیں کرتا لیکن فضل کو حساب میں لاتا ہے۔ یاد رہے کہ فضل کسی طالب عدل کو حق سے منع نہیں کرتا' لیکن اتنی بات ضرور ہے ایک قدیم محاورہ ہے:

ولاجل عین الف عین تکرم۔۔۔ — ایک چہرے کی وجہ سے ہزار چہروں کی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ و سبحانہ نے ہمارے لیے مثالیں بیان فرمائیں تاکہ ہم ان امور میں فضل کے رستے کو اپنا حرز جان بنائیں جو اللہ تعالیٰ کی کسی حد کو ساقط نہیں کرتے' اور نہ ہی مخلوق کے کسی فرد کو جبر و اکراہ کی حد تک پہنچادیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا۔ — اور ان کا باپ نیک آدمی تھا تو آپ کے رب نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکالیں۔

(الکہف: ۸۲)

اللہ تعالیٰ سبحانہ نے اس امر کا بیان محض اس لیے فرمایا کہ ان دونوں بچوں کا باپ صالح (نیک) تھا۔ منقول ہے کہ آیہ مقدسہ میں جس باپ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ان دونوں بچوں کا ساتواں دادا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ۔ (الطور: ۲۱) — اور جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ہم نے ان کی اولاد ان سے ملادی۔

ایک قرات میں بطور جمع "ذریاتھم" بھی آیا ہے جو اللہ رب العزت کے بارگاہ سے فضل پانے میں مبالغہ پر دال ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "بیشک اللہ تعالیٰ جنت میں مومن کی اولاد اس کے ساتھ اسی کے درجے میں ملادے گا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں' اگرچہ وہ اپنے اعمال کے سبب اس درجہ کے اہل نہ ہی ہوں؟" لہٰذا اس قول میں بھی

غرابت نہ ہوئی "فلا جل عین الف عین تکرم۔" بے شک یہ تعظیم و تکریم محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، نہ حد کو ساقط کرتا ہے اور نہ ہی کسی کا حق ضائع کرتا ہے، بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہمیں فضل کے راستے پر گامزن ہونے کی ترغیب دلائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (التغابن: ۱۴)

اور اگر معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اہل بیان کا قول ہے کہ اس آیت میں اطناب ہے کیونکہ "تعفوا، تصفحوا یا تغفروا" میں سے کسی ایک فعل کا استعمال ہی کافی تھا، لیکن اللہ رب العزت نے ان افعال کا تکرار ہمیں فضیلت کی ترغیب دلانے اور اس پر برانگیختہ کرنے کے لیے فرمایا۔ چاہے اس خطاکار کی اصل اور نسب کوئی بھی ہو۔ اللہ جل مجدہ الکریم کا ارشاد ہے:

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ۔ (البقرۃ: ۲۳۷)

اور اے مردو تمہارا زیادہ دینا پرہیزگاری سے نزدیک تر ہے اور آپس میں ایک دوسرے پر احسان کو بھلا نہ دو۔

اصولیین کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ آیہ کریمہ طلاق شدہ عورتوں کے حق میں نازل ہوئی لیکن عبرت الفاظ کے عموم سے ہے نہ کہ سبب کے خصوص سے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ۔ (الشوریٰ: ۴۰)

تو جس نے معاف کیا اور کام سنوارا تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔

اور دیگر آیات کریمہ اور احادیث شریفہ اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ خطاکار کو معاف کر دینے کی ترغیب دلاتا ہے، چاہے جو بھی ہو، تو پھر ان نفوس قدسیہ کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ

واصحابہ وسلم کے اہل بیت ہیں؟ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی قرابت' خاندان اور اولاد کے بارے میں کیا سوچو گے؟ اگر ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم محض رسول ہوتے' صرف تبلیغ رسالت کے لیے مبعوث ہوتے تو ہم پر ہر اس فرد کی تعظیم و تکریم واجب ہوتی جس کا تعلق حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے' چاہے تعلق نسب جسمی کے اعتبار سے ہو یا نسب روحی کے حوالے سے لیکن جو تعلیمات تبلیغ رسالت کے فیضان سے ہم تک پہنچیں' ان کے مطالعہ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی صرف حق رسالت کی ادائیگی میں ہی منحصر نہیں' بلکہ ان کی شان میں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ یوں فرماتے ہیں:

عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔(التوبہ: ۱۲۸)

(وہ رسول ہیں) جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے۔ تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے' مسلمانوں پر کمال مہربان مہربان۔

اور مزید فرماتے ہیں:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔(الاحزاب: ٦)

یہ نبی مسلمانوں کا ان کی جان سے زیادہ مالک ہے۔

اس آیہ کریمہ کو دوبارہ پڑھیں اور غور کریں: "النبی اولی بالمومنین من انفسھم۔" خیال کریں کہ کس شان و شوکت کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے امور سے متعلق حق تبلیغ کو نبھایا' یہاں تک کہ آپ ایسے درجے پر فائز ہوئے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر ہماری جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا شان ہے کہ آپ ﷺ ہم پر ہماری جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں' یہ نہیں فرمایا کہ ہمارے آباء واجداد سے یا بیٹوں سے یا ہم سے---وغیرہ "بابی وامی انت یارسول اللہ۔"

ڈاکٹر محمد عبدہ یمانی آخر میں فیصلہ کن کلام یوں فرماتے ہیں: کہ جب اہل بیت کا کوئی فرد کسی کو تکلیف دے یا کسی سے ظلم و زیادتی کرے تو صاحب حق کو اختیار ہے کہ اپنا کامل حق وصول کرے' لیکن اس سے کسی چیز کی زیادتی نہ کرے۔ بہرحال بہتر یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کی خاطر اور اہل بیت کے حق میں آپ کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے تکلیف دہندہ کو معاف کردے' ظلم و زیادتی کو نظرانداز اور غلطی سے درگزر کرے' جب اس کی استطاعت رکھتا ہو۔ خیرخواہی اور درگزر کرنا یقیناً خلق عظیم ہے جس پر اسلام ابھارتا ہے اور اسی کے ساتھ لوگوں سے معاملہ کرنے کی دعوت دیتا ہے' تو پھر یقیناً اہل بیت اس خلق عظیم کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان سے ایسا ہی برتاؤ کیا جائے۔ اہل بیت کی خیرخواہی اور تعظیم درحقیقت حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی ہی تعظیم و تکریم ہے کیونکہ ان کی مصلحتوں کا لحاظ' ان سے حسن معاملات اور ان کا مقام و مرتبہ اسی مبارک نسب کے شرف سے ہے اور اس شخص کا بھی ان پر اخلاق کریمہ اور خصال حمیدہ سے حق ہے' لیکن وہ حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ ہو تاکہ وہ جلدی قبول ہو اور کوتاہی کی تلافی اور غلطی کی تصحیح کا سبب بنے۔ اسی عادت کریمہ پر برانگیختہ کرتے ہوئے ایک شاعر نے کہا:

فتشبهوا ان لم تكونوا مثلهم
ان التشبه بالكرام فلاح

"تم مشابہت اختیار کرو اگرچہ تم ان کی مثل نہیں' بیشک عظیم المرتبت لوگوں سے مشابہت نجات کا سامان ہے۔"

اہل بیت اطہار اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

صحابہ کرام کی محبت اہل بیت کی محبت کا نتیجہ ہے۔ اہل بیت اطہار کی محبت اس وقت تک کوئی نفع نہیں دیتی جب تک اس کے ساتھ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بغض شامل ہو' کیونکہ صحابہ کرام وہ نفوس قدسیہ ہیں جنہوں نے آسان اور مشکل

وقت میں حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی صحبت کا شرف پایا اور سختی اور نرمی کے حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حرز جاں بنائے رکھا' اور یہی وہ مقدس ہستیاں ہیں جنہوں نے اپنے مال و جان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر نثار کر دیا اور خود تلواروں اور نیزوں جیسے جنگی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ڈھال بنے رہے۔ یہی وہ وارفتگان شمع رسالت ہیں جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنے والے کو محبوب اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھنے والے کو دشمن بنایا' اگرچہ وہ ان کے اپنے آباء واجداد' بیٹے' بھائی یا کنبہ کے افراد ہی تھے اور یہی وہ بزم رسالت کے ادب یافتہ اور سلیقہ شعار افراد ہیں جو اپنے قریبی رشتہ داروں کی بہتری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقارب کی بھلائی کو کہیں زیادہ پسند کیا کرتے تھے۔ یہاں ہم اس مضمون کی توثیق کے لیے چند صحابہ کرام کے جذبات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد گرامی جب فتح مکہ کے دن حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر کو اس کی مبارکباد دی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس پر یوں عرض گزار ہوئے کہ

والله لاسلام ابی طالب کان احب الی من اسلامه' وماذاک الا لانی اعلم انه احب الیک یارسول الله۔

اللہ کی قسم! ابوطالب کا اسلام مجھے ان کے اسلام سے زیادہ محبوب تھا' محض اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ یارسول اللہ وہ آپ کو زیادہ محبوب ہیں۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محترم چچا حضرت عباس نے جب اسلام

قبول کیاتو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یوں عرض کیا کہ

والله لاسلامه احب الی من اسلام الخطاب' لانه احب الی رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

اللہ کی قسم! مجھے عباس کا اسلام قبول کرنا اپنے والد خطاب کے اسلام سے زیادہ عزیز ہے کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ محبوب ہیں۔

یہ وہ مہاجرین صحابہ ہیں جن کو ابتداء اسلام میں قریش کی تشنہ خون دشمنی' کمر توڑ مظالم اور ایسے جان لیوا مصائب کا سامنا کرنا پڑا' جن سے بڑے بڑے مضبوط پہاڑ بھی ثابت قدم نہیں رہ سکتے' لیکن ان نفوس قدسیہ نے ان تمام تر حالات کے باوجود اللہ کے دین سے بغاوت نہیں کی اور نہ ہی کوئی فرعونی طاقت ان کے سینوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو نکال سکی۔ بہرحال قابل تحسین ہیں وہ انصار صحابہ کرام جنہوں نے اپنے مہاجرین بھائیوں کو بے یارومددگار نہیں چھوڑا' اللہ تعالیٰ انصار اور ان کی اولاد پر رحم فرمائے' بے شک انہوں نے حضور علیہ الصلوۃ والسلام اور مہاجرین صحابہ پر مال و جان کی قربانیاں پیش کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا دین غالب آگیا۔ یہاں ہم حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا وہ جواب پیش کرتے ہیں جو انہوں نے انصار کے سردار ہونے کی حیثیت سے غزوہ بدر سے پہلے پورے جوش و خروش اور ہوش سے دیا تھا۔

سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر کی تیاری سے پہلے مہاجرین و انصار کو اکٹھا کیا اور فرمایا:

اشیروا علی۔ مجھے اس بارے میں مشورہ دو۔

تو مہاجرین میں سے حضرت ابوبکر' عمر اور مقداد رضی اللہ عنہم نے اپنی جانبازیوں کی یقین دہانی کراتے ہوئے بھرپور جواب دیئے لیکن اللہ کے پیارے رسول

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جوابات پر اکتفانہ کیا اور تین مرتبہ یہی جملہ "اشیروا علی" دہرایا تو سیدنا حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اللہ کی قسم گویا آپ ہمارا جواب لینا چاہتے ہیں یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں۔" تو انصار کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنی پوری قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا:

"بے شک ہم آپ ﷺ پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی ہے اور گواہی دی ہے کہ جو آپ لائے' وہ حق ہے اور ہم نے آپ سے اس دین کی کامل سماعت اور اطاعت کے پختہ وعدے کئے ہیں' تو یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو چاہتے ہیں کر گزریں' جس سے چاہتے ہوں صلہ رحمی کریں' جس سے چاہتے ہیں قطع تعلق کریں' جسے چاہیں امان دیں' جسے چاہیں دشمن بنائیں۔ ہمارے اموال سے جو چاہیں لیں اور جو چاہیں ہمیں دیں' اور جو آپ ہم سے لیں گے وہ ہمیں اس سے زیادہ عزیز ہو گا جو آپ ہمارے لیے چھوڑیں' اور جو آپ چاہیں ہم کو حکم فرمائیں' ہم آپ کے ارشاد کی تعمیل کریں گے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا' اگر آپ ہمیں یہ سمندر عبور کرنے کا حکم دیں تو ہم کر گزریں گے' ہمارا کوئی فرد بھی پیچھے نہیں رہے گا اور کسی صورت میں بھی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ ہم اپنے دشمن سے دوچار ہونا برا نہیں سمجھتے' ہم یقیناً میدان جنگ کے شہسوار' بہادر اور جنگجو ہیں۔ اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سے وہ جانثاری کی مثالیں دکھائے گا کہ آپ کی مبارک آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ بس آپ اللہ کا نام لے کر چلیں' ہم آپ کے دائیں' بائیں' آگے اور پیچھے ہیں' ہم ان لوگوں کی طرح نہیں ہیں جنھوں نے اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا:

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔(المائدہ: ۲۴)

تو آپ جائیے اور آپ کا رب تم دونوں لڑو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

لیکن ہمارا کہنا ہے کہ آپ ﷺ اور آپ کا پروردگار جائیں اور لڑیں' بیشک ہم بھی تمہاری معیت میں جرات مندانہ جنگ لڑیں گے۔"

اور حقیقت میں مہاجرین اور انصار صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی صفات یہی تھیں۔

علامہ ابن حجر ہیتمی رحمتہ اللہ علیہ اپنی کتاب "اسنی المطالب فی صلہ الاقارب" میں فرماتے ہیں کہ

"مسلمان پر لازم ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور اہل بیت سے ہمیشہ راضی رہے بلکہ کمال ادب بجالائے اور ان کے فضائل اور حقوق سے آشنا رہے۔ ان کے باہمی اختلاف کے بارے سکوت اختیار کرے اور ساتھ ساتھ یہ اعتقاد بھی رکھے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے ارتکاب میں صحیح ہے۔ بلکہ ہر ایک مجتہد ہے اور مجتہدین ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان میں سے جس کا اجتہاد درست ہو گا اسے دس گنا اجر ملے گا اور خطا کرنے والے کو بھی ایک اجر ضرور ملے گا۔ اور تختی' ملامت اور نقص وغیرہ ان سب حضرات سے اٹھا لیے گئے ہیں' لہٰذا اس مسئلہ پر تہہ دل سے غور کرنا ہو گا ورنہ تیرا قدم لغزش کھا جائے گا اور ہلاکت اور ندامت تیرا مقدر بنے گا۔"

انسان اور اس کی کوشش

اللہ تعالیٰ جل جلالہ کا ارشاد گرامی ہے:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔(النجم: ۳۹)

اور یہ کہ آدمی نہ پائے گا مگر اپنی کوشش۔

یہ آیہ کریمہ ان مشکل نصوص میں سے ایک ہے جن کے الفاظ کے ظاہری مفاہیم اور مطلقاً نصوص کے عموم پر بیشتر حضرات اعتماد کرتے ہیں' دیگر ایسے اصول و قرائن کالحاظ نہیں کرتے جو نص کی تخصیص یا تقیید کا فائدہ دیتے ہیں اور جن کے بغیر خصوصاً نصوص علمیہ کا سمجھنا دشوار ہے حالانکہ ایسے قواعد و ضوابط کا تقاضا یہ ہے کہ سب کو ایک ہی راہ پر لے کر چلیں اور تمام متناسب اور مترابط مفاہیم کو ایک ہی لڑی میں پرو دیں جو کہ صاحب الشریعہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائق ہو جو تناقص اور تعارض سے محفوظ ہیں' کیونکہ آپ کی یہ شان ہے:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى -(النجم: ۴)	اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے وہ تو نہیں مگر وحی جو انہیں کی جاتی ہے۔

اس آیہ کریمہ کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد کسی چیز کا نفع نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اس کے لیے وہی ثابت ہے جو اس نے خود اعمال کئے اور اعمال کی جگہ دنیا ہے' لیکن یہاں دیگر کچھ دلائل ایسے بھی ہیں جو میت کی ذاتی کوشش کے علاوہ بھی اس کے لیے نفع ثابت کرتے ہیں' جیسا کہ اس بحث میں آرہا ہے۔ اسی لیے تو محققین علماء اہل السنہ اور خصوصاً انصاف پسند ائمہ سلفیہ مثلاً شیخ ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے لوگوں نے بھی اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھا اور میت کے لیے اس کے ذاتی اور غیر کے عمل سے نفع کو ثابت کیا اور اس آیت کا معنی خوب واضح کیا۔

اس کی دیگر نصوص سے مطابقت

علامہ شیخ فخرالدین عثمان بن علی زیلعی (تبیین الحقائق شرح کنزالدقائق: ۲/۸۵) میں "الحج عن الغیر" کے باب میں رقمطراز ہیں کہ

(۱) "اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وان لیس للانسان الا ما سعی۔" سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان عالیشان

سے منسوخ ہے۔

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيْمَانٍ۔ (الطور: ۲۱) — اور جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی۔

(۲) منقول ہے کہ یہ آیہ کریمہ حضرت موسیٰ اور ابراہیم علیہما السلام کی قوم سے خاص ہے کیونکہ یہ ان کے صحیفوں میں موجود کلام کی حکایت کے لیے واقع ہوئی جس کی دلیل اللہ رب العزت کا یہ ارشاد ہے:

اَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى وَإِبْرَاهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى۔ (النجم: ۳۶،۳۷) — کیا اسے اس کی خبر نہ آئی جو صحیفوں میں ہے، موسیٰ اور ابراہیم کے جو احکام پورے بجالایا۔

(۳) یہاں انسان سے مراد کافر ہے، مومن کے لیے تو اس کے بھائی کے عمل کا نفع ثابت ہے۔

(۴) عمل بالغیر سے نفع طریقہ عدل سے نہیں ہوگا بلکہ فضل کے طور پر ہوگا۔

(۵) ایک قول یہ بھی ہے کہ "الانسان" پر لام "علی" کے معنی میں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا۔ (بنی اسرائیل: ۷) — اور اگر برا کرو گے تو اپنا۔

یہاں "لها" بہ معنی "علیها" ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ۔ (المومن: ۵۲) — اور ان کے لیے لعنت ہے۔

یہاں بھی "لهم" کا معنی "علیهم" ہے۔

(۶) منقول ہے کہ میت کو اس کا اپنا عمل ہی کام آئے گا لیکن کبھی اس کا عمل ایسے اسباب کی مباشرت سے ہوتا ہے جن سے صاحب ایمان حضرات مستفید ہوتے رہتے ہیں اور ان اسباب پر مرتب ہونے والے کارہائے حسنہ کا دراصل بانی تو وہی ہوگا جس نے اسباب مہیا فرمائے جن کا نفع اسے بدستور ملتا رہے گا یہاں تک کہ سفارش کرنے

والوں کی سفارش بھی اسے نفع دے گی۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث اس پر شاہد ہے۔

اِذَامَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَمَلُہٗ اِلَّامِنْ ثَلَاثٍ۔　　جب کوئی آدمی مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے، مگر تین عمل باقی رہتے ہیں۔

یہ حدیث عمل بالغیر کے انقطاع پر دلالت نہیں کرتی۔

اس میں کلام کافی ہے۔ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں جو عقلاً بعید ہو، کیونکہ اس میں تو وہی ہے جس کا اجر و ثواب غیر کے لیے رکھا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اس تک پہنچانے والا ہے اور وہی اس پر قادر ہے، اور نہ ہی وہ اسے کسی ایک عمل سے خاص کرتا ہے۔ (تبیین الحقائق)

اس مسئلہ کا نفیس حل

شیخ ابن ابی العز نے عقیدہ طحاویہ کی شرح میں اس مسئلہ کو ذکر کیا ہے کہ میت کو کسی غیر کے اس عمل کا بھی نفع ہوتا ہے جس میں اس کے کسی سبب کو دخل نہیں، اسی قول کو شیخ نے ترجیح دی ہے اور اس پر کتاب و سنت، اجماع اور قیاس سے دلائل نقل کئے ہیں، پھر اس آیت کا جواب بھی نقل کیا جس کے ظاہر پر مانعین اعتماد کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "وان لیس للانسان الا ما سعی" سے استدلال کرنے والے حضرات کو علماء نے کئی جواب دیئے ہیں، جن میں سے دو زیادہ صحیح ہیں۔

(۱) بے شک انسان اپنی کوشش اور حسن اخلاق سے اچھے دوست بناتا ہے، اولاد نیک بناتا ہے، بیویوں سے نکاح کرتا ہے، بھلائی کے کاموں میں مصروف رہتا ہے اور لوگوں سے محبت کرتا ہے، تو لوگ اس سے رحمت و شفقت کا سلوک کرتے ہیں، اس کے لیے دعا کرتے ہیں اور نیکیوں کا ثواب اس کو ہدیہ بھیجتے ہیں۔ لہٰذا یہ سب کچھ اس کی

مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے بلکہ ایک مسلمان کا مسلمانوں کی جماعت کی معیت میں حلقہ بگوش اسلام ہونا ہی تمام مسلمانوں سے نفع وصول کرنے میں ایک عظیم سبب ہے جس کا وہ اپنی زندگی میں اور موت کے بعد بھی حقدار ہوتا ہے اور مسلمانوں کی دعائیں اسے بعد میں لاحق ہوتی رہتی ہیں۔

اس کی مزید وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ایمان کو سبب بنایا جس کے ذریعے صاحب ایمان اپنے مومن بھائیوں کی دعاؤں اور کوششوں سے نفع پاتا ہے۔ تو جب وہ ایمان لایا گویا اس نے ایسے سبب میں کوشش کی جو اس تک یہ نفع پہنچاتا ہے۔

(۲) دوسرا جواب اس سے بھی مضبوط ہے وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے آدمی کے غیر کے عمل سے نفع پانے کی نفی نہیں کی' البتہ غیر کے عمل پر اس کی ملکیت کی نفی کی ہے۔ دونوں امور میں فرق واضح ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس امر کی خبر دی کہ انسان صرف اپنی کوشش کا ہی مالک ہے' اور غیر اپنی کوشش کا خود مالک ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ اگر وہ چاہے تو کسی غیر کو ہبہ کردے اور اگر چاہے اپنے لیے ذخیرہ کرلے۔

اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے:

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۙ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۙ (النجم: ۳۸'۳۹)	کہ کوئی بوجھ اٹھانے والی جان دوسری کا بوجھ نہیں اٹھاتی اور یہ کہ آدمی نہ پائے گا مگر اپنی کوشش۔

یہ دونوں آیات محکم ہیں جو اللہ رب العزت کے عدل کا تقاضا کرتی ہیں۔

(۱) پہلی آیت کا تو تقاضا یہ ہے کہ کسی کو غیر کے جرم میں عذاب نہیں دیا جائے گا اور نہ ہی غیر کے گناہ میں اسے پکڑا جائے گا۔ جیسا کہ دنیا کے سلاطین کا وطیرہ تھا۔

(۲) دوسری آیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان صرف اپنے عمل سے ہی کامیاب ہوگا تاکہ اس سے اپنے آباء واجداد' اسلاف اور مشائخ کے عمل سے نجات کی طمع منقطع

ہو جائے جیسا کہ جھوٹی طمع رکھنے والوں کا یہ اعتقاد ہے۔ بہر حال اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ "وہ نفع نہیں پا سکتا مگر اپنے ہی عمل سے۔" (العقیدۃ الطحاویہ: ۹۲۵)

موت سے عمل منقطع اور نفع جاری رہتا ہے

مذکورہ آیہ کریمہ سے متصل دیگر دلائل کے ساتھ ساتھ یہ صحیح اور مشہور حدیث قابل ذکر ہے جس کو امام مسلم نے صحیح میں اور امام بخاری نے "الادب المفرد" میں روایت کیا' نیز اس کو ابو داؤد' ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کیا: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا مَاتَ الْعَبْدُ اِنْقَطَعَ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ، صَدَقَةٌ جَارِيَةٌ اَوْ عِلْمٌ يُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُوْلَهٗ	جب بندہ مومن مرتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں مگر تین' صدقہ جاریہ' نفع بخش علم اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا گو رہے۔

سیدی امام علوی بن عباس مالکی حسنی رحمتہ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح یوں فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "اذا مات ابن آدم ---" جان لو کہ موت سے عمل ذاتی کا منقطع ہو جانا ظاہر بات ہے کیونکہ وہ جان عمل نہیں کر پاتی اور نہ ہی موت کے بعد مکلف ہوتی ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ بعض اعمال اپنا پھل دیتے رہتے ہیں یہاں تک کہ موت کے بعد بھی ثمر بار رہتے ہیں' تو ان کا اجر کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے "الا من ثلاث" فرمایا۔ یعنی صرف یہ تین اعمال اس صفت کے حامل ہیں:

(۱) صدقہ جاریہ' مثلاً کنوئیں کا کھودنا' کتب دینیہ کا وقف کرنا اور مساجد و مدارس اور پل بنانا وغیرہ۔

(۲) نفع بخش علم یعنی علم شرعی جس سے نفع حاصل کیا جائے۔ فردوس بریں کی سعادت اور عذاب ابدی سے نجات کا دارومدار اسی پر ہے۔ کتب اسلامیہ کی تصنیف و

تالیف اور ان کا وقف کرنا اسی زمرہ میں آتا ہے' کیونکہ مراد حصول نفع ہے چاہے مباشرت سے ہو یا کسی سبب سے۔

(۳) نیک اولاد' یعنی مسلمان اولاد جو اس کے لیے دعاگو رہے کیونکہ یہ اس کے کسب کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ و سبحانہ نے مہربانی فرمائی ہے کہ اولاد کی تمام تر نیکیوں کا ثواب والدین کے نامہ اعمال میں بھی درج ہو گا نہ کہ برائیوں کا گناہ۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ ان تین اعمال میں حصر نہیں کہ یہ تین ہی ایسی خصال ہیں جن کا ثواب بعد از موت بھی جاری رہے گا' کیونکہ عدد کا مفہوم حجت نہیں ہو گا اس لیے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان تین خصال پر مطلع تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و احسان سے مزید خصال پر مطلع فرما دیا۔ جیسا کہ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ مِمَّا يَلْحَقُ الْمُؤْمِنَ مِنْ عَمَلِهِ وَحَسَنَاتِهِ بَعْدَ مَوْتِهِ: عِلْمًا نَشَرَهُ' وَوَلَدًا صَالِحًا تَرَكَهُ' وَمُصْحَفًا وَرَّثَهُ' وَمَسْجِدًا بَنَاهُ' وَبَيْتًا لِابْنِ السَّبِيلِ بَنَاهُ' وَنَهْرًا أَجْرَاهُ' وَصَدَقَةً أَخْرَجَهَا مِنْ مَالِهِ فِي صِحَّتِهِ وَحَيَاتِهِ تَلْحَقُهُ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهِ۔ (ابن ماجہ: ۱/ ۸۸' حلیہ لابی نعیم عن انس رضی اللہ عنہ: ۲/ ۳۴۴)

بے شک وہ اعمال اور نیکیاں جو مرنے کے بعد مومن کو ملتی رہتی ہیں۔ وہ علم جو اس نے پھیلایا' نیک اولاد جو اس نے چھوڑی' وہ کتب دینیہ جو اس نے چھوڑیں' وہ مسجد جو اس نے بنائی' راہ گیروں کے لیے بنائی ہوئی سرائے' جاری کردہ نہر اور وہ صدقہ جو اس نے اپنے مال سے حالت صحت میں اور خود اپنی زندگی میں نکالا۔ ایسے اعمال کا ثواب اسے بعد از موت بھی بدستور ملتا رہے گا۔

یہ حدیث مبارکہ سات خصال پر مشتمل ہے۔ اگر پہلی تین بھی ساتھ ملا لی

جائیں تو کل دس ہوں گی اور حافظ سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے ان پر بھی ایک زائدہ کی ہے اور ان کو منظم کیا ہے:

جب آدمی مرتا ہے تو اس کے کسی عمل کا ثواب جاری نہیں رہتا سوا ان دس خصال کے۔ وہ علوم جن کی اس نے اشاعت کی' اولاد صالحہ کی دعائیں' کھجور لگانا' صدقات جاریہ' کتب اسلامیہ کا وقف اور پل وغیرہ بنوانا' کنوئیں کھدوانا یا نہریں جاری کروانا' مسافروں کی پناہ کے لیے بنگلہ قائم کرنا اور ذکر و اذکار اور قرآن و سنت کی تعلیم کے لیے جگہ قائم کرنا۔ یہ جملہ خصال حدیث میں حصر کے ساتھ وارد ہیں۔

(امام علوی بن عباس مالکی کی کتاب فتح القریب المجیب علی تہذیب الترغیب والترہیب: ص ۱۱۰-۱۱۱)

ابیات سیوطیؒ اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حافظ سیوطی رحمتہ اللہ علیہ کا قول "اشاعت علوم' دعائے اولاد اور صدقات جاریہ کا ثواب بعد از موت جاری رہتا ہے۔" تو یہ حدیث صحیح مشہور میں وارد ہیں "اذا مات الانسان انقطع عمله الامن ثلاث: صدقة جارية اوعلم ينتفع به اوولد صالح يدعوله" اور علامہ موصوف کا قول "کھجور لگانا اور کنواں کھدوانا۔" تو ان دونوں کا ذکر بھی حدیث انس رضی اللہ عنہ میں مرفوعاً آیا ہے:

سبع يجرى اجرها للعبد بعد موته وهو فى قبره وذكر منها حفر البئر او غرس النخل۔ (رواہ ابو نعیم فی الحلیہ)	سات چیزوں کا اجر بندہ کے لیے مرنے کے بعد بھی جاری رہتا (رواہ ابو نعیم فی الحلیہ) ہے اور ان میں کنواں کھدوانا اور کھجور لگانے کا بھی ذکر ہے۔

نیز علامہ سیوطی رحمتہ اللہ علیہ کے قول "مَحَلُّ ذِكْرٍ" سے مراد مسجد ہے۔ تو اس کا ذکر بھی اوپر "ان مما يلحق المومن ---" والی حدیث میں گزر گیا ہے۔

شیخ ابن ابی العز کا استدلال

شیخ ابن ابی العز رحمتہ اللہ علیہ (شرح العقیدۃ الطحاویہ: ۵۳۱) میں فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی "اذا مات الانسان انقطع عملہ" سے منکرین کا استدلال باطل ہے' کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "انقطع انتفاعہ" نہیں فرمایا کہ اس کا نفع لینا منقطع ہوگیا۔ بلکہ حدیث مبارک میں خبر اس بات کی ہے کہ میت کا ذاتی عمل منقطع ہوگیا۔ رہا کسی دوسرے کا عمل' تو وہ بہرحال اپنے عامل کا ہے لیکن عامل اگر اپنا عمل اس کو ہبہ کرے تو اسے اس کے عمل کا ثواب پہنچے گا' جو کہ اس کے ذاتی عمل کا ثواب نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک انسان کسی دوسرے کا قرض ادا کردے تو مقروض اپنے ذمہ سے بری ہو جاتا ہے' باوجودیکہ جو قرض ادا کیا گیا وہ اس کا ذاتی کسب نہیں ہے۔

قرات علی المیت اور سلف الصالحین

زمانے کے کمترین لوگوں کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ بسا اوقات ہر مسئلہ کے رد اور ہر جدید امر کے انکار میں غلو سے کام لیتے ہوئے کہہ دیتے ہیں کہ "اس کو سلف صالحین نے نہیں کیا۔" اور "یہ ان سے ثابت نہیں۔" نیز کبھی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ قرات علی المیت کو اسلاف نے اختیار نہیں کیا۔ تو اس بارے میں ہم کہیں گے: پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ دعویٰ صحیح نہیں کیونکہ قرات علی الاموات حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ سے صحیح ثابت ہے' جس کو امام شعبی نے انصار سے بیان کیا ہے اور مزید برآں کہ حضرت امام احمد رحمتہ اللہ علیہ سے بھی ثابت ہے' جن کا شمار اکابر ائمہ اسلاف میں ہوتا ہے اور "نفح الطیب فی فوائد المقری الکبیر" میں ہے کہ ایک شخص نے شیخ آبلی کو ابن رومی کا یہ مشہور شعر سنایا:

اَفْنٰی وَاَعْمٰی ذَا الطَّبِیْبُ بِطِبِّہٖ
وَبِکُحْلِہٖ الْاَحْیَاءُ وَالْبُصَرَآءُ
فَاِذَا مَرَرْتُ رَاَیْتُ مِنْ عُمْیَانِہٖ
اُمَمًا عَلٰی اَمْوَاتِہٖ قُرَّآءُ

"اس طبیب نے اپنے طبی نسخوں سے زندوں کو ہلاک اور اپنے سرمے سے انکھیاروں کو نابینا کر دیا۔ تو جب میرا ادھر سے گزر ہوا تو میں نے اس کے کئے ہوئے نابینا حضرات کی ایک جماعت کو دیکھا' جو اس کے ہلاک کردہ لوگوں پر فاتحہ پڑھ رہے تھے۔"

ائمہ مذاہب فقہیہ کے اقوال

علامہ شیخ عبداللہ بن محمد بن حمید رحمتہ اللہ علیہ' جو فقہ حنبلی کے ممتاز فقیہ اعظم ہیں' انہوں نے اپنی کتاب "غایہ المقصود" میں باقاعدہ ایک فصل قائم کر کے ہر مذہب کے علماء کے ان اقوال کو جمع کیا ہے' جو فوت شدگان کو ایصال ثواب کے مسئلہ کے ثبوت میں منقول ہیں۔ یعنی ہر وہ نیک عمل جس کو زندہ شخص کرے اور اس کا ثواب فوت شدگان کو ہبہ کرے مثلاً صدقہ و خیرات' قربانی' حج' عمرہ اور قرات قرآن وغیرہ اور بلاشبہ اس میں جمیع اذکار شامل ہیں مثلاً تہلیل و تکبیر اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام۔ ایسے اعمال پر عامل کو ثواب ملتا ہے اور جب وہ اپنا ثواب میت کو ہبہ کرے تو اللہ تعالیٰ وہ اس سے قبول کر کے میت کو پہنچا دیتا ہے' اور جب ثواب میت کو پہنچتا ہے' تو اسے اللہ تعالیٰ کے فضل اور کرم و احسان سے نفع ہوتا ہے۔

شیخ ابن حمید نے ائمہ احناف کے اقوال نقل کئے ہیں۔ مثلاً:

(۱) شیخ برہان الدین علی بن ابوبکر مرغینانی اپنی کتاب "الھدایہ" (باب الحج عن الغیر) میں۔

(۲) شیخ شمس الدین ابوالعباس احمد بن ابراہیم بن عبدالغنی سروجی اپنی کتاب

"نفحات النسمات فی وصول اھداء الثواب للاموات" میں۔

(۳) بدر الفقہاء علامہ بدر الدین عینی "کنز الدقائق کی شرح" (باب الحج عن الغیر) میں۔

(۴) علامہ ابن عابدین شامی نے "ردالمختار علی الدر المختار" میں۔

(۵) صاحب فتاویٰ ہندیہ، فتاویٰ ہندیہ کے چودہویں باب "الحج عن الغیر" میں۔

(۶) صاحب ہدایہ "احکام الحج عن الغیر" کے بیان میں۔

(۷) اور شیخ ملا علی قاری "المنسک المتوسط" کی شرح میں۔

اور شیخ نے فقہ مالکی کے ائمہ اور حفاظ مذہب کے موضوع سے متعلقہ اقوال کو نقل کیا۔ مثلاً:

(۱) امام ابن رشد اپنی کتاب "النوازل" میں۔

(۲) علامہ شہاب قرافی "الفرق الثانی والسبعین والمائہ" میں۔

(۳) علامہ ابن حاج نے "المدخل" کے جزء اول میں۔

(۴) شیخ ابو زید فاسی "باب الحج عن الغیر" میں۔

(۵) اور شیخ حطاب "الشرح علی خلیل" میں۔

پھر انہوں نے کبار ائمہ شافعیہ کے اقوال کا ذکر کیا۔ مثلاً:

(۱) علامہ شربینی اپنی کتاب "السراج المنیر" میں۔

(۲) امام نووی "روضہ الطالبین" اور "شرح مسلم" میں۔

(۳، ۴، ۵) حافظ سیوطی، امام سبکی اور علامہ ابن الصلاح "فتاویٰ" میں۔

(۶) شیخ ابو المعالی علی بن ابی سعود المعروف سویدی اپنی کتاب "العقد الثمین فی بیان مسائل الدین" میں۔

(۷) امام ابن النحوی "المنهاج" میں۔

(۸) اور شیخ الاسلام ابو عبداللہ قایانی "الروضہ" میں۔

پھر ائمہ حنابلہ اور حفاظ مذہب کے اقوال کو ذکر کرتے ہیں۔ اس کی ابتدا حضرت امام احمد رحمتہ اللہ علیہ کے اس قول سے کرتے ہیں:

اَلْمَيِّتُ يَصِلُ اِلَيْهِ كُلُّ شَيْئٍ مِّنَ الْخَيْرِ مِنْ صَدَقَةٍ اَوْ صَلَاةٍ اَوْ غَيْرِهٖ.	میت کو ہر نیکی کا ثواب پہنچتا ہے چاہے صدقہ ہو یا نماز اور کوئی اور۔

اس کے بعد الموفق بن قدامہ کے کلام کا ذکر کرتے ہیں جو "المغنی" میں طویل اور نہایت نفیس ہے۔ پھر وہ "العدۃ شرح العمدۃ" میں فرماتے ہیں کہ

قرات قرآن اور اس کا ثواب میت کو بخشنے پر بغیر کسی انکار کے اجماع واقع ہے۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ (میت کو پسماندگان کے واویلے سے تکلیف ہوتی ہے) تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شان اس سے کہیں بلند وبرتر ہے کہ وہ سزا میت تک پہنچائے اور ثواب کو اس سے روک دے۔ میں کہتا ہوں کہ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان عالیشان شاہد ہے:

لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا اِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ آدَمَ الْاَوَّلِ كِفْلٌ مِّنْ دَمِهَا، لِاَنَّهٗ اَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ.	جو بھی شخص ظلماً قتل ہوگا اس کا وبال حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے پر ہوگا، کیونکہ اس نے قتل کی بنیاد رکھی۔

(رواہ احمد عن عبداللہ بن مسعود: ۱/۴۳۰)

مقام غور ہے کہ جب یہ عذاب وعتاب میں ایسا ہو رہا ہے تو فضیلت وثواب میں یقیناً اس سے زیادہ مناسب اور لائق ہوگا۔

(شیخ عبداللہ بن محمد بن حمید کی کتاب "غایۃ المقصود فی التنبیہ علی اوہام ابن محمود" ص ۴۳۰)

علماء مذاہب کی نصوص فقہیہ کی توثیق

نصوص مذہب حنفیہ کی توثیق

امام علامہ مرغینانی "الھدایہ" میں "باب الحج عن الغیر" کی ابتداء میں فرماتے ہیں:

"اس باب میں کہ اہل السنہ والجماعہ کے نزدیک ایک انسان اپنے کسی عمل نماز' روزہ یا صدقہ وغیرہ کا ثواب کسی دوسرے کو ہبہ کر سکتا ہے' اصل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے دو چتکبرے مینڈھے ذبح کئے' ایک اپنی ذات کی طرف سے اور دوسرا اپنی اس امت کی طرف سے' جس نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا اور آپ ﷺ کی تبلیغ رسالت کی شہادت دی۔"

(شیخ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی کی کتاب "الھدایہ فی شرح بدایہ المبتدی" ۱/ ۱۸۳)

(اور شیخ ابن عابدین نے اس کو "مجموعہ رسائل" (۱/ ۱۶۵) میں اسی طرح نقل کرکے اس کی توثیق کی)

محقق کمال ابن ہمام نے "فتح القدیر" میں اس موضوع پر نہایت نفیس مضمون تحریر کیا ہے' اس کو وہاں ہی ملاحظہ کرو۔ (شیخ کمال بن ہمام کی "شرح فتح القدیر" ۲/ ۳۰۹)

شیخ ابن تیمیہ کی تحقیق

شیخ تقی الدین ابوالعباس احمد بن تیمیہ کا کہنا ہے کہ

جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ انسان کو اپنے ذاتی عمل کے سوا نفع حاصل نہیں ہو سکتا' اس نے اجماع امت سے بغاوت کی اور یہ اعتقاد مندرجہ ذیل متعدد وجوہات سے باطل ہے:

(۱) بے شک انسان غیر کی دعا سے مستفید ہوتا ہے اور یہی غیر کے عمل سے نفع ہونا

ہے۔

(۲) بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اہل محشر کے لیے حساب شروع کرنے کی سفارش کریں گے، پھر جنتیوں کے لیے بہشت میں داخل ہونے کی، پھر کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے دوزخ سے رہائی کی سفارش کریں گے۔ یہ سب کچھ غیر کے عمل سے نفع ملنا ہے۔

(۳) ہر نبی اور ولی شفاعت کرے گا، جو غیر کے عمل سے نفع کا حصول ہے۔

(۴) ملائکہ زمین والوں کے لیے دعا اور استغفار کرتے ہیں۔ یہ بھی غیر کے عمل سے انتفاع ہے۔

(۵) اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو محض اپنی رحمت سے دوزخ سے نجات دے گا، جس کے دامن میں کوئی نیکی نہیں۔ دیکھیں یہ بھی اس کے ذاتی عمل کا نتیجہ نہیں۔

(۶) مومنین کی اولاد اپنے آباء کے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل ہوگی۔ یہ بھی محض عمل غیر سے انتفاع ہے۔

(۷) اللہ تعالیٰ نے سورۂ کہف میں دو یتیم بچوں کے قصہ میں فرمایا:

وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا۔　اور ان کا باپ نیک آدمی تھا۔

(الکہف: ۸۲)

تو ان دونوں کو اپنے باپ کی نیکی سے نفع حاصل ہوا، نہ کہ ان کا ذاتی عمل تھا۔

(۸) سنت اور اجماع کی روشنی میں میت کی طرف سے صدقہ دیا جائے یا غلام آزاد کیا جائے تو اسے نفع ملتا ہے۔ یہ بھی غیر کا عمل ہے۔

(۹) دلیل سنت سے ثابت ہے کہ میت سے فرضی حج ساقط ہو جاتا ہے جب اس کا ولی اس کی طرف سے حج ادا کرے اور لامحالہ یہ عمل غیر سے نفع ہوا۔

(۱۰) اور یہ بھی دلیل سنت سے ثابت ہے کہ نذر مانا ہوا حج یا روزہ غیر کے عمل سے میت سے ساقط ہو جاتا ہے جو بلاشبہ عمل غیر سے انتفاع ہے۔

(۱۱) ایک مقروض کی نماز جنازہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رک گئے' یہاں تک کہ حضرت ابو قتادہ نے اس کا قرض ادا کیا اور ایک دوسرے شخص کا حضرت علی بن ابو طالب نے ادا کیا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک دعا سے مستفید ہوئے اور قرض کی ادائیگی سے ان کو راحت ہوئی' جبکہ یہ عمل بالغیر ہے۔

(۱۲) بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تنہا نماز پڑھنے والے شخص کی بابت فرمایا:

اَلَا رَجُلٌ يَتَصَدَّقُ عَلٰى هٰذَا فَيُصَلِّيْ مَعَهٗ.　کیا کوئی شخص اس پر صدقہ کر سکتا ہے کہ اس کے ساتھ مل کر نماز پڑھے۔

تو اسے غیر کے فعل سے جماعت کی فضیلت حاصل ہوئی۔

(۱۳) یقیناً انسان مخلوق کے قرضوں سے بری الذمہ ہو جاتا ہے' جب کوئی اس کی طرف سے قرض ادا کر دے۔ یہی تو غیر کے عمل سے نفع حاصل ہوتا ہے۔

(۱۴) جس شخص نے کئی ایک مظالم اور جور و ستم کا ارتکاب کیا' جب اسے معاف کر دیا جائے تو حد (شرعی سزا) ساقط ہو جاتی ہے۔ یقیناً یہ عمل غیر سے انتفاع ہے۔

(۱۵) حدیث شریف میں آتا ہے کہ نیک پڑوسی سے زندگی اور موت میں نفع ملتا ہے۔ یہ بھی عمل غیر سے انتفاع ہے۔

(۱۶) اہل ذکر کی مجلس میں اس بیٹھنے والے پر بھی ان کے ساتھ رحمت ہو جاتی ہے' جو دراصل ان میں شریک نہیں اور نہ اس کے لیے وہاں آیا' بلکہ اپنے کسی کام کے لیے وہاں بیٹھا رہا اور اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اسے غیر کے عمل سے نفع ہوا۔

(۱۷) میت پر نماز جنازہ پڑھنا اور اس کے لیے دعا کرنا اس کے لیے یقیناً نفع بخش ہے اور یہ نفع اسے زندہ کی دعا سے ہوا جو کسی غیر کا عمل ہے۔

(۱۸) جمعہ متعدد افراد کے اجتماع سے ہوتا ہے' اور اسی طرح فضیلت جماعت کثرت تعداد سے ہوتی ہے اور یہ بعض کا بعض سے نفع حاصل کرنا ہے۔

(۱۹) اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ -(الانفال: ۳۳)

اور اللہ کا کام نہیں کہ انہیں عذاب کرے جب تک اے محبوب تم ان میں تشریف فرما ہو۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَوْ لَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ---(الفتح: ۲۵)

اور اگر یہ نہ ہوتا کچھ مسلمان مرد اور کچھ مسلمان عورتیں---

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ---(البقرۃ: ۲۵۱)

اور اگر اللہ لوگوں میں بعض کو بعض سے دفع نہ کرے---

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعض لوگوں سے بعض کی وجہ سے عذاب دور کر دیا تو یہ عمل غیر سے نفع کا حاصل ہونا ہے۔

(۲۰) بے شک صدقہ فطر بچے اور کسی کے زیر کفالت رہنے والے کی طرف سے واجب ہے اور کوئی اس سے ادا کر دے تو وہ نفع پائے گا جبکہ اس کی اپنی کوئی کوشش نہیں۔

(۲۱) بچے اور مجنون کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے جس کی ادائیگی پر اسے ثواب ملتا ہے حالانکہ اس کی اپنی کوئی کوشش نہیں۔

جس نے علم دین پر غور کیا وہ انسان کو ایسے امور سے نفع حاصل کرتے پائے گا جن کو اس نے نہیں کیا اور یہ شمار سے باہر ہیں تو پھر کیسے جائز ہے کہ آیت مبارکہ کی تاویل کتاب وسنت اور اجماع امت کی صراحت کے خلاف کی جائے۔ آیہ کریمہ میں انسان سے مراد عام ہے۔

(غایۃ المقصود فی التنبیہ علیٰ اوہام ابن محمود: ص ۱۰۱ از شیخ عبداللہ بن محمد بن حمید)

حجر اسود اور فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حجر اسود کے پاس آئے اور اسے بوسہ دینے کے بعد فرمایا:

اِنِّیْ اَعْلَمُ اَنَّکَ حَجَرٌ لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ وَلَوْلَا اَنِّیْ رَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُقَبِّلُکَ مَا قَبَّلْتُکَ۔	بے شک میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے' نہ تو نقصان دے سکتا ہے نہ نفع۔ اگر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہیں بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو تجھے کبھی نہ چومتا۔
(صحیح بخاری' کتاب الحج' باب ما ذکر فی الحجر الاسود)	

یہی حدیث مبارک ان لوگوں کی بنیادی دلیل ہے جو آثار نبویہ' مشاہد دینیہ اور مواقع عظیمہ کے ساتھ تبرک کی ممانعت کے قائل ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مبارک نص ہمیں اس فاسد و باطل اور گئے گزرے تصور سے بیگانہ کر کے ایک عالیشان اور نہایت عظمت و جلالت کے حامل مفہوم سے آشنا کرتی ہے' کیونکہ اس کا تعلق ان عظیم بنیادی اصولوں سے ہے جو امور دین میں شارع کو تسلیم کرنے اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل پیروی کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور یہی وہ معنی ہے' تبرک کے قائلین جس کا قصد کرتے ہیں اور اس کی غرض و غایت محض یہی ہے کہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محافظت اور متابعت پر اس گہری محبت کے ساتھ کمربستہ رہنا' جس کا پودا ایمان نے لگایا اور اس شدت اشتیاق سے جس کی اس نے آبیاری کی۔ اس مبارک حدیث کا کوئی جزء ایسا نہیں جو تبرک کی ممانعت پر دلالت کرتا ہو' پھر طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ اس پر حکم لگانے میں بعض کی نوبت تو یہاں تک پہنچ گئی کہ انہوں نے اسے شرک و ضلالت کہہ دیا' کسی نے حرام اور کسی نے بدعت کا بے بنیاد فتویٰ جڑ دیا اور کسی نے نرمی برتتے ہوئے اعتدال کا رخ اختیار

کرتے ہوئے یوں کہا کہ تبرک ممنوع اور ناجائز ہے، مگر ان امور میں جن کا شارع نے حکم دیا اور اس کے جواز کی وضاحت کی۔

جس شخص کا یہ دعویٰ ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اس قول سے تبرک کی حرمت، ممانعت یا تبرک کے قائل کی تردید مقصود ہے تو یقیناً اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ایک بہت بڑا بہتان باندھا اور آپ کے ذمے ایک صریح جھوٹ لگایا۔ اس نے اپنے ذہن کو ایسے امر پر اکسایا جس کا وہ متحمل نہیں اور ایسا خیال کیا جو کبھی اس کے دل نے تسلیم نہیں کیا، لیکن سوء ظن ہر اس امر کے تصور پر ابھارتا ہے جس سے وہ متاثر ہو اور خواہش نفس اور ذاتی رائے پر حکم نافذ کرتا ہے۔ اگرچہ وہ قائل کے مقصود کے خلاف ہی ہو یا اس کی مراد کے برعکس ہی ہو۔ (والعیاذ باللہ من ذلک)

اب حدیث کے ان شارحین کو پڑھیں جنہوں نے ہمارے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صحیح غرض کو بیان کیا۔

۱- طبری

امام طبری کا کہنا ہے کہ سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ اس لیے فرمایا کیونکہ لوگ اس دور میں بتوں کی پرستش کیا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خدشہ ہوا کہ کہیں جہلا یہ گمان نہ کر بیٹھیں کہ حجر اسود کا استلام محض ایک پتھر کی تعظیم ہے جیسا کہ عرب دور جاہلیت میں کرتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو یہ تعلیم دینے کا ارادہ کیا کہ حجر اسود کا استلام محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی ہے، نہ یہ کہ حجر اسود ذاتی طور پر نافع اور ضار ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ بتوں کے بارے میں اعتقاد رکھتے تھے۔

اور مہلب فرماتے ہیں کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث اسی شخص کی تردید کرتی ہے جس نے کہا: کہ

"حجر اسود زمین میں اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے جس کے ساتھ اس کے بندے مصافحہ کرتے ہیں۔" معاذاللہ ثم معاذاللہ کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی عضو ہو۔

(فتح الباری: ۳/ ۴۶۲)

۲- بدر الدین عینی

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ کہنا "انی اعلم انک حجر لا تضر ولا تنفع" اس کلام سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراد میں شارحین نے کلام کیا ہے۔ محمد بن جریر طبری نے کہا ہے کہ اس دور میں لوگ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ اس لیے حضرت عمر کو خدشہ ہوا کہ کہیں جہلاء یہ گمان نہ کر بیٹھیں کہ حجر اسود کا استلام بھی عربوں کے فعل کی طرح ہی ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ لوگوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ اس کے استلام میں محض اللہ عزوجل کی تعظیم مقصود ہے، اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ بے شک یہ بھی حج کے ان شعائر (نشانیاں) میں سے ایک ہے جن کی تعظیم کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا اور اس کا استلام عربوں کے فعل کے خلاف ہے جو وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے، کیونکہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ عبادت ان کو اللہ تعالیٰ کے قریب کر دے گی، تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس اعتقاد کے خلاف یہ تنبیہ کی کہ کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں، مگر وہی ہستی جو نفع و ضرر کی حقیقی مالک ہے، اور وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ جل جلالہ کی ذات ہے۔

اور محب الدین طبری نے یوں فرمایا کہ

بے شک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا آثار نبویہ کا تحفظ اور ان کے ذاتی مفادات سے روگردانی کرنا ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب حجر اسود کو دیکھا جائے کہ اس کا استلام ہوتا ہے، تو اس فعل کا کوئی ظاہری سبب حسی طور پر معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی عقل کی جہت سے کوئی خاص وجہ معلوم ہوتی ہے تو اس میں رائے اور قیاس کو مکمل

طور پر پس پشت ڈال کر محض اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حرز جاں بنایا جاتا ہے۔ جیسا کہ رمل (کندھوں کو ہلاتے ہوئے دوڑنا) میں کیا جاتا ہے۔(عمدہ القاری: ۹/ ۲۴۰)

۳- علامہ قسطلانی

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا "انی اعلم انک حجر لا تضر ولا تنفع "اس لیے تھا کہ زمانہ قریب میں حلقہ بگوش اسلام ہونے والے حضرات کا وہم دور ہو جائے جو وہ دور جاہلیت کے بتوں کے پتھروں میں نفع و نقصان کا اعتقاد رکھتے تھے۔ اگرچہ یہ ایسے امر کی مثال ہے جس میں ثواب کا نفع ہوتا ہے، لیکن اس کو ذاتی طور پر اس پر کوئی قدرت نہیں، کیونکہ وہ تو دوسرے پتھروں کی طرح ایک پتھر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس تعلیم کی اشاعت اس موسم میں کی تاکہ تمام شہروں میں یہ خبر مشہور ہو جائے اور متاخرین اپنے اپنے دور میں اس کو محفوظ رکھیں۔

(ارشاد الساری: ۴/ ۱۳۶)

۴- شیخ کرمانی

شیخ کرمانی نے بھی شرح بخاری میں اسی طرح ذکر کیا ہے اور اس کی تائید میں خطابی کا یہ قول نقل کیا: کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا "انک لا تضر ولا تنفع "اس خوف سے تھا کہ کہیں بعض نو مسلم حضرات حجر اسود کو چومتے ہوئے دیکھ کر اس امر میں شبہ نہ کرنے لگیں کیونکہ وہ پہلے پتھر کے بتوں کی عبادت، ان کی تعظیم اور ان سے نفع کی امید سے مانوس رہ چکے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمادی کہ یہ ذاتی طور پر نہ نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔ اگرچہ اس امر میں ثواب کا نفع حاصل ہوتا ہے لیکن اس کی ذات کو نفع و نقصان کی کوئی قدرت نہیں اور وہ دوسرے پتھروں کی مانند ایک پتھر ہے، حقیقت اس کی یہی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس تعلیم کی اشاعت اس عظیم موقع پر کی تاکہ یہ خبر تمام شہروں میں مشہور ہو جائے اور حج کرنے کے لیے

مختلف ممالک سے آئے ہوئے حضرات اس کو یاد کر لیں۔

علامہ خطابی کہتے ہیں کہ اس میں حکم کو قبول کرنا' اسباب کے مطالبہ کو ترک کرنا اور ان امور میں بھی اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا کرنا ہے جن کا معنی و مفہوم ہم پر منکشف نہیں۔ شریعت کے احکام کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن کا سبب واضح ہے اور دوسرا وہ جس کی علت واضح نہ ہو' اور اس کو فقط قبول کرلینا ضروری ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اس پتھر کو تمام پتھروں پر فضیلت دی ہے' جس طرح اس مقام کو تمام مقامات پر اور یوم عرفہ کو تمام دنوں پر فضیلت دی ہے۔ اسی لیے کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔۔۔

ما انت یا مکه الا واد

شرفک الله علی البلاد

"اے مکہ تو ایک وادی کے سوا کچھ نہ تھا' اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمام شہروں پر فضیلت دے دی۔"

لہٰذا ایسے امور کی کوئی علت نہیں جس کی طرف رجوع کیا جا سکے۔ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا حکم اور اس کی مشیت ہے۔ اس کے فعل سے متعلق سوال نہیں کیا جاتا۔

(شرح الکرمانی علی صحیح البخاری:۸ / ۱۱۶)

۵- حافظ عراقی کا کلام

علامہ بدر الدین عینی اپنے شیخ زین الدین عراقی سے نقل کرتے ہیں کہ اس میں ان پتھروں وغیرہ کے چومنے کی کراہت ہے جن کے چومنے کا شریعت نے حکم نہیں دیا۔ اور شیخ زین الدین فرماتے ہیں کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: "جو کوئی بیت اللہ کو بوسہ دے تو اچھا ہے۔" حالانکہ اس کا جواز بالحسن وارد نہیں بلکہ انہوں نے اس کی اباحت کا ارادہ کیا اور مباح حسن کے قبیلے سے ہے۔ جیسا کہ اصولیوں نے اس کو ذکر کیا' میں کہتا ہوں یہ کلام محل نظر ہے اور انہوں نے مزید کہا کہ بابرکت

مقامات کو تبرک کے ارادے سے بوسہ دینا اور اسی طرح صالحین کے ہاتھوں اور پاؤں کو چومنا قصد و نیت کے اعتبار سے قابل ستائش خصلت ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے وہ جگہ عریاں کرنے کا سوال کیا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوسہ دیا اور وہ آپ کی ناف تھی تو آپ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار اور اولاد کے ساتھ تبرک کی نیت سے اس کو چوم لیا۔

حضرت ثابت بنانی رحمتہ اللہ علیہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا مبارک ہاتھ چومنے سے پہلے چھوڑتے ہی نہ تھے اور ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کرتے کہ اس ہاتھ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو چھوا ہے۔

شیخ مزید فرماتے ہیں کہ مجھ سے حافظ ابو سعید بن علائی نے کہا: کہ میں نے ایک پرانے نسخہ میں احمد بن حنبل کا کلام دیکھا' جس پر ابن ناصر وغیرہ حفاظ کی تقاریظ تھیں' کہ امام احمد رحمتہ اللہ علیہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک اور منبر کے چومنے کا سوال کیا گیا' تو آپ نے فرمایا "اس میں کوئی حرج نہیں۔" تو ہم نے وہ نسخہ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ کو دکھایا تو انہیں اس سے بہت تعجب ہوا اور کہنے لگے کہ مجھے تعجب ہے' احمد میرے نزدیک مستند اور جلیل القدر ہیں' انہوں نے یہ کہا--- یعنی یہ انہوں نے نہیں کہا--- حالانکہ اس میں کون سا تعجب ہے جبکہ ہم نے امام احمد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کی قمیص کو دھویا اور جس پانی سے دھویا وہ پی گئے۔ تو جب آپ رحمتہ اللہ علیہ اہل علم حضرات کی تعظیم اس قدر کرتے تھے تو ان کے نزدیک مقادیر صحابہ اور آثار انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی تعظیم و تکریم کا عالم کیا ہو گا۔ مجنوں نے لیلیٰ کی نسبت کیا خوب کہا ہے۔

أَمُرُّ عَلَى الدِّيَارِ دِيَارِ لَيْلَى
أُقَبِّلُ ذَا الْجِدَارَ وَ ذَا الْجِدَارَا

وَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِيْ
وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَا

"میں ان گھروں سے گزرا جن میں لیلیٰ کا گھر تھا' کبھی میں اس دیوار کو چومتا اور کبھی اس کو' یہ ان گھروں کی محبت میرے دل پر غالب نہیں تھی' لیکن اس (لیلیٰ) کی محبت تھی جو ان گھروں میں سکونت پذیر ہے۔"

حافظ محب طبری فرماتے ہیں: کہ حجراسود کے چومنے اور ارکان کے استلام سے یہ استنباط ہو سکتا ہے کہ ہر اس چیز کا بوسہ جائز ہے جس کے چومنے میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہو۔ اگرچہ اس امر میں نہ استحباب کی کوئی نص وارد ہوئی ہے اور نہ ہی کراہت کی۔

نیز فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے جد امجد محمد بن ابوبکر کے ایک رسالہ میں امام ابو عبداللہ محمد بن ابوالصیف سے منقول دیکھا ہے کہ بعض ائمہ کا معمول تھا کہ جب قرآن حکیم کے نسخہ کو دیکھتے تو اسے بوسے دیتے اور جب حدیث مبارک کے اجزا کو دیکھتے تو انہیں بھی چوم لیتے۔ (عمدۃ القاری: ۹/۲۴۱)

آثار نبویہ اور ہمارا مسلک

یہی مقدم الذکر وہ معنی ہے جس کا ہم قصد کرتے ہیں اور اسی سے ہمارے اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تبرک کے تمام قائلین کے دلوں کو اطمینان کی دولت میسر آتی ہے' یہ سب کچھ حضور علیہ الصلوۃ والسلام' آپ کے آثار واحوال اور زمان و مکان کے ساتھ جنون کی حد تک محبت واشتیاق کے جذبے کا غماز ہے اور یہ وجدان آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی جذبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور آپ کی سنت کے ساتھ کامل وابستگی پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی سے دلوں کو شفاء ملتی ہے اور اطمینان اور سکون کی دولت میسر آتی ہے۔ بہرحال تبرک حقیقت اور واقع میں سنت نبویہ اور افعال محمدیہ کی متابعت کی ایک

صورت ہے۔

سابقہ آثار و نقوش اور حوادث تاریخیہ کی طرف منسوب مواقع' گزشتہ حکومتیں یا سابقہ تہذیب و تمدن کی حامل قومیں ہماری توجہ کا مرکز نہیں۔ ہاں البتہ اس قسم کے آثار و نقوش کی طرف ہمارا متوجہ ہونا اور اجتماع وغیرہ کا اہتمام کرنا محض سیرو سیاحت اور دراست علمیہ کی خاطر ہوتا ہے' جبکہ مذہبی حوالے سے ہم صرف اور صرف معتبر آثار دینیہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہاں اجتماع وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں' لیکن یاد رہے کہ نہ ان کی عبادات مقصود ہوتی ہے نہ طواف' اور نہ ہی نفع و نقصان میں ان کی تاثیر ذاتی کا اعتقاد' اور نہ ہی وہ زندگی و موت' رزق کے دینے اور نہ دینے میں موثر ہوتے ہیں۔ ہم ان سابقہ آثار نبویہ کی طرف اس لیے متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ان امور کا ذکر کیا جائے جو وہاں وقوع پذیر ہوئے اور وہ حالات جو ان کے پس و پیش میں رونما ہوئے اور اس مواقع پر جو احکام قرآنیہ اور احادیث مبارکہ وارد ہوئیں کا خوب تذکرہ کیا جائے' کہ یہاں یہ آیت نازل ہوئی' یہ غزوہ ہوا' رحمت برسی' انوار و تجلیات کی باراں ہوئی' خیرات و برکات دامن گیر ہوئیں۔ یہاں نماز' طواف اور سعی ہوئی' یہاں اللہ کی عبادت اور ذکر ہوا' تسبیح و تہلیل اور تلبیہ و تکبیر کا پرکیف سماں چشم عالم کے دیکھنے میں آیا۔ یہاں فلاں حکم نازل ہوا' یہاں رات گزاری' کھانا تناول فرمایا' پانی نوش فرمایا اور سر مبارک کا حلق کروایا۔ ایسے امور کے ساتھ سنت نبویہ محفوظ ہو جاتی ہے اور اس کا پاس و لحاظ دلوں میں باقی رہتا ہے۔

ازیں قسم کا پاس و لحاظ اور اہتمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و عقیدت نقطہ عروج پر تھی۔ انہی لوگوں نے انتہائی محبت کے ساتھ آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کا حق ادا کیا' یہاں تک کہ انہوں نے آپ ﷺ کے وضو مبارک اور اس کے بقیہ کا ایک قطرہ تک بھی ضائع نہیں ہونے دیا تو پھر کیسے ممکن ہے کہ ان مقدس لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کی جہات مبارکہ اور حرکات و سکنات کا کوئی لمحہ ہاتھ سے جانے دیا ہو' بلکہ یہاں تو موقع پر حاضر نہ ہونے والے حضرات تک حدیث کی تبلیغ اور حفاظت کی سخت ترغیب دلائی جاتی ہے۔

لہٰذا ایسے واقعات تو اجتماعی طور پر حدیث کی حفاظت پر برانگیختہ کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ انہوں نے ہر ممکن طریقے سے حدیث کی حفاظت کی سرتوڑ کوشش کی اور جو کچھ سماعت کیا اس کی تبلیغ کی۔ ان پاکدامن ہستیوں کے دل محبت و ایمان سے معمور تھے اور کان معرفت و ایمان کی ہر ایک بات کو دھیان سے سننے والے تھے۔ کہنے والے نے کیا خوب کہا۔

لَهَا اَحَادِيْثٌ مِّنْ ذِكْرَاكَ تَشْغَلُهَا
عَنِ الشَّرَابِ وَتُلْهِيْهَا عَنِ الزَّادِ

سیدنا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو ہی دیکھئے کہ انہوں نے کیسے نظم و ضبط کے ساتھ وہ حدیث روایت کی کہ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان مبارک گزرگاہوں کا ذکر ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حج و عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے' جو الصحیح البخاری 'کتاب المساجد' باب المساجد التی علی طریق المدینہ... میں موجود ہے۔ اندازہ کریں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے قیام گاہوں' وسیع صحراؤں' بے آب و گیاہ بلند و بالا پہاڑوں' وادیوں کے نشیب و فراز اور ٹیلوں کے حالات' نیز چلنے میں آگے پیچھے کی کیفیات کو کس حسین انداز سے ضبط کیا ہے؟ اور کیسی شاندار طریقے سے ان کی نشاندہی کی ہے' اور یہ اتنا باریکی سے ضبط کر کے روایت کرنا آپ ہی کا حصہ ہے۔ جغرافیہ دان' نقشہ نگار اور مورخ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس روایت کو بار بار دیکھیں اور اس پر بار بار نظر دوڑائیں' پھر فیصلہ کریں کہ کیا عقل کے تصور میں بھی کوئی قوم ایسی ہے جو ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر حفظ و ضبط کرنے والی ہو اور فہم و ادراک میں ان سے زیادہ قوی ہو؟ کیا خوب کہا۔

ونا دتنی الا شواق مھلا فھذہ
منازل من تھوی رویدک فانزل

"مجھے شوق و محبت نے ندا دی' ہوشیار! یہی وہ منازل ہیں جن کی تلاش تیرا مقصود تھا' لہٰذا ڈیرہ ڈال دے۔"

شیخ علامہ محدث محمد یوسف بنوری رحمتہ اللہ علیہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے احوال کی منظر کشی کرتے ہیں تاکہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر سفر میں آثار و دیار اور جائے قیام کے ضبط پر صحابہ کی انتہائی حرص کی معرفت ہو جائے۔ خصوصاً آپ ﷺ کے حجتہ الوداع کے موقع پر مکہ مکرمہ کی طرف سفر میں صحابہ کے احوال کچھ زیادہ ہی قابل رشک ہیں۔ شیخ بنوری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: تعجب کی انتہا ہے کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رہے اور آپ صلی اللہ علیہ کا یہ پہلا حج ہے' اس سے پہلے صحابہ کو مناسک کی ادائیگی کا علم نہیں' لیکن اس میں انہوں نے مناسک سیکھنے کا حق ادا کر دیا۔ سفر میں صحابہ کبھی پیچھے رہ جاتے اور کبھی آگے نکل جاتے' پیادہ بھی تھے' سوار بھی۔ پھر اس کے باوجود انہوں نے حفظ و ضبط کی انتہا کر دی کہ کسی نسک کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا' اور اپنے مابعد مسلمانوں کے لیے ہر قول و فعل کو نقل کیا' پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اصل مقاصد اور ارکان نسک میں کسی کا اختلاف نہیں' حق بات یہ ہے کہ اتنا بڑا اتفاق ہونا قدرت الٰہیہ کی نشانی ہے۔ اس روئے زمین پر کوئی ایسی قوم تاریخ کے اوراق میں محفوظ نہیں' نہ ہی انبیاء و مرسلین کے اصحاب سے اور نہ ہی بادشاہوں اور امرا کے خدام سے کوئی ایسی مثال ملتی ہے۔ حق بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ و سبحانہ نے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہترین امت کا بہترین قائد اور نمونہ بنایا ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں شہداء ہونے کا اعزاز بخشا' اور اس امت کو سب سے زیادہ نیک اور پارسا ہونے کی توفیق دی' جو قلبی طور پر سب سے زیادہ نیکو کار' علمی طور پر

سب سے زیادہ باریک بین ہیں۔ ایسی بلند پایہ شخصیات کو اللہ کریم جل جلالہ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لیے پسند فرمایا جیسا کہ حبر القادسیہ ابن ام عبد نے ان کی شان بیان کی۔

میں نے پہلے معارف السنن ۶/ ۲۳۴ میں طویل تفصیل کے بعد کہا ہے کہ صحابہ کا پہلی مرتبہ ان حقائق دینیہ کا ادراک کرنا ان کے کمال فہم و دانش کی دلیل ہے' ان افعال و اعمال کا مشاہدہ اور ضبط کرنا' انتہائی ذکاوت اور بیداری کا ثبوت دینا پھر ایک ایک عمل کو ضبط کرنا اور ایک ایک ذرے کو خوب سمجھنا ان پاک ہستیوں کا اپنا ہی نصیبہ ہے۔ دنیا و مافیہا کی عقل سے کہیں بالاتر ہے۔ یہ تمام امور اس امت کے اپنے خصائص ہیں۔ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی باطنی صفائی کا کیا کہنا جن کے اذہان و افہام صحبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے روشن ہوئے تو وہ پاکیزگی اور قلبی صفائی کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوئے اور روح کی جلد اور نفس پر قابو پانے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ و سبحانہ ان حقائق شرعیہ کو سمجھنے' ان کے ادراک سے پختہ یقین ہونے اور ان کے معانی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی توفیق بخشے۔ گویا کہ معاملہ ابن بابک کندی کے اس قول کے مطابق ہے

من ام بابک لم تبرح جوارحه
تروی احادیث ما اولیت من منن
فالعین عن قره والکف عن صله
والقلب عن جابر والسمع عن حسن

"جو ام بابک احادیث کی روایہ ہے' کتنے ہی احسانات کی مستحقہ ہے۔ گویا کہ اس کے اعضا یعنی آنکھ کو ٹھنڈک' ہتھیلی کو خیرات' دل کو سلامتی اور سماعت کو حسن کی دولت میسر ہے۔ یہ اعضا کبھی ان صفات سے جدا نہیں ہوئے۔"

پھر اس ذکاء و صفا کے ساتھ ساتھ وہ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس قدر دیوانے تھے کہ تاریخ بشریت کسی قوم کی مثال پیش نہیں کر سکتی جو محبت و مودت میں ان کے مشابہ ہو۔ امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ اپنی صحیح میں صلح حدیبیہ کے متعلق ایک طویل حدیث میں یہ نقل کرتے ہیں:

ثُمَّ اِنَّ عُرْوَةَ جَعَلَ يَرْمُقُ اَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ فَوَ اللّٰهِ مَا تَنَخَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ نُخَامَةً اِلَّا وَقَعَتْ فِيْ كَفِّ رَجُلٍ مِّنْهُمْ فَدَلَكَ بِهَا وَجْهَهٗ وَجِلْدَهٗ وَاِذَا تَوَضَّأَ كَادُوْا يَقْتَتِلُوْنَ عَلٰى وُضُوْئِهٖ---

پھر عروہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتا رہا' کہتا ہے اللہ کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بھی کھنکارا تو وہ کسی شخص کی ہتھیلی پر گرا تو اس نے اسے اپنے چہرے اور بدن پر مل لیا' اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرماتے تو وہ وضو کے پانی پر ٹوٹ پڑتے۔

اسی طرح امام بخاری نے "باب الثوب الاحمر" میں حضرت ابو جحیفہ کی حدیث نقل کی ہے:

وَرَاَيْتُ بِلَالًا اَخَذَ وَضُوْءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَاَيْتُ النَّاسَ يَبْتَدِرُوْنَ ذٰلِكَ الْوَضُوْءَ فَمَنْ اَصَابَ مِنْهُ شَيْئًا تَمَسَّحَ بِهٖ وَمَنْ لَّمْ يُصِبْ مِنْهُ شَيْئًا اَخَذَ مِنْ بَلَلِ يَدِ صَاحِبِهٖ۔

اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا پانی بلال کو لیتے دیکھا اور دیکھا کہ لوگ اس مقدس پانی کے حصول میں جھگڑتے ہیں۔ جسے کچھ مل گیا اس نے مل لیا اور جسے کچھ نہ ملا اس نے اپنے ساتھی کے ہاتھ سے تری لے لی۔

ایسے ہی ایک جماعت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات' رینٹ اور تھوک مبارکہ کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔ ابن زبیر اور ابو طیبہ وغیرہ حضرات کے ایک

گروہ نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھنوں کا خون مبارک نوش کر لیا جیسا کہ البدایہ والنہایہ از علامہ ابن کثیر اور عمدۃ القاری از علامہ بدر الدین عینی میں ہے۔

ابن منیر مالکی فرماتے ہیں: جب حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا تو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عقلیں زائل ہو گئیں۔ بعض کی عقلیں بالکل دم توڑ گئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اسی کیفیت میں قریب قریب تھے۔ بعض ایسے بیٹھے کہ قیام پر قادر نہ ہو سکے اور بعض ایسے خاموش ہوئے کہ کلام پر قدرت نہ حاصل کر سکے اور بعض تو بالکل لاغر ہو گئے کہ صاحب فراش ہو گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ کیفیت تھی کہ چپ چاپ چلتے پھرتے تھے اور کلام کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایسے بیٹھ گئے کہ حرکت کی ہمت نہ رہی۔ ان سب حضرات میں پھر بھی ثابت قدم رہنے والے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جو آئے اور آنکھیں اشکبار تھیں اور بال مبارک پراگندہ تھے اور سانس رک رک جاتا تھا' جیسا کہ صاحب مواہب لدنیہ نے بیان فرمایا۔

زیاد بن حنظلہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی موت کا سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید غم تھا۔ (اسد الغابہ)

علامہ استاد سید ابو الحسن ندوی بطور تعلیق فرماتے ہیں کہ "مسلمانوں کی یہ انتہائی عقلی پختگی ہے کہ اس محبوب شخصیت سے صادر ہونے والی ہر نقل و حرکت اور قول و فعل کے ساتھ ان کی بے پناہ محبت اور شدت تعلق کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اس مبارک سفر کا کوئی دقیقہ اور کوئی چھوٹا سا واقعہ بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اس کو رقم کیا۔ جبکہ عظماء و رؤسا' ملوک و امراء اور علماء و نبغاء کے سفروں میں اس کی مثال تک نہیں ملتی۔ لہٰذا یہ ایک حقیقی محب اور عاشق صادق کی ہی شان ہے جو اپنے محبوب کی ہر شے کو اچھی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کے ذکر سے لطف اندوز ہوتا ہے' اس کی گفتگو کی صحیح پاسداری کرتا ہے' کوئی چھوٹا اور بڑا واقعہ شمار سے باہر نہیں ہونے

دیتا اور کوئی نادر دقیقہ بھی بیان کرنے سے گریز نہیں کرتا۔

جملہ قائدین اور مشاہیر کے سفروں میں ایسی نظائر تلاش کرنا عبث اور اضاعت وقت ہے' کیونکہ بے شمار امتیں اپنے اپنے انبیاء کے ساتھ گزر گئی ہیں جنہوں نے ان کی سیر' اخبار اور مراحل حیات کا ایک بہت بڑا حصہ ضائع کر دیا' ان کی سوانح حیات اور تاریخ مکمل نہ ہوئی۔ ہاں البتہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کے چند مشہور اور آسان احوال و اخبار کو محفوظ کیا۔ اگر کسی نبی کی احوال و اخبار کے حوالے سے کماحقہ مکمل پاسداری کی گئی ہے تو وہ اعزاز نبی آخرالزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے اور جو ہمیں سیدنا مسیح علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کی حیات مبارکہ کے اقتباسات سے معلوم ہیں' وہ آپ علیہ السلام کے آخری تین سالوں کے احوال ہیں۔ یہاں بڑے بڑے اہل علم وادب ہو گزرے جو تہذیب و تمدن کے حامل شہروں میں مقیم تھے اور اولوالعزم رسل بھی ہو گزرے' لیکن محض ان کے نام ہی باقی ہیں' احوال و اخبار اتنے کم ہیں جو کسی طالب کی تسلی کر سکتے ہیں نہ پیاسے کی پیاس بجھا سکتے ہیں' لوگوں کی قیادت کر سکتے ہیں نہ رستے کو واضح کرنے کے اہل ہیں۔

غلط فہمی سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے

یہ اس حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح فہم ہے لیکن بعض نے تنگ نظری' غلط فہمی اور بدگمانی کا مسلمانوں کو نشانہ بنایا کہ اس حدیث سے انبیاء کی طرف منسوب آثار سے تبرک کی حرمت ثابت ہے' خصوصاً ان آثار معلومہ کے ساتھ جو سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہیں۔ پھر اس مریض کی ذہن میں اس امر کا تصور آتا ہے کہ تبرک قبور کے گرد طواف کرنے کا نام ہے تاکہ برکتیں حاصل ہوں' حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں جن کی تعظیم کا حکم دیا گیا ہے اور یہ اس باب میں داخل ہے۔ جیسا کہ اس مریض کا کہنا ہے یہ تبرک صریح شرک تک پہنچا دیتا ہے یعنی قبور کے لیے ذبح کرنا' ان کا طواف کرنا' اللہ کے سوا ان کی عبادت اور ان سے

استغاثہ کرنا اور ان کے نافع وضار ہونے کا اعتقاد رکھنا۔ پھر تم اس کو دیکھنا کہ وہ احادیث پیش کرے گا جو کفار اور بت پرستوں کے حق میں وارد ہوئیں اور انہیں ان توحید پرست مسلمانوں پر چسپاں کرے گا جو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی طرف منسوب آثار کے ساتھ تبرک کے قائل ہیں۔ نہ کہ ان کی عبادت مقصود ہوتی ہے۔ بہرحال عبادت اللہ تعالیٰ کی ہی ہے اور اسی کی طرف ہی توجہ مبذول ہے، محض اس ہستی کا وسیلہ درکار ہے جس کی طرف منسوب چیز کو اللہ کی بارگاہ میں شرف حاصل ہے اور وہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہے۔ مثال کے طور پر ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جس کو ابن وضاح نے مروان بن سوید الاسدی سے روایت کیا ہے کہ میں امیرالمومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مکہ سے مدینہ جانے کے لیے نکلا۔ جب صبح ہوئی تو آپ نے ہمیں صبح کی نماز پڑھائی، پھر دیکھا کہ لوگ ایک طرف جا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کہاں جا رہے ہیں؟ جواب ملا کہ اے امیرالمومنین! ایک مسجد ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی، اس لیے وہ بھی وہاں نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: تم سے پہلی امتیں بھی اسی طرح ہلاک ہوئیں۔ وہ بھی اپنے اپنے انبیاء کے آثار کو تلاش کرتے تھے اور وہاں انہوں نے گرجے اور کنیسے بنالیے، لہٰذا جس کو اس مسجد میں نماز کا وقت آگیا وہ پڑھ لے، اور جس کو نماز کا وقت نہیں آیا وہ گزر جائے اور اس کا اعتماد نہ کرے۔ اسی طرح معرور بن سوید سے بھی مروی ہے۔

(التبرک المشروع والتبرک الممنوع از علی بن نفیع علیانی)

حدیث شد رحال

صحیح بخاری کتاب و باب "فضل الصلاۃ فی مسجد مکہ والمدینہ" میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَۃِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامُ، وَمَسْجِدُ الرَّسُوْلِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، وَمَسْجِدُ الْاَقْصٰی۔

رخت سفر نہ باندھا جائے مگر ان تین مساجد کی طرف: مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔

بیشتر لوگوں نے اس حدیث کے سمجھنے میں خطا کی ہے:

لا تشد الرحال الا الی ثلثۃ مساجد: المسجد الحرام ومسجدی ھذا، والمسجد الاقصی۔

ان تین مساجد کے علاوہ سامان سفر نہ باندھا جائے: مسجد حرام، یہ میری مسجد اور مسجد اقصیٰ۔

وہ اس حدیث کے ساتھ زیارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سفر کرنے کی حرمت پر استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سفر گناہ ہے حالانکہ یہ استدلال مردود ہے کیونکہ اس کا دارومدار ان کی غلط سوچ پر ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

شیخ الاسلام فیروز آبادی فرماتے ہیں کہ "لا تشد الرحال الا الی ثلثہ مساجد" والی حدیث میں زیارت کی نفی پر دلالت نہیں بلکہ وہ تو اس باب میں حجت ہے اور جس نے اس کو حرمت زیارت پر دلیل بنایا ہے اس نے اللہ و رسول کے خلاف بڑی جرات کا مظاہرہ کیا ہے، حالانکہ یہ حدیث ایسے قائل کی غباوت پر برہان قاطع ہے اور اس کے کیفیت استنباط و استدلال کے درجہ سے ناواقف ہونے کی واضح دلیل ہے۔ (الصلات والبشر: ۱۲۷)

ہم کہتے ہیں کہ حدیث کا ورود کسی اور مقصد کے لیے ہے جبکہ مستدل کا مقصد اور ہے۔

حدیث سفر کا صحیح مفہوم

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "لا تشد الرحال الا الی ثلثہ مساجد" استثناء کے اس اسلوب پر مبنی ہے جو اہل لغت کے ہاں مشہور ہے۔ یہ

استثناء مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ کے وجود کا تقاضا کرتا ہے۔ مستثنیٰ وہ ہے جو "الا" کے بعد ہو اور مستثنیٰ منہ "الا" سے پہلے اور مستثنیٰ منہ کبھی مذکور ہوتا ہے اور کبھی محذوف۔ یہ مشہور ضابطہ کتب نحو میں موجود ہے۔

جب ہم اس مبارک حدیث کو بنظر غور دیکھتے ہیں تو اس میں مستثنیٰ کا ذکر تو واضح ملتا ہے جو "ثلثة مساجد" ہے اور "الا" کے بعد ہے، جبکہ مستثنیٰ منہ مذکور نہیں جو "الا" سے پہلے ہوتا ہے، لہٰذا ضروری امر ہے کہ وہ مقدر ہو۔

فرض کریں کہ مستثنیٰ منہ "قبر" ہے تو یہ لفظ مقدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو گا اور تقدیر عبارت یوں ہو گی: "لا تشد الرحال الی قبر الا الی ثلاثة مساجد۔" تو اس کلام کا غیر منظم اور بلاغت نبویہ کے لائق نہ ہونا ظاہر ہے، کیونکہ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کے ضمن میں داخل نہیں ہے جبکہ اصول یہ ہے کہ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہوتا ہے۔ تو اس لفظ مقدر سے کسی عالم کا دل مطمئن نہیں ہوتا اور دل میں یہ اضطراب پیدا ہوتا ہے کہ مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نہ ہو گا اور یہ لفظ مقدر "قبر" استثناء کی حقیقت کے ساتھ متفق نہیں اور نہ ہی یہ مستثنیٰ منہ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہ لفظ مقدر "مکان" ہے تو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی مبارک حدیث کی تقدیر عبارت یوں ہو گی: "لا تشد الرحال الی مکان الا الی ثلاثة مساجد۔" تو اس فرض پر معنی یہ معلوم ہو گا کہ تجارت، علم یا کسی اور بھلائی کے لیے سفر کرنا حرام ہے لہٰذا اس کا باطل ہونا ظاہر ہے۔

دیکھیں یہاں حدیث میں صرف مستثنیٰ کا ذکر ہے اور مستثنیٰ منہ مذکور نہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ مستثنیٰ منہ وہ مقدر مانیں جس پر اہل لغت کا اتفاق ہو۔ اور اس کی تقدیر کے صرف تین احتمال ہیں، جو ذیل میں درج ہیں:

(۱) لفظ مقدر "قبر" ہو تو تقدیر عبارت یوں ہو گی: "لا تشد الرحال الی قبر

الاالی ثلاثة مساجد۔" اس تقدیر کا دارومدار اس شخص کی رائے پر ہے جو اس حدیث سے قبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے سفر کی ممانعت پر استدلال کرتا ہے' حالانکہ یہ تقدیر اتنی غیر مناسب ہے کہ اس کو ادب عربی سے ادنیٰ سا تعلق رکھنے والا شخص بھی جائز نہیں سمجھتا اور نہ ہی ایسا کلام اس مقدس ہستی کے شایان شان ہے جو فصاحت و بلاغت میں بے مثل ہے۔ صلوات اللہ و سلامہ علیہ' حاشاو کلا یہ گیا گزرا اسلوب کلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں ہو گا۔

(۲) حدیث میں مستثنیٰ منہ کی تقدیر لفظ عام کے ساتھ ہو اور وہ لفظ "مکان" ہے تو یہ باطل ہے' اس پر کلام پہلے گزر گیا ہے۔ اس کے باطل ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۳) حدیث میں جو مستثنیٰ منہ مقدر ہے وہ لفظ "مسجد" ہے' اور سیاق حدیث یوں ہے: "لاتشد الرحال الی مسجد الاالی ثلاثة مساجد۔"

اس تقدیر سے اسلوب کلام منظم اور فصیح لغوی طریقے کے مطابق نظر آتا ہے' اور پہلی دونوں صورتوں میں پائی جانے والی کمزوری بھی اس میں نہیں ملتی۔ اس اسلوب میں بوئے نبوت بھی مہکتی ہے اور اس کلام کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے سے متقی دل مطمئن ہوتا ہے۔

یاد رہے کہ سب احتمالات اس صورت میں ہیں' جب کوئی اور روایت ایسی نہ ملے جس میں مستثنیٰ منہ کی تصریح ہو' لیکن جب ایسی روایت مل جائے تو کسی دیندار شخص کے لیے روا نہیں کہ وہ اس سے عدول کرکے محض فرضی احتمال کو اپنائے' چہ جائیکہ وہ صورت فصیح لغت کی بھی حامل نہ ہو۔

بحمدہ تعالیٰ سنت نبویہ میں بیشتر معتبر روایات ہمیں ایسی ملتی ہیں جن میں مستثنیٰ منہ کی تصریح ہے۔ ذیل میں ایسی چند احادیث ہدیہ قارئین کی جاتی ہیں۔

(۱) امام احمد نے شہر بن حوشب کے طریق سے نقل کیا ہے کہ ابو سعید کے پاس صلو

ۃ فی الطور کاذکر ہوا' تو میں نے ان کو فرماتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُصَلِّیْ اَنْ یَّشُدَّ رِحَالَهٗ اِلٰی مَسْجِدٍ یَبْتَغِیْ فِیْهِ الصَّلٰوۃَ غَیْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَ مَسْجِدِیْ۔

کسی نمازی کو جائز نہیں کہ وہ فضیلت نماز کے لیے کسی اور مسجد کا رخ کرے سوا مسجد حرام' مسجد اقصیٰ اور میری مسجد کے۔ (فتح الباری: ۳/ ۸۴' فصل الصلاۃ فی مسجد مکہ والمدینہ)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ شہر بن حوشب حسن الحدیث ہے' اگرچہ اس میں کچھ ضعف ہے۔

(۲) یہی روایت بالفاظ دیگر (مسند امام احمد: ۳/ ۶۴) میں یوں ہے:

لَا یَنْبَغِیْ لِلْمَطِیِّ اَنْ تُشَدَّ رِحَالُهٗ اِلٰی مَسْجِدٍ یَبْتَغِیْ فِیْهِ الصَّلٰوۃَ غَیْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَ مَسْجِدِیْ هٰذَا۔

کسی کے لیے روا نہیں کہ وہ فضیلت نماز کی تلاش میں کسی مسجد کی طرف رخت سفر باندھے' سوا مسجد حرام' مسجد اقصیٰ اور میری مسجد کے۔

(۳) ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَنَا خَاتَمُ الْاَنْبِیَاءِ وَمَسْجِدِیْ خَاتَمُ مَسَاجِدِ الْاَنْبِیَاءِ صَلَاۃٌ فِیْ مَسْجِدِیْ اَفْضَلُ مِنْ اَلْفِ صَلَاۃٍ فِیْمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَسَاجِدِ اِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ۔ (رواہ البزار)

میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد انبیاء کی آخری مسجد ہے' میری مسجد میں نماز دیگر مساجد میں ہزار نماز سے افضل ہے' سوا مسجد حرام کے۔

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مساجد کے بارے یہ فرمانا' امت کو یہ واضح کرنے کے لیے ہے کہ ان تین مساجد کے علاوہ تمام فضیلت میں مساوی ہیں۔ کسی ایک کی طرف سفر کی مشقت اٹھانے میں کوئی فائدہ نہیں۔ بہرحال مذکورہ مساجد کو مزید فضیلت حاصل ہے۔ اس مبارک حدیث میں قبور کو کوئی مداخلت نہیں' لہٰذا اس کا خواہ مخواہ اعتبار کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء باندھنے کے مترادف ہے۔

حدیث سفر اور ائمہ حدیث

بڑے بڑے اجلہ محدثین اور حفاظ نے اس حدیث کی شرح کی ہے "لا تشد الرحال" اور اس کا وہی معنی بیان کیا ہے جو ہم نے پہلے ذکر کیا اور یہ حدیث زیارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سفر کرنے کی ممانعت پر دلالت نہیں کرتی اور بعض کا قول یہ ہے کہ حدیث کسی مخصوص مسجد میں نماز کی نذر ماننے کے متعلق ہے۔ ذیل میں چند ائمہ کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں:

۱- حافظ ابن حجر عسقلانی

امام حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ بعض محققین کا کہنا ہے:
حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا فرمان "الا الی ثلاثۃ مساجد۔" اس میں مستثنیٰ منہ محذوف ہے اور وہ لفظ مقدر عام ہو گا یا اس سے اخص' پہلی صورت میں تقدیر یہ ہو گی:
"لا تشد الرحال الی مکان فی ای امر کان الا الی الثلاثۃ۔" اس کا تو کوئی مفہوم نہیں کیونکہ اس سے تو تجارت' صلہ رحمی اور طلب علم وغیرہ کے لیے سفر کرنے کا بھی دروازہ بند ہو گیا' لہٰذا دوسری تقدیر کا تعین ہوا۔ اب بہتر یہی ہے کہ لفظ مقدر وہ ہو جو سیاق حدیث کے زیادہ مناسب ہو اور وہ "لا تشد الرحال الی مسجد للصلاہ فیہ الا الی الثلاثۃ" ہے۔ تو اس سے قبر نبوی اور قبور اولیاء کی زیارت کے لیے سفر کی ممانعت کا قول باطل ہو جاتا ہے۔" واللہ اعلم

بالصواب۔" (فتح الباری شرح صحیح البخاری: ۳/ ۸۵)

۲- امام محمد بن یوسف کرمانی

امام محمد بن یوسف کرمانی نے "شرح صحیح البخاری" میں بھی یہی معنی ذکر کیا ہے اور اپنے علاوہ دیگران ائمہ کا کلام نقل کیا ہے جو اس معنی کی تائید کرتے ہیں مثلاً علامہ خطابی اور امام نووی وغیرہ۔ (شرح الکرمانی علی البخاری: ۷/ ۱۲)

۳- امام بدر الدین عینی

امام بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی نے بھی (صحیح بخاری کی شرح عمدۃ القاری: ۷/ ۲۶۵) اس معنی کی تائید کی ہے۔

بہرحال تقدیرِ عموم یعنی "لا تشد الرحال الی مکان الا الی المساجد الثلاثۃ" کا صریح بطلان گزر چکا ہے۔

۴- علامہ سبکی

علامہ سبکی شفاء السقام: ص۱۱۹-۱۲۱ میں فرماتے ہیں:

سفر میں دو امر ملحوظ ہوتے ہیں:

(۱) کوئی غرض یا ضرورت باعث سفر ہو جیسے طلب علم اور زیارت والدین وغیرہ، تو یہ بالاتفاق جائز ہے۔

(۲) وہ جگہ جو سفر کی انتہا ہو جیسے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ یا بیت المقدس کی طرف سفر، اور حدیث اسی کو شامل ہے زیارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سفر کرنے والا حدیث میں قطعاً داخل نہیں۔ لامحالہ وہ پہلی قسم میں داخل ہے جو بالاتفاق جائز ہے۔

پھر سفر کی ممانعت دو امور سے مشروط ہے:

(۱) غرضِ سفر مساجد ثلاثہ کی رویت کے علاوہ ہو۔

(۲) سفر کی علت قطعہ زمین کی تعظیم ہو۔

زیارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سفر کی غرض تینوں مساجد میں سے ایک مسجد ہے' اور اس سفر کی علت قطعہ زمین کی تعظیم نہیں بلکہ اس بقعہ مبارکہ کے ساکن کی تعظیم ہے' تو پھر اس مبارک سفر کی ممانعت کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ میں (سبکی) کہتا ہوں کہ سفر مطلوب کے دو سبب ہیں:

(۱) غرض سفر مساجد ثلاثہ میں سے ایک مسجد ہو۔

(۲) سفر اللہ کی عبادت کے لیے ہو اگرچہ مسجد ثلاثہ کے علاوہ کسی اور طرف ہی ہو۔

مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے سفر میں یہ دونوں سبب پائے جاتے ہیں' اس لیے یہ طلب کا اعلیٰ درجہ ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور سفر میں کوئی ایک سبب پایا جائے گا' دونوں یکجا نہیں ہوں گے۔

اگر سفر کی غرض و غایت مساجد ثلاثہ میں کسی ایک کی طرف ہو تو یقیناً وہ نیک نیتی کی بنا پر قربت اور نیکی ہوگی۔

بہرحال وہ سفر جو ان تین مقامات کے علاوہ کسی اور جگہ کی تعظیم کے لیے ہو تو اس بارے میں یہ حدیث وارد ہے "لا تشد الرحال..." جیسا کہ ایک ... مروی ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ میرا کوہ طور پر جانے کا ارادہ ہے تو آپ نے فرمایا:

"سامان سفر نہیں باندھا جاتا مگر تین مساجد کی طرف' مسجد حرام' مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ' لہٰذا طور کو رہنے دو' وہاں نہ جاؤ۔" (شفاء السقام)

۵- امام ابن بطال

بعض علماء کی رائے ہے کہ یہ حدیث کسی مخصوص مسجد میں نماز کی نذر ماننے کے متعلق ہے۔ نیز امام ابن بطال فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس شخص کے بارے میں ہے جس نے مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی اور مسجد میں نماز پڑھنے کی نذر مانی۔

۶- امام خطابی

امام ابو سلیمان خطابی "معالم السنن" میں فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث نذر کے بارے میں ہے۔ ایک انسان کسی مسجد میں نماز پڑھنے کی نذر مانتا ہے تو اسے اختیار ہے چاہے وہ نذر پوری کرے یعنی اس مسجد میں نماز ادا کرے' چاہے کہیں اور کسی مسجد میں نماز پڑھ لے' بخلاف ان تین مساجد کے۔ کیونکہ اگر کسی شخص نے ان مساجد ثلاثہ میں سے کسی ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس نذر کا پورا کرنا اس پر واجب ہو گا۔ ان مساجد کو یہ تخصیص حاصل ہے کیونکہ یہ انبیاء علیہم السلام کی مساجد ہیں اور ہمیں ان کی اقتدا کا حکم دیا گیا ہے۔" (معالم السنن: ۲/ ۴۴۳)

یہ ایک ضابطہ اور اصول ہے کہ نذر صرف طاعت میں ہی واجب ہوتی ہے تو حدیث کا معنی یہ ہوا کہ جس نے ان تین مساجد میں سے کسی ایک میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس کا پورا کرنا اس پر واجب ہے اور جس نے ان مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی مسجد میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس نذر کا پورا کرنا اس پر واجب نہیں۔

۷- امام نووی

امام نووی فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی مسجد کی طرف جانے کی نذر مانی تو ہمارے نزدیک یہ نذر منعقد نہیں ہوگی اور نہ ہی کفارہ لازم آئے گا۔ امام مالک ابو حنیفہ' احمد اور جمہور علماء کا یہی فتویٰ ہے' البتہ امام احمد سے ایک روایت منقول ہے کہ ایسے شخص پر قسم کا کفارہ لازم ہو گا۔ امام محمد بن مسلمہ مالکی فرماتے ہیں کہ جب کسی نے مسجد قبا کے ارادے سے نذر مانی تو وہ اسے لازم ہوگی' اس لیے کہ صحیحین میں مشہور حدیث ہے:

اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَاْتِيْ قُبَاءً كُلَّ سَبْتٍ	بے شک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہفتہ کو مسجد قباء میں سواری پر یا پیدل

رَاكِبًا وَمَاشِيًا۔ تشریف لے جایا کرتے تھے۔

(المجموع شرح المذہب: ۴۷۱/۸)

امام ابن بطال کا فتویٰ

امام ابن بطال فرماتے ہیں کہ جس نے اولیاء اللہ کی مساجد میں نماز پڑھنے اور ان کے ساتھ تبرک حاصل کرنے کا ارادہ نفلی طور پر کیا تو یہ مباح ہو گا' اگرچہ اس میں قصد اسفرہی ہو۔ اس مذکورہ حدیث کا مفہوم اسے کچھ مضر نہیں۔

امام نووی کا فتویٰ

امام نووی شرح صحیح مسلم میں فرماتے ہیں: ہمارے اصحاب کے نزدیک صحیح یہی ہے جو امام الحرمین اور محققین ائمہ نے اختیار کیا کہ یہ سفر نہ حرام ہے اور نہ ہی مکروہ البتہ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس حدیث کی مراد یہ ہے کہ سامان سفر باندھنا انہی تین مساجد کی طرف خاص ہے اور یہی کامل فضیلت ہے۔ واللہ اعلم۔

(شرح صحیح مسلم: ۹/ ۱۰۶)

امام نووی دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: اس مبارک حدیث میں ان مساجد ثلاثہ اور ان کی طرف رخت سفر باندھنے کی فضیلت ہے' کیونکہ جمہور علماء کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف سفر کرنے میں کوئی فضیلت نہیں۔ شیخ ابو محمد الجوینی فرماتے ہیں: کچھ ہمارے اصحاب ان کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف سامان سفر باندھنے کو حرام قرار دیتے ہیں' جو کہ غلط ہے۔

(شرح صحیح مسلم للنووی: ۹/ ۱۶۸)

امام ابن قدامہ مقدسی

شیخ امام ابو محمد بن قدامہ مقدسی فرماتے ہیں: اگر کسی نے قبور و مشاہد کی زیارت کے لیے سفر کیا' تو اس کے بارے میں امام ابن عقیل حنبلی فرماتے ہیں کہ اس شخص کے

لیے قصر کی رخصت نہیں کیونکہ ان (قبور و مشاہد) کی طرف سفر کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد۔ تین مساجد کے علاوہ کسی کی طرف سامان سفر نہ باندھا جائے۔

لیکن صحیح قول یہ ہے کہ یہ سفر جائز ہے اور اس میں قصر کی رخصت بھی ہوگی کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قبا میں سواری پر اور پیدل تشریف لے جایا کرتے تھے اور قبور کی زیارت بھی فرماتے تھے۔ نیز حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا:

زوروھا تذکرکم الاخرۃ۔ تم قبور کی زیارت کیا کرو، یہ تمہیں آخرت یاد دلاتی ہیں۔

بہرحال حضور علیہ الصلوۃ والتسلیمات کا یہ فرمان عالیشان: "لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد" صرف فضیلت کی نفی پر محمول ہوگا نہ کہ تحریم پر۔ اور جواز قصر میں فضیلت شرط نہیں، لہٰذا فضیلت کی نفی قصر کو مضر نہیں ہوگی۔

(المغنی: ۳/ ۱۰۳-۱۰۴)

حدیث کے نذر پر محمول ہونے کی تائید

اس حدیث کو نذر کے ساتھ خاص کرنے کی تائید درج ذیل دلائل سے ہوتی ہے:

(ا) اس حدیث کی سند صحیح ہے اور اس کے رجال صحیح مسلم کے رجال ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ خَيْرَ مَا رُكِبَتْ اِلَيْهِ الرَّوَاحِلُ مَسْجِدِیْ هٰذَا وَالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ۔ بے شک جس کی طرف کجاوے کس کے سفر کرنا سب سے بہتر ہے، وہ یہ میری مسجد اور بیت اللہ شریف ہے۔

یہ حدیث اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ ان کے علاوہ دیگر مقامات کی طرف سامان سفر باندھنا بھی جائز ہے۔

(۲) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے بھی اس حدیث کا یہی مفہوم لیا کہ مساجد ثلاثہ کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف سفر کرنا بھی جائز ہے جبکہ امام عمر بن شبہ نے "تاریخ المدینہ" میں عبدالصمد بن عبدالوارث کے طریق سے روایت کیا ہے کہ ہم سے محمد ابن جویریہ نے بیان کیا کہ عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے:

سَمِعْتُ اَبِیْ یَقُوْلُ: لِاَنْ اُصَلِّیَ فِیْ مَسْجِدِ قُبَاءَ رَکْعَتَیْنِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اٰتِیَ بَیْتَ الْمَقْدِسِ مَرَّتَیْنِ، لَوْ یَعْلَمُوْنَ مَا فِیْ قُبَاءَ لَضَرَبُوْا اِلَیْہِ اَکْبَادَ الْاِبِلِ۔	میں نے اپنے باپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مسجد قبا میں دو رکعت نماز پڑھنا مجھے بیت المقدس دو مرتبہ آنے سے زیادہ پسند اور محبوب ہے۔ اگر لوگ مسجد قبا کی فضیلت اور اس میں برکت و ثواب سے واقف ہوتے تو اپنے اونٹوں کو اسی کی طرف دوڑاتے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "واسنادہ صحیح" اس کی سند صحیح ہے۔ (فتح الباری: ۳/ ۶۹)

ابن ابی شیبہ نے بھی (المصنف: ۲/ ۳۷۳) میں اس طرح روایت کیا ہے۔

اور علامہ عبدالرزاق نے (المصنف: ۵/ ۱۳۳) میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ

(۳) لو کان مسجد قباء فی افق من الافاق لضربنا الیہ اکباد المطی۔	اگر مسجد قبا کسی افق پر بھی ہوتی تو ہم اس کی طرف اپنی سواریاں دوڑا دیتے۔

جبکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خود "لا تشد الرحال" والی حدیث کے

راوی ہیں۔ اگر انہوں نے یہ سمجھا ہوتا کہ حدیث میں سفر کی ممانعت تحریم پر محمول ہے تو یقیناً وہ مسجد قبا کے بارے میں یہ بات نہ فرماتے۔

(۴) امام احمد نے (مسند: ۶ / ۳۹۷) اور امام طبرانی نے (المعجم الکبیر: ۲ / ۳۱۰) میں مرثد بن عبداللہ الیزنی کی حدیث کو روایت کیا ہے کہ ابو بصرہ غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

لقيت ابا هريرة وهو يسير الى مسجد الطور ليصلى فيه قال: فقلت له: لو ادركتك قبل ان ترتحل ما ارتحلت' قال: فقال: ولم؟ قال: فقلت: انى سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا تشد الرحال الا الى ثلاثه مساجد: المسجد الحرام والمسجد الاقصى ومسجدى۔	میری ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی اور وہ مسجد طور میں نماز پڑھنے کے لیے جا رہے تھے' میں نے آپ سے کہا' اگر میں آپ کو روانہ ہونے سے پہلے ملتا تو آپ یہ سفر نہ کرتے' تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ کیوں؟ تو میں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ان تین مساجد کے علاوہ کسی کی طرف سامان سفر نہ باندھا جائے: مسجد حرام مسجد اقصیٰ اور میری مسجد۔

اس کے باوجود حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ واپس نہیں لوٹے' اگر آپ رضی اللہ عنہ حدیث سے تحریم سمجھتے تو کبھی آپ ایسا نہ کرتے۔ آپ کا یہ فعل اس بات کی دلیل ہے کہ حدیث میں مذکور نہی تحریم کا فائدہ نہیں دیتی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہی ہے۔

حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو مولف کی "شفاء الفوائد" اور شیخ محمود سعید ممدوح کی "رفع المنارۃ لتخریج احادیث التوسل والزیارۃ۔"(۱)

(۱) ان دونوں کتب کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ (محمد خان قادری)

مسئلہ شد رحال اور اکابر محدثین

ہندوستان میں اہلسنّت و جماعت کے اکابر محدثین سے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے رخت سفر باندھنے کے بارے میں دریافت کیا گیا' تو انہوں نے نہایت پختہ اور مفید جواب دیا۔ یہاں ہم اس سوال اور جواب کی عبارت کا ترجمہ نقل کرتے ہیں جو کتاب "المفند علی المھند" میں منقول ہے۔ اور اس کے آخر میں علماء کے اسماء بھی مذکور ہیں۔

استفسار: حضور سید کائنات علیہ افضل الصلوت والتحیات وعلی آلہ وصحبہ کی زیارت کے لیے سامان سفر باندھنے کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

زائر کے لیے کیا ضروری ہے' جو امر آپ کو زیادہ پسند اور آپ کے اکابر کے نزدیک بھی افضل ہو؟

کیا روانگی کے وقت وہ زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت کرے یا مسجد نبوی کی یا دونوں کی؟

کسی نے کہا ہے کہ مدینہ کی جانب سفر کرنے والا صرف مسجد نبوی کی نیت کرے؟

جواب: بسم اللہ الرحمن الرحیم' ومنہ نستمد العون والتوفیق وبیدہ ازمہ التحقیق حامدا ومصلیا ومسلما۔

ہمارے اور ہمارے مشائخ کے نزدیک جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم---روحی فداہ---کی قبرانور کی زیارت ایک عظیم قربت اور نیکی ہے اور بہت بڑا ثواب ہے۔ یہ حصول درجات کا ایک اہم ذریعہ ہی نہیں بلکہ واجبات کے قریب تر ہے۔ اگرچہ اس کا حصول سامان سفر باندھنے اور مال و دولت کے خرچ کرنے سے ہوتا ہے۔ زائر بوقت روانگی حضور علیہ الف الف تحیتہ وسلام کی زیارت باسعادت کی نیت

کرے' اور اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی مسجد شریف اور دیگر مقامات اور مشاہد شریفہ کی بھی نیت کرلے بلکہ اولیٰ و افضل یہی ہے کہ جو علامہ ابن ہمام نے فرمایا کہ زائر محض حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی قبر انور کی زیارت کی نیت کرے' اور جب آئے گا تو اسے مسجد نبوی کی زیارت بھی نصیب ہو جائے گی' کیونکہ اس میں حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ عظمت و جلالت کا پہلو ہے اور آپ ﷺ کے اس فرمان عالیشان کے موافق بھی ہے:

من جاء نی زائرا لا تحمله حاجة الازیارتی کان حقا علی ان اکون شفیعا له یوم القیامة:	جو شخص زیارت کی نیت سے میرے پاس آئے اور میری زیارت کے علاوہ اسے کوئی اور مقصد ملحوظ نہ ہو' تو مجھ پر حق ہے کہ میں بروز قیامت اس کیلئے شفیع بنوں۔

اور اسی طرح عارف سامی ملا جامی رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے زیارت کو حج سے علیحدہ ٹھہرایا اور اہل محبت و ذوق کے مذہب کے یہی قریب تر ہے۔

اور مخالفین جو کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ علی ساکنہا الف الف تحیتہ کا مسافر فقط مسجد نبوی کی نیت کرے' ان کی دلیل حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا یہ فرمان ہے: "لا تشد الرحال الاالی ثلاثة مساجد" حالانکہ اس سے ان کا استدلال مردود ہے' کیونکہ حدیث ممانعت پر قطعاً دلالت نہیں کرتی' بلکہ اگر زیرک اور دانا شخص اس پر غور کرے' تو اسے معلوم ہو کہ یہ حدیث دلالت نص کے ساتھ جواز پر رہنمائی کرتی ہے' کیونکہ جس سبب سے مساجد ثلاثہ جمیع مساجد یا زمین سے مستثنیٰ ہیں' وہ ان کی فضیلت ہے جو ان کے ساتھ مختص ہے۔ اور یہی علت روضہ اطہر میں بھی موجود ہے' اس لیے کہ زمین کا وہ مبارک اور مقدس حصہ جو اعضائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ متصل ہے' وہ سب سے افضل ہے حتیٰ کہ کعبہ اور کرسی سے بھی بالاتفاق افضل ہے' جیسا کہ ہمارے فقہاء رحمتہ اللہ علیہم نے تصریح فرمائی ہے جب مساجد ثلاثہ

کو اس خاص فضیلت کی وجہ سے مستثنیٰ کیا گیا تو پھر اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ و افضل ہو گا کہ اس فضیلت عامہ کے سبب بقعہ مبارکہ کو ماوراء سے مستثنیٰ کیا جائے۔ اس مسئلہ کی خوب وضاحت علامہ مولانا رشید احمد گنگوہی نے اپنے رسالہ "زبدہ المناسک فی فضل زیارہ المدینہ المنورہ" میں کی ہے۔ یہ رسالہ متعدد بار شائع ہو چکا ہے اور اسی بحث میں شیخ المشائخ مولانا مفتی صدر الدین دہلوی قدس سرہ العزیز کا ایک رسالہ ہے جس کا نام "احسن المقال فی حدیث لاتشد الرحال" ہے، اس کو انہوں نے ایسے براہین قاطعہ اور دلائل ساطعہ کے ساتھ مزین کیا ہے کہ مخالفین و معارضین پر قیامت کبریٰ برپا کر دی ہے۔ یہ رسالہ بھی شائع ہو چکا ہے اور شہرت بھی حاصل کر چکا ہے، لہٰذا اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ واللہ تعالی اعلم۔

اصحاب فتویٰ اور مویدین کے اسمائے گرامی

١- علامہ رشید احمد گنگوہی۔
٢- علامہ شیخ خلیل احمد سہارنپوری۔
٣- علامہ شیخ محمود الحسن دیوبندی۔
٤- علامہ شیخ میر احمد حسین الحسینی۔
٥- علامہ شیخ عزیز الرحمٰن دیوبندی۔
٦- علامہ شیخ اشرف علی تھانوی۔
٧- علامہ شیخ شاہ عبد الرحیم رامپوری۔
٨- شیخ حاجی حکیم محمد حسن دیوبندی۔
٩- مولوی قدرت اللہ۔
١٠- مولوی مفتی کفایت اللہ۔
١١- علامہ شیخ محمد یحییٰ سہارنپوری۔

فتویٰ ہذا اور علمائے مکہ مکرمہ

مکہ مکرمہ کے تمام اکابر علماء و فقہا نے اس فتویٰ کی تائید کی ہے جن میں سے چند شیوخ کے نام سر فہرست ہیں:

۱- علامہ شیخ محمد سعید محمد باصیل، مفتی شافعیہ، جو مکہ مکرمہ کے علماء کے سرتاج اور مسجد حرام کے امام اور خطیب ہیں۔

۲- شیخ احمد رشید خاں نواب۔

۳- شیخ علامہ فقیہ مفتی عابد بن حسین مالکی، مفتی مالکیہ مکہ مکرمہ میں۔

۴- شیخ علامہ محقق محمد علی بن حسین مالکی، جو مسجد حرام میں امام اور مدرس ہیں۔

علمائے مدینہ منورہ کی تائید

علمائے مدینہ منورہ نے بھی اس فتویٰ کی خوب تائید کی ہے، جن میں چند ایک کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱- علامہ فقیہ سید احمد بن اسماعیل برزنجی۔

۲- شیخ احمد الجزائری، جو حرم نبوی میں شیخ مالکیہ کے عرف سے مشہور ہیں۔

۳- سید محمد زکی برزنجی۔

۴- شیخ عمر حمدان محرسی مشہور محدث ہیں۔

۵- شریف احمد بن مامون بلغیثی۔

۶- شیخ موسیٰ کاظم۔

۷- شیخ ملا محمد خان۔

۸- شیخ خلیل بن ابراہیم۔

۹- شیخ محمد عزیز وزیر تونسی۔

۱۰- شیخ محمد سوسی خیاری۔

۱۱- الحاج احمد بن محمد خیر شقیلی۔

۱۲- شیخ محمد بن عمر فلانی۔

۱۳- شیخ احمد بن احمد اسعد۔

۱۴- شیخ محمد منصور بن نعمان۔

۱۵- شیخ احمد بساطی۔

۱۶- شیخ محمد حسن سندی۔

۱۷- شیخ محمود عبد الجواد۔

علماء ازہر کی تائید

اس فتویٰ کی تائید کرنے والے شیخ الازہر شیخ سلیم بشری اور شیخ محمد ابراہیم قایاتی کا نام قابل ذکر ہے۔

علماء شام کی تائید

شام کے علماء مویدین کے اسماء درج ذیل ہیں:

۱- صاحب فتاویٰ شیخ فقیہ محدث محمد ابو الخیر حفید ابن عابدین المعروف ابن عابدین حسینی۔

۲- شیخ مصطفیٰ بن احمد شطی حنبلی۔

۳- شیخ محمود رشید عطار دمشقی۔ جو شام کے عظیم محدث اور شیخ بدر الدین کے شاگرد ہیں۔

۴- شیخ محمد بوشی حموی۔

۵- شیخ محمد سعید حموی۔

۶- شیخ علی بن محمد دلال حموی۔

۷- شیخ محمد ادیب حورانی، جو موضع حما کے جامعہ سلطان میں مدرس ہیں۔

۸- شیخ عبد القادر لبابیدی۔
۹- شیخ محمد سعید لطفی حنفی۔
۱۰- شیخ فارس ابن احمد شقفہ۔
۱۱- شیخ مصطفیٰ حداد حموی۔ (المفند علی المفند، طبع ہند)

سفر زیارت کی حقیقت

مسئلہ زیارت ایک فقہی مسئلہ ہے اور احکام شرعیہ یعنی حلال، حرام، مکروہ اور مندوب اس کے ساتھ متعلق ہیں۔ اس کا حدیث "لا تشد الرحال" سے کوئی علاقہ نہیں اور نہ ہی یہ عقائد کے باب سے ہے۔

بعض شرپسند حضرات نے اس کو بھی اعتقادی مسئلہ بنایا جیسے انہوں نے توسل بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلہ کو عقیدہ توحید میں شامل کیا اور اس پر شرک، کفر اور ملت سے بغاوت کا حکم ٹھونس دیا (اللہ تعالیٰ ان کو صراط مستقیم کی ہدایت دے) باوجودیکہ شیخ محمد بن عبد الواہاب نے اپنے "رسائل" میں یہ واضح کیا ہے کہ مسئلہ توسل ایک فقہی مسئلہ ہے۔

شیخ ابن عبد الوہاب کا کہنا ہے کہ "بعض علماء توسل بالصالحین کی رخصت دیتے ہیں اور بعض اس کو نبی کریم ﷺ سے خاص کرتے ہیں۔ لیکن اکثر علماء اس سے منع کرتے ہیں اور اس کو مکروہ سمجھتے ہیں، لہٰذا اس مسئلہ کا تعلق مسائل فقہ سے ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک جمہور کا قول درست ہے کہ یہ مکروہ ہے، لیکن ہم اس کے فاعل کی برائی نہیں کرتے اور نہ ہی مسائل اجتہاد میں برائی اور انکار کا کوئی پہلو ہوتا ہے۔"

(فتاویٰ شیخ محمد عبد الوہاب: ۳ / ۶۸، جس کو جامعہ امام محمد بن سعود اسلامیہ نے شائع کیا)

شیخ کا یہ کلام اس بات کی واضح دلیل ہے کہ توسل ان کے ہاں جائز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے بزعم خویش اس کو جمہور کے نزدیک مکروہ سمجھا۔ بہرحال مکروہ حرام نہیں ہوتا چہ جائیکہ بدعت یا شرک ہو۔

ہم کہتے ہیں کہ سلفیہ کے پروردگان نے مسئلہ زیارت اور سیدنا محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سامان سفر باندھنے کو ایمان' کفر' توحید اور شرک کا مسئلہ بنایا' اور یہ لوگ اس مسئلہ میں اپنے ہر مخالف کو ضلالت اور کفر و شرک کے القاب سے نوازتے ہیں--- "لاحول ولاقوۃ الاباللہ العلی العظیم" باوجود اس کے یہ سب اس پر متفق ہیں کہ اس عمارت کی نیت سے سامان سفر باندھنا جائز ہے جسے مسجد نبوی کے نام سے موسوم کرتے ہیں' اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

ہمیں انتہائی تعجب ہوتا ہے کہ یہ مسجد شریف اس فضیلت کی مستحق کیونکر ہوئی؟ اور اس کا شمار ان مساجد میں کیوں ہوا جن کی طرف رخت سفر باندھا جاتا ہے؟ کیا یہ محض اس لیے نہیں کہ یہ حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کی مبارک مسجد ہے؟ اگر نہیں تو بتائیں کہ اس میں اور دیگر مساجد میں کیا فرق ہے؟ جب مسجد کی شرافت و فضیلت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی بدولت ہے' تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ مسجد کی زیارت تو مسنون ہو اور اس کریم آقا علیہ التحیۃ والثناء کی زیارت حرام ہو جن کی وجہ سے مسجد کو یہ شرف حاصل ہوا۔

جب کوئی کہتا ہے کہ میں نے زیارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سامان سفر باندھا تاکہ آپ کی مسجد شریف میں آپ پر درود و سلام پیش کروں' اور صاحبین (صدیق و فاروق) کی زیارت کے لیے اور اس کی زیارت کے لیے جو بھی اس ارض مقدس میں محو استراحت ہے' نیز وحی و تنزیل کے ماثر اور ایمان و جہاد کے مقامات کی زیارت کے لیے۔ جب بھی کوئی یہ کہے: کہ میں اس مبارک ارادے سے سفر کرنے والا ہوں تو کیا وجہ ہے؟ کہ قیامت برپا ہو جائے' مصائب و آلام ٹوٹ پڑیں اور زمین تھرتھرادی جائے جیسا اس کا تھرتھرانا ٹھہرا ہے اور زمین اپنے بوجھ باہر پھینک دے۔

اے بندۂ مومن

میں (سید محمد بن سید علوی مالکی) مومن اور موحد ہوں' میں گواہی دیتا ہوں کہ

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یقیناً محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور میں اللہ کے رب ہونے 'اسلام کے دین ہونے اور محمد ﷺ کے نبی اور رسول ہونے پر بہ دل و جاں راضی ہوں 'میں اللہ پر اور اسماء و صفات پر ایمان رکھتا ہوں۔ اور میں ہر طرح کے شرک و ضلالت سے بیزار ہوں۔ اللہ وحدہ لاشریک کے سوا میں کسی کی عبادت نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہوں۔

تو کیا چیز میرے اس ایمان کو مضر ہے؟ کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے نبی اور حبیب سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی نیت سے سفر کروں اور اعتقاد یہ ہو کہ آپ ﷺ اللہ کے خاص بندے اور رسول ہیں 'جن کو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع بشر کی ہدایت کے لیے بھیجا اور انہوں نے کما حقہ فریضہ رسالت کو نبھایا اور عظیم امانت کی تبلیغ کا حق ادا کر دیا 'اور تادم وصال اللہ تعالیٰ کے رستے میں جہاد کیا 'اور ہمیں ایسا واضح ترین لائحہ عمل دے کر رفیق اعلیٰ سے وصل کا جام نوش کیا 'جس کی رات دن کی مانند روشن ہے اور اس سے کوئی روگرداں نہیں ہو سکتا مگر تباہ و برباد۔

بحمدہ تعالیٰ ہم اس عمدہ اور مقبول عقیدہ پر قائم ہیں اور اسی پر علماء امت محمدیہ کی سواد اعظم کمربستہ ہے 'جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت 'آپ کی طرف سامان سفر باندھنے اور آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توسل کے جواز کے قائل ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ سے ہی دعا کرنے والے اور یہ اعتقاد رکھنے والے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی نافع اور ضار ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ ہی کوئی اس ذات جل جلالہ و اعظم شانہ کے اذن کے بغیر نفع و ضرر دے سکتا ہے اور نہ ہی شفاعت کر سکتا ہے۔ جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔ (البقرہ: ۲۵۵)

وہ کون ہے جو اس کے یہاں سفارش کرے بے اس کے حکم کے۔

زیارت قبر مصطفیٰ ﷺ اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام

امام حاکم نے مستدرک میں محمد بن اسحاق کی حدیث نقل کی ہے' سعید بن ابو سعید سے مروی ہے کہ ام حبیبہ کے غلام عطاء کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لهبطن عيسى ابن مريم حكما عدلا واما ما مقسطا وليسلكن فجا حاجا او معتمدا او بنيتهما' وليا تين قبري حتى يسلم على ولاردن عليه۔	البتہ ضرور بر ضرور عیسیٰ ابن مریم عادل حاکم اور منصف پیشوا کی حیثیت سے نزول فرمائیں گے اور حج' عمرہ یا دونوں کی نیت سے سفر کریں گے' اور ضرور بر ضرور میری قبر پر حاضر ہو کر مجھے سلام پیش کریں گے اور میں ضرور بر ضرور ان کو سلام کا جواب دوں گا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اے لوگو! اگر تم آپ ﷺ کی قبر کی زیارت کرو تو کہنا: ابو ہریرہ آپ کو سلام کہتے ہیں۔

امام حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ اس عبارت کے ساتھ شیخین (بخاری و مسلم) نے اس کو نقل نہیں کیا۔ حافظ ذہبی "تلخیص" میں اسے صحیح کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے بارے میں یوں کہا جائے کہ اس حدیث کی امام حاکم نے تصحیح کی ہے اور حافظ ذہبی نے اسے تسلیم کیا ہے۔

(المستدرک للحاکم' کتاب تواریخ المتقدمین من الانبیاء والمرسلین' باب ذکر نبی اللہ عیسیٰ علیہ السلام : ۲/۵۹۵)

اس حدیث کے تحت ہمارے بھائی علامہ محدث شیخ محمود سعید ممدوح نے بڑی مفید بحث کی ہے اور اس میں ابن اسحاق کے عنعنہ سے متعلق بھی تحقیق درج کی ہے' اور مزید کہا کہ میں نے "رفع المنارہ" حدیث نمبر ۳۳' ص ۲۹۲ کے تحت ذکر کیا ہے کہ محمد بن اسحاق کا سماع کی تصریح نہ کرنا مضر نہیں۔ یہ اس لیے کہ امام حاکم اور حافظ ذہبی کا

اس حدیث کی تصحیح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کی نظر میں حدیث کی صحت میں جو کوئی اضطراب تھا' وہ ختم ہو گیا اور یہ دونوں امام اور حافظ ہیں۔ امام حاکم اگرچہ کچھ تساہل سے موصوف ہیں' لیکن حافظ ذہبی کی تصحیح اس تساہل کا خاتمہ کرتی ہے۔

امام حاکم اور حافظ ذہبی دونوں ایسے متابعات اور شواہد پر مطلع ہوئے ہیں' جن سے ابن اسحاق کے سماع کی عدم تصریح کا ضرر ختم ہو جاتا ہے۔ خصوصاً یہ کہ اس حدیث کے کئی طرق اور متعدد الفاظ ہیں' علاوہ ازیں اجلہ حفاظ متقدمین اور متاخرین ابن اسحاق کی حدیث قبول کرتے ہیں اگرچہ وہ سماع کی تصریح نہ کرے۔ ان میں سے امام ترمذی کا نام سرفہرست ہے' ان کا یہی مذہب ہے' اس کی تائید و نصرت حافظ ابو الفتح ابن سید الناس نے اپنی سیرت کی مشہور کتاب کے مقدمہ میں اور سنن ترمذی پر اپنی شرح میں کی ہے۔

احادیث صحیحہ متابعت میں

ذیل میں دو صحیح احادیث مندرجہ بالا حدیث کی متابعت میں پیش خدمت ہیں:

(ا) امام ابو یعلی موصلی نے اپنی مسند میں امام حاکم کی سند سے زیادہ صحیح سند کے ساتھ اس روایت کو نقل کیا ہے اور یہ ابو صخر حمید بن زیاد خراط کی حدیث ہے کہ سعید مقبری نے انہیں خبر دی کہ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں فرماتے ہوئے سنا ہے:

وَالَّذِيْ نَفْسُ اَبِي الْقَاسِمِ بِيَدِهٖ لَيَنْزِلَنَّ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ...	قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں ابوالقاسم کی جان ہے کہ عیسیٰ ابن مریم ضرور بر ضرور نازل ہوں گے۔

اور اس میں مزید الفاظ یوں ہیں:

ثُمَّ لَئِنْ قَامَ عَلٰى قَبْرِيْ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ لَاُجِيْبَنَّهٗ. (مسند ابو یعلی	پھر اگر وہ میری قبر پر کھڑے ہو کر کہیں "یا محمد" تو میں ضرور بر ضرور ان کو

موصلی حدیث نمبر۶۵۸۴: ۱۱/ ۴۶۲) جواب دوں گا۔

شیخ محمود فرماتے ہیں کہ حمید بن زیاد "صدوق" ہے' اور صحیح مسلم کے رجال میں سے ہے' لہٰذا یہ متابع قوی ہے۔

کتاب کے مولف (محمد بن علوی) فرماتے ہیں: کہ "ہم نے اس کو "المفاہیم" کے باب "بیان مشروعیہ الزیارۃ" میں ذکر کیا ہے' اور اس میں یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس کو (المطالب العالیہ ۴/ ۲۳) میں نقل کیا ہے۔ (مفاہیم یجب ان تصحح للمولف' ص ۲۶۰)

(۲) ابن نجار نے "الدرہ الثمینۃ" میں محمد بن زید بن مہاجر کی حدیث کو نقل کیا کہ

مقبری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان عیسی ابن مریم--- بے شک عیسیٰ ابن مریم---

اس روایت میں یوں ہے:

ولئن سلم علی لارد علیہ۔ اگر انہوں نے مجھے سلام کہا تو میں ضرور ان کو جواب دوں گا۔

(الدرۃ الثمینۃ فی تاریخ المدینۃ' باب ۱۶' ص ۲۱۸)

یہ دونوں روایات محمد بن اسحاق کی روایت کی متابعت میں ہیں۔ رہا محمد بن زید بن مہاجر' یہ ابن قنفذ مدنی ہے' جو ثقہ اور مسلم کے رجال میں سے ہے۔

(۳) مستدرک میں سعید اور ابو ہریرہ کے درمیان جو زائد راوی ہے' وہ سند کو مزید متصل کرتا ہے اور اس کی شرط شاگرد کے سماع کی تصریح ہے اور سعید مقبری نے ابو ہریرہ سے سماع کی تصریح کی ہے' جیساکہ "مسند ابو یعلی" میں مذکور ہے' لہٰذا حدیث صحیح ہے جیساکہ امام حاکم اور حافظ ذہبی نے کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے۔ یہ مبارک حدیث عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے سفر کرنے اور رخت سفر باندھنے میں صریح ہے۔

پھر مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جواب دیتے ہیں۔ یہ انبیاء کا سید الانبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے ساتھ کمال ادب ہے۔

ضعف حدیث کی تردید

یہاں حدیث کو ضعیف کہنے والوں کا رد مقصود ہے۔ بعض حضرات نے اس حدیث میں کلام کرتے ہوئے چند علل کے پیش نظر اس کو ضعیف قرار دیا ہے، جو درج ذیل ہیں:

(۱) ام حبیبہ کا غلام عطاء مجہول ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ جہینہ کا غلام ہے۔

(۲) ابن اسحاق کا عنعنہ۔

(۳) ابن اسحاق کی سند میں اختلاف ہے۔

یہ من گھڑت علتیں درست ہیں، کیونکہ تنقید کرنے والا صرف اور صرف ابن اسحاق کے طریق سے واقف ہے، کسی اور طریق کا اسے علم نہیں، کیونکہ وسعت مطالعہ اس کے بس کی بات نہیں، تو اس نے ان امور سے حدیث کو معلل کیا، حالانکہ درحقیقت یہ علتیں ابن اسحاق کے طریق میں پائی جاتی ہیں نہ کسی اور کے طریق میں۔

(۱) گزارش ہے کہ عطاء ام حبیبہ کا غلام ہو یا جہینہ کا، بات یہ ہے کہ امام نسائی نے اپنی "السنن" میں اس کو حجت مانا ہے۔ (دیکھیں حدیث: ۲۲۱۷) اور جس کو امام نسائی اپنی سنن میں حجت ٹھہرائیں وہ ثقہ ہے۔ جیسا کہ حافظ ذہبی نے "الموقظہ" میں اس کی تصریح کی ہے کہ وہ تابعی ہے اور اس سے ایک ثقہ حافظ اور امام نے روایت کیا ہے، یعنی سعید مقبری۔ تو عطاء کا شمار ان تابعین میں ہوگا جو مستور الحال ہیں اور مستور تابعی کی حدیث مقبول ہوتی ہے، جیسا کہ اکابر حفاظ نے اس پر تنبیہ کی ہے، مثلاً ابن صلاح نے "مقدمہ علوم الحدیث" میں اس پر تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ عطاء ابو علی اور "الدرۃ الثمینہ" کی روایت میں واقع نہیں ہے جیسا کہ پہلے گزر گیا، حدیث میں اصل یہ ہے کہ سعید نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

شاگرد اور استاد کے درمیان کسی شیخ کو داخل کرنا مضر نہیں' کیونکہ اس سے تو سند مزید متصل ہو جاتی ہے۔

(۲) ابن اسحاق کے عنعنہ کا جواب گزر گیا۔

(۳) ابن اسحاق پر اس کی سند میں اختلاف اس وقت ہے جب یہ حدیث فقط ابن اسحاق کے طریق سے خاص ہو اور ابو زرعہ نے (العلل: ۲ / ۴۱۴) میں امام حاکم کے طریق کو ترجیح دی ہے۔

لہٰذا ہر اختلاف میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ حدیث کو اس کی وجہ سے معلل کیا جائے۔ اسی طرح اس اختلاف کی کوئی اہمیت نہیں۔ البتہ جو اختلاف حدیث میں اضطراب پیدا کرے' اس کی کسی ایک وجہ کو ترجیح دینا ممکن نہیں' یا یہ کہ اختلاف ثقہ اور ضعیف کے درمیان ہو۔

بہرحال جب اختلاف فقط ایک ثقہ کے تعین میں ہو تو وہ مضر نہیں ہوتا جیسے اس حدیث میں ابن ابی حاتم کی "علل الحدیث" کے مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

جب کسی ایک وجہ کو ترجیح دینا ممکن ہو تو پھر بھی اختلاف مضر نہیں' جیسے امام حاکم کی نقل کردہ ایک وجہ کی ترجیح پہلے مذکور ہوئی' علاوہ ازیں یہ اختلاف فقط ابن اسحاق پر ہے اور اس کے دو ثقہ متابع موجود ہیں جو پہلے ذکر ہو چکے ہیں۔

لہٰذا حدیث صحیح ہے' اور معترض کا کلام حدیث میں کسی طرح کی کمزوری پیدا کرنے کا اہل نہیں' کیونکہ طرق حدیث متعدد ہیں اور اختلاف اگر ہے تو فقط ایک طریق پر ہے باوجودیکہ حدیث کے دیگر طرق ان تمام تر علتوں سے خالی ہیں' جس کی وضاحت اوپر ہو گئی۔ مزید تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو "رفع المنارہ" از محمود سعید ممدوح' ص ۲۹۲۔

احادیث زیارت پر حاصل کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ احادیث زیارت کے متعدد طرق ہیں' بعض بعض کو

تقویت دیتے ہیں۔ جیسا کہ امام مناوی نے حافظ ذہبی سے "فیض القدیر" میں نقل کیا ہے۔ خصوصاً یہ کہ اکثر علماء نے اس کی تصحیح کی یا تصحیح نقل کی جیسے امام سبکی، ابن سکن، عراقی اور قاضی عیاض نے "الشفاء" میں اور شارح شفاء ملا علی قاری اور امام خفاجی کے یہی اقوال ہیں۔ دیکھیں (نسیم الریاض: ۳/۵۱۱)

یہ سب حضرات حدیث کے حافظ اور بڑے معتمد ائمہ میں سے ہیں، لیکن تسلیم کرنے کو تو یہی کافی ہے کہ ائمہ اربعہ رضی اللہ عنہم اور دیگر متعدد اجلہ علماء کرام کا یہی کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت جائز ہے، جیسا کہ ان سے ان کے اصحاب نے اپنی معتمد کتب فقہ میں نقل کیا ہے۔ احادیث زیارت کی تصحیح اور قبولیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے، کیونکہ ضعیف حدیث عمل اور فتویٰ سے قوی اور مضبوط ہو جاتی ہے۔ یہ محدثین اور اصولیین کا معروف اور مسلمہ قاعدہ ہے۔

اب ہم مختلف حفاظ ائمہ کی آراء ہدیہ قارئین کرتے ہیں:

۱۔ امام حافظ حلیمی

امام حافظ ابو عبداللہ حسین بن حسن حلیمی "شعب الایمان" کے پندرہویں باب میں، جو خصوصی طور پر نبی کریم ﷺ کی جلالت اور تعظیم و توقیر کے بارے میں ہے، قرآن کریم میں نازل ہونے والی وجوب تکریم مصطفیٰ ﷺ کی نصوص اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کی مروی روایات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: کہ "یہ تعظیم و توقیر تو ان لوگوں کا نصیبہ تھا جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے مشاہدہ اور صحبت کی دولت سے سرشار تھے اور اس دور میں تعظیم کا اعلیٰ درجہ زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ آپ ﷺ سے مروی ہے کہ

مَنْ زَارَنِيْ بَعْدَ وَفَاتِيْ فَكَأَنَّمَا زَارَنِيْ فِيْ حَيَاتِيْ۔ — جس نے میری بعد از وصال زیارت کی، گویا کہ اس نے میری ظاہری حیات میں زیارت کی۔

(شعب الایمان للحافظ الحلیمی ۔ ۲۲۰/۱۰)

۲- امام حافظ ذہبی

حافظ ذہبی زیارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سامان سفر باندھنے کے بارے میں درج ذیل حدیث نقل کر کے تبصرہ فرماتے ہیں:

حسن بن حسن بن علی سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو اس مکان پر کھڑے ہوئے دیکھا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرانور ہے' کہ وہ آپ کو ندا دیتا ہوا آپ پر درود پڑھ رہا ہے تو انہوں نے اس شخص سے کہا: ایسا نہ کرو' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تتخذوا بیتی(۱) عیدا ولا تجعلوا بیوتکم قبورا وصلوا علی حیث ما کنتم فان صلاتکم تبلغنی۔	میرے گھر کو عید مت بناؤ اور اپنے گھروں کو قبر نہ بناؤ' اور مجھ پر جہاں سے بھی تم درود پڑھو تو تمہارا درود مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔

تبصرہ

یہ مرسل ہے اور نہ ہی حسن نے اپنے فتویٰ میں کوئی ایسا استدلال کیا' اور جو شخص حجرہ مقدسہ کے پاس کھڑا تھا' نہایت عاجزی کے ساتھ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے عقیدت بھرے پھول نچھاور کر رہا تھا' مبارک ہو اسے کہ اس نے کتنی حسین زیارت کی سعادت حاصل کی' اور انکساری اور محبت کا کتنا اچھا انداز اپنایا کہ اس شخص سے اس نے ایک زائد عبادت کا شرف حاصل کر لیا جس نے محض اپنے مکان یا اپنی نماز میں آپ ﷺ پر درود پڑھا' کیونکہ زائر کے لیے زیارت کا اجر بھی

(۱) حافظ ذہبی کے یہ الفاظ ہیں اور مشہور ہے "لا تجعلوا قبری عیدا۔" اور مولف کا یہ کہنا ہے کہ سیدنا حسن نے اس شخص کو ایسی حالت پر کھڑے دیکھا جو ادب و وقار کے خلاف تھی' اسی لیے آپ نے اسے منع کیا اور اس حدیث کو خصوصاً ذکر کیا اور بعض محدثین نے اس حدیث مبارکہ میں لفظ "عید" کا معنی سوء ادب کہا ہے۔ یہ میری تحقیق ہے۔

ہے اور آپ ﷺ پر درود پڑھنے کا بھی، جبکہ تمام سرزمین میں آپ ﷺ پر درود پڑھنے والوں کے لیے صرف درود کا ہی اجر ہے۔ تو جو شخص حضور علیہ الصلوۃ والسلام پر ایک مرتبہ درود پڑھے، اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس شخص پر دس رحمتیں نازل فرماتے ہیں، لیکن جو شخص حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی زیارت کرے اور بظاہر ادب زیارت کا پاس نہ رکھے، وہاں سجدہ کرے یا غیر مشروع کام کرے، تو یہ فعل اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی، جو نیت سے معلوم ہو گا۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

اللہ کی قسم کسی مسلمان کو اضطراب و بے قراری، چیخنا چلانا، دیواروں کے بوسے لینا اور کثرت بکاء میسر نہیں آتی، مگر اس کو جو اللہ اور اس کے رسول سے سچی محبت رکھنے والا ہو، اور اس کی محبت معیار ہے اور اہل جنت اور اہل دوزخ میں فرق کرنے والی ہے۔ لہذا حضور پر نور شافع یوم النشور ﷺ کی قبر انور کی زیارت افضل ترین نیکی ہے۔ اگر بالفرض ہم یہ تسلیم کر لیں کہ انبیاء و اولیاء کی قبور کی طرف سفر کرنا جائز نہیں، کیونکہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا یہ فرمان عام ہے: "لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد" تو پھر بھی حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی طرف سامان سفر باندھنا آپ ﷺ کی مسجد شریف کی طرف سفر کو مستلزم ہو گا، لہذا ابتدا مسجد کی نیت سے ہوئی پھر صاحب مسجد ﷺ کی نیت۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اس کی زیارت سے مشرف فرمائے۔ آمین۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴/ ۴۸۳-۴۸۵)

۳- امام شیخ الاسلام فیروز آبادی

امام شیخ الاسلام مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی فرماتے ہیں: "لا تشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد" میں زیارت سے ممانعت پر دلالت نہیں، بلکہ یہ حدیث اس میں حجت ہے اور جس نے اس کو زیارت کی حرمت پر دلیل بنایا ہے اس نے اللہ اور اس کے رسول پر عظیم جسارت کی ہے، اس حدیث میں ایسا کہنے والے کی غباوت پر برہان قاطع موجود ہے، اور اس کا کیفیت استنباط اور استدلال سے واقف نہ

ہونا اظہر من الشمس ہے' حالانکہ اس مبارک حدیث میں زیارت کے استحباب پر دو وجہ سے دلیل قائم ہے۔

(۱) بے شک آپ ﷺ کی قبرانور کی جگہ تمام سرزمین سے افضل و اعلیٰ ہے اور صاحب مزار صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق سے افضل و اعلیٰ ہیں اور اللہ کے ہاں سب سے زیادہ معزز و مکرم ہیں' کیونکہ اللہ جل شانہ نے آپ کے علاوہ کسی کی زندگی کی قسم نہیں کھائی' اور انبیاء سے آپ ﷺ کے ساتھ ایمان و نصرت کے وعدے لیے' جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ۔ (آل عمران: ۸۱)	اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور ضرور اس کی مدد کرنا۔

اور آپ ﷺ کو جمیع انبیاء و مرسلین پر فضیلت بخشی اور ختم نبوت کی تکریم و تعظیم کا تاج بھی آپ ہی کے سر سجایا اور علیین میں بھی آپ ﷺ کے درجات بلند فرمائے' تو جب یہ ثابت اور مسلم ہوگیا کہ آپ ﷺ جمیع مخلوق سے افضل ہیں اور آپ کی تربت انور تمام سرزمین سے افضل ہے تو لامحالہ آپ ﷺ اور آپ کی تربت انور کی طرف سامان سفرباندھنا بطریق اولیٰ مستحب ٹھہرا۔

(۲) بلاشبہ مسجد مدینہ کی طرف سفر کرنا مستحب ہے' لیکن ایک مخلص مومن کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا ارادہ و نیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے خالی ہو اور یہ کیسے تصور ہو سکتا ہے کہ ایک باوقار مومن نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و عظمت کی خاطر آپ کی مسجد شریف میں حاضر ہو اور حجرۂ مقدسہ کی

زیارت کرے' حالانکہ یہ امر ثابت ہے کہ آپ ﷺ اس کا کلام سنتے ہیں' پھر اس کے بعد یہ بھی ہو کہ نہ حجرہ مقدسہ کا قصد ہے اور نہ ہی قبرانور کا' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھے؟ لہٰذا یہ مسئلہ کسی پر مخفی نہیں۔ اگر کسی نے آپ ﷺ کی قبرانور کی زیارت کا قصد کیا تو اس کا قصد مسجد نبوی سے خالی نہیں ہو گا۔

یہ بحث اقوال میں تقریب و تطبیق کے لحاظ سے پختہ ہے' جس کو علامہ شیخ عطیہ محمد سالم مدنی نے "اضواء البیان" کے تکملہ میں ذکر کیا ہے' جس کا مفصل بیان عنقریب آجائے گا۔

اللہ کی خوشنودی کے لیے بھائیوں اور دوستوں کی زیارت کی فضیلت میں کثیر احادیث صحیحہ وارد ہیں تو پھر نبی ﷺ کی زیارت کہیں زیادہ افضل اور اعلیٰ ہو گی۔

ذیل میں چند امور پیش خدمت ہیں:

(ا) حضور نبی کریم ﷺ کی تعظیم و تکریم ہر حال میں واجب ہے' حیات ظاہری ہو یا بعد از وصال اور بلاشبہ آپ ﷺ کی حیات ظاہری میں آپ کی طرف ہجرت کرنا ایک اہم ترین امر تھا تو اسی طرح ہی وصال کے بعد بھی ہو گا۔

(۲) زیارت قبور کے استحباب پر متعدد احادیث دلالت کرتی ہیں' اور یہ مردوں کے حق میں ہیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے اور عورتوں کے حق میں اختلاف ہے۔ ہم نے اس مسئلہ کو اپنی کتاب "اثارۃ الشجون لزیارۃ الحجون" میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ کتاب قبرنبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دیگر قبور کے بارے میں ہے اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرانور کی زیارت پر تو اجماع ہے کہ مردوں اور عورتوں کے لیے مستحب ہے۔

(۳) تجارت اور دنیاوی منافع کے حصول کے لیے سفر کرنے کے جواز پر اجماع ثابت ہے' تو یہ اس سے کہیں افضل ہے کیونکہ اس میں عظیم اخروی مصلحت پیش نظر ہے۔

(۴) حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے لے کر آج تک آپ ﷺ کی زیارت اور آپ کی طرف سامان سفرباندھنے پر لوگوں کا عملی اجماع ہے۔

(۵) اجماع قولی بھی منقول ہے۔ابو الفضل قاضی فرماتے ہیں: حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرنا مسلمانوں کی سنت ہے' اس پر اجماع ہے۔ البتہ اس مسئلہ میں آثار کا سہارا لیا جائے تو بے شمار ملتے ہیں۔

(الصلات والبشر فی الصلوۃ علی خیر البشر: ۱۲۷-۱۲۸)

۴- حافظ ابن عساکر

امام حافظ ابوالیمن عبدالصمد بن عبدالوہاب المعروف ابو الیمن ابن عساکر فرماتے ہیں:

حمد و ثنا کے بعد... یہ رسالہ سیدنا و سید البشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے بارے میں ہے' لیکن مختصر ہونے کے باوجود انتہائی قدر و عظمت کا حامل ہے۔ اس کو گویا میں نے زائر کے لیے تحفہ کے طور پر تالیف کیا اور اسے مقیم کا عطیہ بنایا جسے مسافر زادراہ بناتا ہے۔ جب آپ ﷺ کی تربت مقدسہ مکرمہ کی زیارت ایک اہم ترین نیکی' آپ ﷺ کی مسجد شریف کا قصد کرنا نہایت قرب کی بات ہے' تو آپ ﷺ کی طرف سامان سفر باندھنا اور وہاں ہر طرح کے بوجھ اتر جانا اور امیدوں کا بر آنا لامحالہ قرب خداوندی کی دلیل ہے۔

(اتحاف الزائر للحافظ ابی الیمن ابن عساکر (مخطوط): ص ۳)

۵- شیخ عطیہ محمد سالم کی مفید تحقیق

علامہ مفسر شیخ محمد امین شنقیطی نے تفسیر لکھی جو "اضواء البیان" کے نام سے مشہور ہے لیکن وہ اسے مکمل نہ کرپائے' تو انہی کے لائق ترین شاگرد شیخ عطیہ محمد سالم نے اس کی تکمیل کی اور یہ مدینہ منورہ کے قاضی ہیں' انہوں نے تکملہ میں اس مسئلہ کو

یوں ذکر کیا کہ

میں سمجھتا ہوں کہ شیخ الاسلام کے معاصرین کا آپ سے دیگر مسائل میں کوئی نزاع نہیں تو یہ مسئلہ بھی محل نزاع نہیں ہے اور نہ ہی اس میں نزاع کی کوئی گنجائش ہے۔ لیکن بات صرف اتنی ہے کہ انہوں نے اس مسئلے کو بہت نازک سمجھا اور محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت سے اس پر وہ حکم لگانے کا التزام کیا' جو شیخ الاسلام کے اس کلام سے لازم آ رہا تھا کہ

لا یکون شد الرحال لمجرد الزیارۃ' بل تکون للمسجد من اجل الزیارۃ عملا بنص الحدیث۔	شد رحال (سفر) محض زیارت کے لیے نہ ہو بلکہ مسجد کی زیارت سے ہو تاکہ حدیث پر عمل ہو جائے۔

تو انہوں نے آپ پر وہ الزام لگایا جو آپ نے صراحتاً نہیں کہا تھا اگر کلام کو نہی کی بجائے نفی پر محمول کیا جائے تو موافقت ہو جاتی ہے یعنی یہ وہم پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ شیخ الاسلام رحمتہ اللہ علیہ نے نہ آپ ﷺ کی زیارت سے منع کیا اور نہ ہی آپ ﷺ کی بارگاہ میں سلام پیش کرنے سے۔ بلکہ آپ نے تو اس کو ایک فضیلت اور اہم نیکی قرار دیا ہے' اور آپ نے حدیث کی عبارت سے مسجد شریف کی طرف سفر کرنے کا التزام کیا ہے اور بقیہ جمیع زیارات اس کے ضمن میں شامل کیں اور اسی سے رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس پر سلام بھیجنا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اس کی اپنی کتب میں وضاحت کی۔ (کلام الشیخ عطیہ فی اضواء البیان : ۸ / ۵۸۶)

اس کے بعد شیخ عطیہ ابن تیمیہ کی عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

فدل کلامہ رحمہ اللہ ان زیارۃ القبر والصلوٰۃ فی المسجد مرتبطان' ومن	آپ رحمتہ اللہ علیہ کا کلام اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ زیارت قبرانور اور مسجد میں نماز' دونوں متصل ہیں اور جس شخص

ادعی انفکا کہما عملیا فقد خالف الواقع' واذا ثبت الرابطہ بینہما انتفی الخلاف وزال موجب النزاع والحمدللہ رب العلمین۔	نے ان دونوں کے عملی طور پر جدا جدا ہونے کا دعویٰ کیا' اس نے واقع کے خلاف کیا۔ جب ان دونوں میں رابطہ اور اتصال ثابت ہوگیا تو اختلاف ختم ہوا' اور نزاع کا سبب بھی زائل ہوا۔

ایک اور مقام پر شیخ الاسلام تصریح کرتے ہیں کہ قبور صالحین کی زیارت کے لیے کئے جانے والے سفر میں نماز کے قصر ہونے کے بارے میں امام احمد کے اصحاب کے چار اقوال ہیں' جن میں سے تیسرا یہ ہے:

تقصر الی قبر نبینا علیہ الصلوۃ والسلام۔	ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرانور کی زیارت کے سفر میں نماز قصر کی جائے گی۔

(اضواء البیان والتکملہ: ۸/۵۹۰)

پھر شیخ عطیہ فرماتے ہیں: کہ یہ شیخ الاسلام کی انتہائی تصریح ہے کہ واقع کے اعتبار سے زیارت قبرانور اور مسجد میں نماز' دونوں میں جدائی کا قطعاً کوئی تصور نہیں اور یہی عام علماء کے نزدیک مفتی بہ ہے۔

رہی جاہل کی بات تو اس کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ "جو شخص اس حدیث کو نہیں جانتا اور محض قبرانور کی زیارت کے ارادے سے سفر کرتا ہے تو ضروری امر ہے کہ وہ آپ کی مسجد شریف میں نماز پڑھے گا تو اس پر اسے ثواب ملے گا اور جو اس نے کیا وہ ممنوع تھا لیکن وہ نہیں جانتا' لہٰذا اس پر کوئی عقاب و عتاب نہیں ہوگا اور اجر و ثواب ضرور حاصل ہوگا۔" (اضواء البیان والتکملہ: ۸/۵۹۰)

اس سے ظاہر ہوا کہ قبرانور کی زیارت کا قصد کرنے والا کسی حال میں بھی اجر و ثواب سے محروم نہیں رہتا' تو پھر اس کے بارے میں بدعتی' گمراہ اور مشرک کا فتویٰ دینا کیسے صحیح ہوگا؟ "سبحانک ھذا بھتان عظیم۔"

حالانکہ اس مقدس جگہ سے آشنائی کی دولت میسر آئی جہاں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا اور مزید اس مقدس ومنور جگہ کا تعارف ہوا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربت اطہر ہے۔ گویا کہ اس کو انتہائی قیمتی معلومات کا خزانہ ملا تو اس سے بڑھ کر اور سعادت کیا ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ اس مقام اطہر واقدس کی شرافت وعظمت کو مزید چار چاند لگائے۔

میں (مولف) کہتا ہوں کہ یہ حدیث لفظ قبر اور لفظ بیت' دونوں کے اعتبار سے اپنے جمیع طرق کے ساتھ حد تواتر کو پہنچ جاتی ہے۔ اس کو صحابہ کی ایک بڑی جماعت نے روایت کیا ہے' جن میں سے حضرت علی بن ابو طالب' عبداللہ بن عمر' ابو ہریرہ' ابو سعید خدری' جابر بن عبداللہ' سعد بن ابی وقاص' عبداللہ بن زید مازنی' ابو بکر' جبیر بن مطعم' ابو واقد لیثی' زید بن ثابت' زین بن حارثہ' انس' عائشہ اور معاذ بن حارث رضی اللہ عنہم اجمعین کے نام سرفہرست ہیں۔ واللہ اعلم۔

(التلخیص الحبیر: ۳/ ۲۳' نظم المتناثر: ۱۲۸' اتحاف ذوی الفضل: ۱۳۶ اور فضائل المدینہ: ۲/ ۲۶۵)

اور ان کی احادیث کو امام مالک بن انس' امام احمد بن حنبل' امام ترمذی' طحاوی' ابو علی' ضیاء مقدسی' بزار' ابن عساکر اور خطیب بغدادی جیسے اجلہ ائمہ حدیث نے اپنی کتب میں نقل کیا:

لَا تَجْعَلُوا قَبْرِیْ عِیْدًا

"میری قبر کو میلہ نہ بناؤ"

یہ مبارک حدیث بھی ان نصوص میں سے ایک ہے جن کی تحریف اور باطل تاویل کا بار گراں غالی قسم کے لوگوں نے اٹھا رکھا ہے' اور ان کو اپنی خواہشات نفسانیہ کے مطابق ڈھالتے ہیں اور وہاں وارد کرتے ہیں جو ان کا محل نہیں۔ اسی طرح اس

حدیث سے بھی وہ لوگ زیارت نبویہ کے لیے سفر کرنے کی حرمت پر استدلال کرتے ہیں' حالانکہ ان کے مابین بھی اس کے حرام اور بدعت ہونے میں اختلاف ہے۔ چلیں ہم ان کی بات بھی سن لیتے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ

یہ شرک ہے۔

پھر کہنے لگے: یہ حرام ہے۔

پھر یوں گویا ہوئے: یہ بدعت ہے۔

امید ہے کہ بعد میں کہیں گے: یہ خلاف سنت ہے۔

شاید پھر یہ بھی کہہ ڈالیں: یہ مباح ہے۔

جیسا کہ مسئلہ توسل بالنبی ﷺ میں بھی ان کے اجتہاد میں یہ تدریجی تغیر ہمارے سامنے ہے کیونکہ اس مسئلہ میں بھی ہم نے ان کو یہ کہتے سنا ہے کہ

یہ شرک ہے۔

پھر حکم میں تغیر ہوا اور کہا: یہ حرام ہے۔

پھر مزید تغیر ہوا اور کہا: یہ بدعت ہے۔

پھر وہاں سے حکم بدل کر یہاں تک پہنچا کہ یہ خلاف سنت اور ناجائز ہے۔

لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

اس کے باوجود ہم اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے ہیں جو صراط مستقیم کی ہدایت دیتا ہے اور ہم اس سے سوال کرتے ہیں کہ ہمیں نور بصیرت کی بیکراں دولت سے سرفراز فرمائے اور بھلائی کی طرف ہماری خوب دستگیری فرمائے۔ ہر غیور مسلمان کی یہی تمنا ہوتی ہے۔

بہرحال حاصل یہ ہے کہ اس مبارک حدیث کا مسئلہ زیارت سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسے حدیث لا تشد الرحال --- کیونکہ اس حدیث کا مقصود کچھ اور ہے جبکہ مسئلہ زیارت ایک الگ امر ہے۔ اب ہم اس حدیث کا درجہ بیان کرنے کے بعد ائمہ

ثقات کے حوالے سے اس کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کی کامل توفیق سے کہتا ہوں:

اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بایں الفاظ روایت کیا ہے:

لا تجعلوا بیوتکم قبورا ولا تجعلوا قبری عیدا وصلوا علی فان صلاتکم تبلغنی حیثما کنتم۔(رواۃ ابوداؤد)	اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ اور میری قبر کو میلہ نہ بناؤ اور مجھ پر درود پڑھو' بے شک تمہارا درود مجھے پہنچ جاتا ہے تم جہاں بھی ہو۔

اس حدیث کے ایک راوی عبداللہ بن نافع صائغ میں اختلاف ہے۔ امام احمد کا کہنا ہے: یہ ضعیف ہے اور ابو حاتم رازی کا بھی یہی قول ہے حالانکہ امام یحییٰ بن معین نے اس کی توثیق کی ہے اور ابو زرعہ فرماتے ہیں: "لا باس بہ" (اس میں کوئی حرج نہیں) امام منذری کی "مختصر ابی داؤد" میں اسی طرح ہے۔

(مختصر ابی داؤد للمنذری: ۲/ ۴۴۷)

مجمع الزوائد میں ہے کہ اس کو ابو یعلی نے روایت کیا' اور اس میں ابو حفص ابن ابراہیم جعفری ہے' جس کو ابن ابی حاتم نے ذکر کیا اور اس میں کوئی جرح نہیں کی اور اس روایت کے بقیہ رجال ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد: ۴/ ۳)

اب ذیل میں ہم ائمہ ثقات کے حوالے سے مفہوم حدیث کے احتمالات درج کرتے ہیں:

(۱) حافظ زکی الدین منذری فرماتے ہیں کہ

"اس سے مراد حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی قبر انور کی کثرت زیارت پر برانگیختہ کرنا ہے تاکہ اس عمل کو چھوڑ نہ دیا جائے اور صرف عید کی طرح ہی کسی وقت زیارت کی جائے' جو سال میں صرف دو ہی مرتبہ آتی ہے۔"

(۲) بعض ائمہ نے اس سے اس امر کی ممانعت مراد لی ہے کہ زیارت کے لیے عید کی طرف کوئی دن متعین کیا جائے' جس کے علاوہ زیارت نہ کی جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جہاں تک آسانی سے ممکن ہو' غیردن کی تخصیص کے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی کثرت سے زیارت کی جائے۔ اس تاویل کو امام تقی سبکی نے ذکر کیا ہے۔

(۳) بعض ائمہ نے یہ معنی بیان کیا کہ زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سوء ادب سے ممانعت ہے یعنی وہاں لہو ولعب میں مشغول نہ ہو جاؤ' جس طرح عیدوں میں کیا جاتا ہے۔ فقط حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی زیارت کی جائے' آپ ﷺ کے پاس دعا کی جائے اور آپ ﷺ کی نظر شفقت کی برکت' دعا اور سلام کے جواب کی امید رکھی جائے اور ساتھ ساتھ اس بارگاہ شریفہ نبویہ کے ادب کا دامن ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

امید ہے کہ یہ معنی غرض حدیث کے زیادہ قریب ہے۔ انشاءاللہ 'کیونکہ اہل کتاب کی عادت تھی کہ وہ اپنے انبیاء و صالحین کی زیارت کے وقت لہو ولہب اور زینت میں ہی مشغول رہتے' تو نبی کریم ﷺ نے امت کو اس سے منع فرمایا کہ اپنے نبی ﷺ کی زیارت کے وقت اس طرح کے لہو ولہب میں مشغول ہو کر ان سے مشابہت پیدا کی جائے۔ بلکہ امت مسلمہ پر لازم ہے کہ وہ آپ ﷺ کی زیارت کو توبہ و استغفار کرتے ہوئے آئیں' اور بعد از وصال بھی نبی ﷺ کی زیارت انہی قواعد ادب پر کی جائے جو آپ ﷺ کی حیات ظاہری میں ان کے ملحوظ خاطر ہوتے تھے۔

یقین جان لو! بے شک نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کی زیارت نیکی اور بھلائی ہے' اور بھلائی میں کثرت کرنا مزید نیکی ہے' لہٰذا زائر پر لازم ہے کہ ادب و احترام کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھے اور لہو ولعب سے گریز کرے۔

(۴) عبدالرزاق نے اپنی "المصنف" میں جو روایت نقل کی ہے کہ حسن بن

حسن نے قبر نبوی کے پاس ایک قوم کو دیکھا تو انہیں منع کیا اور اپنے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان عالی شان ان کے گوش گزار کیا:

لاتجعلوا قبری عیدا۔ میری قبر کو میلہ نہ بناؤ۔

تو اس میں ان کو ادب کا لحاظ نہ رکھنے پر زجر کی گئی۔ یہ روایت اسی معنی پر محمول ہے۔

اور یہ حدیث اس معنی کی تائید کرتی ہے کہ زیارت کے وقت سوء ادب سے منع کیا گیا اور ایسی لاپرواہی سے روک دیا گیا جو عیدوں میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ بہرحال زیارت سے ممانعت مقصود نہیں۔

شیخ الاسلام امام تقی سبکی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کہ اسلاف میں سے کسی ایک فرد کے بارے میں یہ تصور کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے زیارت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے منع کیا ہو، جبکہ جمیع اموات کی زیارت پر ان سب کا اجماع ہے۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا یُّعْبَدُ

"اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنا کہ اس کی عبادت کی جائے"

یہ مبارک حدیث بھی انہی نصوص میں سے ایک ہے، جن کے ساتھ استدلال کرنے میں غالی اور محرفین حضرات اپنی خواہشات کے مطابق تاویل کرتے ہیں تو اس حدیث کا مفہوم بھی انہوں نے اپنی طبع نفسانیہ کے تحت ڈھالا اور بڑی بھیانک تحریف کرتے ہوئے استدلال یہ کیا کہ نبی مکرم خیرالبریہ علیہ افضل الصلوۃ واتم التسلیم کی زیارت کے لیے سفر کرنا حرام ہے یا بدعت یا مکروہ۔ کیسی یہ باطل سوچ ہے جو راہ حق سے بھٹکی ہوئی ہے۔ ابھی اس کے راوی کے ذکر کے بعد ہم اس کا صحیح مفہوم بیان کرتے ہیں۔

اس کو امام احمد نے بایں الفاظ روایت کیا:

اللھم لا تجعل قبری وثنا لعن اللہ قوما اتخذوا قبور انبیائھم مساجد۔	اے اللہ میری قبر کو بت نہ بنا' اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس قوم پر جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مساجد بنایا۔

(مسند احمد: ۲/۲۴۶)

امام مالک نے اسے (الموطا: ۱/ ۱۷۲) میں مرسل روایت کیا۔ اسی طرح اس کو ابو یعلی نے روایت کیا' جس میں اسحاق بن ابو اسرائیل ہے' اس میں کلام ہے اور راس کے بقیہ رجال ثقہ ہیں۔

علامہ زرقانی فرماتے ہیں کہ جو شخص ثقات کی مراسیل کو حجت مانتا ہے اس کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے نزدیک بھی جس نے موطا کے الفاظ کو عمر بن محمد کی سند سے مسند کہا' اس شخص کی زیادت قبول ہے اور عقیلی کے پاس اس کا شاہد موجود ہے۔ شرح الزرقانی للموطا میں اسی طرح ہے۔ (شرح الزرقانی للموطا: ۱/ ۳۵۱)

جان لو کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی قبر انور راس جگہ میں ہے جو آپ کے حجرہ مقدسہ میں داخل ہے اور حجرہ مقدسہ آپ ﷺ کی مسجد شریف میں داخل ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس پر عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر جمیع علماء اعلام' ائمہ اسلام اور سلف صالحین کا اتفاق ہے۔

صحیح حدیث میں وارد ہے جو حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور کے شرک و پرستش سے محفوظ ہونے پر دال ہے۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ میری قبر بت نہ بنے جس کی پرستش کی جائے' اور آپ ﷺ کی دعا مقبول ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے یوں دعا کی:

اللھم لا تجعل قبری وثنا یعبد' اشتد غضب اللہ علی	اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا کہ اس کی عبادت کی جائے' اللہ کا غضب ہوا اس قوم

قوم اتخذوا قبور انبیائھم مساجد۔ پر جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبور کو مساجد بنایا۔

جمیع طرق سے اس کی تمام روایات کو یکجا کرنے سے حدیث شریف کا معنی یہ حاصل ہوتا ہے کہ اس نیت سے قبرانور کی طرف جانے کی ممانعت ہے کہ اس پر یا اس کی طرف نماز پڑھی جائے تاکہ صاحب قبر یا قبر کی تعظیم ہو کیونکہ امم سابقہ کا شرک اور قبور واہل قبور کی عبادت کی طرف مائل ہونے کا یہی ذریعہ بنا۔

شارع علیہ الصلوۃ والسلام نے اس نہی سے اسی ذریعہ کا اعتبار کیا ہے' تو اس کو اپنی امت پر بند کر دیا تاکہ وہ ان امور میں نہ پڑ جائیں' جن کی وجہ سے ان سے پہلے کی امتیں ہلاک ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی امید کو ثابت اور دعا کو قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی فرد مسلم آپ ﷺ کی قبرانور کی تعظیم اس طرح نہیں کرتا کہ اس پر یا اس کی طرف نماز پڑھے۔

حضور پر نور شافع یوم النشور ﷺ سے اپنے دفن کا اسی جگہ میں اشارہ ثابت ہے۔ بزار نے صحیح سند کے ساتھ اور طبرانی نے مرفوعا روایت کیا:

ما بین قبری و منبری روضۃ من ریاض الجنۃ۔ میری قبر اور منبر کا درمیانی حصہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔

یہاں بیت کی جگہ پر قبر گویا آپ ﷺ کو علم ہے کہ مسجد نبوی شریف قبرانور کے ساتھ متصل ہو گی' تو یہ فضیلت اسی کے لیے ثابت رکھی اور اسی کی طرف آنے میں امت کو رغبت دلائی اور قبر کی وجہ سے مسجد کا قصد ترک کرنے کا حکم دیا اور نہ ہی اس کے منہدم کرنے کا' بلکہ تصریح فرما دی کہ اس مسجد میں ایک نماز پڑھنا مسجد حرام کے علاوہ دیگر مساجد میں ہزار نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ اور ارض مقدس کا جو حصہ قبرانور سے متصل ہے' اس کی منبر منور تک یوں تخصیص فرمائی:

روضۃ من ریاض الجنۃ۔ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔

قبر انور اور مسجد نبوی

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس جگہ میں دفن ہونے پر اشارہ ثابت ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ہے کہ قبر یہاں ہوگی اور یقیناً وہ باغ جنت کی طرف ہوگی۔ یہ ان نصوص واردہ سے ثابت ہے' جہاں احادیث روضہ میں قبر کا لفظ آیا ہے مثلاً (ما بین قبری ومنبری) اور یہ دوسرے الفاظ (ما بین بیتی ومنبری) کے معارض نہیں۔ ہم نے ان روایات کی تفصیل اپنی کتاب "دار التوحید" میں پیش کردی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امام مالک نے موطا میں اپنی سند سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما بین قبری ومنبری روضۃ من ریاض الجنۃ ومنبری علی حوضی۔	میری قبر سے لے کر منبر تک جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے اور میرا منبر میرے حوض پر ہے۔

اسی طرح ہی امام مالک نے اسے "الموطا' کتاب الصلوۃ' باب مسجد رسول اللہ" میں اس کو روایت کیا۔

میں کہتا ہوں: بعض نسخوں میں "ما بین بیتی" کے الفاظ وارد ہیں۔ اور یہ دونوں روایتیں "قبری" اور "بیتی" کے لفظ والی صحیح ہیں۔ ابن عبدالبر نے (التمہید:۱/ ۲۸۷) میں اس کی تنبیہ کی ہے اور شیخین نے صحیحین میں اس پر اعتماد کیا ہے' جہاں انہوں نے لفظ قبر کے ساتھ حدیث کا مفہوم واضح کیا ہے۔

(صحیح بخاری: ۳/ ۷۰ فتح' صحیح مسلم حدیث:۵۰۱)

امام طحاوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے معنی میں توقیف ضروری ہے اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ارشاد گرامی "ما بین قبری ومنبری روضۃ من ریاض الجنۃ" اکثر ان آثار اور ماسوا پر مبنی ہے۔ ان میں سے "ما بین بیتی ومنبری روضۃ من ریاض الجنۃ" ہے' جس کی تصحیح اس طرح

کرنا ضروری ہے کہ آپ ﷺ کا بیت یہی قبر ہے اور یہ علامات نبوت میں سے ایک جلیل القدر علامت ہے۔

کیونکہ اللہ جل جلالہ نے آپ ﷺ کے سوا ہر نفس پر اس زمین کو مخفی رکھا ہے 'جہاں اس کی موت آئے گی۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ بِاَىِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ۔(لقمان: ۳۴)	اور کوئی جان نہیں جانتی کہ کس زمین میں مرے گی۔

فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطٰنِ

"بے شک اگر یا کاش کا لفظ شیطان کا عمل کھولتا ہے"

یہ حدیث صحیح ہے جس کو امام مسلم وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِىُّ خَيْرٌ وَّاَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ' وَفِىْ كُلٍّ خَيْرٌ' اِحْرِصْ عَلٰى مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ وَلَا تَعْجَزْ' وَاِنْ اَصَابَكَ شَيْئٌ فَلَا تَقُلْ:لَوْاَنِّىْ فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا۔۔۔وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَرُاللّٰهِ وَمَا شَآءَ فَعَلَ' فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطٰنُ۔	قوی مومن ضعیف مومن سے بہتر اور اللہ کو زیادہ پسند ہے اور ہر ایک میں بھلائی ہے' اس امر کی کوشش کر جو تمہیں نفع دے اور اللہ سے مدد طلب کر' تھک ہار کر نہ بیٹھ جا' اگر تجھے کوئی نقصان پہنچے تو یہ نہ کہہ کہ اگر میں کرتا تو ایسے ایسے ہو جاتا بلکہ یہ کہہ کہ یہ تقدیر الٰہی ہے' جو اس نے چاہا کر دیا' کیونکہ اگر یا کاش کا لفظ شیطان کا عمل کھولتا ہے۔

(صحیح مسلم: کتاب القدر باب الایمان والاذعان لہ)

یہ مبارک حدیث ایک ایسی نص ہے جس پر بعض نصوص کے ظواہر پر ہی اعتماد کرنے والے حضرات ہر اس شخص پر کفر کا فتویٰ لگا دیتے ہیں، جس نے کسی ایسی صورت میں اگر یا کاش کا لفظ استعمال کیا جو کسی حالت کے ہاتھ سے نکل جانے پر اظہار افسوس ہو اور بطور دلیل یہی فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتے ہیں کہ "بے شک، اگر یا کاش کا لفظ شیطان کا عمل کھولتا ہے۔" شرک اور کفر و ضلالت بھی شیطانی اعمال سے متعلق ہیں، اس لیے جو بھی اگر یا کاش کا لفظ استعمال کرے وہ شیطانی جھنڈے تلے داخل ہوا۔ (یہ ان ظواہر نصوص پر حکم لگانے والوں کا کہنا ہے)

میں کہتا ہوں: یہ اطلاق صحیح نہیں، اسی لیے ہم نے جب ان ارباب فہم و بصیرت کی طرف رجوع کیا جن کو فقہ و حدیث کے ائمہ ہونے کا شرف حاصل ہے، تو ہمیں کافی اور شافی جواب میسر ہوا۔

امام نووی رحمتہ اللہ علیہ قاضی عیاض سے نقل کرتے ہیں کہ یہ نہی اس شخص کے لیے ہے جس نے حتمی اعتماد کے ساتھ یہ کہا اور اگر واقعی اس نے ایسا کیا تو قطعاً درست نہیں اور جو اسے اللہ تعالیٰ کی مشیت کی طرف منسوب کرے کہ ہرگز اسے نہیں پہنچا مگر جو اللہ نے چاہا، تو یہ اس قبیلہ سے نہیں۔ قسم اول کا استدلال حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اس فرمان سے ہے جو آپ نے نماز میں کہا:

لَوْاَنَّ اَحَدَهُمْ رَفَعَ رَاْسَهٗ لَرَاٰنَا۔	اگر ان میں سے کوئی بھی اپنا سر اٹھاتا تو ہمیں دیکھ لیتا۔

قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ اس باب میں حجت نہیں، کیونکہ آپ نے مستقبل کی خبر دی نہ کہ وقوع تقدیر کے بعد اس کے رد کا دعویٰ کیا۔ مزید فرماتے ہیں کہ ایسے ہی ان احادیث کا مفہوم ہے جو امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ نے "باب ما یجوز من اللہ" میں ذکر کیں، مثلاً:

(۱) لَوْلَا حُدْثَانُ عَهْدِ قَوْمِكِ	اگر تیری قوم کا زمانہ کفر کے قریب نہ

بِالْكُفْرِ لَاتَمَمْتُ الْبَيْتَ عَلٰى قَوَاعِدِ اِبْرَاهِيْمَ۔ ہوتا تو میں بیت اللہ کو ابراہیم (علیہ السلام) کی بنیادوں پر کھڑا کر دیتا۔

(۲) وَلَوْ كُنْتُ رَاجِمًا بِغَيْرِ بَيِّنَةٍ لَرَجَمْتُ هٰذِهِ۔ اگر میں بغیر دلیل کے کسی کو سنگسار کرتا تو اس عورت کو کرتا۔

(۳) وَلَوْ لَاَانْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِيْ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ۔ اگر میں اپنی امت پر گراں نہ سمجھتا تو ضرور انہیں مسواک کا حکم دیتا۔

اور اسی طرح دیگر احادیث سب مستقبل سے متعلق ہیں۔ تقدیر کے معاملہ میں یہ محل اعتراض نہیں اور نہ ہی اس میں کراہت ہے کیونکہ آپ ﷺ نے ان امور کے بارے میں خبر دی ہے جن کو آپ مانع نہ ہونے کی صورت میں سرانجام دے سکتے ہیں اور آپ کی قدرت میں ہیں اور جو گزر جائے وہ قدرت سے باہر ہو جاتا ہے۔

قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میرے نزدیک حدیث کا معنی یہ ہے کہ نہی اپنے ظاہر اور عموم کے اعتبار سے نہی تزیہہ ہے اور اس پر حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا یہ فرمان دال ہے:

فان لو تفتح عمل الشيطن۔ بے شک اگر یا کاش کا لفظ شیطان کا عمل کھولتا ہے۔

یعنی دل میں تقدیر کا معارضہ ڈالتا ہے اور شیطان اس سے وسوسہ ڈالتا ہے۔ یہ قاضی عیاض کا کلام ہے۔ مین کہتا ہوں: یہ ماضی میں اگر یا کاش کے استعمال سے متعلق ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

لَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِيْ مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا سُقْتُ الْهَدْيَ۔ اگر اپنا معاملہ مجھے پہلے معلوم ہوتا جو بعد میں معلوم ہوا تو میں قربانی ساتھ نہ لاتا۔

وغیرہ تو ظاہر ہے کہ ایسے امور میں ان الفاظ کے اطلاق سے ممانعت ہے جن میں کوئی فائدہ نہیں، تو نہی تنزیہہ ہوگی نہ کہ تحریم۔ لہٰذا جس شخص کی اطاعت الٰہی کی قضا پر اظہار افسوس

کرتے ہوئے یہ کہا اس طرح کا کوئی اور امر پیش نظر تھا' تو اس پر کوئی حرج نہیں۔ اور یہ اکثر استعمال ہوتا ہے جس کی متعدد امثلہ احادیث مبارکہ میں موجود ہیں۔ واللہ اعلم۔

(شرح النووی علی مسلم: ۶/ ۲۱۶)

شیخ ابن قیم نے بہت اچھا کہا ہے کہ یہ جہالت ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کیونکہ ایک عالم' عاقل اور عارف اعتماد کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا' اس لیے کہ یہ بھی کبھی انسان کی زبان پر عادتاً جاری ہوتا ہے اور اس کا حقیقی معنی مقصود نہیں ہوتا۔

شیخ ابن قیم (زاد المعاد: ۲/ ۳۵۶) میں کہتے ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک امر کے گزر جانے کے بعد قائل کو اس قول سے منع فرمایا کہ یوں نہ کہو:

لو انی فعلت کذا و کذا۔ کاش کہ میں ایسے ایسے کرتا۔

اور فرمایا کہ "کاش کا لفظ شیطان کا عمل کھولتا ہے۔" اور اس کو وہ کہنے کی ہدایت دی جو اس کلمہ سے کہیں زیادہ نفع بخش ہے کہ یوں کہو:

قدر اللہ وما شاء فعل۔ اللہ کی تقدیر ہے' جو اس نے چاہا کر دیا۔

یہ اس لیے کہ اس کا یہ قول "اگر میں ایسے ایسے کرتا تو میرے ہاتھ سے نہ نکلتا جو نکل گیا یا میں اس کام میں نہ پڑتا جس میں پڑ گیا۔" ایک ایسا کلام ہے جس پر قطعاً کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ یہ امر گزر گیا ہے' آنے والا نہیں اور گزرے ہوئے یعنی غیر مستقل نے اسے "کاش" کے لفظ سے ہلاک کر دیا' اس لیے کہ "لو" (کاش) کے ضمن میں یہ دعویٰ پنہاں ہے کہ امر اگر اس کے خیال کے مطابق ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی قضاء اور قدر و مشیت کا غیر ہوتا' اور جو اس کی تمنا کے خلاف واقع ہوا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور قدر و مشیت کے تحت ہے۔ تو جب اس نے کہا: "اگر میں ایسا کرتا تو واقع کے خلاف ہوتا۔" تو یہ محال ہے' کیونکہ تقدیر الٰہی میں طے شدہ امر کا خلاف محال ہے تو لازماً اس کا کلام کذب و جہل اور محال کو متضمن ہوا' اگر تقدیر کی تکذیب سے محفوظ بھی

ہو لیکن اس کے معارضہ سے محفوظ نہیں رہے گا' جو اس قول سے ہے: "اگر میں ایسے کرتا تو اسے ہٹالیتا جو اللہ نے میرے مقدر میں کیا تھا۔"

ایک وہم اور اس کا ازالہ

اگر یہ کہا جائے کہ اس میں تقدیر کا رد یا اس کا انکار نہیں' کیونکہ یہ اسباب بھی تقدیر ہیں جن کی اس نے تمنا کی اور کہا کہ اگر اس قدر کو پالیتا تو اس کی وجہ سے وہ قدر مجھ سے دور ہو جاتی اور ایک قدر سے دوسری کا ٹل جانا مسلم ہے' جیسے مرض کی قدر دوا سے 'گناہوں کی قدر توبہ سے اور دشمن کی قدر جہاد سے ٹل جاتی ہے' حالانکہ ہر دو کا تعلق تقدیر سے ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات حق ہے' لیکن یہ مکروہ قدر کے وقوع سے پہلے نفع بخش ہے۔ جب قدر واقع ہو جائے تو اس کے دور کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں' ہاں اگر کسی اور قدر کے ساتھ اس کے دفعیہ یا تخفیف کا کوئی راستہ ہو تو وہ اس زبانی قول سے کہیں بہتر ہے کہ "کاش میں اسے کر لیتا۔۔۔" بلکہ ایسی حالت میں اس کا عمل یہ ہے کہ اس فعل کی طرف توجہ کرے' جس سے واقع ہونے والی قدر کا دفعیہ ہے یا اس کے اثر میں تخفیف ہو اور اس امر کی تمنا نہ کرے جس کے حصول میں کوشاں نہیں' کیونکہ یہ محض عجز اور کمزوری ہے اور اللہ تعالیٰ عجز پر ملامت کرتے ہیں' جبکہ محنت کرنا ضروری اور مامور بہ ہے۔ محنت کا مطلب ہے کہ ان اسباب کا دستیاب کرنا جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وہ مسببات وابستہ کئے ہیں جو بندے کی معاش و معاد میں اس کے لیے نفع بخش ہیں تو یہ محنت بھلائی کا دروازہ کھولتی ہے' اور عجز (سستی) شیاطین کا عمل کھولتی ہے۔ لامحالہ جب انسان نفع بخش امور سے عاجز ہو جاتا ہے تو خواہشات باطلہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے' اور طرح طرح کی باتیں کرتا ہے: "اگر ایسے ایسے ہو جائے۔۔۔ اور اگر میں ایسا کروں۔" تو اس پر شیاطین کا عمل کھل جاتا ہے تو گویا اس کا خلاصہ تھک ہار جانا اور سستی ہے یعنی عجز و کسل۔ اس لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں

سے پناہ مانگی۔ دعائیہ الفاظ یوں وارد ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعِجْزِوَالْکَسَلِ۔	اے اللہ میں عجز و کسل سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

یہ دونوں برائی کی جڑ ہیں۔ پریشانی' افسردگی' بزدلی' بخل اور مقروض و مغلوب ہو جانا' سب انہی کی شاخیں ہیں۔ امام بخاری نے (الدعوات:۱۱/ ۱۴۸) میں روایت کیا ہے کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ان سب سے بایں الفاظ اللہ کی پناہ مانگی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعِجْزِ وَالْکَسَلِ وَالْبُخْلِ وَالْجُبْنِ وَضَلَعِ الدَّیْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ۔	اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں غم و اندوہ سے' عجز و کسل سے' بخل' بزدلی اور مقروض و مغلوب ہونے سے۔

لہٰذا ان تمام بیماریوں کی جڑ عجز اور کسل ہے' جس کا عنوان "اگر یا کاش" کا لفظ ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "بے شک اگر یا کاش کا لفظ شیاطین کا عمل کھولتا ہے۔" لہٰذا تمنا کرنے والا سب سے زیادہ بیکار اور مفلس ہے' کیونکہ تمنا مفلسوں کا راس المال ہے اور عجز ہر برائی کی کنجی ہے۔

بہرحال تمام گناہوں کی بنیاد عجز (بیکاری) ہے۔ آخرکار بندہ عبادات کے اسباب سے عاجز ہو جاتا ہے اور ان اسباب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جو اس کو گناہوں سے روک سکیں' اور اس کے اور معاصی کے درمیان حائل ہو سکیں تو وہ گناہوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ حدیث بڑی جامع ہے۔ فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعِجْزِوَالْکَسَلِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ۔	اے اللہ میں عجز و کسل سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور غم و اندوہ سے بھی تیری پناہ مانگتا ہوں۔

لہٰذا برائی کے اصول و فروع' مبادی و غایات اور موارد و مصادر یہی چیزیں ہیں۔

غیرت فاروقی اور شجرۂ رضوان

شجرۂ رضوان سے مراد وہ مبارک درخت ہے جس کے نیچے صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بیعت لی۔

علامہ ابن سعد نے "الطبقات" میں نافع سے روایت کیا ہے:

كان الناس ياتون الشجرة التي يقال لها: شجرة الرضوان' فيصلون عندها قال: فبلغ ذلك عمر بن الخطاب' فاوعدهم فيها' وامر بقطعها فقطعت۔ (التبرک المشروع والتبرک الممنوع از علی بن نفیع علیانی: ص ٦٥)	لوگ ایک درخت کے پاس آتے جسے شجرہ رضوان کہا جاتا تھا اور اس کے پاس نماز پڑھتے۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کی خبر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہوئی' تو آپ نے اس مسئلے میں انہیں زجر و توبیخ کی اور درخت کے کاٹ دینے کا حکم دیا تو اسے کاٹ دیا گیا۔

اس نص کے ساتھ وہ لوگ بڑے خوش ہوتے ہیں جو صحیح ثابتہ آثار نبویہ کے ساتھ تبرک کے منکر ہیں۔ ہمارا مقصود جیسا کہ واضح ہے کہ وہ تبرک شرعی ہے اور توجہ محض اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف ہے اور اسی سے دعا اور استعانت ہے۔ صرف توسل صاحب مکان کے ساتھ ہے اور یہ توسل جائز ہے' سنت نبویہ میں وارد ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے' جیسا کہ آپ ﷺ نے اعرابی کو توسل کی تعلیم دی۔ رہا وہ استدلال جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درخت کٹوانے سے کیا جاتا ہے' وہ قطعاً باطل ہے۔ کیونکہ جس درخت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کٹوادیا وہ ایک اور درخت تھا اور لوگوں کے گمان میں وہی شجرہ رضوان تھا اور اس کے پاس آکر نماز

پڑھتے اور انتہائی توجہ سے اس کا قصد کرتے۔ لامحالہ یہ عمل باطل ہے کیونکہ وہ ایسی چیز کے پاس عمل تھا جس کی نسبت وہ جس ہستی کی طرف کرتے تھے وہ ثابت اور صحیح نہیں تھی کہ وہ اس درخت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مشکوک نسبت پر جلیل القدر صحابی کی غیرت شدت اختیار کر گئی۔

اس پر دلیل یہ ہے کہ وہ درخت نامعلوم ہے' اللہ تعالیٰ نے اس کا مقام و محل امت مسلمہ کو بھلا دیا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے شب قدر کی گھڑی کا تعین اپنے نبی ﷺ پر فراموش کر دیا' اور یہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کا مصداق ہے جو بخاری میں موجود ہے:

إِنَّهُ جَاءَ فِي الْعَامِ التَّالِي لِعَامِ بَيْعَةِ الرِّضْوَانِ قَالَ: فَبَحَثْنَا عَنِ الشَّجَرَةِ فَلَمْ يَقَعْ عَلَيْهَا رَجُلَانِ۔

کہ آپ رضی اللہ عنہ بیعت رضوان کے آئندہ سال آئے' فرماتے ہیں کہ ہم نے شجرۂ رضوان کی بابت دریافت کیا تو دو آدمی بھی اس کی نشاندہی نہ کر پائے۔

اور امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ ان کے والد فرماتے ہیں:

لَقَدْ رَأَيْتُ الشَّجَرَةَ ثُمَّ أُنْسِيتُهَا بَعْدُ فَلَمْ أَعْرِفْهَا' قَالَ مَحْمُودٌ: ثُمَّ أُنْسِيتُهَا بَعْدُ۔

میں نے شجرۂ رضوان کو دیکھا ہے پھر بعد میں مجھے وہ بھلا دیا گیا پھر میں نے اسے نہیں پہچانا' محمود (بن غیلان جو امام بخاری کے شیخ ہیں) فرماتے ہیں: پھر بعد میں مجھے وہ بھلا دیا گیا۔

طارق بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ میں حج کی نیت سے جا رہا تھا کہ میں ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرا جو نماز پڑھ رہی تھی' میں نے پوچھا: کیا یہ مسجد ہے؟ انہوں نے کہا: یہ وہ درخت ہے جس کے نیچے حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے بیعت رضوان لی۔ تو میں سعید بن مسیب کے پاس آیا اور انہیں خبر دی' تو سعید فرماتے ہیں کہ مجھے میرے

والد (مسیب) نے بتایا ہے' جو شجرۂ رضوان کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کا شرف حاصل کرنے والوں میں شامل ہیں کہ جب ہم آئندہ سال آئے تو ہمیں وہ درخت بھلا دیا گیا اور ہم اس پر قادر نہیں ہو سکے۔ سعید فرماتے ہیں کہ اصحاب رسول ﷺ تو اس درخت کو نہیں جانتے' اور تم اس کو جانتے ہو؟ اور تم زیادہ جاننے والے ہو۔

ان دونوں کو امام بخاری نے کتاب المغازی' باب غزوۃ الحدیبیہ میں روایت کیا۔

حفاظ ابن حجر فرماتے ہیں: اس کا قول "نسیناها" کشمیہنی کی روایت میں "انسیناها" ہے یعنی ہمزہ مضموم اور نون ساکن کے ساتھ۔ کہ ہمیں اس کی جگہ ہی بھلا دی گئی' اس مفہوم پر "فلم نقدر علیها" کے الفاظ شاہد ہیں۔

سعید بن مسیب کا یہ کہنا:

إِنَّ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ ﷺ لَمْ يَعْلَمُوهَا وَعَلِمْتُمُوهَا أَنْتُمْ؟ فَأَنْتُمْ أَعْلَمُ.	اصحاب رسول ﷺ تو اس درخت کو نہیں جانتے اور تم جانتے ہو؟ اور تم زیادہ جاننے والے ہو۔

کلام انکاری ہے' اور "فانتم اعلم" کا جملہ غصہ کی حالت پر دال ہے۔ قیس بن ربیع کی روایت میں ہے کہ لوگوں کی باتیں بہت زیادہ ہیں۔

(فتح الباری: ۷ / ۵۶۸)

امام بخاری نے سعید ابن مسیب سے روایت کیا کہ ان کے والد شجرۂ رضوان کے نیچے بیعت کی سعادت سے بہرہ ور ہونے والوں میں شامل تھے' کہتے ہیں کہ جب ہم آئندہ سال آئے تو ہم پر وہ مخفی کر دیا گیا۔ اور اسی طرح امام بخاری نے طارق سے روایت کیا کہ میں نے سعید بن مسیب کے پاس شجرہ رضوان کا ذکر کیا تو وہ مسکرائے اور کہا کہ مجھے میرے والد نے خبر دی کہ جو اس کے شاہد ہیں۔ ان دونوں کو امام بخاری نے کتاب المغازی' باب غزوۃ الحدیبیہ میں روایت کیا۔

سعید کے والد مسیب کا قول:

لَقَدْ رَاَیْتُ الشَّجَرَةَ ثُمَّ اُنْسِیْتُهَا بَعْدُ فَلَمْ اَعْرِفُهَا۔

میں نے درخت دیکھا ہے بعد میں مجھے بھلا دیا گیا اور میں اسے نہیں پہچانتا۔

اور طارق بن عبدالرحمٰن کا قول:

طلعت حاجا فمررت بقوم یصلون، فقلت: ما هذا المسجد؟ قالوا: هذا الشجرة حیث بایع رسول الله ﷺ بیعة الرضوان، فاتیت سعید بن المسیب فاخبرته، فقال: حدثنی ابی: انه کان فیمن بایع تحت الشجرة، قال فلما خرجنا من العام المقبل نسیناها، وعلمتموها انتم؟ فانتم اعلم۔

میں حج کی نیت سے چلا تو ایک قوم سے گزر ہوا جو نماز پڑھ رہی تھی، میں نے پوچھا کیا یہ مسجد ہے؟ انہوں نے کہا یہ وہ درخت ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان لی، تو میں نے سعید بن مسیب کو آکر خبر دی۔ انہوں نے کہا مجھ سے میرے والد نے بیان کیا جو ان افراد میں شامل تھے جنہوں نے درخت کے نیچے بیعت کی کہ جب ہم آئندہ سال آئے تو ہم اس درخت کو بھول گئے۔ اور تم اس کو جانتے ہو؟ اور تم زیادہ جاننے والے ہو۔

اور ایک روایت میں ان کے یہ الفاظ مروی ہیں:

فَعُمِّیَتْ عَلَیْنَا۔ وہ ہم پر مخفی کر دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دونوں اشخاص کی آراء درخت کے تعین میں متفق نہیں۔ جب ایک عہد میں ایک سال کے وقفہ میں اس درخت کا یہ حال ہے باوجودیکہ اس وقت بیعت رضوان کی سعادت حاصل کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثرت موجود تھی، تو اس وقت درخت کے حال کی بابت تیرا کیا خیال ہو گا؟ جب وہ کئی سالوں بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ظہور پذیر ہوا، جبکہ دور بھی بدل گیا

اور اکثر موقع کے شاہد صحابہ وصال فرما گئے۔ لہٰذا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو اس لیے نہیں کٹوایا کہ آثار کے ساتھ تبرک منع ہے اور نہ ہی یہ معنی آپ کا مقصود تھا اور نہ ہی آپ کے دل میں ایسا وہم پیدا ہوا کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تو تبرک ثابت ہے اور آپ نے تو آثار کے ساتھ تبرک طلب کیا' جیسا کہ آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے وہ نیزہ یا بھالا مانگا جو رسول اللہ ﷺ کے پاس تھا اور رسول اللہ ﷺ نے وہ زبیر سے ادھار لیا تھا۔ جیسا کہ صحیح بخاری باب شہود الملائکہ بدر اکتاب المغازی میں ہے۔ (صحیح البخاری بالقسطلانی: ۶/ ۲۶۴)

احتمال دیگر

یہاں ایک اور احتمال بھی ہے جو بڑا قوی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حال و زمان سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے' وہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا درخت کو کٹوا دینا شرک کے سدباب کے لیے تھا کیونکہ اس کے شبہات ابھی ذہنوں میں جاگزیں یا قریب قریب تھے' اس کے اثرات نے آہستہ آہستہ زائل ہونا تھا جو عرصہ دراز کی پرانی ریت تھی اور تبرک کی ممانعت کے لیے ایسا نہیں کیا۔ تبرک اور شرک میں تو بہت بڑا فرق ہے' تبرک سے تو اللہ اور اللہ کی قدرت پر ایمان پختہ ہوتا ہے' اور یہ عمل صالح کے آثار کے تبرک کی پختہ دلیل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل ان کا ذاتی اجتہاد ہے تاکہ شرک کا مکمل خاتمہ ہو جائے اور اس کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے' لہٰذا یہ ایک موقع و محل کی مناسبت سے امیر المومنین کا اجتہاد ٹھہرا نہ کہ شریعت نبویہ' ارے تعجب تو یہ ہے کہ جو لوگ یہاں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فعل سے استدلال کرتے ہیں' وہی بیس رکعت تراویح کے مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل کی مخالفت کرتے ہیں اور آٹھ رکعت پڑھتے ہیں۔ بہرحال یہ کوئی دین نہیں' محض مخالفت کی عادت ہے جو لوگوں میں سرایت کر چکی ہے۔ (العیاذ باللہ)

(الرد المحکم المنیع علی منکرات وشبہات ابن منیع از سید یوسف ہاشم رفاعی: ص ۷۵)

شیخ محمد بن عبدالوہاب، شیخ آل بوطامی کی نظر میں

ان کے یہاں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے متبعین پر افتراءات کا ازالہ مقصود ہے۔

وفاقی شرعی عدالت کے قاضی شیخ احمد بن حجر آل بوطامی، آل بن علی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں: شیخ مجدد شہیر محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان تمیمی کے بیشتر معاصرین نے ان پر اور ان کے پیروکاروں پر افترا باندھا اور اکثر متاخرین اسی کو ہی نقل کرتے چلے آئے، اور بیشتر حضرات نے اپنے آپ کو اہل علم اور ان کو عوام کی صف میں شامل کیا اور شیخ موصوف رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے متبعین کی طرف یہ منسوب کیا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس کو ملحوظ نہیں رکھتے بلکہ ان میں سے کسی کا یہ کہنا بھی ہے کہ "میری لاٹھی رسول سے بہتر ہے۔" علماء و صالحین کو کوئی مقام نہیں دیتے، رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے منکر ہیں، آپ ﷺ کی قبر انور اور تمام مومنین کی قبور کی زیارت کو حرام قرار دیتے ہیں، رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھنے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، ائمہ کی کتب کی کوئی پرواہ نہیں کرتے بلکہ ان کو جلادیتے ہیں اور ردی میں ڈال دیتے ہیں، ان کی تقلید کو جائز نہیں سمجھتے، مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں ماسوا اس کے جو ان کے عقیدہ پر ہو اور مولد نبوی پڑھنے کو حرام ٹھہراتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

ان سب افتراءات کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام امور جو ان کی طرف منسوب ہیں، جھوٹ ہے، صحت سے ان کا دور کا واسطہ بھی نہیں، دیکھیں ان کی کتب آپ کے سامنے ہیں، فروخت اور تقسیم ہوئی ہیں، جو شخص ان مزاعم کا جھوٹ پہچاننا چاہے وہ ان کی کتب کا مطالعہ کرے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمتہ اللہ علیہ نے نجد و حجاز اور بصرہ و عراق کے اکثر اہالیان کو دیکھا (جیسا کہ دیگر ریاستوں سے نقل تواتر کے ساتھ سنا

گیا) کہ وہ لوگ انبیاء' اولیاء اور صالحین کی قبور کی پرستش کرتے ہیں' بلکہ متعدد سرنگوں' غاروں اور درختوں میں نفع و ضرر کا وہ اعتقاد رکھتے ہیں' ان کی قبور کے گرد طواف کرتے ہیں اور ان قبور و اشجار کے لیے نذریں مانتے ہیں' ان کے لیے نذرانے لاتے ہیں' انبیاء اور صالحین کی قسمیں اٹھاتے ہیں اور مصائب و آلام اور مشکلات میں ان سے استغاثہ کرتے ہیں تاکہ مصائب و آلام کا دفعیہ ہو' مشکلات حل ہوں اور حاجات بر آئیں اور لاپرواہی کو دیکھا' جس کا سبب ان کی بدعت و ضلالت میں زیادتی تھی' ایسے ہی انہوں نے اس دور کے علماء کو ایسے باطل اور منکر امور پر سکوت کرتے دیکھا الا ماشاء اللہ' تو ان کے عزم و ہمت میں تقویت آئی کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے لوگوں کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دی اور ان کو توحید باری تعالیٰ اور اس کے افراد کی صحیح معرفت کی طرف بلایا اور ان کو واضح کیا کہ تمہارا یہ اعتقاد کہ اللہ تعالیٰ خالق' رازق' زندہ کرنے والا' موت دینے والا اور تدبیر فرمانے والا ہے' تمہیں اللہ کے عذاب سے نجات نہیں دے گا جب تک تم اللہ کے لیے مخلص نہ ہو اور اپنی عبادات میں قصد و ارادہ کے ساتھ اس کو ایک نہ مانو' اور تم ہو کہ اس کے ساتھ نبی' ولی یا درخت کو شریک ٹھہراتے ہو۔

اور ان کے لیے توحید کی اقسام بیان کیں: توحید الوہیت' توحید ربوبیت اور توحید اسماء و صفات۔ اور ان کے لیے واضح کیا کہ محض توحید ربوبیت کا اعتقاد انسان کے اسلام میں داخل ہونے کے لیے کافی نہیں' کیونکہ پہلے مشرکین بھی یہ اعتقاد رکھتے تھے' اس کے باوجود اسلام میں داخل نہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ فرماتے ہیں:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ۔	اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کس نے بنائے تو ضرور کہیں گے کہ انہیں بنایا اس عزت والے علم والے نے۔

(الزخرف: ۹)

بلکہ اس کے ساتھ ساتھ توحید عبودیت ضروری ہے' عبادت کا لفظ ان جمیع اقوال واعمال کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند اور محبوب ہیں۔ پس نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' طواف نذر' خشیت' رغبت' توکل' ذبح' اور استغاثہ' تمام کے تمام عبادت کے افراد ہیں' لہٰذا جس نے غیراللہ کے لیے نذر مانی یا اس سے استغاثہ کیا یا قبور کا طواف کیا' یا ان کے واسطے سے بھلائی اور نفع کے حصول کا اعتقاد رکھا' یا یہ اعتقاد رکھا کہ ان سے اللہ کی بارگاہ میں قربت حاصل ہوگی تو وہ مشرک ہے۔

شیخ نے اپنی دعوت پر آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے استدلال کیا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

(۱) يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ.

(البقرۃ: ۲۱)

اے لوگو! اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔

(۲) وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُوْنَ.

(المومنون: ۱۱۷)

اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو پوجے جس کی اس کے پاس کوئی سند نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے یہاں ہے بے شک کافروں کا چھٹکارا نہیں۔

(۳) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ.

(یونس: ۱۰۶)

اور اللہ کے سوا اس کی بندگی نہ کر جو تیرا بھلا کر سکے نہ برا پھر اگر ایسا کرے تو اس وقت تو ظالموں سے ہو گا۔

(۴) اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ

وہ جنہیں اللہ کے سوا تم پوجتے ہو ایک مکھی نہ بنا سکیں گے۔ اگرچہ سب اس پر

اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ وَاِنۡ يَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَيۡـًٔا لَّا يَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ۔
(الحج: ۷۳)

اکٹھے ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین کر لے جائے تو اس سے چھڑا نہ سکیں کتنا کمزور چاہنے والا اور جس کو چاہا۔

"من دون الله" کا کلمہ اللہ کے سوا ہر معبود کو شامل ہے چاہے نبی ہو یا ولی' بادشاہ ہو یا کوئی اور۔ نیز شیخ نے صالحین اور اولیاء کی عبادت سے ممانعت پر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا:

(۵) وَلَا يَاۡمُرَكُمۡ اَنۡ تَتَّخِذُوا الۡمَلٰٓـئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرۡبَابًا اَيَاۡمُرُكُمۡ بِالۡكُفۡرِ اِذۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ۔

اور نہ تمہیں یہ حکم دے گا کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہرالو۔ کیا تمہیں کفر کا حکم دے گا اور بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو لیے۔

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حضرت مسیح علیہ السلام سے سوال کرے گا تاکہ ان کی عبادت کرنے والے اور اللہ کے سوا ان کو "الہ" ماننے والے پچھتائیں اور روئیں۔ سوال یہ ہو گا' اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(٦) وَاِذۡ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ ءَاَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِىۡ وَاُمِّىَ اِلٰهَيۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ۔

اور جب اللہ فرمائے گا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ (سلام اللہ علیہما) کیا تو نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو دو خدا بنالو اللہ کے سوا۔

وہاں اللہ کے پیغمبر حضرت مسیح علیہ السلام بری ہو جائیں گے اور یوں جواب عرض کریں گے:

قَالَ سُبۡحٰنَكَ مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اَقُوۡلَ مَا لَـيۡسَ لِىۡ بِحَقٍّ اِنۡ

عرض کرے گا پاکی ہے تجھے' مجھے روا نہیں کہ وہ بات کہوں جو مجھے نہیں پہنچتی'

كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۔(المائدہ: ۱۱۶)	اگر میں نے ایسا کہا تو ضرور تجھے معلوم ہو گا' تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہے۔ بے شک تو ہی ہے سب غیبوں کا خوب جاننے والا۔

تو جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پرستاروں کو رسوا کر رہا ہے' حالانکہ وہ نبی اور رسول ہیں' تو غیر کی عبادت کرنے والوں کا کیا حال ہو گا؟

مختصرا یہ کہ شیخ نے ان کو کتاب و سنت کے ساتھ پختہ وابستگی کی ترغیب دلائی اور شرک و بدعت کے ترک کرنے کی دعوت دی' تو اس پر جہلاء' اہل بدعت و ضلالت اور علماء سوء نے قیامت برپا کر دی اور شیخ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا' اور محض تاریخ کے اوراق پر اعتماد کر کے ان افتراءات (الزامات) کا شیخ کو ذمہ دار ٹھہرایا۔

ان مزاعم کی تکذیب کے لیے قاری کی خدمت میں:

ہم کہتے ہیں کہ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمیع مخلوق سے بلکہ تمام انبیاء و مرسلین سے افضل و اعلیٰ ہیں اور آپ ﷺ کی شفاعت عظمیٰ اور دیگر تمام شفاعات پر ایمان رکھتے ہیں۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمتہ اللہ علیہ اپنے رسالہ میں فرماتے ہیں جو انہوں نے اہل قصیم کے لیے لکھا:

واومن بشفاعته صلی الله علیه وسلم وانه اول شافع واول مشفع ولا ینکر شفاعه النبی الا اهل البدع والضلال ولکنها لا تکون الا من بعد الاذن والرضا کما قال الله	میں نبی کریم ﷺ پر ایمان رکھتا ہوں' بے شک وہ سب سے پہلے شفاعت کرنے والے ہیں اور سب سے پہلے انہی کی شفاعت قبول ہوگی۔ نبی ﷺ کی شفاعت کا انکار بدعتی اور گمراہ کے سوا کوئی نہیں کرتا' لیکن شفاعت اللہ تعالیٰ کے اذن

تعالیٰ: مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔	اور رضا کے بعد ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ کون ہے جو اس کے یہاں سفارش کرے بے اس کے حکم کے۔ (البقرہ: ۲۵۵)

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کو بہت بڑی نیکی اور افضل عبادت جانتے ہیں' بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کو نماز کا رکن سمجھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے بغیر نماز صحیح نہیں جبکہ تمام مذاہب میں اسے فقط سنت کا درجہ دیتے ہیں۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت کی محبت و تعظیم میں ان سے بڑھ کر کون ہے؟ اور ان میں سے کسی نے نہیں کہا کہ "میری لاٹھی رسول سے بہتر ہے۔" بلکہ لاٹھی تو ایک طرف وہ اس کے بھی قائل نہیں کہ ابراہیم خلیل اللہ رسول ﷺ سے بہتر ہیں اور نہ ہی وہ رسول اللہ ﷺ کی قبرانور کی زیارت کو حرام ٹھہراتے ہیں اور نہ ہی دیگر جمیع قبور کی زیارت کو' بلکہ وہ اسے مسنون کہتے ہیں' ہاں البتہ عورتوں کو قبور کی زیارت سے منع کرتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ حدیث ہے:

لَعَنَ اللّٰهُ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِیْنَ عَلَیْهَا الْمَسَاجِدَ۔ (الحدیث)	اللہ کی لعنت ہو قبور کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور ان پر مسجدیں بنانے والوں پر۔

لیکن انبیاء علیہم السلام وغیرہم کی قبور کی طرف رخت سفر باندھنے کو حرام ٹھہراتے ہیں' جس پر دلیل یہ حدیث لاتے ہیں:

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدِ مَسْجِدِیْ هٰذَا وَالْمَسْجِدُ الْحَرَامُ وَالْمَسْجِدُ الْاَقْصٰی۔	رخت سفر نہ باندھا جائے مگر تین مسجدوں کی طرف: یہ میری مسجد' مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ۔

اور مناسب یہی ہے کہ زیارت مسجد کی نیت کرے تاکہ نص حدیث پر عمل ہو جائے(۱) اور جب وہاں چلا جائے تو رسول اللہ ﷺ اور صاحبین (صدیق و فاروق) رضی اللہ عنہما پر سلام کہے اور جنت البقیع کی بھی زیارت کر لے۔

جب مومنین کی جمیع قبور کی زیارت سنت ہے' جیسے حدیث وارد ہے:

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُورِ فَزُورُوهَا۔ — میں نے تمہیں قبور کی زیارت سے منع کیا تھا' پس اب تم ان کی زیارت کیا کرو۔

تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور کی زیارت کیسے ممنوع ہو سکتی ہے۔

اور وہ تمام مذاہب کے علماء اور صالحین کو بہت بڑا مقام دیتے ہیں اور ان کی کتب کو بھاری قیمت میں خرید کر ان سے استفادہ کرتے ہیں' لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ علماء و صالحین حتیٰ کہ انبیاء و مرسلین عبادت کے مستحق نہیں' کیونکہ عبادت اللہ رب العالمین کے ساتھ مختص ہے کیونکہ ہم جب ان کو الٰہ مان کر ان کی عبادت کرتے ہیں تو وہ اسے پسند نہیں کرتے' لہذا ہم پر ضروری ہے کہ ہم ان کی تعظیم کریں اور ان کی ہدایت کی پیروی کریں جو رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے موافق ہے' اور ان کے علم اور کتب سے نفع حاصل کریں۔

مزید لکھتے ہیں کہ وہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والوں کی تکفیر نہیں کرتے' جیسا کہ اہل سنت کا مذہب ہے اور نہ ہی وہ سب لوگوں کو کافر کہتے ہیں' جیسا کہ جھوٹوں کا خیال ہے' بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ جو غیر اللہ کی عبادت کرے' جیسے نبی یا ولی کی قبر' کسی درخت یا غار کا نماز' صدقہ' نذر یا ذبح کے ساتھ تقرب حاصل کرنا یا مخلوق میں نفع و ضرر کا اعتقاد رکھنا' تو وہ مشرک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

(۱) یاد رہے کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے اس کو عقائد میں مداخلت نہیں' اور مسئلہ توسل بھی ایک اختلافی مسئلہ ہے جو حلال حرام کے درمیان دائر ہے۔ جس طرح شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اپنے رسالہ میں اس کی وضاحت کی جس کو ہم نے "المفاہیم" میں نقل کیا کہ یہ ایک فقہی مسئلہ ہے۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (المومنون: ۱۱۷)	اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو پوجے، جس کی اس کے پاس کوئی سند نہیں، تو اس کا حساب اس کے رب کے یہاں ہے۔ بے شک کافروں کا چھٹکارا نہیں۔

اور فرمان باری تعالیٰ ہے:

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ۔ (المائدہ: ۷۲)	بے شک جو اللہ کا شریک ٹھہرائے تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

اور اللہ جل جلالہ کا ارشاد گرامی ہے:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا۔ (الکہف: ۱۱۰)	تو جسے اپنے رب سے ملنے کی امید ہو، اسے چاہیے کہ نیک کام کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔

کسی عقل مند مسلمان کو اس میں شک نہیں کہ طواف، نذر، ذبح، اور دعا سب عبادات ہیں، لہٰذا جب کوئی ان میں سے کسی ایک کو بھی غیر اللہ کے لیے کرے گا تو گویا اس نے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو شریک ٹھہرایا لیکن وہ کسی کی تکفیر کی جسارت نہیں کرتے، ہاں البتہ کتاب اللہ سے اس پر حجت قائم کرتے ہیں کہ انبیاء و مرسلین بھی عبادت کے مستحق نہیں، کیونکہ عبادت اللہ رب العالمین کے ساتھ مختص ہے۔ اور ہم جب ان کی عبادت کرتے ہیں اور انہیں معبود ٹھہراتے ہیں تو وہ اسے پسند نہیں کرتے (ہمارا، ہمارے آباؤ اجداد اور مشائخ کا یہی طریقہ ہے)

لیکن ہم پر ضروری ہے کہ ہم ان کی تعظیم کریں اور ان کی ہدایت میں پیروی کریں جو

رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے موافق ہے' اور ان کی تعلیم اور کتب سے استفادہ کریں۔

کیسے وہ علماء سے محبت نہ کریں جو انبیاء کے وارث اور اہل زمین کے ستارے ہیں؟ انہوں نے معتبر ائمہ کی تقلید کو حرام نہیں قرار دیا' باوجودیکہ مسئلہ تقلید میں اختلاف ہے۔ بعض علماء نے اس کو مطلقاً حرام ٹھہرایا' بعض نے اسے مطلقاً جائز قرار دیا اور بعض نے یہ کہا کہ مجتہد یا اجتہاد پر قادر شخص پر تقلید حرام ہے اور غیر قادر پر واجب۔

شیخ محمد بن عبد الوہاب حنبلی تھے اور ان کے پیرو کار بھی حنابلہ ہیں۔ اگر وہ تقلید کو حرام قرار دیتے تو حنابلہ نہ ہوتے اور وہ مقدمین اور سابقین حنابلہ کی اکثر کتب خصوصی طور پر پڑھتے ہیں' ان کی درس و تدریس کرتے ہیں اور استفادہ کرتے ہیں' اور دیگر مذاہب کے متبعین کی کتب کا عموماً مطالعہ کرتے ہیں۔

ہاں شیخ رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے متبعین ایسی دلیل سے تمسک لازم سمجھتے ہیں' جس کا کوئی معارض' مخصص اور ناسخ نہ ہو' اگرچہ وہ مذہب کے خلاف ہی ہو۔ ان کے علماء نے بعض مسائل میں مذہب کے خلاف دلیل پر اعتماد کیا ہے لیکن ایسا بہت کم ہے کہ وہ قول معتمد مذہب کے خلاف ہو' جس کی تائید میں دلیل موجود ہے' اور اس میں امام احمد رحمتہ اللہ علیہ کی روایت نہ ہو۔ علاوہ ازیں اگر ہم تسلیم جدلی کے طور پر مان بھی لیں کہ انہوں نے تقلید سے منع کیا ہے تو وہ اس میں منفرد نہیں' بلکہ اختلاف موجود ہے۔ یہ کتب اصول موجود ہیں جو ہر ایک کے امکان کو واضح کرتی ہیں' لہٰذا ضروری ہے کہ اجتہاد اور تقلید کا باب پڑھا جائے تاکہ مسئلہ تقلید میں اختلاف کی معرفت ہو' جب اختلاف ہے تو پھر نجدی حنابلہ کا ہی کیا قصور ہے؟

شیخ محمد بن عبد الوہاب اور محفل میلاد

لوگوں کا گمان ہے کہ وہ میلاد شریف پڑھنے کو حرام قرار دیتے ہیں تو یہ قائل کی انتہائی جہالت پر دلیل ہے' جیسے گزشتہ صفحات پر ان کی جہالت اور فاسد تعصب واضح ہے کیونکہ ہر وہ شخص جس کو علم کی بو تک بھی میسر ہے' جانتا ہے کہ محفل میلاد ساتویں

صدی ہجری میں شروع ہوا' جس کی ابتداء اربل کے حکمران ملک مظفر نے کی اور وہ بڑے بڑے عمدہ اور قیمتی کھانے تیار کراتا تھا' حتیٰ کہ منقول ہے کہ میلاد کی مبارک رات کو دس ہزار بکرے ذبح کئے جاتے تھے۔ اس سے پہلے چوتھی صدی ہجری میں فاطمیوں نے مصر میں یہ سبقت کی 'کہ ماتم کی بنیاد ڈالی اور ایک قبر بنا کر اس کا نام قبر حسین رکھا۔ حالانکہ یہ صریح جھوٹ ہے اس کا صحت سے کوئی واسطہ نہیں۔

بہرحال اس نئے امر کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ محفل میلاد بدعت حسنہ ہے' اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے' اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد احادیث وارد ہیں' جو بدعت اور نئے امور سے باز رکھنے میں کافی ہیں' مثلاً:

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ مِنْ بَعْدِيْ عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلَّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔ (رواہ الترمذی وحسنہ)	تم پر میری اور خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے' میرے بعد اس پر مضبوطی سے قائم رہو اور نئے امور پیدا کرنے سے بچو۔ بے شک ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی باعث جنہم ہے۔ (اس کو ترمذی نے روایت کیا اور اسے حسن کہا)

اور کوئی ایسی نص وارد نہیں جو اس عموم کی تخصیص کرے' تاکہ وہ گمان کریں کہ یہ بدعت حسنہ ہے۔

میلاد کا تذکرہ دراصل سیرت نبویہ کا ایک باب ہے' اور انسان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت' شمائل' معجزات' ہجرت اور غزوات کا تذکرہ کرنا یقیناً ایمان کو فروغ دیتا ہے اور اسے تقویت بخشتا ہے۔ ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ رسول ﷺ کی سیرت اور مناقب سے اتنا لگاؤ رکھے یہاں تک کہ اس رسول معظم ﷺ کی حقیقت سے آشنا ہو جائے' جس کو اللہ

تعالیٰ جل شانہ نے سب جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

شیخ محمد رحمتہ اللہ علیہ نے مختصر سیرت تالیف کی' جو متعدد بار شائع ہوئی ہے اور تمام علاقوں میں پھیلی اگر وہ محب رسول نہ ہوتے تو آپ ﷺ کی سیرت کی تالیف نہ کرتے' اور جو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہیں کرتا وہ مسلمان نہیں ہو سکتا بلکہ وہ یہودی یا مسیحی ہو گا۔

شیخ اور ان کے متبعین' لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت صحیحہ پر تمسک کی ترغیب دلاتے ہیں اور جو سنت رسول کی مخالفت کرے' اس پر تشدد کرتے ہیں اور اسے بدعتی شمار کرتے ہیں۔

کیا یہ ان کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کمال محبت و تعظیم کی دلیل نہیں؟ لیکن منحرف قسم کے لوگ ترانے' اشعار' رسول سے استغاثہ اور برزنجی وغیرہ پڑھنے میں رسول اللہ ﷺ کی محبت سمجھتے ہیں اور ایسا کرنے والے کو محب رسول ﷺ کا اعزاز بخشتے ہیں' اگرچہ وہ معاصی کا ارتکاب کرے اور امور فاحشہ اور منکرہ میں ملوث ہو اور جو ایسا نہیں کرتا وہ رسول خدا ﷺ کا محب نہیں۔

اس مقام میں لطیف فرق یہ ہے کہ ولادت و شمائل کے حوالے سے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قرات میں کوئی اختلاف نہیں' لیکن ماہ ربیع الاول کی بارہویں شب کو محفل منعقد کرنا' مخصوص کتاب کا پڑھنا' دف بجانا اور جو اختلاط اور امور محرمہ سے وقوع پذیر ہوتا ہے' یہ سب کچھ بدعت اور گناہ ہے اور اس کا مرتکب منکر اور بدعتی ہے۔

اگر ایسے امور رونما نہ ہوتے ہوں تو جو شخص سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھنے اور لوگوں کو آپ ﷺ کے اخلاق عظیمہ اور شمائل کریمہ سمجھانے کا ارادہ کرے تو اس میں کوئی ممانعت نہیں بلکہ مستحب ہے' جب چاہے کرے۔

جہاں تک ان اکاذیب اور افتراءات کا تعلق ہے' وہ کچھ اچھے برے لوگوں اور علماء سوء

نے شیخ کی دعوت سے نفرت دلانے کے لیے اس وقت ان کے ذمے لگائے' جب انہوں نے دیکھا کہ حکومت سعودیہ اس وقت مضبوط ہو چکی ہے اور سارا نجد اس کے زیر سلطنت آ چکا ہے نیز اس کی سلطنت عسیر' حجاز' عمان اور عراق کو اپنے دامن میں لے چکی ہے تو انہوں نے ایسی اشاعات اور توہمات کے ساتھ بھی حکومت سعودیہ سے جنگ کی' جیسے انہوں نے تلوار کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا لیکن تاریخ شاہد ہے' بہر حال اللہ تعالیٰ جل شانہ کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا کرے گا اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔

شیخ کی متعدد تصنیفات ہیں' جن میں سے زیادہ شہرت "کتاب التوحید" کو حاصل ہے' جس کی شرح شیخ عبدالرحمٰن بن حسن نے کی اور اس کا نام "فتح المجید بشرح کتاب التوحید" رکھا اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی "کتاب الکبائر و نصیحۃ المسلمین" اور "رسالہ کشف الشبہات" اور "مسائل الجاہلیہ" قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کے متعدد رسائل ہیں جیسے "ثلاثۃ الاصول۔"

(نقض کلام المفترین علی الحنابلہ السلفیین از شیخ احمد بن حجر آل بوطامی)

شیخ بوطامی کے کلام کا محاسبہ

شیخ احمد بوطامی کے کلام کا ابتدائیہ یہ ہے کہ

ان الشیخ محمد بن عبدالوھاب رای اکثر اھل نجدواھل الحجاز---الخ	شیخ محمد بن عبدالوہاب نے نجد و حجاز اور بصرہ و عراق کے اکثر اہالیان کو دیکھا..... آخر تک۔

میں کہتا ہوں کہ اہل حجاز کے متعلق یہ لکھنا تسلیم نہیں' اور اس کے علاوہ دیگر بلاد کا جو اس نے ذکر کیا وہ بھی اپنے اپنے شہر کے حالات کو بہتر جانتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے' جہاں تک حجاز مقدس اور بالخصوص حرمین شریفین کا تعلق ہے تو وہ دونوں علم کے مرکز اور علماء کا وطن ہیں۔ مسجد حرام اور مسجد نبوی عالمی تعلیمات اسلامیہ کو جامع ہے' جہاں کبار علماء دین مفسرین' محدثین' فقہاء اور صالحین کا بحر ذخار ہے۔ تراجم و تواریخ

کی کتب اس پر شاہد عادل ہیں۔ مثلاً علامہ فاسی کی "العقد الثمین"۔ "نشر النور والزہر" جو دسویں صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک علماء مکہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ "المختصر"۔ "نشر الدرر" اور "تراجم علماء المدینہ المنورہ" وغیرہ۔

حالانکہ اس وقت الصولیتہ 'الفخریہ اور الفلاح جیسے قدیم علمی مدارس موجود تھے اور اس کے ساتھ ساتھ مکتبہ حرم 'مکتبہ مکہ 'مکتبہ حرم نبوی 'مکتبہ عارف حکمت اور مکتبہ محمودیہ جیسے درجنوں مکاتب موجود تھے 'جو فروغ تعلیم کے لیے وقف تھے اور متعدد مدارس ایسے تھے جن میں مسافر و مقیم طلباء اور علماء کی رہائش کا بھی انتظام تھا اور بے شمار طلباء ان میں ہمہ وقت زیر تعلیم رہتے تھے۔ اس پر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب علماء حرمین سے حصول تعلیم اور استفادہ کے لیے حجاز مقدس پہنچا جیسا کہ اس کی سوانح عمری میں موجود ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں ایک مدت تک رہا اور علماء کی مجالس میں جاتا اور ان کے دروس کو سماعت کرتا اور ان سے خوب استفادہ کیا۔ اس وقت حجاز مقدس کے مستند محدث کبیر شیخ بصری کی تبلیغ و تدریس کا یہ فیض تھا کہ کوئی شہر بھی ان کے شاگردوں سے خالی نہ تھا بلکہ ہر کہیں آپ کا شاگرد مل جاتا تھا۔ تو شیخ نے ان سے استفادہ کیا جس طرح انہوں نے مدینہ منورہ کے مشہور محدث شیخ سندھی سے تعلیم حاصل کی اور مکہ مکرمہ میں مطبع ماجدیہ کے علاوہ دیگر مطابع و مکاتب بھی ایسے تھے جو مسجد حرام اور مسجد نبوی کے گرد کتب فروخت کرتے تھے۔ الحمد للہ جمیع بلاد ایمان 'اہل ایمان 'حفاظ قرآن اور علماء توحید سے آباد ہیں۔ اس کے باوجود معاملہ خلل و نقصان اور تقصیر و جہل سے خالی نہیں 'جیسا کہ ہر اجتماع اور ہر شہر میں رو پذیر ہوتا ہے۔ کمال مطلق تو اللہ وحدہ لا شریک کی ذات کے لیے ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

دوسرا باب

نبوت کا بیان

قرآن اور وصال رسول ﷺ

فرمان باری تعالیٰ ہے:

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ۔ (الزمر: ۳۰)

بے شک تمہیں انتقال فرمانا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے۔

بعض حضرات کی ہٹ دھرمی تو ہم نے یہاں تک دیکھی ہے کہ وہ اس فرمان خداوندی اور اس قسم کی دیگر آیات کا معنی و مفہوم کچھ اس انداز سے کرتے ہیں، جس سے ان کمالات بشریہ اور خصائص نبویہ کی نفی پر استدلال ہو سکے، جن سے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی جمیع مخلوق سے ممتاز ہوتی ہے اور پھر اس معنی پر خاصا زور بھی دیتے ہیں۔ ان آیات مبارکہ میں سے ایک یہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِکَ

اور ہم نے تم سے پہلے کسی آدمی کے

الْخُلْدَ اَفَئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُوْنَ-(الانبیاء: ۳۴)	لیے دنیا میں ہمیشگی نہ بنائی تو کیا اگر تم انتقال فرماؤ تو یہ ہمیشہ رہیں گے۔

کون ان آیات کا منکر ہے؟ کون یہ خیال کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ایسے زندہ ہیں جیسے دنیا میں تھے؟

یقیناً ایسی بات کوئی نہیں کرتا ہاں اگر کوئی جاہل اور کند ذہن جس کو قرآن و سنت کی ادنیٰ سی بھی معرفت نہ ہو یہ کہے تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں۔ لیکن جو ان آیات کو محل اعتراض بنائے وہ صحیح نہیں۔ بہرحال یہ آیات کریمہ تو لوگوں کو متنبہ کرتے ہوئے اس عقیدہ کی وضاحت کر رہی ہیں کہ بے شک محمد ﷺ پر بھی موت طاری ہوگی جو تمام بنی نوع بشر پر جاری ہوتی ہے' اور باقی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو ایسی زندہ ہے جس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔ یہ آیات مقدسہ اس واضح حقیقت کا اعلان کرنے کے ساتھ ساتھ اس باطل تصور کا قلع قمع بھی کر رہی ہیں' جو عقول جاہلیت میں اپنی جگہ بنا چکا تھا کہ کمالات انسانیہ و فضائل بشریہ اور زندگی کے درمیان ایک ایسا ربط اور تعلق ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا فضل و کمال بھی ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے اور تمام تر خصائص اس کے ساتھ ہی موت کے دامن میں چلے جاتے ہیں گویا کہ اس شخص کی کوئی قیمت اور فضیلت باقی نہیں رہتی بلکہ وہ اپنے تمام فضائل و خصائل کے ساتھ صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔

تو اس معنی کے فساد اور اس تصور کے بطلان کو واضح کرنے کے لیے اللہ کریم جل شانہ نے یہ آیات نازل فرمائیں' تاکہ تم ابوجہل' ابولہب اور مشرکین وغیرہ کو یہ بتا سکو کہ یقیناً محمد ﷺ بشر ہیں--- اور روئے زمین پر ہمیشہ نہیں رہیں گے بلکہ عنقریب وہ بھی موت کو اپنے دامن سے وابستہ کریں گے' جو موت عالم بنی نوع بشر پر طاری ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ موت آپ ﷺ کے کمالات اور عظمت و مرتبت میں کسی طرح کی کمی کا باعث نہیں بن سکتی اور نہ ہی آپ ﷺ کے درجہ و مقام پر موثر

ہو سکتی ہے' اگرچہ آپ ﷺ بھی ایک بشر ہیں اور روئے زمین پر ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ آخر آپ ﷺ کے وصال کا دن بھی آئے گا کیونکہ موت ہر بشر کی لکھی جا چکی ہے' جیسا کہ فرمان خداوندی ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ۔ ہر جان کو موت چکھنی ہے۔

(آل عمران: ۱۸۵)

لیکن یہ موت آپ ﷺ کے مقام و فضل میں کوئی تغیر پیدا نہیں کر سکتی' گویا کہ ان کفار و مشرکین کو خبردار کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے تم میں سے کسی کے ذہن میں یہ شائبہ تک بھی پیدا نہ ہو کہ آپ ﷺ کے مقام میں کوئی کمی واقع ہو گئی ہے۔ العیاذ باللہ۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تو بعض یہ سمجھے کہ اب وہ نفع دے سکتے ہیں نہ فائدہ' نہ سن سکتے ہیں نہ جواب دے سکتے ہیں' دعا کر سکتے ہیں نہ شفاعت' لہٰذا اس غلط تصور کے بطلان اور ان حقائق کے اثبات کے لیے یہ آیات کریمہ نازل ہوئیں' تاکہ ان کے اذہان سے خدشات کا ازالہ ہو جائے۔

یہ اس لیے کہ وہ بعثت بعد از موت اور حساب کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ "یہ جو کچھ ارحام سے باہر آئے اور جو زمین سے نکلے' ان میں ارحام اور زمین ہی موثر حقیقی ہے' اور ہم کو کوئی ہلاک نہیں کرتا مگر گردش زمانہ۔" قرآن حکیم برہان رشید میں بے شمار ایسی آیات ہیں جو ان کی اس تصور و عقیدہ کی موافقت کو واضح کرتی ہیں' اور ان کے حیات برزخیہ اور قبر کی نعمتوں اور عذاب کے انکار کو متضمن ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ان سے حکایت ہے:

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ	بے شک یہ کہتے ہیں کہ وہ تو نہیں مگر ہمارا ایک دفعہ کا مرنا اور ہم اٹھائیں نہ جائیں گے تو ہمارے باپ دادا کو لے آؤ اگر

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ -(الدخان: ۴۰-۳۴)	تم سچے ہو کیا وہ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور جو ان سے پہلے تھے اور ہم نے نہ بنائے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر۔ ہم نے انہیں نہ بنایا مگر حق کے ساتھ لیکن ان میں اکثر جانتے نہیں بے شک فیصلہ کا دن ان سب کی میعاد ہے۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا -(مریم: ٦٦-٦٧)	اور آدمی کہتا ہے کہ جب مر جاؤں گا تو ضرور عنقریب جلا کر نکالا جاؤں گا اور کیا آدمی کو یاد نہیں کہ ہم نے اس سے پہلے اسے بنایا اور وہ کچھ نہ تھا۔

اور اللہ تعالیٰ وسبحانہ کا ارشاد گرامی ہے:

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَا اِنْ كُنْتُمْ	اور بولے وہ تو نہیں مگر یہی ہماری دنیا کی زندگی مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں نہیں کرتا مگر زمانہ۔ اور انہیں اس کا علم نہیں اور وہ تو نرے گمان دوڑاتے ہیں' اور جب ان پر ہماری روشن آیات پڑھی جائیں تو بس ان کی حجت یہی ہوتی ہے کہ کہتے ہیں ہمارے باپ دادا کو لے آؤ اگر سچے ہو۔ تم

صٰدِقِيْنَ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

فرماؤ اللہ تمہیں جلاتا ہے پھر تم کو مارے گا پھر تم سب کو اکٹھا کرے گا قیامت کے دن جس میں کوئی شک نہیں لیکن بہت آدمی نہیں جانتے۔

(الجاثیہ: ۲۶-۲۴)

اور فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ۔(یٰسین: ۷۹-۷۸)

اور ہمارے لیے کہاوت کہتا ہے اور اپنی پیدائش بھول گیا بولا ایسا کون ہے کہ ہڈیوں کو زندہ کرے جب وہ بالکل گل گئیں۔ تم فرماؤ انہیں وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انہیں بنایا اور اسے پیدائش کا علم ہے۔

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا اعلان حقیقت

اسی لیے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس حقیقت کا بایں الفاظ اعلان کیا کہ

مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا۔۔۔الخ جو محمد ﷺ کی عبادت کرتا ہے۔۔۔

یہاں بعض ناحقیقت شناس اور کینے لوگ یہ آیہ مقدسہ:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ (الزمر: ۳۰)

بے شک تمہیں انتقال فرمانا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے۔

اور دیگر آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ، جو اس موضوع سے متعلق ہیں کو محض اس لیے لاتے ہیں تاکہ مقاصد فاسدہ اور خیالات خبیثہ پر استدلال ہو سکے، جو ان کے اذہان میں رچ بس چکے ہیں۔ یعنی مقصود یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح کمالات محمدیہ کی نفی اور بشریت عادیہ کا اثبات ہو سکے، جس سے وہ اشرف المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو عوام الناس کے ساتھ مساوی رکھنے کا ارادہ حتمی قرار دے سکیں۔

کتنے ہی لوگوں کو ہم نے سنا ہے بلکہ بعض نے تو اپنی اس خباثت کی وجہ سے بذریعہ قلم اوراق کی جگر چاکی سے بھی منہ کالا کیا ہے جو ہماری نظر سے گزرے' اور نہایت بے باکی سے کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہ سنتے ہیں نہ نفع دیتے ہیں بلکہ بعض نے تو حسد و کینہ اور بے ادبی کی انتہا کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر جا کر امور دنیا میں سے (درہم یا پانی کے پیالے جیسی) چھوٹی سی چیز بھی آپ سے مانگو تو وہ تمہیں نہیں دے سکیں گے۔

میں (سید محمد بن علوی مالکی) کہتا ہوں: کہ یہ کہنے اور لکھنے والا پرلے درجے کا احمق اور ناحقیقت شناس ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار پر انور پر حاضری دینے والا نبی ﷺ کا توسل پکڑتا ہے یا آپ ﷺ سے کچھ طلب کرتا ہے؟ یقیناً وہ یہ طلب کرتا ہے کہ آپ ﷺ اس کے لیے اللہ سے سوال کریں۔ یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ و سبحانہ کی بارگاہ میں آپ ﷺ کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ یہ حقیر چیزیں طلب نہیں کرتا جو ان مال خور اور حقیر دنیا کے غلاموں کے ذہنوں میں واقع ہوتی ہیں۔ جن کا مقصد صرف اور صرف مال و دولت کی ذخیرہ اندوزی ہے اور ان کی کوششیں محض اسی مقصد کے حصول سے وابستہ ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دیتے ہوئے یوں فرمایا:

تَعَسَ وَانْتَكَسَ۔ ہلاک اور سرنگوں ہو۔

یہ ان لوگوں کے لیے بددعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ ان کو برباد اور سرنگوں کرے اور یہ خبر دینا ہے کہ وہ ضرور ایسا ہی ہوگا' والعیاذ باللہ۔

لہٰذا ہر وہ شخص جو ایسی علمی بحث کا ارادہ کرے جو ہوائے نفس' تعصب اور سینہ زوری سے پاک ہو اور اہلِ حق کے نقش قدم پر گامزن ہونے کا ارادہ رکھتا ہو یعنی جو اہل ذوق اور ادب و معرفت کی لذت سے سرشار ہونے والوں کا طریق ہے' تو ہر ایسے شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنے کلام کا مضمون اس طرح مرتب کرے جو حضور

کریم ﷺ کے کمالات اور خصائص کے باقی اور محفوظ ہونے کو مفید ہو' اور نہ ہی ان کی بقاء و حفاظت میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش ہے۔ بے شک حضور سرور کائنات ﷺ کلام سنتے ہیں اور سلام کے جواب سے نوازتے ہیں اور جو امت مسلمہ کے نیک اعمال آپ ﷺ پر پیش کئے جاتے ہیں' ان پر آپ اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کرتے ہیں' اور جو ان کے برے اعمال پیش کئے جاتے ہیں تو آپ ﷺ ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کے مقام استراحت پر نہایت ادب سے حاضر ہونا' زیارت کی سعادت حاصل کرنا اور آپ پر سلام پیش کرنا' قبرانور' مسجد شریف اور روضہ اطہر کا پاس رکھنا' یہ بہت ضروری اور بہت بڑی نیکی کا سامان ہے' کیونکہ آپ ﷺ کی بعد از وصال بھی تعظیم و توقیر ایسی ہے جیسے حیات ظاہری میں تھی۔ جیسا کہ دار ہجرت کے امام نے خلیفہ عباسی سے کہا اگرچہ آپ ﷺ وصال فرما گئے اور آپ کا جسد انور ہم سے روپوش ہو گیا' بلاشبہ باقی صرف وہی ایک ذات ہے جو حی قیوم ہے۔ جس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند' لیکن آپ ﷺ کامل حیات برزخیہ سے زندہ ہیں اور یہ حیات دنیاوی زندگی سے کہیں اشرف و افضل اور اکمل ہے' اور یہ اس سے کہیں بڑھ کر اعلیٰ' گراں بہا' شیریں اور نفع بخش ہے۔ اس حیات مبارکہ سے سرشار ہونے والے نفوس قدسیہ تین صفات سے ہمہ وقت موصوف رہتے ہیں: یعنی زندگی' رزق اور بارگاہ خداوندی میں حاضری۔ اس پر اللہ رب العزت کا یہ فرمان عالیشان شاہد ہے:

أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ۔ (آل عمران: ۱۶۹)

وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں' روزی پاتے ہیں۔

جب شہداء کے حق میں یہ انعامات ہیں جو انبیاء کے رتبہ سے کہیں کم تر ہیں' تو پھر انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی کیا شان و شوکت ہو گی؟ سبحان اللہ۔

انبیاء علیہم السلام کی حیات برزخیہ

انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے اپنی قبور میں زندہ ہونے کے بے شمار دلائل ہیں۔ ابھی ہم کچھ پیش کرتے ہیں جن میں ہر ایک شخص کے لیے انشاء اللہ کامل شفا بھی ہوگی جس کے دل میں مرض ہے۔

(۱) بیہقی اور ابو یعلی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْاَنْبِيَاءُ اَحْيَاءٌ فِىْ قُبُوْرِهِمْ يُصَلُّوْنَ۔ انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔

یہ حدیث صحیح ہے۔ امام مناوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کیونکہ وہ شہداء کی طرح ہیں بلکہ ان کی حیات مبارکہ شہداء کی زندگی سے کہیں اعلیٰ ہے اور شہداء کو اپنے پروردگار کے پاس سے رزق بھی دیا جاتا ہے۔ حیات شہداء میں "عِنْدَ رَبِّهِمْ" یعنی عندیت کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ معلوم ہو کہ ان کی زندگی ہمارے ہاں ظاہر نہیں بلکہ وہ حیات ملائکہ کی طرح ہے اور اسی طرح ہی انبیاء کی حیات کا مسئلہ ہے۔ اسی لیے تو انبیاء کے ترکہ کا وارث نہیں ہوتا بلکہ بعد میں ان کی ازواج مطہرات کو نکاح کی اجازت نہیں۔

امام بیہقی "کتاب الاعتقاد" میں فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی روحیں قبض کرنے کے بعد ان کو لوٹا دی جاتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار کے پاس شہداء کی طرح زندہ ہیں، جیسا کہ ہمارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج ان کی جماعت کا مشاہدہ فرمایا۔ مزید فرماتے ہیں کہ ہم نے حیات انبیاء کے اثبات میں ایک علیحدہ کتاب تحریر کردی ہے۔

(۲) امام ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا، جیسا کہ امام سبکی نے کہا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا:

مَا مِنْ اَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ اِلَّا رَدَّاللّٰهُ عَلَيَّ رُوْحِيْ حَتّٰى اَرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ۔	جو کوئی بھی مجھ پر سلام پیش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اسے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

امام بیہقی نے "باب زیارۃ قبرالنبی ﷺ" کی ابتداء اسی حدیث سے کی، اور اس پر ائمہ کی ایک جماعت نے اعتماد کیا ہے جس میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ جیسے جلیل القدر حضرات شامل ہیں۔ امام سبکی کا کہنا ہے کہ یہ اعتماد صحیح ہے اس لیے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کی عظیم فضیلت کو متضمن کرتا ہے۔

سوال: اگر یہ کہا جائے کہ حدیث مبارکہ میں ہے "اللہ تعالیٰ میری روح مجھے واپس لوٹاتا ہے۔" اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں دوام اور ہمیشگی نہیں۔

جواب: اس کا جواب چند طرح سے پیش کیا جاتا ہے:

(۱) امام بیہقی اس سے حیات انبیاء پر استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے اور وہ خوب جانتا ہے مگر میری روح مجھے واپس لوٹاتا ہے یہاں تک کہ میں اسے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

(۲) امام سبکی کا کہنا ہے کہ احتمال ہے کہ روح کا لوٹانا معنوی طور پر ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح شریفہ بارگاہ عالیہ کی حاضری میں مستغرق رہتی ہے اور اس عالم سے بے نیاز ہو کر ملا اعلیٰ کی طرف متوجہ رہتی ہے تو جب آپ ﷺ پر سلام پیش کیا جاتا ہے تو آپ ﷺ کی روح مبارکہ اس عالم کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے تاکہ سلام کا تدارک کرے اور سلام پیش کرنے والے کو جواب دے یعنی آپ ﷺ کی روح شریفہ کا لوٹنا ایک روحانی التفات ہے اور بارگاہ علیا میں استغراق سے دوائر بشریہ کی طرف تنزل ہے۔

(۳) بعض نے یوں بھی کہا ہے کہ یہ خطاب مخاطبین حضرات کی سمجھ کی مقدار پر موقوف ہے۔ بہرحال ضروری امر ہے کہ روح مبارکہ کے لوٹنے سے آپ ﷺ سنتے بھی ہیں اور جواب بھی دیتے ہیں' گویا آپ ﷺ نے فرمایا: کہ میں مکمل سنتا ہوں اور پوری طرح جواب دیتا ہوں' جس پر روح کا لوٹا دال ہے۔ پہلے سلام پیش کرنے والے کے سلام کے وقت آپ ﷺ پر روح لوٹادی گئی اور بعد میں قبض نہیں کی گئی۔ کوئی بھی روح کے بار بار لوٹنے اور قبض ہونے کا قائل نہیں' کیونکہ اس سے تو بے شمار لگاتار موتیں وجود میں آتی ہیں' باوجودیکہ ہم علم اور سماع جیسے ادراکات کے ثبوت کا تمام اموات کے لیے اعتقاد رکھتے ہیں چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام اور ہمارا قطعی یقین ہے کہ ہر میت کو قبر میں روح لوٹادی جاتی ہے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے تاکہ سوال و جواب کا مسئلہ چل سکے۔ لہٰذا قبر کی نعمتوں اور عذاب پر ایمان لانے کی طرح اس پر بھی ایمان لانا ضروری اور واجب ہے اور اس کا ادراک ایسی اعراض سے ہے جو حیات سے مشروط ہیں۔

ایک وہم کا ازالہ

کہا جاتا ہے کہ اگر وہ زندہ ہیں تو ضروری ہے کہ ہم ان کو دیکھ پائیں تو ہماری ان سے گزارش ہے کہ ملائکہ زندہ ہیں نیز شہداء اور جن بھی زندہ ہیں لیکن ہم ان کو نہیں دیکھتے' حالانکہ ان کا دیکھنا روا بھی ہے کیونکہ ہر موجود کو دیکھنا ممکن ہے۔

امام سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک کتاب مرتب کی ہے جس کا نام "نور الحلک فی جواز رویہ الجن والملک" رکھا ہے' اس میں انہوں نے نبی کریم ﷺ کی زیارت کو بھی جائز قرار دیا ہے اور اس پر مثبت دلائل قائم کئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

(۳) حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اکثروا من الصلاة علی فی	جمعہ کے روز مجھ پر کثرت سے درود پڑھو
یوم الجمعة فانه یوم مشهود	کیونکہ وہ یوم مشہود ہے' اس دن ملائکہ
تشهده الملائكه وان احد الن	حاضر ہوتے ہیں جو کوئی بھی مجھ پر درود پڑھتا
يصلى على الا عرضت على	ہے تو اس کا درود مجھے پیش کیا جاتا ہے یہاں
صلاته حتى يفرغ منها قبل	تک کہ وہ اس سے فارغ ہو جاتے ہیں' پہلے
وبعد الموت قال وبعد الموت	بھی اور موت کے بعد بھی۔ فرمایا موت کے
ان الله حرم على الارض ان	بعد بیشک اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے
تاكل اجساد الانبياء فنبي	اجساد کو کھانا حرام ٹھہرا دیا ہے۔ اللہ کا نبی
الله حی یرزق۔(ابن ماجہ 'الکبیر للطبرانی)	زندہ ہے اور رزق دیا جاتا ہے۔

حضور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "مجھ پر درود پیش کیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہو جائے" سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب درود پڑھنے والا درود شریف پڑھنا شروع کرتا ہے تو سرکار علیہ الصلوۃ والسلام اسے سن رہے ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہو جاتے ہیں۔

کتنا اچھا کیا ہے اس سائل نے جس نے حضور اکرم ﷺ سے اس امر کی وضاحت طلب کی کہ "آیا مرنے کے بعد بھی" تو آپ ﷺ نے واضح فرمادیا کہ بے شک موت کے بعد درود پیش ہو گا اس لیے کہ صفتِ حیات آپ ﷺ میں موجود ہو گی۔ پھر آپ ﷺ نے اپنے بیان کو مزید واضح کرتے ہوئے یہ ارشاد سنا دیا "فنبی اللہ حیٌ" (کہ اللہ کا نبی زندہ ہے) پھر نبی کو صفتِ حیات سے متصف کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ فرمادیا: "یرزق" (وہ رزق بھی دیا جاتا ہے)

زندہ اور مردے کے درمیان رزق ایک بہت بڑی حد فاصل ہے۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مشکل نہیں چھوڑی مگر اس کی خوب وضاحت کر دی۔ اللہ تعالیٰ اس مسلمان سائل کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

(۴) امام بیہقی نے اوس بن اوس کی حدیث کو مرفوعاً ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

افضل ایامکم یوم الجمعۃ فیہ خلق ادم وفیہ قبض وفیہ النفخۃ وفیہ الصعقۃ فاکثروا علی من الصلوٰۃ فیہ فان صلاتکم معروضہ علی۔

سب دنوں سے افضل دن جمعہ کا دن ہے اس میں آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی اور اسی دن روح قبض ہوئی۔ اسی دن صور پھونکا جائے گا اور اسی دن قیامت آئے گی۔ بس تم اس دن کثرت سے مجھ پر درود پڑھو' بیشک تمہارے درود مجھ پر پیش کیے جاتے ہیں۔

لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارا درود آپ پر کیسے پیش ہو گا؟ شاید کہ آپ بوسیدہ ہو جائیں تو حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے زمین پر نبیوں کے جسموں کو کھانا۔

اس کو امام ابو داؤد' ابن ماجہ اور ابن حبان نے "صحیح" میں نقل کیا اور امام حاکم نے اسے نقل کر کے اسے صحیح قرار دیا' اس کی تصحیح بھی کی۔ امام بیہقی نے اس کے کئی ایک شواہد ذکر کیے پھر یہ حدیث ذکر کی۔

ان للّٰہ ملائکۃ سیاحین یبلغون عن امتی السلام۔

بے شک اللہ کے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو سیر کرتے ہیں اور میری امت کا سلام پہنچاتے ہیں۔

اس کے علاوہ اور احادیث بھی امام بیہقی لائے ہیں:

یہ حدیث اوس صحیح ہے اور پہلی حدیث کو تقویت دیتی ہے جسے ابن ماجہ اور طبرانی نے نقل کیا یعنی وہ حدیث جس میں "درود کا پیش ہونا اور اجساد انبیاء کو زمین کا نہ کھانا" مذکور ہے۔

(۵) امام حاکم اپنی "تاریخ" اور بیہقی نے "سنن" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

ان الانبیاء لا یترکون فی قبورھم بعد اربعین لیلۃ ولکن یصلون بین یدی اللہ حتی ینفخ فی الصور۔

بیشک انبیاء علیہم السلام کو چالیس راتوں کے بعد قبروں میں نہیں چھوڑا جاتا لیکن وہ اپنے اللہ کے حضور نماز میں مصروف ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ صور پھونکا جائے گا۔

امام بیہقی فرماتے ہیں: اگر یہ حدیث بایں الفاظ صحیح ہے تو مراد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ بظاہر تو "لا یترکون" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی قبروں میں اتنی مقدار (چالیس راتیں) نماز نہیں پڑھتے اس کے بعد پھر وہ اللہ کے حضور نماز میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

(۶) ابن عدی نے اپنی "کامل" میں ثابت سے، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

الانبیاء احیاء فی قبورھم یصلون۔

انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔

اس کو امام بیہقی نے روایت کیا اور صحیح قرار دیا۔ یہ حدیث پہلی حدیث سے زیادہ صحیح تر ہے۔ اس کی تقویت اس سے بھی ہوتی ہے کہ ہمارے نبی مکرم ﷺ شب معراج گزرے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ جیسا کہ حضور سرور کائنات ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

مررت لیلۃ اسری بی علی موسی عند الکثیب الاحمر وھو قائم یصلی فی قبرہ۔

میں شب معراج سرخ ٹیلے کے پاس موسیٰ علیہ السلام پر گزرا تو وہ اپنی قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔

اس کو ابن عساکر، طبرانی، نسائی، ابن حبان، ابن خزیمہ اور امام مسلم نے

روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے پہلی حدیث کا معنی سمجھ میں آجاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں بغیر نماز کے نہیں چھوڑے جاتے بلکہ اپنی قبروں میں اللہ جل شانہ کے حضور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور وہ قبر بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہو کر حضوری سے لطف اندوز ہوتے ہیں' اور نماز کی لذت خوب حاصل کرتے ہیں جو نماز دنیا میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنائی گئی تھی۔

اور صحیح ثابت ہے کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں سارے انبیاء کے ساتھ اکٹھے ہوئے اور وہ سب اپنی اصلی شکلوں کے ساتھ زندہ تھے۔ آپ ﷺ نے ان سب کو نماز پڑھائی اور انہوں نے آپ ﷺ کی اقتدا کا شرف حاصل کیا۔

(۷) امام مسلم نے اسے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

قد رایتنی فی جماعۃ من الانبیاء واذا بابراھیم علیہ السلام قائم یصلی اشبہ الناس بہ صاحبکم فحانت الصلوٰۃ فاممتھم۔	میں نے اپنے آپ کو جماعتِ انبیاء میں دیکھا ہے اور ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ تمہارا صاحب سب سے زیادہ ان کے مشابہ ہے۔ پس نماز کا وقت ہوا تو میں نے ان کی امامت کی۔

یہ واقعہ شب معراج کا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا "فحانت الصلوٰۃ" اس بات پر دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام اوقات نماز کی پابندی کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شب معراج نبی کریم ﷺ نے انبیاء کو اپنی قبور میں نماز پڑھتے دیکھا پھر انہیں مسجد اقصیٰ میں دیکھا پھر اسی لحظہ ان کو آسمانوں پر اپنے اپنے مرتبے پر فائز دیکھا' پہلے آسمان سے لے کر ساتویں آسمان تک انبیاء اپنے اپنے مرتبے پہ موجود تھے' جب آپ ﷺ کو معراج ہوئی۔ آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چھٹے آسمان پر ملاقات کی' اسی لیے اللہ تعالیٰ وسبحانہ

نے فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَائِهٖ۔	اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا فرمائی تو تم اس کے ملنے میں شک نہ کرو۔

یعنی شب معراج میں جیساکہ مفسرین نے ذکر کیا ہے۔

(۸) حضور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت موسیٰ، عیسیٰ اور ابراہیم علیہم الصلوۃ والسلام کو طواف کعبہ کرتے ہوئے دیکھا اور موسیٰ علیہ اسلام کی ہیئت بیان کی کہ آپ سرو کی طرح سیدھے اور قد آور تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وصف یوں بیان کیا کہ آپ کا قد میانہ تھا گویا کہ آپ ابھی حمام سے نہا کر نکلے ہیں۔

امام ترمذی نے شمائل میں کہا ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں دیکھا کہ ان کے سر سے ابھی پانی کے قطرے گر رہے ہیں گویا کہ انہوں نے ابھی ابھی آب زمزم سے غسل کیا اور ان کی تشبیہ عروہ بن مسعود سے دی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیان کیا کہ وہ سب سے زیادہ حضور علیہ السلام کے مشابہ تھے۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں:

کانی انظر الی موسی فی هذا الوادی محرما علیه قطوانیتین۔(رواہ الطبرانی)	گویا کہ میں اس وادی میں موسیٰ علیہ السلام کو حالت احرام میں دیکھ رہا ہوں، آپ پر دو ریشمی چادریں ہیں۔

امام احمد، مسلم اور ابن ماجہ کی روایت میں "له جؤار" کے الفاظ بھی ہیں یعنی وہ با آواز بلند تلبیہ وغیرہ پڑھ رہے تھے۔

اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے اللہ کے نبی حضرت یونس علیہ السلام کو حج کرتے آتے ہوئے دیکھا جو پہاڑی سے تلبیہ پڑھتے ہوئے نمودار ہوئے حضور ﷺ فرماتے ہیں:

كاني انظر الى يونس بن متى عليه السلام على ناقة حمراء جعدة عليه جبة من صوف خطام ناقته خلبة وهو يلبي -(رواه احمد و مسلم)	میں حضرت یونس بن متی علیہ السلام کو سرخ اونٹنی پر سوار دیکھ رہا ہوں' اون کا جبہ آپ کے زیب تن ہے' آپ کی اونٹنی کی مہار کھجور کے پتوں کی ہے اور تلبیہ کہہ رہے ہیں۔

کیا ان احادیث صحیحہ سے وارد دلائل کے بعد بھی کسی کو انبیاء علیہم السلام کی حیات مبارکہ میں شک ہو سکتا ہے؟

اور کیا یہ نماز' طواف' غسل' حج' تلبیہ' گڑگڑانا' جبہ پہننا' سواری کرنا' قبر میں رزق ملنا اور اجساد مبارکہ کا فنانہ ہونا یعنی جو امور انبیاء سے واقف ہوئے ہیں' یہ محض خیال ہیں' ان کی کوئی اصل نہیں؟

اور کیا ایسے امور مردوں سے صادر ہوتے ہیں؟

اور کیا یہ نماز' طواف' غسل' سواری وغیرہ جیسے مذکورہ امور اجسام کے علاوہ محض ارواح سے سرزد ہوتے ہیں؟

یقیناً مردے ایسے احوال پر قدرت نہیں رکھتے اور نہ ہی روحیں ایسے امور کی محتاج ہوتی ہیں' لہٰذا ان امور میں انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی ارواح اور اجساد کا اجتماع ضروری اور مسلم ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی حیات طیبہ پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ جب انبیاء علیہم السلام سے ملے تو آپ نے حضرت ابراہیم' موسیٰ اور یونس علیہم السلام کے اوصاف بھی اسی طرح ہی بیان فرمائے جیسے عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا وصف بیان کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کی حیات مبارکہ نص و اجماع سے ثابت ہے' لہٰذا دیگر انبیاء علیہم السلام کی حیات کے ثبوت میں بھی تامل نہ ہو گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی حیات میں کوئی فرق

نہیں۔ حیات انبیاء اور ان کے اجساد کی سلامتی کا کوئی بھی منکر نہیں مگر وہی جو قرآن و سنت سے ناواقف ہے اور جو ان کی قدر و عظمت اور خصائص کو نہیں جانتا' جن سے اللہ تعالیٰ نے انہیں خاص کیا اور تمام بنی نوع بشر سے ممتاز ٹھہرایا۔

اللہ تعالیٰ و سبحانہ نے فی سبیل اللہ قتل ہونے والوں کو مردہ کہنے سے منع فرمایا ہے بلکہ تصریح فرمائی ہے کہ وہ زندہ ہیں جبکہ انبیاء علیہم السلام تو اس منصب کے زیادہ لائق ہیں' کیونکہ شہداء انبیا کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے' وہ تو اس مرتبے پر بھی انبیاء علیہم السلام کی پیروی کی برکت سے پہنچے ہیں اور یہ ان کی نیکیوں میں سے ایک نیکی ہے اور مرتبہ میں صدیقین سے کم ہیں۔

اب اس میں کوئی اشکال باقی نہیں رہا کہ نبی کریم ﷺ نے انبیاء کو اپنی قبروں میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ پھر ان کو مسجد اقصیٰ میں پھر اسی لحہ آسمانوں میں دیکھا' کیونکہ موت کے بعد ارواح غائب ہو جاتی ہیں اور ارواح کے افعال عقل سے قیاس نہیں کیے جاتے' لہٰذا موت کے بعد اجساد روحوں کے تابع ہوتے ہیں جو کہ لطیف ہیں' جس طرح دنیا میں روحیں اجساد کے تابع ہوتی ہیں جو کہ کثیف ہیں۔

(۹) امام بیہقی فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی حیات بعد از موت پہ احادیث صحیحہ سے بے شمار شواہد ملتے ہیں۔ پھر امام بیہقی نے یہ حدیث ذکر کی:

مررت بموسى وهو قائم	میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو
يصلي في قبره-	وہ اپنی قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔

اور اس کے علاوہ دیگر احادیث بھی ذکر کیں جن میں نبی ﷺ کی انبیاء علیہم السلام سے ملاقات مذکور ہے اور صحیحین کی یہ حدیث بھی ذکر کی:

فاذا موسى باطش بجانب	تو موسیٰ علیہ السلام عرش کا کنارہ پکڑے
العرش فلا ادرى اكان فيمن	ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ بے ہوش
صعق فافاق قبلي ام كان ممن	ہونے والوں میں تھے اور مجھ سے پہلے ہوش

استثنی اللہ عزوجل۔	میں آگئے یا ان میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ فرمادیا ہے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو موت کے بعد روحیں لوٹادیتا ہے اور وہ اپنے رب کے پاس شہداء کی طرح زندہ ہیں۔ جب پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو ہر زندہ بے ہوش ہو جائے گا' اور انبیاء بھی بے ہوش ہو جائیں گے۔ پھر یہ جمیع معانی کے ساتھ موت نہیں ثابت ہوگی' محض اتنا ہے کہ اس حالت میں شعور سلب ہو جائے گا۔

منقول ہے کہ شہداء کا شمار ان لوگوں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس بے ہوشی سے مستثنیٰ فرمایا مگر جسے چاہے اللہ تو پھر کہاں شہداء اور کہاں انبیاء۔

(۱۰) امام سمہودی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حیات انبیاء علیہم السلام کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

ان عیسی ابن مریم علیہ السلام سینزل مارا بالمدینہ حاجا او معتمرا وان سلم علی لاردن علیہ۔	بے شک عیسیٰ بن مریم حج یا عمرہ کے سفر میں مدینہ میں اتریں گے' اگر انہوں نے مجھے سلام پیش کیا تو ضرور میں انہیں جواب دوں گا۔

(نفس الرحمٰن للسید الغربانی و مفاہیم للمولف)

(۱۱) امام حاکم نے (المستدرک: ۲/ ۵۹۵) میں بایں الفاظ روایت کیا ہے:

لیھبطن ابن مریم حکما عدلا واما ما مقسطا ولیسلکن فجا حاجا او معتمرا ولیاتین قبری حتی یسلم علی ولاردن علیہ۔	ابن مریم علیہ السلام ضرور عادل حکمران اور منصف امام بن کر اتریں گے اور حج یا عمرہ کیلئے سفر کرتے میری قبر پر ضرور آئیں گے' حتیٰ کہ مجھے سلام کہیں گے اور میں ضرور بر ضرور ان کے سلام کا جواب دوں گا۔

سیدنا محمد ﷺ کی حیات طیبہ

ہمارے آقا و مولا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی حیات برزخیہ ثابت ہے اور وہ لامحالہ اغیار کی زندگی سے اکمل اور اعظم ہے۔ حضور ﷺ نے خود اس حیات مبارکہ کو بیان فرمایا ہے۔ آپ ﷺ کی اپنی امت سے دائمی وابستگی' احوال سے معرفت' اعمال سے آگاہی' ان کے کلام کو سننا اور جواب دینا ثابت ہے۔ اس باب میں احادیث کا وافر مواد موجود ہے' یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

(۱) "الترغیب والترہیب: ۲/ ۴۹۸" میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے:

ان للہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغونی من امتی السلام۔	بے شک اللہ کے کچھ فرشتے زمین میں سیاحت کرتے ہیں جو میری امت کا سلام مجھے پہنچاتے ہیں۔

امام منذری کہتے ہیں کہ اس کو امام نسائی کے علاوہ ابن حبان نے بھی اپنی "صحیح" میں روایت کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس کو اسماعیل قاضی وغیرہ نے مختلف طرق سے اسانید صحیحہ کے ساتھ روایت کیا' جن میں سفیان ثوری تک تو بالکل کوئی شک نہیں اور سفیان ثوری نے عبداللہ بن سائب سے' زاذان سے' عبداللہ بن مسعود سے روایت کی ہے اور ثوری نے سماع کی تصریح کی ہے۔ قاضی اسماعیل کی کتاب میں ہے کہ ثوری نے کہا: "حدثنی عبد اللہ بن السائب۔" لہٰذا اس میں کوئی شک نہ رہا اور عبداللہ بن سائب اور زاذان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ امام مسلم نے ان دونوں سے روایت لی ہے اور امام ابن معین نے ان دونوں کی توثیق کی ہے' لہٰذا اسند صحیح ہے۔

(۲) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ

حیاتی خیر لکم تحدثون	میری زندگی تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم
ویحدث لکم و وفاتی خیر	پوچھتے ہو اور تمہیں بیان کر دیا جاتا ہے' اور
لکم تعرض اعمالکم علی	میری وفات تمہارے لیے بہتر ہے کہ
فما رایت من خیر حمدت	تمہارے اعمال مجھ پر پیش کئے جاتے ہیں جو
الله' ومارایت من شر استغفرت	میں بھلائی دیکھتا ہوں تو اللہ کی تعریف کرتا
الله لکم۔	ہوں اور جو کوئی میں برائی دیکھتا ہوں تو اللہ
	سے تمہارے لیے بخشش طلب کرتا ہوں۔

حفاظ عراقی (طرح التثریب فی شرح التقریب: ۳ / ۲۹۷) کتاب الجنائز میں کہتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے۔

حافظ ہیثمی (مجمع الزوائد: ۹ / ۲۴) میں کہتے ہیں کہ اس کو بزار نے روایت کیا اور اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔ حافظ سیوطی نے معجزات و خصائص میں اس کی تصحیح کی اور اسی طرح شارح بخاری علامہ قسطلانی سے بھی منقول ہے۔ امام مناوی کا (فیض القدیر: ۳ / ۴۰۱) میں کہنا ہے کہ یہ صحیح ہے اور اسی طرح علامہ زرقانی شرح مواہب' علامہ شہاب خفاجی (شرح الشفاء: ۱ / ۱۰۲) میں کہتے ہیں اور مزید فرماتے ہیں کہ اس کو حارث بن اسامہ نے بھی اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا۔

علامہ ابن حجر (المطالب العالیہ: ۴ / ۲۲) میں ذکر کرتے ہیں کہ یہ حدیث ایک دوسرے طریق سے بکر بن عبداللہ مزنی سے مرسل آئی ہے' جس کو حافظ اسماعیل قاضی نے اپنے رسالہ "الصلاۃ علی النبی ﷺ" میں روایت کیا ہے۔ اسے شیخ البانی نے بھی مرسل صحیح کہا ہے اور حافظ ابن عبدالہادی نے انتہائی سینہ زوری اور تشدد کے باوجود اپنی کتاب "الصارم المنکی" میں اس کی تصحیح کی۔ ان اجلہ ائمہ کی تصحیح کے بعد کیا کسی نادان کو مزید کلام کی ضرورت ہے؟ پس حدیث صحیح ہے اس میں کوئی طعن نہیں۔ اور یہی حدیث اس امر پر دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اعمال کو جانتے

ہیں کیونکہ وہ آپ پر پیش ہوتے ہیں اور اللہ سے ہمارے لیے ہماری برائیوں پر مغفرت طلب کرتے ہیں۔ جب ایسے ہے تو ہمیں بھی روا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کا وسیلہ پیش کریں اور اللہ کے ہاں آپ کی شفاعت طلب کریں' کیونکہ آپ ﷺ جانتے ہیں اور ہمارے حق میں شفاعت و دعا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ شفیع اور مشفع ہیں' اللہ تعالیٰ آپ کی شرافت و کرامت اور زیادہ کرے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پر گواہ ہیں' اس تاکید کا تقاضا یہ ہے کہ اعمال امت آپ ﷺ پر پیش ہوں تاکہ آپ مشاہدہ فرمالیں۔ ابن مبارک فرماتے ہیں کہ ہمیں ایک انصاری مرد نے منہال بن عمرو سے خبر دی۔ انہوں نے سعید بن مسیب کو فرماتے ہوئے سنا کہ

لیس من یوم الا ویعرض فیه علی النبی صلی الله علیه وسلم امته غدوة وعشیا فیعرضهم باسمائهم واعمالهم فلذلک یشهد علیهم یقول الله تعالی: فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍۭ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا۔ (النساء: ۴۱)

ہر روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی امت اپنے اسماء اور اعمال کے ساتھ صبح و شام پیش کی جاتی ہے' اسی لیے آپ ان پر گواہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تو کیسی ہوگی جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور اے محبوب! تمہیں ان سب پر گواہ اور نگہبان بنا کر لائیں۔

(۳) حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الله وکل بقبری ملکا اعطاه الله اسماء الخلائق

بے شک اللہ تعالیٰ نے میری قبر پر ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے

فلا یصلی علی احد الی یوم القیامۃ الا ابلغنی باسمہ واسم ابیہ ھذا فلان ابن فلان قدصلی علیک۔	جمیع مخلوق کے اسماء کا علم عطا کر دیا ہے' قیامت تک جو بھی مجھ پر درود پڑھے گا' وہ فرشتہ مجھے اس کا نام اور اس کے والد کا نام لے کر درود پہنچائے گا کہ فلاں بن فلاں نے آپ پر درود پڑھا ہے۔

اس کو بزار نے روایت کیا ہے اور شیخ ابن حبان کے لفظ یہ ہیں:

ان اللہ تبارک وتعالی وکل ملکا اعطاہ اسماء الخلائق فھو قائم علی قبری اذا مت' فلیس احد یصلی علی صلاہ الاقال:یامحمد!صلی علیک فلان بن فلان قال: فیصلی الرب تبارک وتعالی علی ذلک الرجل بکل واحدۃ عشرا۔	بے شک اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ کو مخلوقات کے نام دے کر مقرر کیا ہے جو میری قبر پر کھڑا رہے گا جب سے میں وصال کروں گا۔ جو بھی مجھ پر درود پڑھے گا وہ کہے گا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فلاں بن فلاں نے تم پر درود پڑھا ہے' آپ ﷺ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ اس شخص پر ایک درود کے بدلے دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔

اس کو امام طبرانی نے الکبیر میں اسی طرح روایت کیا ہے۔(الترغیب والترہیب:۲/ ۵۰۰)

(۴) عمرو بن حارث سے' سعید بن ابی ہلال سے' زید بن ایمن سے' عبادہ بن نسی سے' ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اکثروا الصلوۃ علی یوم الجمعۃ فانہ مشھود تشھدہ الملائکۃ وان احدالن یصلی علی الا عرضت علی صلاتہ	جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو' بے شک یہ حاضری کا دن ہے۔ ملائکہ اس دن حاضر ہوتے ہیں جو بھی مجھ پر درود پڑھتا ہے تو وہ مجھ پر پیش کیا جاتا ہے یہاں

حتی یفرغ منها۔ تک کہ وہ اس سے فارغ ہو جائے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا' کیا موت کے بعد بھی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

وبعد الموت ان اللہ حرم علی الارض ان تاکل اجساد الانبیاء فنبی اللّٰہ حیی یرزق۔

موت کے بعد بھی' بے شک اللہ تعالٰی نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے اجساد کو کھانا حرام ٹھہرا دیا ہے۔ اللہ کا نبی زندہ ہے اور رزق دیا جاتا ہے۔

ابن ماجہ نے اس کو "السنن" میں روایت کیا' اور مجمع الزوائد میں ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے مگر دو جگہ میں منقطع ہے کیونکہ عبادہ کی ابو درداء سے روایت مرسل ہے۔ یہ علاء کا قول ہے اور زید بن ایمن کی روایت کا عبادہ سے مرسل ہونا امام بخاری کا قول ہے۔ (سنن ابن ماجہ : ۵۳۴)

(۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ما من احد یسلم علی الارد اللہ علی روحی حتی ارد علیہ السلام۔

جو کوئی بھی مجھے سلام پیش کرتا ہے تو اللہ تعالٰی میری روح مجھے واپس لوٹا دیتا ہے' یہاں تک کہ میں اسے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

(رواہ ابوداؤد' الترغیب والترہیب: ۲ / ۴۹۹)

شیخ ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ یہ حدیث شرط مسلم پر ہے۔

مسند ابن ابی شیبہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من صلی علی سمعتہ' ومن صلی علی نائیا بلغتہ۔

جو مجھ پر درود پڑھے' میں اسے سنتا ہوں اور جو شخص دور سے پڑھے تو مجھے پہنچایا جاتا ہے۔

اس کو دار قطنی نے اسی معنی سے روایت کیا ہے:

(۶) نسائی وغیرہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

ان اللہ وکل بقبری ملائکہ یبلغونی عن امتی السلام۔ (اقتضاء الصراط المستقیم: ۳۲۴)	بے شک اللہ تعالیٰ نے میری قبر پر ملائکہ کو مقرر فرمایا ہے جو میری امت کا سلام مجھ تک پہنچاتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہاں متعدد احادیث وارد ہیں۔

تبصرہ

میں کہتا ہوں کہ جو نص ابن تیمیہ نے ابن شیبہ سے ذکر کی ہے' اس میں نقص ہے اور جو امام بیہقی "شعب الایمان" میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث لائے ہیں' وہ اس سے کہیں کامل اور قابل یقین ہے۔ اور اس کے لفظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من صلی علی عند قبری وکل بھا ملک یبلغنی وکفی بھا امر دنیاہ وآخرتہ وکنت لہ شھیدا اوشفیعا۔	جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھتا ہے تو ایک فرشتہ مقرر ہے جو مجھے پہنچا دیتا ہے اور یہ اسے دنیاوی اور اخروی امور میں کافی ہے اور میں اس کا گواہ اور سفارشی ہوں گا۔

یہ حدیث اصمعی کے الفاظ ہیں۔ حنفی کی روایت میں الفاظ یوں ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی نائیا ابلغتہ۔	جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھے تو میں خود اسے سنتا ہوں اور جو دور سے پڑھے تو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔

(الجامع لشعب الایمان للبیہقی: ۳/ ۲۱۳)

امام سخاوی نے اپنے شیخ علامہ ابن حجر سے نقل کیا ہے کہ ابن عراق کا "تنزیہ الشریعہ المرفوعہ" میں کہنا ہے کہ اس کی سند جید ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اس کے شواہد بھی ملتے ہیں مثلاً حدیث ابن مسعود، ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، جن کو امام بیہقی نے نقل کیا اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حدیث، جس کو دیلمی نے نقل کیا اور حضرت عمار کی حدیث جو امام عقیلی نے علی بن قاسم کندی کے طریق سے نقل کی اور کہا کہ علی بن قاسم شیعی ہے لہٰذا یہ محل نظر ہے، اس کی حدیث کا کوئی متابع نہیں "لسان المیزان" میں ہے کہ ابن حبان نے علی بن قاسم کا ثقات میں ذکر کیا ہے، اور عبدالرحمن بن صالح اور قبیصہ بن عقبہ اس کی متابعت میں ہیں جن کی روایات کو امام طبرانی نے نقل کیا۔ (تنزیہ الشریعہ المرفوعہ لابن عراق : ۱/ ۳۳۵)

میں (مولف) کہتا ہوں کہ اس نے سخت زیادتی کی ہے جس نے اس پر وضع کا حکم لگایا ہے۔

اجابت رسول ﷺ

جو شخص بھی حضور نبی کریم ﷺ کو "یا محمد" کہہ کر پکارتا ہے تو آپ ﷺ اس کو جواب سے نوازتے ہیں۔

امام ابو یعلیٰ کے نزدیک ذکر عیسیٰ میں حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں ہے:

ولئن قام علی قبری فقال: یامحمد لاجیبنہ... اگر وہ (عیسیٰ) میری قبر پر کھڑے ہو کر "یا محمد" کہیں گے تو میں ضرور بر ضرور ان کو جواب دوں گا۔

علامہ ابن حجر نے اس کو (المطالب العالیہ: ۴/ ۲۳) میں "حیاۃ ﷺ فی قبرہ" کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔

بارگاہ نبوی ﷺ میں سلام ارسال کرنا

یزید مہدی کہتے ہیں کہ جب میں حضرت عمر بن عبدالعزیز سے الوداع ہوا تو انہوں نے کہا کہ "مجھے آپ سے ایک کام ہے۔" میں نے عرض کیا اے امیرالمومنین! آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟ تو انہوں نے کہا:

انی اراک اذا اتیت المدینہ" ستری قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فا قرئہ منی السلام۔

میرا خیال ہے کہ جب تو مدینہ منورہ جائے گا تو قبر نبی ﷺ کی زیارت کرے گا' تو آپ ﷺ کی بارگاہ میں میرا سلام بھی پیش کر دینا۔

حاتم بن وردان کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز شام سے مدینہ منورہ جانے والے قاصد کو متوجہ کیا کرتے تھے' تاکہ وہ نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں ان کا سلام عرض کرے۔ اس کو قاضی عیاض نے "الشفاء باب الزیارۃ: ۲ / ۸۳" میں ذکر کیا ہے۔

امام خفاجی اور ملا علی قاری نے شرح شفاء میں ذکر کیا ہے کہ اس کو ابن ابی الدنیا اور حافظ بیہقی نے "شعب" میں روایت کیا ہے۔ اور امام خفاجی کا کہنا ہے کہ اسلاف کا یہ طریقہ تھا کہ وہ بارگاہ رسالت ماب ﷺ میں سلام ارسال کرتے تھے۔ سیدنا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ایسا ہی کرتے اور آپ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالٰی عنہما کو بھی سلام ارسال کرتے تھے۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پیش کرنے والے کا سلام پہنچنا ثابت ہے اگرچہ وہ دور رہی ہو' لیکن پھر بھی اس طریقہ میں آپ ﷺ کے پاس خطاب کی فضیلت ہے اور آپ ﷺ کا بنفس نفیس اس کو سلام کا جواب دینا ہے۔ (نسیم الریاض للخفاجی: ۲ / ۵۱۲)

علامہ فیروز آبادی نے بھی اس کو (الصلات والبشر: ۱۵۲) میں ذکر کیا ہے۔

قبر نبوی ﷺ سے سلام و اذان کی سماعت

امام حافظ ابو محمد عبداللہ دارمی اپنی کتاب "السنن" میں روایت کرتے ہیں' یاد رہے کہ یہ اصول حدیثیہ ستہ کی معتبر کتاب ہے:

قال: اخبرنا مروان بن محمد عن سعيد بن عبد العزيز قال: لما كان ايام الحره لم يوذن في مسجد النبي ﷺ ثلاثا' ولم يقم ولم يبرح سعيد بن المسيب من المسجد وكان لا يعرف وقت الصلوة الا بهمهمه يسمعها من قبر النبي ﷺ - (سنن الدارمی: ۱/۴۴)

کہتے ہیں کہ ہمیں مروان بن محمد نے سعید بن عبدالعزیز سے خبر دی' کہ ایام حرہ کے دوران مسجد نبوی میں تین دن تک ازان و اقامت نہ ہوئی' اور سعید بن مسیب مسجد میں ہی محصور رہے' اور نماز کے وقت وہ قبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آواز سنتے' جس سے وقت نماز کی پہچان ہو جاتی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب نے اسے اپنے "مجموعہ مولفات" کے "احکام تمنی الموت" میں نقل کیا ہے۔ (صفحہ: ۳/ ۷۴)

صاحب قاموس امام مجد الدین فیروز آبادی نے ابراہیم بن شیبان کی یہ روایت نقل کی ہے کہ

حججت فجئت المدينه فتقدمت الى قبر النبي صلى الله عليه وسلم فسلمت عليه فسمعت من داخل الحجرة وعليك السلام.

میں حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ آیا اور قبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام پیش کیا تو میں نے حجرہ شریف کے اندر سے یہ جواب سنا: وعلیک السلام:

(الصلات والبشر: ۵۴)

شیخ ابن تیمیہ کی تائید

شیخ ابن تیمیہ نے "قبر کو مسجد یا عبادت کے لیے بت بنانے" کے بارے میں کلام کرتے ہوئے ان واقعات کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ امور ہمارے اس باب سے متعلق نہیں، یعنی جو یہ مروی ہے کہ لوگوں نے نبی ﷺ کی قبرانور سے یا دیگر صالحین کی قبور سے سلام کا جواب سنا' اور یہ کہ حضرت سعید بن مسیب حرہ کی راتیں قبرانور سے اذان کی سماعت کرتے وغیرہ۔

دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ اسی طرح جو کرامات اور خوارق عادت امور ذکر کئے جاتے ہیں' جو انبیاء و صالحین کی قبور کے پاس ظہور پذیر ہوتے ہیں مثلاً وہاں انوار و ملائکہ کا نزول' شیاطین و بہائم کا فرار' قبور اور مجاوروں کا نار دوزخ سے چھٹکارا' ہمسایہ کی اموات کی شفاعت' وہاں تدفین کا مستحب ہونا اور انس و سکون کا حصول' نیز ان کی اہانت وغیرہ پر عذاب کا نازل ہونا' یہ سب کچھ حق ہے لیکن ہمارے موضوع سے خارج ہے اور جو انبیاء و صالحین کی قبور میں اللہ تعالیٰ کی کرامت و رحمت ہے' وہ مسلم ہے۔ اور اس سے اوپر اللہ تعالیٰ کے ہاں جو کرامت و رحمت اکثر مخلوق خیال کرتی ہے' وہ محض وہم ہے لیکن یہ مقام اس مسئلہ کی تفصیل کا نہیں۔

(اقتضاء الصراط المستقیم للشیخ ابن تیمیہ: ۳۷۳-۳۷۴)

عصمت مصطفےٰ ﷺ

اللہ تعالیٰ و سبحانہ کا ارشاد گرامی ہے:

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔(حٰمٓ السجدۃ: ۳۶)	اور اگر تجھے شیطان کا کوئی کونچا پہنچے تو اللہ کی پناہ مانگ' بے شک وہی سننا جاننا ہے۔

اس آیہ مبارکہ کے ظاہری الفاظ کے پیش نظر ایسے لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں' جو عارفین کے دستر خوان کے طفیلی اور کلام الٰہی کی تفسیر کی بزعم خود جسارت کرنے والے ہیں اور استدلال اس سے یہ کرتے ہیں کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر شیطان کا تسلط اور وسوسہ ڈالنا جائز ہے۔ العیاذ باللہ۔

اور اس باب میں دیگر آیات واردہ اور احادیث مرویہ کو بھی اپنی تائید میں پیش کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے' جبکہ وہ صرف ظاہری الفاظ کے پجاری ہیں اور حقائق ثابتہ سے بالکل بحث نہیں کرتے اور نہ ہی اصول یقینیہ متواترہ کی کوئی پرواہ اور رعایت کرتے ہیں' حالانکہ وہ دین کے ازحد ضروری اصول معلومہ ہیں جو ہر نص کو صحیح سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

اس اصول سے کمال درجے کی عصمت انبیاء علیہم السلام ثابت ہوتی ہے چہ جائیکہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم' جن کو انبیاء میں بھی حد درجے کا کمال حاصل ہے۔

قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امت مسلمہ کا اس پر اجماع ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت اپنے کمال پر ہے اور آپ ﷺ شیطانی تسلط اور وساوس سے کماحقہ محفوظ و مامون ہیں۔ شیطان میں آپ ﷺ کو کسی طرح کی جسمانی تکلیف دینے کی قوت نہیں اور نہ ہی آپ ﷺ کے قلب انور پر وساوس کی طاقت بلکہ آپ ﷺ کے جمیع احوال میں اس کی کوئی مداخلت نہیں اور اس کے لیے مکمل طور پر سد باب ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مامنکم من احد الا و کل به قرینه من الجن وقرینه من	تم میں سے ہر ایک کے ساتھ دو قرین مقرر کئے گئے ہیں: ایک جن (شیطان) اور

الملائکۃ" قالوا: وایاک یارسول اللہ؟ قال: وایای ولکن اللہ اعاننی علیہ فاسلم۔

دوسرا فرشتہ۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ کے ساتھ بھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں میرے ساتھ بھی' لیکن اللہ تعالٰی نے اس میں میری مدد فرمائی کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے۔

حضرت منصور سے یہ زیادت بھی مروی ہے کہ

فلا یامرنی الابخیر۔

وہ مجھ سے صرف امر خیر کی ہی بات کرتا ہے۔

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی اس معنی میں مروی ہے "فاسلم" کا لفظ میم کی پیش سے بھی مروی ہے یعنی "فاسلم انا منہ" (میں اس سے محفوظ ہوں)

بعض نے اسی روایت کو صحیح اور قابل ترجیح قرار دیا ہے اور "فاسلم" کا لفظ میم کی زبر کے ساتھ بھی مروی ہے یعنی وہ قرین حالت کفر سے نکل کر حلقہ بگوش اسلام ہو گیا اور فرشتے کی طرف وہ مجھ سے صرف بھلائی ہی کی باتیں کرتا ہے اور یہی حدیث کا ظاہر ہے اور بعض نے اس کو "فاستسلم" بھی روایت کیا ہے۔

جب اس شیطان اور قرین کا یہ حکم ہے جو بنی آدم پر مسلط ہے تو کسی اور شیطان کی کیا مجال ہو گی' لہذا کسی شیطان کو آپ ﷺ سے صحبت و قرب کی جرأت نہیں۔

اعتراض اور اس کا جواب

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالٰی کے اس فرمان عالیشان کا کیا معنی ہے:

وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ...

اور اگر تجھے شیطان کا کوئی کونچا (وسوسہ) پہنچے تو اللہ کی پناہ مانگ' بے شک وہی سنتا جانتا ہے۔ (حم السجدہ: ۳۶)

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس خطاب سے آپ ﷺ کی امت مراد ہے۔

یہ بھی ان دیگر خطابات کی طرح ہے' جن میں روئے سخن نبی کریم ﷺ کی طرف ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی اسی باب سے ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ -(الحج: ۵۲)	اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے سب پر کبھی یہ واقعہ گزرا ہے کہ جب انہوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا' تو مٹا دیتا ہے اللہ اس شیطان کے ڈالے ہوئے کو' پھر اللہ اپنی آیتیں پکی کر دیتا ہے اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔

اس آیت کے معنی سمجھنے میں کثیر علماء نے لغزش کھائی اور بیشتر قراء کی سوچیں غلط رخ دھار گئیں' جب انہوں نے یہاں "تمنی" کی تفسیر "تلاوت" سے کی اور "اذا تمنی" کا معنی "اذا قراء" کیا' یعنی معنی یوں ہوا کہ جب رسول یا نبی وہ پڑھتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی کیا' تو شیطان اس کی قرات پر مسلط ہو جاتا ہے اور اس میں کچھ ملا دیتا ہے جو وہ چاہتا ہے' پھر اللہ تعالیٰ اس شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسے کو مٹا دیتا ہے۔

اس تاویل کی صحت کے لیے وہ غرانیق کے قصہ سے استدلال کرتے ہیں' اور وہ قصہ یہ ہے کہ "مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سورہ "والنجم" کی تلاوت فرمائی اور:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى۔	تو کیا تم نے دیکھا لات اور عزیٰ اور تیسری دیوی کو۔

کی تلاوت کرنے کے بعد یہ کہا:

تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى وَاِنَّ شَفَاعَتَهَا لَتُرْتَجٰى۔	یہ خوبصورت بلند پایہ دیوتے ہیں اور بیشک ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔

غرانیق اصل میں ایک آبی نر پرندے کو کہتے ہیں (جو سارس کے مشابہ ہوتا ہے) اور اس کی سفیدی کی وجہ سے اس نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی واحد "غرنوق اور غرنیق" آتی ہے۔ اور اس کا معنی کرکی (سارس) بھی منقول ہے (اس کی جمع کراکی آتی ہے)

غرنوق سفید خوبصورت نوجوان کو بھی کہتے ہیں۔ ان کا گمان یہ تھا کہ یہ بت انہیں اللہ سے قریب کرتے ہیں اور ان کے لیے شفاعت کرتے ہیں' لہٰذا وہ بلند پایہ ہونے میں پرندوں سے مشابہ ٹھہرائے گئے جو آسمانوں میں بلندی پہ پرواز کرتے ہیں۔

"لترتجٰی" کی بجائے "لترتضی" بھی مروی ہے۔ اور ایک روایت میں یوں مروی ہے:

اِنَّ شَفَاعَتَهَا لَتُرْتَجٰى وَاِنَّهَا لَمَعَ الْغَرَانِيْقِ الْعُلٰى۔	بیشک ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے اور یہ اپنے بلند پایہ دیوتاؤں کے ساتھ ہیں۔

جبکہ دوسری روایت میں یوں ہے:

وَالْغَرَانِيْقَةُ الْعُلٰى تِلْكَ الشَّفَاعَةُ تُرْتَجٰى۔	اور بلند پایہ دیوتیاں ہیں' ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔

تو جب سورہ ختم ہوتی تو حضور ﷺ نے سجدہ کیا اور مسلمان بھی سجدہ ریز ہو گئے' نیز کفار بھی سجدہ میں گر گئے جب انہوں نے اپنے معبودوں کی تعریف سنی۔

اور جو بعض روایات میں آیا ہے کہ شیطان لعین نے یہ کلمہ آپ ﷺ کی زبان پر جاری کر دیا اور نبی کریم ﷺ کی یہ خواہش تھی کہ کوئی ایسی برہان نازل ہو جو آپ ﷺ اور آپ کی قوم کے درمیان مقاربت پیدا کرے' تو جب شیطان نے یہ

الفاظ القاء کئے تو آپ ﷺ بے حد غمگین ہوئے تو اللہ تعالیٰ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ ﷺ کی تسلی کے لیے یہ آیہ مقدسہ نازل فرمائی:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ‌ ۚ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ‌ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۙ۔(الحج: ۵۲)

اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول یا نبی بھیجے سب پر کبھی یہ واقعہ گزرا ہے کہ جب انہوں نے پڑھا تو شیطان نے ان کے پڑھنے میں لوگوں پر کچھ اپنی طرف سے ملا دیا۔ تو مٹا دیتا ہے اللہ اس شیطان کے ڈالے ہوئے کو' پھر اللہ اپنی آیتیں پکی کر دیتا ہے اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی:

وَاِنۡ كَادُوۡا لَيَفۡتِنُوۡنَكَ عَنِ الَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ لِتَفۡتَرِىَ عَلَيۡنَا غَيۡرَهٗ ‌ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوۡكَ خَلِيۡلًا ۔(بنی اسرائیل: ۷۳)

اور وہ تو قریب تھا کہ تمہیں کچھ لغزش دیتے ہماری وحی سے جو ہم نے تم کو بھیجی کہ تم ہماری طرف کچھ اور نسبت کر دو اور ایسا ہوتا تو وہ تم کو اپنا گہرا دوست بنا لیتے۔

آیت کریمہ کی صحیح تفسیر

اب اس آیہ کریمہ کی صحیح تفسیر جو امام عارف باللہ شیخ عبد العزیز دباغ رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے' وہ قارئین کے سپرد ہے:

اللہ تعالیٰ و سبحانہ نے جو رسول اور نبی بھی کسی امت کی طرف مبعوث فرمایا' تو وہ رسول اپنی امت کے لیے ایمان کا خواہاں رہا اور یہی ان کے لیے پسند کرتا اور اسی کی ترغیب دیتا' نیز انہیں ایمان پر خوب برانگیختہ کرتا اور اس سلسلے میں آڑے آنے والے امور کا سدباب بھی کرتا' خصوصاً اس معاملہ میں ہمارے آقا و مولا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت اور شان ہی نرالی تھی' جن کو اللہ رب

العزت سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا۔(الکھف: ۶)	تو کہیں تم اپنی جان پر کھیل جاؤ گے ان کے پیچھے اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائیں غم سے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ۔(یوسف: ۱۰۳)	اور اکثر آدمی تم کتنا ہی چاہو ایمان نہ لائیں گے۔

اور فرمان خداوندی ہے:

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔(یونس: ۹۹)	تو کیا تم لوگوں کو زبردستی کرو گے یہاں تک کہ مسلمان ہو جائیں۔

وغیرہ دیگر آیات بھی جو اس معنیٰ کو متضمن ہیں۔ پھر امت آپس میں تقسیم ہوگئی' جیساکہ ارشاد پروردگار عالم ہے:

وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ۔(البقرۃ: ۲۵۳)	لیکن وہ مختلف ہوگئے' ان میں کوئی ایمان پر رہا اور کوئی کافر ہوگیا۔

لہٰذا جو کافر ہوا اس کے دل میں شیطان نے وساوس ڈالے' جو رسالت کے بارے میں اسے بے چین کرتے رہے' حتیٰ کہ اس کے کفر کا سبب بنے۔ اسی طرح مومن بھی وساوس سے خالی نہیں ہوتا کیونکہ یہ اکثر ایمان بالغیب کو لازم ہیں' اگرچہ لوگوں میں قلت وکثرت اور متعلقات کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

یہ بات ذہن نشین ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ "تمنی" کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لیے ایمان جیسی لازوال دولت کے متمنی تھے اور ان کے لیے رشد وہدایت بھلائی اور فلاح وبہبود کے خواہاں تھے۔ ہر رسول اور ہر نبی کی یہی خواہش ہوتی ہے اور شیطان کے القاء کا مطلب یہ ہے کہ اس نے

امت دعوت کے دلوں میں ایسے ایسے وسوسے ڈال دیئے جو بعض کے کفر کا سبب ٹھہرے[9] اور اللہ تعالیٰ جل مجدہ الکریم نے مومنوں پر رحم فرماتے ہوئے ان کے دلوں سے ان وساوس کو مٹادیا اور ان میں ایسی آیات بینات منقش کردیں جو توحید و رسالت پر واضح دلالت کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے منافقین اور کافرین کے دلوں میں ان وساوس کو باقی رکھا تاکہ وہ اس سے فتنے میں ڈالے جائیں۔

پس معلوم ہوا کہ وساوس دونوں گروہوں کے دلوں میں ڈالے گئے' پھر مومنین کے دلوں سے خارج کردیئے گئے اور کافرین پر دوام اختیار کرگئے۔ یہی صحیح کلام ہے جو اس آیہ کریمہ کی تفسیر سے متعلق ہے۔

رہا قصہ غرانیق' تو جہاں تک اس قصہ کا تعلق ہے یہ عقلاً اور نقلاً" باطل ہے۔ اب اس قصہ غرانیق کا ابطال ذرا تفصیل سے درج ذیل ہے:

قصہ غرانیق اور نقل

اس بیان کی حدیث اہل صحت میں سے کسی نے بھی نقل نہیں کی اور نہ ہی کسی ثقہ آدمی نے سلیم اور متصل روایت کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے۔ البتہ اس طرح کے غیر مسلم واقعات کے ذمہ دار وہ مفسرین اور مورخین ہیں جو ہر نئی بات کے فوراً گرویدہ ہو جاتے ہیں اور اسے کتابوں سے فوراً اچک لیتے ہیں جبکہ اس کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کا قطعاً کوئی خیال نہیں کرتے۔

قاضی بکر بن علاء مالکی نے خوب سچ کہا ہے کہ

لوگ بعض اہل اہواء و تفسیر کی باتوں میں مبتلا ہیں' حالانکہ اس واقعہ میں بھی ملحدین قسم کے لوگوں کا ہاتھ ہے' باوجودیکہ اس کی نقل میں ضعف' روایات میں اضطراب' سند میں انقطاع اور کلمات میں اختلاف ہے' مثلاً ایک کہتا ہے کہ "آپ ﷺ نماز میں تھے۔" اور دوسرا کہتا ہے کہ "آپ ﷺ کو اونگھ آئی۔" اور کوئی کہتا ہے کہ "آپ ﷺ بھول گئے۔" اور کوئی یہ کہتا ہے کہ "شیطان نے یہ کلمات

آپ ﷺ کی زبان پر کہے' اور جب نبی کریم ﷺ نے وہ جبریل علیہ السلام پر پیش کیے تو انہوں نے کہا: "کیا اس طرح میں نے آپ کو پڑھایا ہے؟" اور کوئی یوں کہتا ہے کہ "شیطان نے لوگوں کو یہ سکھایا کہ نبی ﷺ نے یوں قرات کی۔" تو جب یہ بات آپ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کی قسم اس طرح کی آیات نازل نہیں ہوئیں۔" وغیرہ راویوں کے اختلاف سے وارد ہیں۔

میں (مالکی) نے جس مفسر اور تابعی سے بھی اس حکایت کو پایا اور اس کی چھان بین کی تو ان میں سے کسی نے بھی اس کی سند بیان نہیں کی اور نہ ہی اس کا مرفوع ہونا ثابت کیا۔ اس کے اکثر طرق تو انتہائی ضعف کے حامل ہیں۔

قصہ غرانیق اور عقل

اس مسئلہ پر امت مسلمہ کا اجماع ہے اور حجت قائم ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں اور آپ ﷺ اس طرح کے رذائل اور قبائح سے منزہ اور مبرا ہیں۔ قصہ غرانیق کا اعتقاد دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو یہ ہوگا کہ آپ ﷺ متمنی تھے کہ اس طرح غیر اللہ یعنی معبودان باطلہ کی مدح کا نزول ہو' تو یہ صریح کفر ہے۔ یا یہ کہ آپ پر شیطان مسلط ہو گیا اور قرآن کو آپ پر مشتبہ کر دیا حتیٰ کہ اس میں وہ کلمات ملا دیئے جو حقیقت میں قرآن کا حصہ نہیں تھے اور نبی کریم ﷺ نے خیال کیا کہ یہ قرآن ہی ہے حالانکہ وہ قرآن نہیں تھا' یہاں تک کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے تنبیہ فرمائی۔ یہ سارے کی ساری گفتگو آپ ﷺ کے حق میں ممتنع ہے یا یہ کہ نبی کریم ﷺ نے خود جان بوجھ کر یہ کلمات کہے تو یہ واضح کفر ہے' یا بھول کر' بہرحال نبی کریم ﷺ ان تمام امور سے معصوم ہیں۔

دلائل و براہین اور اجماع سے یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ گیا کہ حضور ﷺ معصوم ہیں۔ کفر آپ ﷺ کے قلب و لسان پر جاری نہیں ہو سکتا' نہ جان بوجھ کر اور نہ بھول کر۔ وہ قرآن جو فرشتہ آپ ﷺ پر لے کر آیا' شیطان اس میں ملاوٹ

کر کے آپ پر مشتبہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے آپ ﷺ پر کوئی چارہ ہے۔ نیز جو آپ ﷺ پر نازل نہیں ہوا' اس کو جانتے ہوئے یا نہ جانتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا آپ ﷺ کی شان نہیں' گویا کہ ایسا معاملہ آپ ﷺ کے منصب عالیہ سے قطعاً خارج ہے اور اللہ تعالیٰ و سبحانہ کا ارشاد گرامی ہے:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ۔	اور اگر وہ ہم پر ایک بات بھی بنا کر کہتے ضرور ہم ان سے بقوت بدلہ لیتے۔

(الحاقہ: ۴۴-۴۵)

اور فرمان خداوندی ہے:

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا۔	اور ایسا ہوتا تو ہم تم کو دونی عمر اور دوچند موت کا مزہ دیتے پھر تم ہمارے مقابل اپنا کوئی مددگار نہ پاتے۔

(بنی اسرائیل: ۷۵)

ایک ادنیٰ سے غور و فکر والے پر بھی یہ بات مخفی نہیں کہ یہ مروی کلام قرآنی اسلوب سے کوسوں دور' فصاحت قرآنی سے قطعاً کوئی مناسبت نہ رکھنے والا' مدح و ذم کو یکجا کرنے والا اور تالیف و نظم کے خلاف ہے' اور دوسری بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم' حاضرین مسلمانوں اور سرداران مشرکین پر یہ مخفی رہا' اگر یہ کلام ایسا ہی ہے تو حضور نبی مکرم ﷺ کے حلم اور حکمت و دانائی کو ترجیح کیسے حاصل ہوگی' جبکہ آپ ﷺ کا مبارک علم بیان اور فصیح کلام کی معرفت کے بیان میں بہت وسیع ہے؟

منافقین' معاندین' مشرکین' کمزور دلوں والے اور جاہل مسلمانوں کی یہ عادت معلوم ہے کہ وہ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی باتوں اور ناقابل توجہ امر کو لغزش قرار دے کر اسلام سے نفرت کا اظہار کرتے اور دشمنان اسلام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلام پر

طعن و تشنیع کرنے کا موقع فراہم کرتے' مسلمانوں کو ہمیشہ عار دلاتے اور وقتاً فوقتاً ان کو سب و شتم کا نشانہ بناتے رہتے تھے اور یہ لوگ ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے کہ کہیں کوئی ادنیٰ سا شبہ بھی سامنے آئے تو ہم اسلام سے پھر جائیں تاکہ مسلمان متاثر ہوں' کیونکہ ان کے دلوں میں بیماری تھی۔

اور جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے یہ بھی اسی باب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس قصہ کو کسی ثقہ آدمی نے روایت نہیں کیا' صرف یہ ایک روایت ہے جو اصلاً ضعیف ہے۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو قریش اس دلیل سے مسلمانوں پر غالب آ جاتے۔ یہود ان پر حجت قائم کرتے' جیسا کہ انہوں نے واقعہ معراج میں مکابرہ کیا' حتیٰ کہ اس روایت میں بعض ضعفاء کی ردت ثابت ہے۔ مسلمان تو مسلمان کسی معاند سے بھی اس قصہ میں کوئی کلمہ مروی نہیں' جو اس قصہ کے بطلان اور کذب پر واضح دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ سید ہے

حضرت عبداللہ بن شخیر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ وہ قبیلہ بنو عامر میں شامل تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں وفد کی شکل میں حاضر ہوا' کہتے ہیں:

فسلمنا علیه' فقلنا انت	ہم نے آپ ﷺ کو سلام پیش کیا اور
ولینا وانت سیدنا وانت اطول	یوں عرض گزار ہوئے کہ آپ (ﷺ)
علینا طولا وانت افضل علینا	ہمارے آقا و مولا' ہمارے سردار' ہم پر بہت
فضلا وانت الجفنه الغراء	زیادہ احسانات کرنے والے اور انتہائی
فقال قولوا قولکم ولا	شریف فیاض سردار ہیں' تو آپ ﷺ
یستجرنکم الشیطان وربما	نے فرمایا: صرف اپنے محاورے کی بات کرو'

قال:ولا یستھوینکم۔(رواہ احمد)

اور شیطان تجھے ہانک کر نہ لے جائے۔ (راوی کبھی یوں رویت کرتے) اور شیطان تجھے ہوا و ہوس کی طرف نہ لے جائے۔ (یعنی تعریف میں مبالغہ کی طرف)

حضرت عبداللہ بن شخیر اپنے والد سے راوی ہیں: کہ ایک شخص بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر یوں عرض گزار ہوا:

انت سید قریش فقال النبی ﷺ: السید الله' قال انت افضلها فیها قولا واعظمها فیها طولاً فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لیقل احدکم بقوله: ولا یستجره الشیطان۔(رواہ احمد)

آپ (ﷺ) قریش کے سردار ہیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سردار اللہ ہے' وہ عرض کرنے لگا: آپ (ﷺ) نے ان میں قول کے اعتبار سے افضل و اعلیٰ اور سخاوت کے اعتبار سے زیادہ فیاض ہیں' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی یہ کہے کہ شیطان اسے پھسلا نہ دے۔

اور ایک روایت میں یوں ہے کہ

فقلنا انت سیدنا' فقال: السید الله' قلنا: وافضلنا فضلا واعظمنا طولاً فقال: قولوا بقولکم او بعض قولکم ولا یستجرینکم الشیطان۔ (رواہ ابوداؤد)

ہم نے عرض کیا آپ ہمارے سردار ہیں' تو آپ ﷺ نے فرمایا: سید (سردار) اللہ ہی ہے' تو ہم نے کہا: آپ (ﷺ) سب سے زیادہ عظمت و فضیلت والے اور ہم سب سے زیادہ فیاض ہیں' تو آپ ﷺ نے فرمایا: بس اپنی ملت کے معروف قول پر اکتفا کرو اور شیطان تمہیں اپنا وکیل نہ بنالے۔

بعض حضرات نے اس حدیث کے ظاہر سے سمجھا کہ لفظ "سید" کا اطلاق مخلوق

پر جائز نہیں اور یہ صرف اللہ الخالق سبحانہ و تعالیٰ کی ذات سے مختص ہے' بلکہ بعض تشدد پسند حضرات نے تو مخلوق پر لفظ "سید" کا اطلاق کرنے والوں کی تکفیر کی۔ حالانکہ یہ قول باطل ہے اور کتاب و سنت متواترہ کے سراسر خلاف ہے۔

کیا مخلوق کو سید کہنا جائز ہے؟

مخلوق پر لفظ "سید" کے اطلاق کے جواز پر کتاب اللہ اور سنت متواترہ سے دلائل شاہد ہیں۔ پہلے قرآن حکیم و برہان رشید کے دلائل ملاحظہ ہوں۔

(۱) اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا۔ (آل عمران: ۳۹)	اور سردار اور ہمیشہ کے لیے عورتوں سے بچنے والا۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کے بارے میں اللہ کریم کا ارشاد ہے:

وَاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ۔ (یوسف: ۲۵)	اور دونوں کو عورت کا میاں دروازے کے پاس ملا۔

(۳) کفار کی حکایت اللہ تعالیٰ نے یوں فرمائی:

اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا۔ (الاحزاب: ٦٧)	ہم اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کے کہنے پر چلے۔

(۴) اور فرمان باری تعالیٰ ہے:

يَوْمَ لَا يُغْنِىْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ۔ (الدخان: ۴۱-۴۲)	جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ان کی مدد ہوگی' مگر جس پر اللہ رحم کرے۔

اب وہ روایات ملاحظہ ہوں جو حضور نبی اکرم ﷺ سے ایسے تواتر کے ساتھ مروی ہیں' جس میں کوئی شبہ نہیں۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد گرامی ہے:

لا یقولن احدکم عبدی وامتی ولا یقولن المملوک ربی وربتی' لیقل المالک فتای وفتاتی' ولیقل المملوک سیدی وسیدتی فانهم المملوکون والرب الله عزوجل۔(رواہ احمد)

تم میں کوئی اپنے غلام کو "عبد" اور "امہ" کے لفظ سے یاد نہ کرے' اور نہ ہی کوئی غلام اپنے مالک کے لیے "رب" اور "ربہ" کا لفظ استعمال کرے۔ بلکہ مالک اسے خادم اور خادمہ کہے' اور غلام اسے سید اور سیدہ کہے۔ بیشک یہ سب مملوک ہیں اور رب اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں:

لا یقل احدکم اطعم ربک وضئی ربک اسق ربک' ولیقل سیدی ومولای' ولا یقل احدکم عبدی وامتی ولیقل: فتای وفتاتی وغلامی۔

(رواہ البخاری)

تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ اپنے رب کو کھانا کھلا' اپنے رب کو پانی پلا......

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت یوں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

لا یقولن احدکم عبدی فکلکم عبید الله ولکن لیقل فتای ولا یقل العبد ربی ولکن لیقل سیدی۔

(رواہ ابوداؤد)

تم میں سے کوئی اپنے غلام کے لیے "عبدی" کا لفظ استعمال نہ کرے کہ تم سب اللہ کے عبد ہو' اور اس کی بجائے "فتای" کا لفظ کہے اور نہ ہی کوئی غلام اپنے مالک کو "ربی" کہہ کر پکارے بلکہ اسے "سیدی" کے

لفظ سے یاد کرے۔

(۴) حضرت سعید بن ابی سعید مقبری سے مروی ہے کہ ہم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھے' اتنے میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور ہمیں سلام کہا اور ہم نے انہیں سلام کا جواب دیا' ابو ہریرہ کو یہ معلوم نہ تھا' تو ہم نے انہیں بتایا کہ اے ابو ہریرہ یہ حسن بن علی ہیں جنہوں نے ہمیں سلام کہا ہے' تو آپ رضی اللہ عنہ نے ساتھ لاحق ہوتے ہوئے یوں کہا:

وعلیک السلام یاسیدی'	اے میرے سردار! آپ پر سلام ہو' پھر
ثم قال: سمعت رسول الله	کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی الله علیه وسلم یقول:	کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بے شک یہ
انه سید۔(رواۃ الحاکم)	"سید" ہیں۔

امام حاکم اسے روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے اور شیخین نے اسے نقل نہیں کیا اور امام طبرانی نے کبیر میں اسے روایت کیا' اور اس کے رجال ثقہ ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور بھی احادیث مروی ہیں۔

(۵) حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اہل قریظہ جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر متفق ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پیغام بھیجا تو وہ گدھے پر سوار ہو کر حاضر ہوئے' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قُوْمُوْآ اِلٰی سَیِّدِکُمْ اَوْ اِلٰی خَیْرِکُمْ۔	تم اپنے سردار کی خاطر کھڑے ہو جاؤ۔

اس حدیث مبارکہ کو امام احمد' امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا۔

(۶) حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحسن والحسین سیدا شباب اھل الجنه۔	حسن اور حسین جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں۔

امام احمد اور امام ترمذی نے اسے روایت کیا' نیز امام ترمذی نے اس حدیث مبارکہ کو حسن صحیح کہا۔

(۷) ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مرض مرگ میں مبتلا تھے' تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں' ان کی ہر چال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مشابہ تھی' جونہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو کہا:

مرحبا بابنتی' فاقعدھا عن یمینہ او عن یسارہ ثم سارھا بشیئی۔	اے میری بیٹی خوش آمدید' پھر انہیں اپنے دائیں یا بائیں بٹھالیا۔ پھر ان سے کچھ سرگوشیاں کیں۔

اس حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کہا:

یافاطمۃ اما ترضین ان تکونی سیدۃ نساء العالمین او سیدۃ نساء ھذہ الامۃ فضحکت۔(رواۃ ابوداؤد والطیالسی)	اے فاطمہ! کیا تو راضی نہیں کہ تو تمام جہان کی عورتوں کی سردار ہو یا اس امت کی عورتوں کی سردار' تو وہ مسکرا پڑیں۔

اور ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں:

الا ترضین ان تکونی سیدۃ نساء المؤمنات او نساء المؤمنین۔	کیا تو راضی نہیں کہ تو ایمان والی عورتوں یا ایمان والوں کی عورتوں کی سردار ہو۔

اس کو امام احمد' امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا اور اس کے طرق متعدد ہیں۔

(۸) ابوبکرہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں خطبہ ارشاد فرمارہے تھے کہ حضرت حسن تشریف لائے' تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان ابنی ھذا سید' ولعل اللّٰه تبارک وتعالی ان یصلح به بین فئتین من المسلمین- (رواہ البخاری)

بے شک میرا یہ نواسہ سید ہے' اور امید ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح فرمادے گا۔

(۹) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس حالت میں دیکھا کہ آپ ﷺ منبر پر تھے اور حسن آپ ﷺ کے پاس تھے' اور آپ ﷺ ایک مرتبہ لوگوں پر متوجہ ہوتے اور ایک مرتبہ حسن پر متوجہ ہو کر فرماتے:

ان ابنی ھذا سید-(رواہ الامام احمد)

بے شک میرا یہ نواسہ سید ہے۔

اس باب میں روایات کثیرہ وارد ہیں' جن کا یہاں احاطہ کرنا مشکل ہے' البتہ آخر میں صحیح کی ایک حدیث ہدیہ قارئین ہے۔

(۱۰) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا نصح العبد لسیدہ واحسن عبادۃ ربه کان له اجرہ مرتین-(رواہ البخاری و مسلم)

جب غلام اپنے آقا کی خیرخواہی اور اپنے رب کی خوب عبادت کرتا ہے تو اس کے لیے اس کا دوگنا اجر ہے۔

جب ان احادیث متواترہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ لفظ "سید" کا اطلاق اس امت کے افراد پر جائز ہے' تو لامحالہ حضور نبی کریم ﷺ تمام مخلوق سے زیادہ اس کے مستحق اور لائق ہیں۔ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔

لفظ "سید" کا صحیح مفہوم

علامہ خطابی کہتے ہیں کہ دراصل حقیقی سرداری صرف اللہ تعالیٰ عزوجل کے لیے ہے اور تمام مخلوق اس کی عبد ہے' اور حضور سرور کائنات ﷺ نے اپنے ارشاد گرامی:

انا سید ولد آدم۔ میں اولاد آدم کا سردار ہوں۔

کے باوجود انہیں "سید" کہنے سے اس لیے منع کیا کہ وہ ابھی نئے نئے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے اور ان کا خیال تھا کہ نبوت کی سیادت ایسے ہی ہے ' جیسے اسباب دنیا میں رؤسا کی سیادت ہے ' جس کی وجہ سے وہ ان کی تعظیم کرتے اور ان کے احکام بجالاتے ہیں۔ حضور ﷺ کے ارشاد گرامی "قولوا بقولکم " کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اہل دین اور اہل ملت کا قول اختیار کرو ' اور مجھے نبی اور رسول کہہ کر پکارو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب مبین میں میرا نام رکھا اور مجھے سید کے نام سے نہ پکارو جیسا کہ تم اپنے رؤساء اور عظماء کو پکارتے ہو ' مزید یہ کہ مجھے ان کی مثل نہ ٹھہراؤ ' بے شک میں ان میں سے کسی کی طرح نہیں ہوں ' کیونکہ وہ تمہارے اسباب دنیا کے سردار ہیں اور میں نبوت و رسالت میں تمہارا سردار ہوں۔ یہاں مولانا محمد یحیٰ مرحوم ایک تقریر میں رقمطراز ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "السید ھو اللہ " اور ان کو اس سے منع فرمانا ' باوجودیکہ اس کلمہ کے اطلاق کی رخصت ہے ' محض آپ ﷺ کے نفس نفیسہ کی انکساری ہے۔ (بذل المجھود فی حل ابی داؤد : ۱۹/۲۶)

میں (سید مالکی) کہتا ہوں : احتمال ہے کہ آپ ﷺ نے ان کو یہ وحی آنے سے قبل منع فرمایا ہو کہ " آپ ﷺ اولاد آدم کے سردار ہیں۔ "

حافظ غماری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عالیشان "السید ھو اللہ " اور "قولوا بقولکم " حقیقت میں ان کو یہ تعلیم دینا مقصود تھی کہ جس معنیٰ کا انہوں نے اس کلمے سے قصد کیا تھا۔ اس کی صحیح معرفت کے بعد "سیدنا " کہیں ' کیونکہ لفظ "سید " ان کی لغت میں کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً :

(۱) جس کا اطلاق مخلوق پر جائز ہے۔

(۲) جس کا اطلاق و اعتقاد صرف اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی ذات پر جائز ہے اور اس کا

اطلاق فقط مالک حقیقی پر ہوتا ہے جو کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہی ذات گرامی ہے۔

(۳) مجازی طور پر جن کو ملک اور رقبہ مجازیہ میں تصرف حاصل ہے' ان پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

(۴) جو اپنی قوم سے بلند پایہ اور قدر و منزلت کا حامل ہو' اس پر کلمے کا اطلاق ہوتا ہے۔

(۵) دانشور' فاضل' فیاض' شریف اور ایسے بردبار اور تحمل والے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کا غصہ اس کی شخصیت کو مجروح نہ کرے۔

(۶) اس کلمے کا اطلاق زوج پر بھی ہوتا ہے۔

تو جب انہوں نے آپ ﷺ کو "انت سید" کہا تو آپ ﷺ کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ ایسی سیادت حقیقی کا اعتقاد نہ کر بیٹھیں' جو صرف اور صرف اللہ رب العزت کے ہی شایان شان ہے' کیونکہ ابھی اسلام میں ان کا بالکل نیا قدم ہے اور قواعد اسلامیہ سے پوری طرح واقف بھی نہیں کہ کون سے امور اللہ تعالیٰ جل شانہ کے لیے واجب اور کون سے جائز ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ ان کی توجہ اس حقیقی معنی کی طرف دلائی کہ "حقیقی سردار اللہ تعالیٰ ہی ہے۔" اس کے علاوہ کوئی نہیں' اور جب انہوں نے لفظ سید کا معنی مقصود متعین کر لیا کہ "آپ ﷺ ان سے افضل ہیں۔" تو یقیناً انہوں نے اس معنی کا ارادہ کیا جس کا اطلاق مخلوق پر جائز ہے' تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ کہنے کی اجازت دے دی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اپنی پہلی بات یعنی "سردار صرف اللہ ہے" پر اکتفا نہیں فرمایا' کیونکہ اگر آپ ﷺ اس پر خاموشی اختیار کر جاتے' تو وہ اس کلمے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اطلاق کی ممانعت پر دلیل بن جاتی۔ اسی لیے سکوت اختیار نہیں فرمایا بلکہ انہیں کہا "قولوا" (تم کہو) جو کہ آپ ﷺ کے ساتھ مخاطب ہونے اور آپ ﷺ کے نام نامی اسم گرامی کے ذکر کے وقت لفظ

"سید" کے استحباب کی تاکید پر دلیل ہے۔

سرداری میرے حضور ﷺ کی

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ سرداروں کے سردار اور زمین و آسمان والوں کے امام ہیں' جیساکہ آپ ﷺ کا واضح ارشاد گرامی ہے:

انا سید ولد آدم۔ میں اولاد آدم کا سردار ہوں۔

پس حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی ذات کے لیے سرداری ثابت کی اور یہ خبر دی کہ آپ ﷺ اولاد آدم کے سردار اور مومنین کے آقا ہیں بدیہی اور ضروری طور پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ خبر محض اس لیے دی کہ اس پر کامل ایمان رکھا جائے اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کیا جائے۔ عمل سے مراد آپ ﷺ کی سیادت کا اعتقاد اور زبانی اعتراف ہے' جیساکہ آپ ﷺ نے اپنے رسول ہونے کی خبر دی تو آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان اور زبانی اعتراف واجب ٹھہرا۔

حضور نوشہ بزم ہدایت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس ارشاد گرامی "انا سید ولد آدم" کے راوی مندرجہ ذیل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں:

حضرت ابو ہریرہ' ابو سعید خدری' عبد اللہ بن عمرو بن عاص' واثلہ بن اسقع' حضرت ابو بکر صدیق' جابر بن عبد اللہ' انس بن مالک' عبد اللہ بن سلام' عبادہ بن صامت' ابن عباس' ام المومنین عائشہ' حسن بن علی' سلمہ بن کہیل' حذیفہ بن یمان' ام کرز' اور ابو موسیٰ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

اب چند منتخب احادیث اس باب میں پیش کی جاتی ہیں:

(1) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی معیت میں ایک دعوت میں حاضر ہوئے تو دستی کا گوشت آپ ﷺ کو پیش کیا گیا۔ کیونکہ وہ آپ ﷺ کو زیادہ پسند تھا تو آپ ﷺ نے اسے دانتوں سے کھانا شروع کر دیا اور

فرمایا:

انا سید الناس یوم القیامۃ: میں بروز قیامت لوگوں کا سردار ہوں گا۔

امام احمد' امام بخاری اور امام مسلم نے طویل حدیث شفاعت میں اسے نقل کیا:

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انا سید ولد آدم یوم القیامۃ واول من ینشق عنہ القبر واول شافع واول مشفع۔

میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور سب سے پہلے میری ہی قبر کھولی جائے گی اور سب سے پہلے میں ہی شفاعت کرنے والا ہوں گا اور میری ہی شفاعت پہلے قبول کی جائے گی۔

صحیح مسلم میں فضائل کے باب میں یہ مروی ہے اور امام ابوداؤد نے اپنی "سنن" میں اسے روایت کیا ہے۔

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

انا اول من یدخل الجنۃ ولا فخر وانا اول شافع واول مشفع ولا فخر وانا بیدی لواء الحمد یوم القیامۃ ولا فخر وانا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولا فخر واول شخص یدخل الجنۃ فاطمہ بنت محمد ﷺ ومثلھا فی ھذہ الامۃ مثل مریم فی بنی اسرائیل۔

سب سے پہلے میں ہی جنت میں جاؤں گا مجھے فخر نہیں اور میں ہی پہلے شفاعت کرنے والا ہوں گا اور پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی مجھے فخر نہیں بروز قیامت حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہی ہو گا مجھے فخر نہیں' اور پہلی جنت میں داخل ہونے والی فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے' ان کی مثال اس امت میں ایسی ہے جیسے مریم بنی اسرائیل میں۔

ابو نعیم نے اسے دلائل النبوۃ میں روایت کیا:

(۴) حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولا فخر وبیدی لواء الحمد ولا فخر ما من نبی یومئذ آدم فمن سواہ الا تحت لوآئی وانا اول من تنشق عنہ الارض ولا فخر۔	میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور مجھے فخر نہیں' میرے ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہو گا مجھے فخر نہیں' اس دن آدم علیہ السلام اور تمام نبی میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے' اور سب سے پہلے میری ہی قبر کھولی جائے گی اور مجھے فخر نہیں۔

امام احمد' ترمذی اور ابن ماجہ نے اسے روایت کیا نیز امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا۔

(۵) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولا فخر واول من تنشق عنہ الارض واول شافع مشفع بیدی لواء الحمد تحتہ آدم فمن دونہ۔	میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا لیکن مجھے فخر نہیں' اور پہلے میری ہی قبر کھولی جائے گی اور میں پہلے شفاعت کرنے والا ہوں گا اور میری شفاعت ہی پہلے قبول کی جائے گی' میرے ہاتھ ہی میں حمد کا جھنڈا ہو گا' جس کے نیچے آدم علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام ہوں گے۔

ابن حبان نے اپنی صحیح میں قسم ثالث نوع سابع و سبعین میں اسے روایت کیا۔

(۶) حضرت واثلہ بن اسقع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں:

ان اللہ اصطفی من ولد	بے شک اللہ تعالیٰ نے اولاد اسماعیل

اسماعیل کنانۃ واصطفی من کنانۃ قریش واصطفی من کنانۃ قریشا بنی ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم' فانا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولا فخر واول من تنشق عنہ الارض واول شافع واول مشفع۔	سے کنانہ کو منتخب فرمایا اور کنانہ سے قریش اور قریش سے بنو ہاشم کو چن لیا' اور بنو ہاشم سے میرا انتخاب فرمایا' میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا لیکن مجھے فخر نہیں اور پہلے میری ہی قبر کھولی جائے گی' میں پہلے شفاعت کرنے والا ہوں گا اور پہلے میری ہی شفاعت قبول کی جائے گی۔

ابن حبان نے اسے بھی صحیح میں قسم ثانی' نوع رابعہ و عشرین میں روایت کیا ہے۔

(۷) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انا اول من یاخذ بحلقۃ باب الجنۃ فیفتحھا اللہ لی او فیدخلنیھا اللہ ومعی فقراء المومنین وانا سید الاولین والاخرین من النبیین ولا فخر۔	جنت کے دروازے کا کنڈا سب سے پہلے میں ہی پکڑوں گا تو اللہ تعالیٰ وہ میرے لیے کھول دے گا یا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس میں داخل فرمادے گا اور میرے ساتھ ایمان والے فقرا ہوں گے' اور میں پہلے اور پچھلے نبیوں کا سردار ہوں گا' لیکن مجھے فخر نہیں۔

دیلمی نے اسے مسند الفردوس سے روایت کیا۔

(۸) ابو نعیم نے دلائل النبوۃ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ارسلت الی الجن والانس والی کل احمر واسود واحلت لی الغنائم دون الانبیاء	میں جن و انس اور ہر سرخ و سیاہ کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ میرے لیے غنیمت کا مال حلال کیا گیا' جو کہ دوسرے انبیاء علیہم

وجعلت لی الارض کلھا طھورا ومسجدا ونصرت بالرعب امامی شھرا واعطیت خواتیم سورۃ البقرۃ وکانت من کنوز العرش وخصصت بھا دون الانبیاء واعطیت المثانی مکان التوراۃ والمائدہ مکان الانجیل والخواتیم مکان الزبور وفضلت بالمفصل وانا سید ولد آدم فی الدنیا والاخرہ۔	السلام کے لیے نہ تھا' میرے لیے ساری زمین پاک اور مسجد بنائی گئی اور میری رعب کے ساتھ مدد کی گئی جو کہ ایک ماہ کی مسافت تک مخالف پر طاری ہو جاتا' مجھے سورہ بقرہ کی آخری آیات دی گئیں جو کہ عرش کے خاص خزانے سے نازل ہوئیں' مجھے ان (نعمتوں) سے مختص کیا گیا جس سے دوسرے انبیاء علیہم السلام محروم رہے' اور مجھے تورات کی جگہ سبع مثانی' انجیل کی جگہ مائدہ اور زبور کی جگہ سورہ بقرہ کی آخری آیات سے نوازا گیا' اور مجھے مفصل کے ساتھ فضیلت دی گئی اور میں دنیا و آخرت میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا۔

(۹) ام کرز سے ابو نعیم دلائل میں روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

انا سید المومنین اذا بعثوا وسائقھم اذا وردوا ومبشرھم اذا ابلسوا وامامھم اذا سجدوا واقربھم مجلسا من الرب تعالی اذا اجتمعوا اقول فاتکلم فیصدقنی واشفع فیشفعنی واسال فیعطینی۔ (رواہ ابو نعیم فی الدلائل)	میں مومنوں کا سردار ہوں گا جب وہ اٹھیں گے اور میں ان کا سائق ہوں گا جب وہ آئیں گے اور میں ہی ان کو خوشخبری سنانے والا ہوں گا۔ جب وہ متحیر اور شکستہ خاطر ہوں گے۔ میں ان کا امام ہوں گا جب وہ سجدہ کریں گے اور میں ہی اللہ رب العزت کی بارگاہ میں ان سے زیادہ قریب بیٹھنے والا ہوں گا جب وہ اکٹھے ہوں گے' میں

کہتا ہوں کہ میں کلام کروں گا اللہ تعالیٰ
میری تصدیق فرمائے گا' میں شفاعت کروں
گا وہ میری شفاعت قبول فرمائے گا اور میں
سوال کروں گا اور وہ مجھے عطا فرمادے گا۔

یہ اس حدیث کی بعض روایات ہیں جن کو ہم نے منتخب کیا ہے۔ ان سب کو حافظ ابو الفیض احمد بن محمد بن صدیق غماری نے ذکر کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ یہ طرق متواترہ ہیں جو یقینی اور قطعی علم کا فائدہ دیتے ہیں' کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انا سید ولد آدم" اور بے شک آپ ﷺ ہر مومن مرد اور عورت کے آقا و مولیٰ ہیں۔ اس پر ایمان رکھنا فرض واجب اور قطعاً لازم ہے جو زبانی اقرار کے سوا کامل نہیں ہوتا' بلکہ خود رسول معظم ﷺ نے اس کے حکم اور اسم گرامی کو بغیر سیادت کے ذکر کرنے والے پر تنبیہ کی طرف اشارہ فرمایا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے' وہ فرماتے ہیں کہ

صعد رسول الله صلى الله عليه وسلم على المنبر فحمد الله واثنى عليه' ثم قال من انا؟ قلنا رسول الله' قال نعم' ولكن من انا؟ قلنا: انت محمد بن عبدالله بن عبدالمطلب ابن هاشم بن عبد مناف' قال انا سيد ولد آدم ولا فخر۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر جلوہ افروز ہوئے' اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی' پھر فرمایا میں کون ہوں؟ ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے' لیکن میں کون ہوں؟ ہم نے کہا: آپ ﷺ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور مجھے کوئی فخر نہیں۔

اس کو امام حاکم نے روایت کیا اور فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے

اور شیخین نے اسے نقل نہیں کیا۔ میں (مالکی) کہتا ہوں کہ حق یہی ہے' حافظ ذہبی کی ابن اسحاق عطار اور قاسم ہاشمی کی تنقید کا کوئی اعتبار نہیں' ابن حبان نے قاسم ہاشمی کو ثقات میں ذکر کیا اور ابو حاتم وغیرہ نے ان دونوں کی تعریف کی ہے۔

صحابہ کا جواباً یہ کہنا "انت محمد بن عبد اللہ" اور اس کے بعد حضور پرنور شافع یوم النشور ﷺ کا فرمانا "انا سید ولد ولا فخر" سیادت کے امر اور عدم ذکر سیادت کی نفی میں عرف کے اعتبار سے ظاہر بلکہ نص جلی ہے۔ گویا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: تم کیوں نہیں کہتے "سیدنا محمد ﷺ! بے شک آپ ﷺ اولاد آدم کے سردار ہیں لیکن فخر نہیں۔"

ندائے رسول اللہ ﷺ

اس کی تائید اور مزید وضاحت اس امر سے ہوتی ہے کہ اللہ جل شانہ نے ہمیں آپ ﷺ کو تعظیم سے خالی فقط نام مبارک سے ندا دینے سے منع فرمایا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لا تجعلوا دعا الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا۔(النور: ۶۳)	رسول (ﷺ) کے پکارنے کو آپس میں ایسا نہ ٹھہرالو جیسا تم میں ایک دوسرے کو پکارتا ہے۔

ابو نعیم دلائل النبوۃ میں فرماتے ہیں کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ نے لوگوں کو منع فرما دیا کہ وہ آپ ﷺ سے صرف اسم ذات کے ساتھ مخاطب نہ ہوں' اور پہلی تمام امتوں کی خبر دی کہ وہ اپنے انبیاء و رسل سے ان کا نام لے کر مخاطب ہوتے' جیسے ان کا قول "یاموسی اجعل لنا الھا کما لھم آلھہ۔" اور "یاعیسی ابن مریم ھل یستطیع ربک" اور "یاھود اجئتنا" اور "یاصالح ائتنا" واضح دال ہے۔ تو اللہ رب العزت نے امت مسلمہ کو رسول اللہ ﷺ

کے کمال ادب کی تعظیم دیتے ہوئے فرمایا:

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔(النور: ۶۳)	رسول (ﷺ) کے پکارنے کو آپس میں ایسا نہ ٹھہرالو جیسا تم میں ایک دوسرے کو پکارتا ہے۔

گویا کہ اللہ تعالیٰ وسبحانہ نے آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ کی تشریف و تکریم کی خاطر امت مسلمہ کو نبوت و رسالت کے وصف سے یاد کرنے کی تعلیم فرمائی۔ اس عظیم فضیلت سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جمیع انبیاء و مرسلین میں ممتاز کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: "لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا" کے بارے میں حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگ آپ ﷺ کو "یا محمد" اور "یا ابا القاسم" کہہ کر پکارتے تھے' تو اللہ کریم نے اپنے پیارے نبی ﷺ کی عظمت کی خاطر انہیں اس سے منع فرمایا' اور فرمایا کہ یوں کہا کرو: "یا نبی اللہ' یا رسول اللہ۔"

"کدعاء بعضکم بعضا" کے بارے حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا کہ عاجزی اور انکساری کے ساتھ "یا رسول اللہ" کہا کرو اور ترش روئی میں "یا محمد" مت کہو۔

اسی ارشاد باری تعالیٰ کے متعلق حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ اللہ کریم نے انہیں حکم دیا کہ میرے نبی ﷺ کی تشریف و تفخیم کا پاس رکھو۔

حضرت قتادہ کی اسی روایت کو علامہ عبد الرزاق' عبد بن حمید' ابن منذر اور ابن حاتم نے بایں الفاظ روایت کیا ہے:

امر اللہ ان یھاب نبیہ وان یبجل وان یعظم وان یفخم ویشرف۔	اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم اور تشریف و تفخیم کا پاس رکھا جائے۔

اسی آیہ مقدسہ کے بارے میں حضرت عکرمہ سے عبد بن حمید روایت کرتے ہیں کہ

لا تقولوا یامحمد ولکن قولوایارسول اللہ۔	یامحمد نہ کہو بلکہ یارسول اللہ کہو۔

اسی طرح ہی سعید بن جبیر اور حسن کے اقوال ہیں' جن کے بھی راوی عبد بن یدہی ہیں۔

حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ اللہ کریم نے اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم اور سیادت کے لحاظ رکھنے کا حکم فرمایا۔ اور مقاتل کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب تم اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یاد کرو تو یا محمد اور یا ابن عبد اللہ نہ کہو بلکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شرافت و عظمت کا خیال رکھتے ہوئے یوں کہو: یا نبی اللہ' یا رسول اللہ۔

(دیکھئے امام حافظ شہاب الدین ابو لفیض احمد بن محمد بن صدیق کی کتاب: تشنیف الاذان: ص ۸۸)

یہی وہ معنی ہے جس پر ائمہ اسلام اور فقہائے مذاہب کا اتفاق ہے۔ اور انہوں نے اسی آیہ کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے آپ ﷺ کو مجرد نام سے نداء کرنے کی حرمت پر فتویٰ دیا' اور مذکورہ بالا معنی کو ثابت کیا' اور اسی طرح ہی علماء سیرو خصائص کا بیان ہے۔ جیسا کہ حافظ عراقی "الالفیہ فی السیرۃ النبویہ" میں فرماتے ہیں۔

ولا یحل الرفع فوق صوتہ
ولا ینادی باسمہ بل نعتہ

"آپ ﷺ کی آواز سے اونچی آواز کرنا جائز نہیں' اور نہ آپ ﷺ کو مجرد نام سے ندا دی جائے بلکہ آپ ﷺ کے وصف و نعت کو ذکر کیا جائے۔"

اور ابن زکری "الہمزیہ" میں فرماتے ہیں۔

ولحرمة قدركم حرمت دعا
وتكم باسمكم وذم النداء

"تمہارے ناموں کے ساتھ تمہیں پکارنا' تمہارے صاحب قدر و منزلت

ہونے کی بدولت جائز نہیں اور ایسی نداء مذموم ہے۔"

اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ادب سکھاتے ہوئے ان کو منع فرمادیا کہ وہ آپ ﷺ کو نام لے کر ندا کریں اور یوں کہیں "یا محمد" یہ تمہاری وہاں اپنی قدر و عظمت اور بلند مرتبہ یعنی شان و شوکت برقرار رکھنے کی دلیل ہے اور اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرف اشارہ فرمایا: "لا تجعلوا دعاء الرسول بينكم كدعا بعضكم بعضا۔" جس کی تفسیر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نام مبارک سے نہ پکارو جیسے تم میں ایک دوسرے کو پکارتا ہے' بلکہ ادب و احترام اور تعظیم و توقیر کو بجالاتے ہوئے پست آواز اور انکساری کے ساتھ یوں کہو "یارسول اللہ اور یانبی اللہ۔" کیونکہ آپ ﷺ ہمارے خلیفہ اکبر' نائب اعظم اور انتہائی مقرب عبد خاص ہیں۔ تمہارا ان کی تعظیم کرنا ہماری تعظیم' تمہارا ان کا ادب و احترام کرنا ہمارا ادب' تمہارا ان سے تعلق قائم کرنا ہمارے ساتھ تعلق اور تمہارا ان کی طرف منسوب ہونا ہماری طرف منسوب ہونا ہے' نیز تمہارا ان کی نظروں میں ذلیل ہونا ہمارے ہاں ذلیل ہونا ہے لہٰذا تم پر لازم ہے کہ تم ان کے ادب و احترام اور تعظیم و تکریم کا پورا پورا خیال رکھو اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس کی تائید کرتا ہے:

وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ۔ اور ان کے حضور بات چلا کر نہ کہو۔

(الحجرات: ۲)

ابو محمد مکی فرماتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کے لیے خطاب میں سختی نہ برتو' اور نہ ہی آپ ﷺ کو اسم گرامی سے ندا دو جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو' بلکہ آپ ﷺ کی تعظیم و توقیر کرو اور عمدہ ترین وصف سے آپ ﷺ

کو پکارو جس سے پکارنا محبوب ہے یعنی "یا رسول اللہ' یا نبی اللہ۔" اور آپ ﷺ کے ذکر کے وقت تسوید (سیدنا کہنا) بھی اسی معنی سے متعلق ہے۔ قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روایت میں لفظ "سید" اور "مولیٰ" کی زیادتی اچھی ہے' اگرچہ اصل میں وارد نہ ہو اور یہ حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر کے حکم کا مقتضی ہے۔ (تشنیف الاذان : ص ۸۸)

لا تسیدونی

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ خبر حدیث نبوی ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت کرنا صحیح نہیں' کیونکہ یہ ایک فاحش طرز اور لغوی خطا ہے' لہٰذا اس کی نسبت افصح الخلق صلوات اللہ وسلامہ علیہ کی طرف کرنا جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سید بطور فعل لغت عرب میں استعمال نہیں ہوتا۔ ہاں سود کا استعمال ہوتا ہے' اس لیے بعض لوگوں نے یہ معنی لیا اور کہا کہ حدیث کے لفظ یہ ہیں:

لاتسودونی فی الصلوۃ۔ مجھے نماز میں سردار نہ بناؤ۔

لیکن یہ بھی بالکل باطل' بہت بڑا جھوٹ اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء ہے' کثیر محدثین نے اسے موضوعات میں شامل کیا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی منسوب کی گئیں۔

امام جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے جواباً فرمایا: یہ موضوع اور باطل ہے۔ جیسا کہ اس پر امام سیوطی کی "الحاوی للفتاوی" میں کلام ہے۔

اور حافظ سخاوی رحمتہ اللہ علیہ "مقاصد حسنہ" میں فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی اصل نہیں اور اسی طرح امام جلال الدین محلی' شمس رملی' ابن حجر ہیتمی اور بعض فقہاء شافعیہ' مالکیہ اور حنفیہ کا بیان ہے۔ ملا علی قاری نے موضوعات میں اس کے بطلان کو واضح کیا ہے اور اسی طرح ہی ان کا قول:

لاتعظمونی فی المسجد۔ مسجد میں میری تعظیم نہ کرو۔

یہ بھی باطل ہے۔ حافظ عجلونی کا "کشف الخفاء" میں کہنا ہے کہ امام سخاوی کے "مقاصد حسنہ" میں ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں۔ علامہ ناجی "المولد موسوم بکنز العفاہ" میں کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ، من گھڑت اور افتراء ہے۔ دیکھئے جلد نمبر ۲، ص ۴۹۴۔

سید یوم القیامۃ

یادرہے کہ یہ سیادت بروز قیامت سے خاص نہیں، جیساکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان:

انا سید ولد آدم یوم القیامۃ۔ میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا۔

سے بعد نادانوں نے سمجھا ہے بلکہ آپ ﷺ دنیا و آخرت میں اولاد آدم کے سردار ہیں۔

امام نووی صحیح مسلم میں حضور پر نور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان ذیشان:

انا سید ولد آدم یوم القیامۃ واول من ینشق عنہ القبر واول شافع واول مشفع۔ میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار ہوں گا، سب سے پہلے میری ہی قبر کھولی جائے گی، میں ہی سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں اور سب سے پہلے میری ہی شفاعت قبول کی جائے گی۔

کے تحت کہتے ہیں کہ علامہ ہروی کا کہنا ہے کہ سید وہ ہوتا ہے جو امور خیر میں اپنی قوم سے فائق ہو اور بعض کہتے ہیں کہ سید وہ ہے جس کی طرف مصائب و آلام میں رجوع کیا جائے اور وہ ان کی دستگیری کرے، نیز ان کے مصائب و مشکلات کو دور کرے اور

انہیں نجات دلائے۔

حضور ﷺ کو فخر نہیں

سیدنا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی: "میں اولاد کا سردار ہوں" لیکن اس پر مجھے فخر نہیں، بلکہ غیر مسلمانوں میں بھی نفی فخر کی تصریح فرمائی جیسا کہ حدیث مشہور میں ہے:

انا سید ولد آدم ولا فخر۔ — میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور مجھے فخر نہیں۔

آپ ﷺ کے یہ کہنے کی دو وجہ ہیں:

(۱) تحدیث نعمت کے لیے، تاکہ فرمان باری تعالیٰ کا مقتضیٰ برقرار رہے:

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ (الضحیٰ: ۱۱) — اور اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو۔

(۲) اس بیان کی اپنی امت کو تبلیغ کرنا آپ ﷺ پر ضروری ہے، تاکہ وہ آپ ﷺ کے جاہ و مرتبہ کو پہچانیں، تعظیم و توقیر بجالائیں اور اس کے مقتضیٰ پر کامل اعتقاد رکھتے ہوئے عملی جامہ پہنائیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے آپ ﷺ کے حسب مرتبہ آداب بجالانے میں کوتاہی نہ کریں۔ یہ مبارک حدیث آپ ﷺ کی تمام مخلوق پر فضیلت کی دلیل ہے۔ یعنی آپ ﷺ جمیع مخلوق سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ کیونکہ اہل سنت کا مذہب ہے کہ آدمی ملائکہ سے افضل ہیں اور حضور پرنور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم تمام آدمیوں اور دیگر مخلوقات سے افضل و بالاتر ہیں۔

رہی یہ دوسری حدیث کہ

لاتفضلوا بین الانبیاء۔ — انبیاء میں فضیلت نہ دو۔

تو اس کا جواب پانچ وجہ سے درج ذیل ہے:

(۱) اولاد آدم کی سرداری معلوم ہونے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا لہٰذا جب سیادت بنی آدم کا علم ہوا' تو اس کی خبر دی۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادب اور تواضع کے لیے فرمایا۔

(۳) یہ نہی ایسی تفضیل سے ہے جو مفضول (جس پر فضیلت کی گئی) کی تنقیص کرے۔

(۴) ایسی تفضیل سے نہی ہے جو فتنہ و فساد تک پہنچا دے' جیسا کہ سبب حدیث میں مشہور ہے۔

(۵) یہ نہی نفس نبوت میں تفضیل سے خالی ہے' اس میں کسی کو کوئی فضیلت نہیں۔ رہی وہ تفضیل جو دیگر خصائص و فضائل سے تعلق رکھتی ہے تو ایسی تفضیل کا اعتقاد ضروری ہے گویا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔	یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں ایک کو دوسرے پر افضل کیا۔

(البقرہ: ۲۵۳)

کیا نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ناجائز ہے؟

سیدنا ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا:

سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: لا تطرونی کما اطرت النصاری ابن مریم' فانما انا عبدہ فقولوا: عبداللہ ورسولہ۔	کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھے تعریف میں اتنا نہ بڑھا دو جتنا نصاریٰ نے ابن مریم کو بڑھا دیا' بے شک میں اس کا بندہ ہوں۔ پس تم کہو: اللہ کے بندے اور اس کے رسول۔

(رواہ البخاری فی الصحیح)

حافظ ابن حجر "الفتح" میں فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد گرامی "لاتطرونی" "باب افعال سے ہے، جس کی مصدر "الاطراء" ہے جس کا معنی ہے "المدح الباطل" باطل طریقے سے مدح کرنا۔ جیسے تم کہتے ہو۔ "اطریت فلانا مدحته" کا معنی "فافرطت فی مدحه" ہے یعنی میں نے اس کی مدح میں مبالغہ کیا۔

(الفتح: احادیث الانبیاء باب واذکر فی الکتاب مریم: ٦/ ٦٠٦)

علامہ بدرالدین عینی "عمدۃ القاری" میں فرماتے ہیں کہ یہ اطراء سے مشتق ہے جس کا معنی المدح الباطل ہے، جیسے "اطریت فلانا مدحته" کا معنی "افرطت فی مدحه" ہے یعنی میں نے اس کی مدح میں مبالغہ کیا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ

الاطراء مجاوزه الحد فی المدح والکذب فیه۔	اطراء، تعریف میں حد سے گزر جانے اور اس میں جھوٹ بولنے کو کہتے ہیں۔

(عمدۃ القاری: احادیث الانبیاء، باب واذکر فی الکتاب مریم: ١٦/ ٣٧)

حافظ ابن حجر "فتح الباری" میں دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی (فقولوا عبد اللہ) اور امام مالک کی روایت میں (فانما انا عبد اللہ فقولوا) کے تحت محدث ابن جوزی کا کہنا ہے کہ کسی چیز کی نہی سے اس کا وقوع لازم نہیں آتا، کیونکہ ہمارے علم میں نہیں کہ کسی نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا دعویٰ کیا ہو جیسا نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا۔ رہا نہی کا سبب، تو وہ یہ ہے جو حدیث معاذ بن جبل سے ظاہر ہے کہ جب انہوں نے آپ ﷺ کے لیے سجدہ کرنے کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے انہیں منع فرمایا اور ایسا کرنے سے روکا۔ گویا کہ خدشہ یہ تھا کہ کہیں کوئی اس میں مبالغہ نہ کر بیٹھے، لہٰذا آپ ﷺ نے معاملہ کو تاکیداً منع فرمادیا۔

ابن تین کہتے ہیں کہ "لاتطرونی" کا معنی "لاتمدحونی کمدح

النصاری " ہے۔ یعنی نصاریٰ کی طرح میری تعریف نہ کرو' جیسے انہوں نے شان عیسیٰ علیہ السلام میں غلو کیا کہ بعض نے انہیں معبود بنالیا اور بعض نے ان کے اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اور کوئی ان کے ابن اللہ ہونے کا مدعی ٹھہرا' پھر نبی کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:"انا عبد الله۔"(میں اللہ کا بندہ ہوں)

(الفتح: کتاب الحدود' باب رجم الحبلی فی الزنا: ۱۲/ ۱۸۱)

یہ حدیث مبارکہ ایک ایسی نص ہے کہ غالی قسم کے لوگ اس کا سہارا لے کر من پرستی میں حد سے بڑھ جاتے ہیں' اس حدیث کو اس کے موضوع سے بدل دیتے ہیں اور اس کے مقتضی کے خلاف تاویل کرتے ہیں۔ نیز اس کو بے جا وارد کرتے ہیں' تاکہ اس سے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف کی ممانعت پر استدلال کر سکیں' حالانکہ اس کا تعلق اطراء اور ایسے مذموم غلو سے ہے جو شرک تک پہنچادے' لیکن ان کا استدلال کہ ہر وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی کرے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دیگر عام نوع بشر سے رفعت بیان کرے اور آپ ﷺ کی ایسی تعریف و توصیف کرے جو ماسوا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ممتاز کرے' تو اس نے دین متین میں بدعت پیدا کی اور سنت سید المرسلین ﷺ کے خلاف کیا۔

یقیناً یہ ایک بری سمجھ ہے اور ایسا کہنے والے کی کوتاہ نظری پر دال ہے۔ حالانکہ اس کا مفہوم واضح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باطل مدح سے منع فرمایا جیسے نصاریٰ نے ابن مریم کی باطل مدح کی' کہ انہوں نے "اللہ کا بیٹا" کہا۔

تو اس کا معنی یہ ہوا کہ جس نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی باطل مدح کی اور ایسا وصف بیان کیا جیسا نصاریٰ نے اپنے نبی کے لیے بیان کیا' تو وہ بھی انہی کی مثل ہوگا۔

رہا وہ شخص: حضور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف کما حقہ

کرتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حقیقت بشریت سے خارج نہیں کرتا اور نہ ہی نصاریٰ والا اعتقاد رکھتا ہے بلکہ پختہ یقین رکھتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں' تو بلاشک وشبہ ایسا شخص توحید پرستی میں سب سے کامل اور اکمل ہے' بہرحال سب سے پہلے جو اس طریقہ کار کے ذمہ دار ہیں' وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں' جو سب سے زیادہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننے والے' بارگاہ رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے زیادہ قرب حاصل کرنے والے اور آپ ﷺ کے پسندیدہ فعل پر کاربند ہونے اور ناپسندیدہ اور مکروہ فعل کے ترک کرنے پر سب سے زیادہ حریص تھے۔

علامہ قسطلانی "المواہب اللدنیہ" میں فرماتے ہیں کہ "حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ شعراء جو اسلام کا دفاع کیا کرتے تھے' ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: کعب بن مالک' عبداللہ بن رواحہ اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم۔ اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری دعا فرمائی ہے:

اَللّٰهُمَّ اَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ اے اللہ! اس (حسان) کی روح القدس (جبرئیل علیہ اسلام) کے ساتھ نصرت واعانت فرما۔

منقول ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ستر اشعار کے ساتھ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی اعانت فرمائی' اور حدیث میں وارد ہے کہ جبرئیل علیہ السلام حسان کے ساتھ ہوتے ہیں' جب وہ میری مدافعت کرتے ہیں۔ یعنی مشرکین کے ہجو پر مبنی اشعار کا منہ توڑ جواب دے کر مدافعت کرتے ہیں اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے وہ شعراء جو کفار پر بہت بھاری تھے وہ حضرت حسان اور حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔

(المواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیہ للعلامہ القسطلانی)

علامہ ابن اثیر "اسد الغابہ" میں رقمطراز ہیں کہ ابن سیرین فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شعراء حسان بن ثابت' کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کے کلام کی تقسیم اس طرح ہے کہ حضرت کعب بن مالک انہیں جنگ سے خوفزدہ کرتے' حضرت حسان ان کے حسب ونسب کو نیچا دکھاتے اور عبداللہ بن رواحہ انہیں کفر کی عار اور شرم دلایا کرتے تھے۔

ابھی ہم سیدنا و مولانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی میں ان کے اشعار بطور نمونہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محترم چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرض گزار ہوئے' یارسول اللہ! میں آپ ﷺ کی مدح میں کچھ کہنا چاہتا ہوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کہو' اللہ تعالیٰ تمہارے منہ کو سلامت رکھے' تو وہ یوں گویا ہوئے۔

من قبلها طبت فی الظلال وفی
مستودع حیث یخصف الورق

اس (زمین پر آنے) سے پہلے آپ جنت کے سایہ اور ودیعت گاہ میں خوش حال تھے جہاں پتے اوپر نیچے جوڑے جاتے تھے۔

ثم هبطت البلاد لا بشر
انت ولا مضغه ولا علق

پھر آپ زمین پر تشریف لائے' آپ اس وقت نہ بشر تھے نہ مضغہ اور نہ علقہ۔

بل نطفه ترکب السفین وقد
الجم نسرا واهله الغرق

بلکہ ایک مادہ مائیہ تھے جو کشتی نوح میں سوار تھا اور حال یہ تھا کہ طوفان غرق نسر (بت) اور اہل نسر کے لبوں تک پہنچ رہا تھا۔

تنقل من صالب الی رحم
اذا مضی عالم بدا طبق

وہ مادہ اسی طرح ایک صلب سے دوسرے رحم تک منتقل ہوتا رہا' جب ایک عالم گزر جاتا تھا دوسرا طبقہ شروع ہو جاتا۔

وردت نار الخلیل مکتتما
فی صلبه انت کیف یحترق

اور اسی طرح آپ نار خلیل میں بھی وارد ہوئے' آپ ان کے صلب میں پوشیدہ تھے تو وہ کیسے جلتے۔

حتی احتوی بیتک المهیمن من
خندف علیاء تحتها النطق

حتیٰ کہ اولاد خندف سے آپ کو وہ شرف عالی نصیب ہوا کہ دوسرے طبقوں کو اس سے بالکل نشیب کی نسبت ہے۔

وانت لما ولدت اشرقت
الارض وضاءت بنورک الافق

اور آپ کی جب ولادت باسعادت ہوئی تو زمین روشن ہو گئی اور آپ کے نور سے آفاق منور ہو گئے۔

فنحن فی ذالک الضیاء وفی
النور وسبل الرشاد نخترق

پس ہم اس ضیاء اور اس نور میں ہدایت کے راستوں کو طے کر رہے ہیں۔

حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اپنے ایک قصیدہ میں جس کا مطلع اس طرح ہے کہ۔

عفت ذات الاصابع فالجواء
الی عذراء منزلها خلاء

اس میں آپ رضی اللہ عنہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی میں یوں رطب اللسان ہوتے ہیں۔

وقال الله قد ارسلت عبدا
يقول الحق ان نفع البلاء

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے عبد خاص کو بھیجا ہے جو ہمیشہ حق بات کرتا ہے اگرچہ مصائب سے سامنا ہو۔

شهدت به فقوموا صدقوه
فقلتم لا نقوم ولا نشاء

میں اس کا شاہد ہوں بس تم اٹھو اور آپ ﷺ کی تصدیق کرو اور تم کہتے ہو کہ ہم اس کے لیے تیار ہی نہیں۔

وقال الله قد سيرت جندا
هم الانصار عرضتها اللقا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے انصار کو ایک لشکر کی صورت میں چلایا جن سے سامنا ہوا۔

لنا فی كل يوم من معد
سباب او قتال او هجاء

ہم ہر دن تیار رہتے ہیں گرفتاری ہو، قتال ہو یا ہجو۔

فنحكم بالقوا فى من هجاها
ونضرب حين تختلط الدماء

ہم ان کی ہجو کرنے والے کو ہجوی اشعار کا نشانہ بناتے ہیں اور مارتے ہیں جس وقت خون مختلط ہوتے ہیں۔

الا ابلغ ابا سفيان عنى
مغلغله فقد برح الخفاء

سنو! میں ابو سفیان کو اپنی طرف سے یہ پیغام پہنچاتا ہوں تاکہ ابہام اٹھ جائے۔

بان سيوفنا تركتك عبدا
وعبد الدار سادتها الاماء

بے شک ہماری تلواروں نے تمہیں غلام بنادیا اور غلام بھی وہ جس کی مالکہ باندیاں ہیں۔

هجوت محمدا فاجبت عنه
وعند الله فى ذاك الجزاء

تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتے ہو تو میں اس کا منہ توڑ جواب دیتا ہوں' اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس عمل کا بہت اجر ہے۔

اتهجوه ولست له بكف
فشر كما لخير كما الفداء

کیا تم اس کی ہجو کرتے ہو جس کی تم مثل نہیں ہو' بس تمہارا شر تمہاری بھلائی پر غالب ہے۔

هجوت مباركا برا حنيفا
امين الله شيمته الوفاء

تو نے ایک مبارک' نیکو کار اور راہ راست پر گامزن ہستی کی ہجو کی جو اللہ کے امین ہیں اور وفا ان کی عادت کریمہ ہے۔

فمن یھجو رسول اللہ منکم
ویمدحہ وینصرہ سواء

جو تم میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتا ہے' تو وہ مدح و نصرت میں بھی ایسے ہی ہے۔

فان ابی و والدہ وعرضی
بعرض محمد منکم وقاء

بے شک میرا باپ دادا اور میری عزت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے محافظ ہیں۔

لسانی صارم لا عیب فیہ
و بحری لا تکدرہ الدلاء

میری زبان گویا تلوار کی طرح تیز ہے جس میں کوئی عیب نہیں اور میرے دریا کو ڈول مکدر نہیں کر سکتے۔

اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی میں ایک قصیدہ یہ ہے جیسا کہ "المواہب" میں ہے:

اغر علیہ للنبوہ خاتم
من اللہ مشھود یلوح و یشھد

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مہر نبوت جلوہ افروز ہے جو اللہ کے سچے نبی ہونے کی شاہد ہے۔

وضم الا لہ اسم النبی الی اسمہ
اذا قال فی الخمس الموذن اشھد

اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اپنے نام سے ملا کر رکھا جب موذن پانچویں جملہ میں کہتا ہے اشہد---"

و شق له من اسمه ليجله
فذوا العرش محمود و هذا محمد

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے نام کو اپنے نام سے مشتق کیا تاکہ ان کی عظمت پر دال ہو کہ صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمد (ﷺ)

نبي اتانا بعد ياس وفتره
من الرسل والاوثان في الارض تعبد

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رسولوں کے آنے کی ناامیدی اور فترت کے بعد ہمارے پاس تشریف لائے' جبکہ زمین میں بتوں کی پوجا ہوتی تھی۔

فامسى سراجا مستنيرا و هاديا
يلوح كما لاح الصقيل المهند

آپ ﷺ سراج منیر اور ہادی بن کر ظاہر ہوئے جیسے تیز دھار اور چمکدار تلوار ظاہر ہوتی ہے۔

و انذرنا نارا و بشر جنه
و علمنا الاسلام فالله نحمد

آپ ﷺ نے ہمیں دوزخ سے ڈرایا اور جنت کی خوشخبری دی اور ہمیں اسلام کی تعلیم دی' ہم اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

وانت اله الخلق ربي و خالقي
بذلك ما عمرت في الناس اشهد

بے شک تو ہی مخلوق کا معبود' میرا رب اور میرا خالق ہے اسی لیے تو نے لوگوں میں عمر بھر رائج کر دیا اشہد ان لا الٰہ---"

تعالیت رب الناس عن قول من دعا
سواک الها انت اعلی و امجد

اے لوگوں کے پروردگار! تو اس قول سے بلند و بالا ہے جو تیرے سوا کوئی معبود بنائے اور تو ہی سب سے بلند و بالا اور بزرگوار ہے۔

لک الخلق والنعماء والامر کله
فایاک نستهدی وایاک نعبد

تمام مخلوق' نعمتیں اور تمام امور تیری ہی ملکیت ہیں' ہم تجھ سے ہی ہدایت طلب کرتے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔

"اسد الغابہ" اور کتاب شرف الرسول میں ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور سرور کائنات ﷺ کو یوں بھی مخاطب کرنے کی سعادت حاصل کی:

یا رکن معتمد وعصمه لائذ
و ملاذ منتجع و جار مجاور

اے مضبوط اور باوقار سہارے (محمد ﷺ) اور پناہ لینے والوں اور بخشیں مانگنے والوں کے پناہ گاہ اور پناہ گیروں کے سہارا اور ارمان۔

یامن تخیره الا له لخلقه
فحباه بالخلق الزکی الطاهر

اے وہ ذات جسے اللہ نے اپنی تخلیق کے لیے اختیار بخشا اور انہیں پاکیزہ اور صاف ستھرے خلق و خلق سے مختص کیا۔

انت النبی وخیر عصبه آدم
یامن یجود کفیض بحر ذاخر

آپ ﷺ نبی اور اولاد آدم سے بہتر ہیں' اے وہ ذات جس کی سخاوت

سمندر کی موجوں کی طرح جاری ہے۔

میکال معک و جبرئیل کلا هما
مدد لنصرک من عزیز قاهر

میکائیل اور جبرئیل علیہما السلام دونوں تمہاری مدد و نصرت کے لیے غالب اور قاہر(اللہ) کی طرف سے تمہارے ساتھ مامور ہیں۔

اور "اسد الغابہ" میں ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی قسم واقعہ ایسا ہی ہے جیسے حسان رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی مدح میں کہا کہ

متی یبدو فی الداجی البهیم جبینه
یلح مثل مصباح الدجی المتوقد

جب تاریک رات میں آپ ﷺ کی مبارک پیشانی کھل جاتی ہے تو ایسے چمکتی ہے جیسے اندھیرے میں روشن چراغ۔

فمن کان او من قد یکون کاحمد
نظام لحق ونکال لملحد

بس حضرت احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مثل کون ہوا ہے یا کون ہو گا جو اس قدر حق کا منتظم اور ملحد کو سزا دینے والا ہو۔

معاهد التنصیص میں ہے کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یوں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی کی سعادت حاصل کی:

له همم لا منتهی لکبارها
وهمته الصغری اجل من الدهر

آپ ﷺ کی بالا ہمتوں کی کوئی حد نہیں، جبکہ آپ ﷺ کی ادنیٰ سی ہمت بھی زمانے پر بھاری ہے۔

لہ راحہ لو ان معشار جودھا
علی البر کان البر اندی من البحر

آپ ﷺ کی یہ شان ہے کہ اگر آپ کی سخاوت کا دسواں حصہ خشکی پر ڈال دیا جائے تو وہ سمندر سے سخی ہو جاتی ہے۔

اور مدح رسول ﷺ میں ان اشعار کو بڑی شہرت حاصل ہے جو حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی طرف ہی منسوب ہیں:

واحسن منک لم ترقط عینی
واجمل منک لم تلد النساء

تجھ سا حسین میری آنکھ نے کبھی نہ دیکھا اور تجھ سا جمیل کسی عورت (ماں) نے نہ جنا۔

خلقت مبرءا من کل عیب
کانک قد خلقت کما تشاء

تمہیں ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا گویا کہ تمہاری تخلیق ویسے ہی ہوئی جیسے آپ چاہتے تھے۔

سیدنا حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ

"اسد الغابہ" میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے حضور سرور کائنات ﷺ کی نعت گوئی میں یوں لب کشائی کی:

انی تفرست فیک الخیر اعرفہ
واللہ یعلم ان ما خاننی البصر

بے شک میں نے آپ ﷺ کی ذات گرامی میں بھلائی کو پہچان لیا تھا اور میں اسے پہچان لیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ میری بصیرت نے خطا نہیں کی۔

انت النبی ومن یحرم شفاعته
یوم الحساب فقد ازری به القدر

آپ (ﷺ) نبی ہیں' اور بروز قیامت جو شخص آپ کی شفاعت سے محروم کر دیا گیا' بے شک قضاو قدر نے اسے حقیر اور نکما کر دیا۔

فثبت الله ما اتاك من حسن
تثبیت موسی ونصرا کالذی نصروا

بس اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی ان خوبیوں کو قائم اور ثابت رکھے جو اس نے آپ کو عطا کی ہیں جیسے اس نے موسیٰ علیہ السلام کو ثابت قدم رکھا اور ان کی صفات کو قائم رکھا' اور آپ کی مدد فرمائے جیسے پہلوں کی مدد کی۔

تو نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دعا دی کہ "اے ابن رواحہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی ثابت قدم رکھے۔" اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ثابت قدمی کی نعمت سے نوازا حتیٰ کہ آپ رضی اللہ عنہ جام شہادت نوش کر گئے۔

اور "اسد الغابہ" ہی میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یوں بھی مدح سرائی کی:

وفینا رسول الله یتلو کتابه
اذا انشق معروف من الفجر ساطع

اور ہم میں اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں جو اس کی کتاب کی تلاوت فرماتے ہیں' جب صبح صادق کے مشہور انوار پھوٹ نکلتے ہیں۔

ارانا الهدی بعد العمی فقلوبنا
به موقنات ان ما قال واقع

ہمیں آپ ﷺ نے گمراہی کے بعد ہدایت کا راستہ دکھایا اور ہمارے

دل یہ پختہ یقین رکھتے ہیں جو آپ ﷺ نے فرمایا وہ واقعتاً ایسے ہی ہے۔

یبیت یجا فی جنبه عن فراشه
اذا استثقلت بالمشرکین المضاجع

آپ ﷺ رات اس طرح بسر کرتے ہیں کہ آپ کا پہلو مبارک بستر سے جدا رہتا ہے' جبکہ مشرکین کی خواب گاہیں بھی ان کا بوجھ محسوس کرتی ہیں۔

سیدنا حضرت عبداللہ بن زبعری اور ایک صحابی شاعر رضی اللہ عنہما

منع الرقاد بلا بل وهموم
واللیل معتلج الرواق بهیم

مصائب و آلام نے نیند دور کر دی اور تاریک رات کے پردے پڑے ہیں۔

مما اتانی ان احمد لا منی
فیه فبت کاننی محموم

مجھے خبر ملی کہ احمد نے رات میں مجھ سے ملاقات کی' تو میری رات ایسی گزری کہ میں بخار زدہ ہوں (یعنی بہت سختی اور اضطراب میں رات بسر ہوئی)

یا خیر من حملت علی اوصالها
عیرانه سرح الیدین غشوم

اے ان لوگوں میں سب سے بہتر' جنہیں تیز رفتار اور طاقتور اونٹنی نے اپنے اعضاء پر سوار کیا۔ (یعنی جمیع اہل عرب سے بہتر)

انی لمعتذر الیک من التی
اسدیت اذ انا فی الضلال اهیم

میں آپ ﷺ سے ان امور کی معذرت کرتا ہوں، جن کا ارتکاب میں نے حالت کفر میں کیا۔

ایام تامرنی باغوی خطه
سهم و تامرنی بها مخزوم

یعنی جن دنوں میں قبیلہ سہم و مخزوم کو بغاوت اور سرکشی کا حکم دیتے تھے۔

وامد اسباب الردی و یقودنی
امر الغواه و امرهم مشووم

اور میں خواہش نفس کے اسباب کو بڑھاتا تھا اور سرکش لوگ مجھے کھینچ رہے تھے اور ان کا کام بالکل برا تھا۔

فالیوم آمن بالنبی محمد
قلبی و مخطئی هذا محروم

پس آج دن میرا دل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا اور اس سے رودگردانی کرنے والا۔یقینا محروم ہے۔

مضت العداوه وانقضت اسبابها
واتت اواصر بیننا وحلوم

دشمنی ختم ہو گئی اور دشمنی کے اسباب کٹ کر رہ گئے اور ہمارے درمیان قرابت داری اور عقل مندی کی باتیں آگئیں۔

فاغفر فدالك والدای کلا هما
زللی فانك راحم مرحوم

پس آپ (ﷺ) میری لغزشوں کو معاف فرما دیجئے، میرے ماں اور باپ دونوں آپ پر نثار ہوں، بے شک آپ ﷺ رحم فرمانے والے اور

رحم فرمائے گئے ہیں۔

وعلیک من سمه الملیک علامه
نور اغر و خاتم مختوم

اور آپ (ﷺ) پر مالک الملک کی عظیم نشانی موجود ہے' یعنی چمکتا ہوا نور اور ختم نبوت کی مہر۔

اعطاک بعد محبه برهانه
شرفا و برهان الاله عظیم

اللہ تعالیٰ نے محبت کے بعد آپ کو شرافت کی وجہ سے اپنی برہان عطا کی اور اللہ تعالیٰ کی برہان بہت بڑی ہے۔

ولقد شهدت بان دینک صادق
حتق و انک فی العباد جسیم

بے شک میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کا دین بالکل سچا ہے' اور یقیناً آپ بندوں میں عظیم المرتبہ ہیں۔

والله یشهد ان احمد مصطفی
متقبل فی الصالحین کریم

اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بے شک احمد (ﷺ) برگزیدہ ہیں اور نیکو کاروں میں مقبول اور معزز ہیں۔

قوم علا بنیانه من هاشم
فرع تمکن فی الذری واروم

بنو ہاشم قوم کی بنیادیں بہت بلند ہیں' اور ان کی نسل مضبوط اور بامقصد ہے۔

حضرت سیدنا اعشیٰ بکر بن وائل رضی اللہ عنہ

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ حضرت سیدنا اعشیٰ بکر بن وائل رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت سرائی میں یوں رطب اللسان ہوئے:

الم تغتمض عيناك ليله ارمدا
وبت كما بات السليم مسهدا

کیا آشوب زدہ آنکھ کی طرح تیری آنکھ بھی رات کو نہیں سوئی اور تو نے بھی ایسے ہی رات بسر کی جس طرح سانپ کا ڈسا ہوا شخص رات گزارتا ہے' یعنی سو نہیں سکتا۔

وما ذاك من عشق النساء وانما
تناسيت قبل اليوم خله مهددا

اور عورتوں کے عشق کی وجہ سے یہ حالت نہیں ہوئی (کیونکہ) مہدد کی محبت تو میں آج سے بہت پہلے بھول چکا ہوں۔

ولكن ارى الدهر الذى هو خائن
اذآ اصلحت كفاى عاد فافسدا

اور اس خیانت کرنے والے دور کی حالت میرے پیش نظر ہے کہ جب میرے ہاتھ کسی چیز کی اصلاح کرتے ہیں تو وہ دوبارہ اسے خراب کر دیتا ہے۔

كهولا و شبانا فقدت و ثروه
فلله هذا الدهر كيف ترددا

میں کئی بوڑھوں' جوانوں اور دولت و ثروت سے ہاتھ دھو بیٹھا یعنی میں نے انہیں کھو دیا' اللہ ہی جانے کہ اس زمانے کی گردش کتنی حیرت انگیز ہے۔

وما زلت بغى المال مذانا يافع
وليدا وكهلا حين شبت و امردا

میں جوان ہونے سے پہلے جب بے ریش بچہ تھا اس وقت سے لے کر میں ہمیشہ مال و دولت ہی کی تلاش میں رہا یہاں تک کہ میں ادھیڑ عمر ہوا اور بوڑھا ہو گیا۔

وابتذل العیس المراقیل تغتلی
مسافه ما بین النجیر فصر خدا

اور اب میں سرخی مائل سفید اونٹوں کو اتنی تیز رفتاری کے ساتھ پامال کر رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے سے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔

الا ایھذا السائلی این یممت
فان لھا فی اھل یثرب موعدا

اے وہ لوگو! جو مجھ سے اس بات کو پوچھتے ہو کہ آخران اونٹوں کا کہاں جانے کا قصد ہے؟ تو سن لو کہ یثرب والے لوگوں میں پہنچنا ان کی وعدہ گاہ ہے۔

فان تسالی عنی فیا رب سائل
حفی عن الاعشی به حیث اصعدا

اگر تم میرے متعلق دریافت کرتے ہو (تو کوئی تعجب نہیں) کیونکہ اعشیٰ کے بارے میں دریافت کرنے والے اور اس کے کرم فرما بہت زیادہ ہیں' وہ جہاں بھی جاتا ہے وہ اس کے متعلق پوچھتے رہتے ہیں۔

اجدت بر جلیھا النجاء وراجعت
یداھا خنافا لینا غیر احردا

اونٹنی نے اپنی تیز رفتاری میں انتہائی کوشش کی حتیٰ کہ اس کے اگلے پاؤں مڑ مڑ کر پڑنے لگے اور نرم ہو گئے لیکن وہ لنگڑاتی نہیں۔

وفیھا اذا ما ھجرت عجر فیه
اذا خلت حرباء الظھیره اصیدا

دوپہر کے سفر میں اس اونٹنی کی رفتار کا انداز انوکھا اور بے مثال ہوتا ہے' جب تو دھوپ میں دیکھے کہ گرگٹ گردن اکڑائے ہوئے بیٹھا ہے۔

والیت لها اری لها من کلالہ
ولا من حفی حتی تلاقی محمدا

اور میں نے قسم کھالی ہے کہ کسی قسم کی تھکاوٹ اور پاؤں کے گھس جانے کے باعث بھی میں اس پر نرمی نہیں کروں گا' حتیٰ کہ وہ محمد ﷺ تک پہنچ جائے۔

متی ما تناخی عند باب ابن ھاشم
تراحی و تلقی من فواضلہ ندا

جب تو ابن ہاشم کے دروازے کے پاس بٹھائی جائے گی تو تجھے راحت اور سکون میسر آئے گا اور تو آپ ﷺ کیا خلاق فاضلہ کا فیض حاصل کرے گی۔

نبی یری ما لا ترون و ذکرہ
اغار لعمری فی البلاد و ابجدا

آپ ﷺ ایسے نبی ہیں جو ان چیزوں کا مشاہدہ فرماتے ہیں جنہیں تم نہیں دیکھتے اور آپ ﷺ کا شہرہ ہر سو پست و بالا شہروں میں ہو گیا ہے۔

لہ صدقات ما تغب و نائل
ولیس عطاء الیوم مانعہ غدا

آپ ﷺ کی عطائیں ہمیشہ اور مسلسل ہوتی رہتی ہیں (یعنی کبھی وقفہ نہیں ہوتا) اور آج کی عطا کل کی عطا کو مانع نہیں ہوتی۔

اجدک لم تسمع وصاہ محمد
نبی الالہ حیث اوصی و اشھدا

کیا تیری اس تگ و دو نے محمد ﷺ کی نصیحتوں کو نہیں سنا' جن کی ہر نصیحت اور گواہی اللہ تعالیٰ کی اطلاع پر مبنی ہے۔

اذا انت لم ترحل بزاد من التقی
ولا قیت بعد الموت من قد تزودا

جب تو تقویٰ کو زاد راہ لے کر سفر نہ کرے اور موت کے بعد ان لوگوں سے نہ ملے جو اپنے ساتھ توشہ لے گئے ہیں۔

ندمت علی ان لا تکون کمثله
فترصد للموت الذی کان اوصدا

تو تجھے اس بات پر سخت ندامت ہوگی کہ تو ان جیسا نہیں ہوگا' اور اب تو اس موت کا انتظار کرے گا جو کبھی تیرے انتظار میں ہوتی تھی۔

فایاک والمیتات لا تقربنها
ولا تاخذا سهما حدیدا لتفصدا

پس مردار جانوروں سے اپنے آپ کو بچا اور ان کے قریب نہ جا' اور خون بہانے کے لیے تیز تیر ہرگز نہ پکڑ (یعنی بتوں کے لیے قربانیاں نہ کر)

ولا النصب المنصوب لا تنسکنه
ولا تعبد الاوثان واللّٰه فاعبدا

اور ان نصب کیے ہوئے بتوں کے پاس قربانیاں نہ کر' اور بتوں کی پرستش نہ کر' اور فقط اللہ تعالیٰ کی عبادت کر۔

ولا تقربن حره کان سرها
علیک جراما فانکحن او تابدا

اور کسی شریف عورت کے قریب مت جا جس کی شرم گاہ تجھ پر حرام ہے' ہاں ان سے نکاح کر لے تو فبہا ورنہ ان سے دور رہ۔

وذا الرحم القربی فلا تقطعنه
لعاقبه ' ولا الاسیرا المقیدا

اور سزا دینے کے لیے قریبی رشتہ داروں سے تعلقات منقطع نہ کر اور نہ ہی قیدیوں سے بدسلوکی کر۔

وسبح علی حین العشیات والضحی
ولا تحمر الشیطان والله فاحمدا

اور رات دن کے اوقات میں تسبیح و تہلیل میں مصروف رہ' شیطان کی مدح سرائی نہ کر' صرف اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کیا کر۔

ولا تسخرن من بائس ذی ضراره
ولا تحسبن المال للمرء مخلدا

اور حاجت مندوں اور معذوروں کی ہنسی نہ اڑا' اور مال کے متعلق یہ گمان نہ کر کہ وہ آدمی کو ہمیشگی اور عطا کرنے والا ہے۔

حضرت سیدنا اصید بن سلمہ سلمی رضی اللہ عنہ

"اسد الغابہ" میں ہے کہ اصید بن سلمہ سلمی رضی اللہ عنہ نے حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی یوں مدح سرائی کی:

ان الذی سمک السماء بقدره
حتی علا فی ملکه فتوحدا

بے شک جس ذات نے آسمان کو اپنی قدرت سے بلند کیا ہے' یہاں تک کہ وہ ذات اپنی بادشاہی میں یکتا ہے۔

بعث الذی لا مثله فیما مضی
یدعو لرحمته النبی محمدا

اس نے ایک ایسی ہستی کو نبی بنا کر بھیجا ہے جس کی مثال پہلوں میں

نہیں ملتی' وہ (لوگوں کو) اللہ کی رحمت کی طرف دعوت دیتے ہیں یعنی وہ محمد
ﷺ (کے مبارک نام سے موسوم) ہیں۔

ضخم الدسیعه کالغزاله وجهه
قرنا تازر بالمکارم و ارتدی

بڑی اعلیٰ طبیعت کے مالک ہیں' روز روشن کی طرح ان کا چہرہ چمک رہا
ہے اور وہ عمدہ اخلاق سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔

فدعا العباد لدینه فتتابعوا
طوعا و کرها مقبلین علی الهدی

انہوں نے بندوں کو دین کی طرف بلایا تو سب لوگ خواہ مخواہ ان کی
پیروی کرتے ہوئے ہدایت کی طرف گامزن ہوئے۔

وتخوفوا النار التی من اجلها
کان الشقی الخاسر المتلددا

اور اس آگ سے وہ لوگ ڈر گئے جس کے لیے بدبخت اور ذلیل لوگ
ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔

حضرت سیدنا قیس بحرا شجعی رضی اللہ عنہ

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ حضرت قیس بن بحرا شجعی رضی اللہ عنہ نے بارگاہ رسالت
ماب ﷺ میں یوں گلہائے عقیدت نچھاور کیے:

فمن مبلغ عنی قریشا رساله
فهل بعدهم فی المجد من متکرم

کون ہے جو میرا پیغام قریش کو پہنچائے کہ کیا ان کے بعد کوئی بزرگی و
برتری والا ہے۔

بان اخاکم فاعلمن محمدا
تلید الندی بین الحجون و زمزم

بے شک تمہارے بھائیوں نے محمد ﷺ کو (امین) مان لیا' جب مقام حجون اور زمزم کے درمیان خون کی ندی بہنے والی تھی۔

فدینوا لہ بالحق تجسم امورکم
و تسم من الدنیا الی کل معظم

تو تم آپ ﷺ کے دین حق کو قبول کر لو' تمہارے کام سنور جائیں گے اور دنیا کی ہر نعمت تمہیں میسر آئے گی۔

نبی تلاقتہ من اللہ رحمہ
ولا تسالوہ امر غیب مرجم

نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ملی ہے اور تم ان سے غیب کا امر دریافت نہ کرو کہ سزا ملے۔

فقد کان فی بدر لعمری عبرہ
لکم یا قریشا والقلیب الملمم

مجھے اپنی عمر کی قسم کہ اے قریش تمہیں میدان بدر میں عبرت دلائی گئی ہے کہ تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔

غداہ اتی فی الخزرجیہ عامدا
الیکم مطیعا للعظیم المکرم

علی الصبح بنو خزرج میں قصدا تمہارے پاس آئے' محض عظیم اور مکرم (قائد) کی تعظیم کے لیے۔

معانا بروح القدس ینکی عدوہ
رسولا من الرحمن حقا بمعلم

روح قدس کے ساتھ ان کی مدد کی گئی ہے اور ان کے دشمنوں کو رسوا کیا جاتا ہے' رحمٰن تعالیٰ کے رسول ہیں جو حق کے ساتھ مبعوث ہوئے۔

رسولا من الرحمن يتلو كتابه
فلما انار الحق لم يتلعثم

رحمٰن تعالیٰ کے رسول ہیں جو اس کتاب کی تلاوت کرتے ہیں اور جب حق کا اعلان کرتے ہیں تو توقف نہیں کرتے۔

ارى امره يزداد فى كل موطن
علوا لامر حمه الله محكم

میں نے ان کے دین کو دیکھا ہے کہ وہ ہر وطن میں زیادہ سے زیادہ قبولیت حاصل کر رہا ہے' اللہ تعالیٰ اس محکم دین کی حفاظت فرمائے۔

حضرت سیدنا عباس بن مرداس سلمی رضی اللہ عنہ

ابن عبد السمیع ہاشمی کی کتاب "شرف الرسول" میں ہے کہ حضرت سیدنا عباس بن مرداس سلمی رضی اللہ عنہ نے حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی میں یوں لب کشائی کی:

لعمرى انى يوم اجعل جاهدا
ضمادا لرب العالمين مشاركا

مجھے اپنی عمر کی قسم کہ میں آج سے رب العالمین کا شریک ٹھہرانے والے کو مارنے کی کوشش کروں گا۔

وتركى رسول الله والاوس حوله
اولئك انصار له ما اولائكا

اور رسول اللہ ﷺ کو ترک کرنا' حالانکہ قبیلہ اوس آپ کے اردگرد ہے' وہ لوگ آپ ﷺ کے انصار ہیں۔

كتاركٌ سهل الارض والحزن يبتغي
ليسلكٌ في غيب الامور المسالكٌ

ایسے ہی ہے جیسے کوئی نرم زمین کو چھوڑتا ہے اور غم تلاش کرتا ہے تاکہ امور غیب میں کوئی راستہ تلاش کرے۔

فامنت بالله الذى انا عبده
وخالفت من امسى يريد المهالكٌ

پس میں اس اللہ پر ایمان لایا ہوں جس کا میں بندہ ہوں اور اس کی مخالفت کی ہے جو تباہی و بربادی کا ارادہ رکھتا ہے۔

و وجهت وجهى نحو مكه قاصدا
وتابعت بين الاخشبين المباركا

میں نے قصداً مکہ کی جانب رخ کیا اور دو ٹیلوں کے درمیان ایک مبارک ہستی کا تابع ہوا۔

نبى اتانا بعد عيسى بناطق
من الحق فيه الفضل منه لذلكا .

ہمارے پاس عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نبی تشریف لائے جو حق بات کرتے ہیں جن میں کمال درجے کی فضیلت ہے۔

امينا على الفرقان اول شافع
وآخر مبعوث يجيب الملائكا

وہ فرقان مجید کے امین' سب سے پہلے شفاعت کرنے والے اور آخر میں مبعوث ہونے والے ہیں اور ملائکہ کی بات سنتے ہیں۔

یلافی' عری الاسلام بعد انفصامها
فاحکمها حتی اقام المناسکا

آپ ﷺ نے فترت کے بعد اسلام کو استوار کیا اور مضبوط کیا حتیٰ کہ اس کے اصولوں کو نافذ کیا۔

رایتک یاخیر البریه کلها
توسطت فی القربی من المجد مالکا

اے تمام مخلوق سے بہتر (ﷺ) میں نے آپ کو دیکھا کہ قرابت داروں میں اعلیٰ بزرگی کے حامل ہیں۔

سبقتهم بالمجد والجود والعلا
وبالغایه القصوی تفوت السنابکا

تمہاری بزرگی' سخاوت اور بلندی ان سے سبقت لے گئی اور انتہائی حیرت ہے کہ تم اطراف عالم سے تجاوز کر گئے۔

فانت المصفی من قریش اذا سمت
غلاصمها تبغی القروم الفواتکا

اور آپ (ﷺ) قریش میں مصفی اور برگزیدہ ہوئے جب آپ نے راستہ اختیار کیا' جبکہ ان کے سردار پہلے لوگوں کے نشان ہی تلاش کرتے رہ گئے۔

نیز کتاب "شرف الرسول" میں ہے کہ حضرت عباس بن مرداس سلمی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی یوں بھی مدح سرائی کرنے کی سعادت حاصل کی۔

یا خاتم النباء انک مرسل
بالحق کل هدی السبیل هداکا

اے خاتم النبیین (ﷺ) بے شک تم حق کے ساتھ بھیجے گئے ہو

اور ہر سیدھی راہ تمہاری ہدایت ہے۔

ان الا لہ بنی علیک محبہ
فی خلقہ و محمدا سماکا

بے شک معبود برحق نے اپنی مخلوق میں آپ ﷺ پر ہی محبت کی بنیاد رکھی اور محمد (ﷺ) تمہارا نام رکھا۔

حضرت سیدنا کلیب بن اسید حضرمی رضی اللہ عنہ

حافظ امام سیوطی کی "الخصائص الکبریٰ" میں ہے کہ حضرت کلیب بن اسید حضرمی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی مدح سرائی میں یوں لب کشائی کی:

من ارض برهوت تهوى بی غذا فره
الیک یاخیر من یحفی و ینتعل

اے وہ ہستی جو ہر ننگے پاؤں اور ہر جوتا پہن کر چلنے والے سے بہتر ہے' خوفناک سرزمین سے اونٹنی مجھے آپ تک کھینچ لائی ہے۔

تجوب بی صفصفا غبرا مناهله
تزداد عفوا اذا ما کلت الابل

مجھے وہ ایسے بیابان سے تنہا اور گرد آلود کھینچ لائی کہ جس کے گھاٹ دامن صاف کئے ہوئے ہوتے جب بھی اونٹنی کچھ پینے لگتی۔

شهرین اعملها نصا علی وجل
ارجو بذاک ثواب اللہ یارجل

دو ماہ میں نے اسے خوب تیزی اور مشقت سے دوڑایا' اے مخاطب اس پر میں اللہ کے یہاں ثواب کی امید رکھتا ہوں۔

انت النبی الذی کنا نخبره
وبشرتنا به التوراه والرسل

تم وہ نبی ہو جن کی ہم خبر رکھتے ہیں اور تورات اور پہلے رسولوں نے ہمیں یہ بشارت دی ہے۔

حضرت سیدنا فضالہ بن عمیر لیثی رضی اللہ عنہ

"اسد الغابہ" میں ہے کہ حضرت فضالہ بن عمیر لیثی رضی اللہ عنہ، فتح مکہ کے دن بتوں کے ٹوٹنے کی یوں منظر کشی کرتے ہیں:

لو ما رایت محمدا وجنوده
بالفتح یوم تکسر الاصنام

اگرچہ میں نے فتح مکہ کے دن محمد ﷺ اور آپ کے لشکر کو بت توڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔

لرایت دین الله اصبح بینا
والشرک یغشی وجهه الاظلام

البتہ میں نے اللہ کے دین کو واضح پایا اور شرک کے چہرے پہ ظلمت چھائی ہوئی دیکھی۔

حضرت سیدنا مازن بن غضوبہ طائی رضی اللہ عنہ

"اسد الغابہ" میں ہے کہ حضرت مازن بن غضوبہ رضی اللہ عنہ، جب مسلمان ہو کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو یوں عرض گزار ہوئے:

الیک رسول الله خبت مطیتی
تجوب الفیافی من عمان الی العرج

یارسول اللہ تمہاری طرف آتے ہوئے میری سواری دھیمی پڑ گئی، جو عمان سے عرج تک بے آب و گیاہ بیابان سے گزر آئی۔

لتشفع لی یاخیر من وطی الحصی
فیغفرلی ربی فارجع بالفلج

تاکہ آپ میری سفارش کر دیں اے ہر زمین پر چلنے والے سے بہتر' تو میرا رب مجھے بخش دے گا اور میں کامیاب واپس لوٹوں گا۔

الی معشر جانبت فی الله دینهم
فلا دینهم دینی ولا شرجهم شرجی

میں دین الٰہی کی حال ایک جماعت سے وابستہ ہوا' نہ ان کا دین میرا دین تھا اور نہ ان کی جماعت میری جماعت۔

وکنت امرا باللهو والخمد مولعا
شبابی الی ان آذن الجسم بالنهج

میں ایک اوباش اور شرابی آدمی تھا' میری جوانی جسم کو ایک خاص طریقے پر استعمال کرنے کی گرویدہ تھی۔

فبدلنی بالخمر امنا وخشیه
وبالعهر احصانا فحصن لی فرجی

تو میری شراب امن اور خشیت اور زناکاری پاک دامنی میں بدل گئی اور میری شرمگاہ محفوظ ہو گئی۔

فاصبحت همی فی الجهاد ونیتی
فلله ما صرصی ولله ما حجی

اور میری ہمت اور قصد جہاد میں مصروف ہوئی' تو میرا روزہ اور حج محض اللہ کی رضا کے لیے ہو گیا۔

امام بیہقی نے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو عورتیں اور بچے یہ پڑھنے لگے کہ

طلع البدر علینا من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع
ایہا المبعوث فینا جئت بالامر المطاع

ہم پر چودھویں کا چاند وداع کی پہاڑیوں سے طلوع ہوا' ہم پر اس کا شکر واجب ہے جو انہوں نے اللہ کی دعوت دی' اے ہم میں تشریف لانے والے (ﷺ) آپ وہ دین لائے ہیں جس کی اطاعت کی جاتی ہے۔

نیز آپ ﷺ کی مدینہ منورہ آمد پر بنو نجار کی بچیاں دف بجاتی ہوئی یوں کہتی تھیں:

نحن جوار من بنی النجار
یاحبذا محمد من جار

ہم بنو نجار کی بچیاں محمد ﷺ کی تشریف آوری پر خوش آمدید کہتی ہیں۔

ہم میں ہیں بچیاں بنو نجار کے عالی گھرانے کی
ہمیں خوشی ہے آمنہ کے لال کے تشریف لانے کی

حضور ﷺ کی مدح سے بے نیازی

واضح رہے کہ نبی کریم رؤف رحیم ﷺ تعریف کرنے والوں کی تعریف سے مطلقاً بے نیاز ہیں' کیونکہ ان کا مادح یعنی تعریف کرنے والا خود خالق کائنات جل جلالہ ہے' جیسا کہ اس پروردگار عالم نے قرآن حکیم برہان رشید میں آپ ﷺ کی مدح میں فرمایا:

وانک لعلی خلق عظیم۔ (القلم: ۴) اور بے شک تمہاری خو بو بڑی شان کی ہے۔

اور یہ امر مسلم ہے کہ مدح کی قدر ممدوح کے ہاں مادح کی عظمت کے پیش نظر ہوتی ہے اور بدیہی طور پر یہ ہمارے علم و مشاہدہ میں ہے کہ ایک عظیم القدر شخص کے مدح کرنے اور ایک حقیر آدمی کے مدح کرنے میں فرق ہے' ہے تو ہر ایک مادح' لیکن اس کے باوجود ان دونوں کی مدح میں بہت بڑا فرق ہے۔ پھر اسی طرح ممدوح کے قول میں بڑا فرق ہے کہ "فلاں نے میری مدح سرائی کی' جو کہ بڑا جلیل القدر شخص ہے۔" اور "فلاں حقیر شخص نے میری مدح کی' جس کی کوئی وقعت نہیں۔" جب لوگ ایک دوسرے کی مدح سرائی کریں تو مادح کی نسبت سے اتنا فرق ملحوظ ہوتا ہے' حالانکہ یہ سب مخلوق ہیں' تو ذرا ایمان سے بتائیے کہ مخلوق کی مدح کو رب العالمین جل شانہ کی مدح سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ ان دونوں میں کتنا فرق ظاہر ہوتا ہے؟ یہ ایک ایسا امتیازی فرق ہے' جس کا ادراک کرنے سے دل اور تعبیر کرنے سے زبان عاجز ہے۔ تو ہمیں تحقیق سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ قطعاً مخلوق کی مدح کے محتاج نہیں۔

دوسری طرف سیدنا رسول اللہ ﷺ کے غلاموں کا حال ملاحظہ ہو جو مادحین کی مدح کے وقت ان کی حوصلہ افزائی کرتے اور اپنے فضل و کرم کے تقاضا کے مطابق انہیں خوب نوازتے' تاکہ ان ہدایا و تحائف کے ساتھ وہ ان کے بارے اپنا حسن ظن قائم رکھ سکیں۔ اور ان کی نوازشات کا مقصد ان کی آرزوؤں کی تلافی ہے' نہ کہ وہ ان کی مدح کے محتاج ہیں بلکہ یوں کہہ لیں کہ ان معززین میں ایسی قوی کریمانہ صلاحیتیں پائی جاتی ہیں' جن کے مقتضا پر عمل کیے بغیر انہیں کوئی چارہ نہیں' جیسا کہ سید کائنات ﷺ کی سیرت طیبہ میں بھی یہ نمونہ ملتا ہے کہ جب حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی شان اقدس میں قصیدہ "بانت سعاد" پڑھا' تو حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کوتاہی معاف کرنے کے علاوہ اپنی کریمانہ خصلت کے ساتھ اپنی مبارک چادر بھی انہی پر اوڑھ دی' جس کے عوض انہیں زر کثیر کی پیش کش ہوتی رہی لیکن انہوں نے بیچنا گوارہ نہ کیا۔ جب وہی مبارک چادر ورثاء کے ہاتھ آئی تو حضرت

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھاری قیمت دے کر اسے خرید لیا' اور وہ خلفاء اور ملوک میں وراثتاً چلتی رہی' لہٰذا خصلت فیاضی سے متصف شرفاء نے شعراء کو نوازنے میں سنت رسول ﷺ کی پیروی کی۔

نعت رسول ﷺ کی امتیازی شان و شوکت

مدائح نبویہ کا سلسلہ عہد رسالت سے لے کر آج تک پوری آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے جو کہ اسلام اور صاحب اسلام سیدنا رسول اللہ ﷺ کی بزرگی و برتری کی واضح دلیل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مدائح نبویہ اسلامیہ کو عقل و شعور کی وسعت' عمدہ فصاحت و بلاغت' حسن تفنن اور حسین منظر کشی میں دیگر مدائح سے طرۂ امتیاز حاصل ہے' بلکہ ان کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کے اصحاب عہد رسالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالیہ میں جمال محمدی' کمال نبوی اور فضل اسلامی کے مشاہدہ سے سرشار ہو کر مدائح نبویہ اسلامیہ سے رطب اللسان ہوئے۔

بلاشبہ مدائح نبویہ کو ایک ایسی امتیازی شان و شوکت حاصل ہے' جس میں روئے زمین کی کوئی مدح و تعریف نہ شریک ہو سکی اور نہ ہی مزاحم۔ علاوہ اس کے وہ اس کے تابع اور اسی کے جھنڈے تلے داخل ہو۔ وہ امتیازی فرق محض اخلاص' سچی محبت اور دل میں ایمان کی ایسی پختگی ہے جس میں خواہش نفس قطعاً دخل انداز نہ ہو' نہ ہی کوئی غرض اس میں کارفرما ہو اور نہ ہی اس میں کوئی طمع و لالچ کا کوئی پہلو نظر آئے' کیونکہ وہ محض اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول ﷺ کی خوشنودی کے لیے ہے۔

مدائح تقلیدیہ اور مدائح نبویہ کا بنیادی فرق یہی ہے کہ وہ ممدوح کی طرف سے ہونے والی عطاء بخشش اور انعام و ہبہ وغیرہ کی منتظر رہتیں' جس کی وجہ سے مادح اپنی تمام تر کاوشیں حصول انعام میں وقف کر دیتا' اسی طرح مختلف ادوار میں بادشاہوں' امراء اور شعراء کے واقعات تاریخی اوراق میں محفوظ ہوتے رہے' جبکہ مدائح نبویہ کا

اس طریقے سے کوئی علاقہ نہیں اور ایسی غرض و ہوس سے بالکل الگ تھلگ ہیں، مدائح نبویہ میں صرف اخلاص ہی اخلاص ہے، جو ہر طرح کی خواہش نفس، غرض و ہوس اور طمع و لالچ سے خالی ہے کیونکہ ان میں خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رضا، رسول اللہ ﷺ کی سچی محبت اور آپ ﷺ کے اہل بیت اطہار کی محبت ہے، ان کی محبت میں بھی درحقیقت حضور ﷺ کی ہی محبت اور تعظیم و تکریم ہے اور ان کی مدح سرائی کا مقصد ان کی شان و عظمت کا دفاع کرنا ہے۔

بحث کی تائید

ہماری مذکورہ بحث کی تائید میں بہت بڑی شہادت وہ ہزاروں قصائد ہیں جو کئی ان شعری دیوانوں میں محفوظ ہیں جو رسول معظم نبی مکرم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال باکمال کے بعد منصہ شہود پر آئے۔ کتنی سعادت ہے کہ ایک شاعر رسول اللہ ﷺ کی مدح سرائی میں وفات پا جائے اور یہ مدح اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب اور وسیلہ بن جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی مدح سرائی درحقیقت اس دین اسلام کی برتری ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کے لیے نازل فرمایا اور اسی کو ایمان لانے یا کفر پر جزا و سزا کا معیار ٹھہرایا۔

نوٹ: اس بحث کی تفصیل کے لیے مولف کا رسالہ "المدح النبوی بین الغلو والانصاف" ملاحظہ ہو، جو اس بحث سے خاص ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی ایک دوسرے پر فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

لَاتُفَضِّلُوْا بَيْنَ الْاَنْبِيَاءِ۔ .. انبیاء میں ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔

یہ اس مبارک حدیث کا ایک جز ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک یہودی اور ایک مسلمان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ مسلمان نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں پر برگزیدہ بنایا' یہودی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام جہانوں پر چن لیا' تو مسلمان نے یہودی کے منہ پر تھپڑ دے مارا' یہودی بارگاہ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا اور سارا ماجرا سنایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو بلایا اور معاملہ دریافت کیا تو اس نے وہی بتایا' اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تخیرونی علی موسی فان الناس یصعقون یوم القیامه فاصعق معهم فاکون اول من یفیق فاذا موسی باطش جنب العرش فلا ادری اکان فیمن صعق فافاق قبلی او کان ممن استثنی الله۔

مجھے موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو۔ بیشک سارے لوگ قیامت کے دن بے ہوش ہو جائیں گے اور میں بھی ان کے ساتھ ہوں گا اور سب سے پہلے افاقہ مجھے ہوگا تو موسیٰ علیہ السلام عرش کے پائے کو پکڑے ہوئے ہوں گے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا وہ بے ہوش ہوئے ہیں اور مجھ سے پہلے ہوش میں آئے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے انہیں مستثنیٰ رکھا ہے۔

اس کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے "کتاب الخصومات" باب "ما یذکر فی الاشخاص والخصومات بین المسلم والیهودی" (۵ / ۷۰) میں اور اسی طرح کتاب احادیث الانبیاء باب قولہ تعالیٰ: "وان یونس لمن المرسلین" (۴ / ۱۳۲-۱۳۳) میں روایت کیا اور صحیح مسلم بالنووی کتاب الفضائل باب من فضائل موسیٰ: (۱۵ / ۱۳۱) میں ہے۔

امام مسلم کے نزدیک ایک روایت میں یوں ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ أَنْبِيَاءِ اللّٰهِ۔ اللہ کے نبیوں میں ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔

(صحیح مسلم بالنووی: ۱۵/ ۱۳۰)

اسی طرح امام مسلم ایک روایت حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یوں لائے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُخَيِّرُوْا بَيْنَ الْاَنْبِيَاءِ۔ انبیاء میں ایک کو دوسرے پر بزرگی نہ دو۔

(صحیح مسلم بالنووی: ۱۵/ ۱۳۳)

مسئلہ فضیلت انبیاء اور امام نووی

حضور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی:

لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ الْاَنْبِيَاءِ۔ انبیاء میں ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔

امام نووی رحمتہ اللہ علیہ اس کا جواب پانچ وجہ سے دیتے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(۱) حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی یہ معلوم ہونے سے پہلے کا ہے کہ "آپ ﷺ اولاد آدم کے سردار ہیں۔" جب معلوم ہو گیا تو اسی کی خبر دی۔

(۲) آپ ﷺ نے ادب اور انکساری کے طور پر فرمایا۔

(۳) یہ ممانعت ایسی تفضیل سے ہے جو مفضول (جس پر فضیلت دی گئی) کی تنقیص کرے۔

(۴) ایسی فضیلت سے ممانعت ہے جو جھگڑے اور فساد تک پہنچا دے، جیسا کہ حدیث مذکورہ کے سبب میں ظاہر ہے۔

(۵) اس ممانعت سے مراد ہے کہ نفس نبوت میں ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو، کیونکہ اس میں سب برابر ہیں اور فضیلت دیگر خصائص و فضائل سے حاصل ہوتی ہے۔

بہر حال تفضیل کا اعتقاد ضروری ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ (البقرۃ: ۲۵۳)

یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں ایک کو دوسرے پر افضل کیا۔ (صحیح مسلم بالنووی: ۱۵/ ۱۳۲)

مسئلہ فضیلت اور حافظ ابن حجر

علماء فرماتے ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معلوم ہو جانے "کہ آپ ﷺ جمیع مخلوق سے افضل ہیں" کے بعد فرمایا تو یقیناً یہ عاجزی اور انکساری کے طور پر فرمایا اور اگر اس کے علم سے پہلے فرمایا تو کوئی اشکال نہیں اور جو یونس علیہ السلام کا ذکر خصوصی طور پر فرمایا وہ اس خدشہ کے پیش نظر تھا کہ کہیں ان کا قصہ سننے والے کے دل میں ان کی تنقیص نہ جنم لے' لہٰذا اس کے سد باب کے لیے نام لے کر ان کی فضیلت کا خصوصی اہتمام فرمایا۔ (فتح الباری: ۶/ ۵۵۸)

اصلاح مفاہیم

ایک روایت میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَاتُفَضِّلُوابَيْنَ اَنْبِيَاءِاللّٰهِ۔

اللہ کے نبیوں کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو۔

اور دوسری روایت میں ہے:

لَا يَنْبَغِيْ لِعَبْدٍ اَنْ يَقُوْلَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ يُوْنُسَ بْنِ مَتّٰى۔

کسی بندے کے لیے روا نہیں کہ وہ یوں کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں۔

ان کو امام بخاری نے صحیح میں کتاب احادیث الانبیاء باب قول اللہ تعالیٰ: "وان یونس لمن المرسلین" (۴/ ۱۳۲-۱۳۳) میں روایت کیا۔ یہ احادیث ان نصوص میں سے ہیں جن کے سہارے فتنہ پرور لوگ ہمیشہ دین متین میں ہوائے نفس کو

داخل کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں۔ یہی لوگ احادیث کو بنیاد بناتے ہوئے غلو سے کام لیتے ہوئے ہر اس شخص پر دھاوا بول دیتے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر کرے اور آپ ﷺ کی قدر و عظمت کا کماحقہ لحاظ کرے، جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے جائز ہی نہیں بلکہ ہم پر واجب قرار دیتے ہوئے یوں حکم صادر فرمایا:

لِتُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَّاَصِيلًا ۔(الفتح: ۹)

تاکہ اے لوگو! تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور رسول کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح و شام اللہ کی پاکی بولو۔

بعض اہل فتنہ نے اس ارشاد باری تعالیٰ سے یہ معنی اخذ کیا:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۔(البقرۃ: ۲۸۵)

ہم اس کے کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے۔

حالانکہ یہ معنی مردود اور فاسد ہے کہ انبیاء میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا جائز نہیں، اور نہ ہی خصائص و کمالات کی بنا پر ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا جائز ہے اور جس نے ایسا کیا اس نے برا طریقہ ایجاد کیا اور دین حق کی مخالفت کی اور ملحدین میں سے ہو گیا۔

یہ غافل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو بھول گیا:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۔(البقرۃ: ۲۵۳)

یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر افضل کیا۔

ہاں! اگر یوں کہے کہ ایسا مفاضلہ جائز نہیں جس سے مفضول کی تحقیر یا تنقیص سمجھی جائے کیونکہ یہ مفضول بھی تو اللہ کا نبی ہے اس کا بھی فضل و مقام اور بلند مرتبہ نبوت کا پاس رہے، تو یہ عین حق ہے۔ مقارنات کے ذکر کے وقت ہم ہمیشہ اسی نقطہ کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور تنبیہ کرتے ہیں کہ یہ تفضیل درجات

میں ہے 'اصل نبوت میں سب برابر ہیں' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔ ہم اس کے کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے۔ (البقرہ: ۲۸۵)

اور خصائص و کمالات میں متفاوت ہیں' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تلک الرسل---الایہ۔"

امام قرطبی کی گفتگو

امام ابو عبداللہ اپنی تفسیر (۳/ ۱۷۱-۱۷۲) میں فرماتے ہیں کہ یہ آیہ کریمہ مشکلہ ہے اور احادیث ثابت ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تُخَيِّرُوْا بَيْنَ الْاَنْبِيَآءِ۔ انبیاء میں ایک کو دوسرے پر بزرگی نہ دو۔

لَا تُفَضِّلُوْا بَيْنَ اَنْبِيَآءِ اللّٰهِ۔ اللہ کے نبیوں میں ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔

ان کو ثقہ ائمہ نے روایت کیا ہے' یعنی یہ نہ کہو کہ فلاں فلاں سے بہتر ہے اور فلاں فلاں سے افضل ہے' کہا جاتا ہے کہ ان میں فلاں کو بزرگی یا فضیلت حاصل ہے' جب کوئی یہ کہے تو اس معنی کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے؟ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اگر یہ ارشاد گرامی آیت تفضیل کے نزول سے پہلے کا ہے' یا یہ معلوم ہونے سے پہلے کا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم اولاد آدم کے سردار ہیں۔" تو یقیناً قرآن تفضیل کی ممانعت کا ناسخ ہے۔

ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ حضور پرنور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "انا سید ولد آدم" روز قیامت سے متعلق ہے' کیونکہ آپ ﷺ اس دن شفیع ہوں گے اور حمد کا جھنڈا آپ ﷺ کے مبارک ہاتھ میں ہوگا اور حوض کوثر بھی آپ ﷺ کے تصرف میں ہوگا اور یہ فرمان عالیشان "لا تخیرونی علی موسی" تواضع اور انکساری پر مبنی ہے۔ جیسا کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

وُلِّیْتُکُمْ وَلَسْتُ بِخَیْرِکُمْ۔ میں تمہارا والی بنایا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں۔

اسی طرح ہی آپ ﷺ کے اس فرمان عالیشان میں تواضع وانکساری ہے:

لا یقل احد انا خیر من یونس بن متی۔ کوئی یہ نہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس امر پر دال ہے کہ آپ ﷺ ان سے افضل ہیں:

وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ۔ اس مچھلی والے کی طرح نہ ہونا۔

(القلم: ۴۸)

کیونکہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے فرمایا کہ اس کی مثل نہ ہونا' تو یہ واضح دلیل ہے کہ حضور ﷺ کا یہ فرمانا:

لَا تُفَضِّلُوْنِیْ عَلَیْهِ۔ مجھے اس پر فضیلت نہ دو۔

بطریق تواضع ہے۔

مہلب نے یہ تاویل اختیار کی ہے کہ جائز ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مجھے عمل میں اس پر فضیلت نہ دو' شاید وہ عمل میں مجھ سے افضل ہوں' اور آزمائش اور امتحان میں مجھے ان پر فضیلت نہ دو' کیونکہ ان کی مشقت مجھ سے زیادہ ہے۔ ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کو جو اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کی سرداری اور جمیع انبیاء و رسل سے فضیلت عطا فرمائی ہے وہ آپ ﷺ کے عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے محض خصوصی عنایت کے ساتھ آپ ﷺ کو فضیلت کے ساتھ مختص فرمایا۔

بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ اس مسئلہ میں مبالغہ کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ اس میں مبالغہ جنگ وجدال کا سبب بنتا ہے' اور نوبت یہاں تک آسکتی ہے کہ کوئی کسی نبی کے بارے میں ناقابل شان کلمات کہہ دے' اور ایسی صورت میں ان کا احترام کم ہو جائے۔

ہمارے شیخ فرماتے ہیں کہ یوں نہ کہا جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں سے افضل ہیں اور نہ یہ کہ فلاں سے بہتر اور برتر ہیں' جیسا کہ نہی سے ظاہر ہے' خصوصاً اس وقت جب مفضول کی تنقیص کا خدشہ ہو' کیونکہ نہی کا تقاضا لفظ کا اطلاق ہے نہ کہ اس معنی کے اعتقاد کی ممانعت' بے شک اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ رسولوں کی جماعت میں ایک دوسرے پر افضل ہے۔ لہٰذا تم نہ کہو کہ ہمارے نبی ﷺ انبیاء سے بہتر ہیں اور نہ یوں کہو کہ فلاں نبی سے بہتر ہیں۔ یہ اجتناب محض اس نہی کا ادب اور اس پر عمل ہے' جبکہ اعتقاد وہی ہے جو کہ قرآن کریم نے تفضیل کا درس دیا۔ اللہ تعالیٰ ہی امور کے حقائق کو بہتر جانتے ہیں۔

میں (مولف) کہتا ہوں کہ سب سے بہتر قول اس کا ہے جس نے کہا کہ تفضیل کی ممانعت جہت نبوت سے ہے۔ اور یہ ایک خصلت ہے جس میں کسی کو فضیلت نہیں۔ تفضیل کا دارومدار احوال' خصائص' کرامات' الطاف اور معجزات کی زیادتی پر ہے' نہ کہ نفس نبوت پر۔ نبوت فی نفسہ تفاضل کو قبول نہیں کرتی' تفاضل دیگر امور سے ہے جو اس پر زائد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض رسل اور اولوالعزم ہیں' اور کسی کو خلیل بنایا گیا اور کسی سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا اور کسی کو درجوں بلند فرمایا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ ۖ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا۔ (بنی اسرائیل: ۵۵)	اور بے شک ہم نے نبیوں میں ایک کو دوسرے پر بڑائی دی اور داؤد کو زبور عطا فرمائی۔

اور فرمایا:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۔ (البقرہ: ۲۵۳)	یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں ایک کو دوسرے پر افضل کیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ ان سے آیات و احادیث بغیر نسخ

کے جمع ہو جاتی ہیں اور بعض کی بعض پر تفضیل ان فضائل اور وسائل کی بنا پر ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "بے شک اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو انبیاء اور آسمانوں والوں پر فضیلت دی ہے۔" لوگوں نے دریافت کیا کہ اے ابن عباس اہل سماء پر اللہ تعالیٰ نے انہیں کس سے فضیلت دی ہے؟ تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَٰهٌ مِنْ دُونِهِ فَذَٰلِكَ نَجْزِيهِ جَهَنَّمَ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ۔ (الانبیا:۲۹)	اور ان میں جو کوئی کہے کہ میں اللہ کے سوا معبود ہوں تو اسے ہم جہنم کی جزا دیں گے، ہم ایسی ہی سزا دیتے ہیں ستم گاروں کو۔

اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ارشاد ہوا:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (الفتح:۱-۲)	بے شک ہم نے تمہارے لیے روشن فتح فرمادی تاکہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں کے اور تمہارے پچھلوں کے۔"

پھر انہوں نے دریافت کیا کہ آپ ﷺ کو انبیاء پر کیا فضیلت دی؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ۔ (ابراہیم:۴)	اور ہم نے رسول اس کی قوم ہی کی زبان میں بھیجا کہ وہ انہیں صاف بتائے۔

اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ۔ (السبا:۲۸)	اور اے محبوب! ہم نے تم کو نہ بھیجا مگر ایسی رسالت سے جو تمام آدمیوں کو گھیرنے

والی ہے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ثقلین یعنی جن و انس کی طرف مبعوث فرمایا: اس کو امام محمد دارمی نے اپنی مسند میں ذکر کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بنی آدم میں نوح، ابراہیم، موسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم و علیہم اجمعین برگزیدہ ہیں اور یہ اولوالعزم رسول ہیں اور تعیین میں یہ ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی نص ہے۔ نیز معلوم ہوا کہ صفت رسالت سے متصف انبیاء ان سے افضل ہیں جن کو رسالت عطا نہیں کی گئی گویا کہ صفت رسالت کی بنا پر رسول دوسروں سے افضل ہیں جبکہ نبوت میں سب برابر ہیں اور انبیاء کی طرح رسولوں کو بھی ان کی امتوں نے جھٹلایا اور قتل و جدال کا معرکہ گرم رہا۔

ابن عطیہ ابو محمد عبدالحق کا کہنا ہے کہ قرآن تفضیل کا تقاضا تو کرتا ہے لیکن کسی ایک مفضول کا تعین نہیں کرتا۔ اسی اصول پر یہ احادیث جاری ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

اَنَا اَکْرَمُ وُلْدِ آدَمَ عَلٰی رَبِّیْ۔	میں اپنے رب کے ہاں تمام اولاد سے معزز ہوں۔

اور فرمایا:

انا سید ولد آدم۔	میں اولاد آدم کا سردار ہوں۔

غور فرمائیں کہ آپ ﷺ نے کسی مفضول کا تعین نہیں فرمایا۔

اور دوسری طرف حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

لا ینبغی لاحد ان یقول انا خیر من یونس بن متی۔	کسی کو یوں کہنا روا نہیں کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں۔

اور فرمایا:

لاتفضلونی علی موسی۔	مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو۔

ابن عطیہ کہتے ہیں کہ اس میں مفضول کے تعین سے سخت ممانعت ہے' کیونکہ حضرت یونس علیہ السلام معمولی سی لغزش پر بار نبوت تلے پس گئے۔ جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت اور خاموشی اختیار فرمائی ہے تو دوسروں کو تو اس بارے میں زیادہ محتاط رہنا چاہیے۔

میں (مولف) کہتا ہوں کہ ہمارا اختیار کردہ مفہوم انشاء اللہ تعالیٰ صحت سے زیادہ قریب ہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا جن سے انہیں فضیلت ملی' تو مسئلہ عمومیت کے بعد خاص ہو گیا اور خاص الخاص حضور سید دو عالم ﷺ کی ذات ٹھہری' جو کہ درج ذیل آیات بینات سے ظاہر ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۚ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ۔ (البقرہ: ۲۵۳)

ان میں کسی سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلند کیا اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلی نشانیاں دیں۔

(۲) وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔ (بنی اسرائیل: ۵۵)

اور ہم نے داؤد کو زبور عطا فرمائی۔

(۳) وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ۔ (المائدہ: ۴۶)

اور ہم نے اسے انجیل عطا کی۔

(۴) وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ (الانبیاء: ۴۸)

اور بے شک ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فیصلہ دیا اور اجالا اور پرہیزگاروں کو نصیحت۔

(۵) وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا۔ (النمل: ۱۵)

اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان کو بڑا علم عطا فرمایا۔

(۶) وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ۔ (الاحزاب: ۷)

اور اے محبوب یاد کرو جب ہم نے نبیوں سے عہد لیا اور تم سے اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے۔

اس آخری آیہ مقدسہ میں ذکر عموم کے بعد تخصیص کی ابتداء حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائی۔

تفضیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

بالکل اسی طرح ہی تفضیل صحابہ کا مسئلہ ہے اور وہی مذکورہ اصول یہاں بھی جاری ہوتا ہے کہ جمیع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نفس صحبت میں برابر ہیں۔ پھر ان ہدایا اور وسائل کی بنا پر ایک دوسرے سے افضل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے' لہٰذا وہ بھی ایک دوسرے سے افضل ہیں باوجودیکہ سب کو صحبت' عدالت اور تعریف میسر ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ جل شانہ کے درج ذیل اشارات دال ہیں:

(۱) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا۔ (الفتح: ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والے کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل تو انہیں دیکھے گا رکوع کرتے سجدے میں گرتے۔

(۲) وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْۤا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا۔ (الفتح: ۲۶)

اور اللہ نے پرہیزگاری کا کلمہ ان پر لازم فرمایا اور وہ اس کے زیادہ سزاوار اور اس کے اہل تھے۔

(۳) لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ۔ (الحدید: ۱۰)

تم میں برابر نہیں وہ جنہوں نے فتح مکہ سے قبل خرچ اور جہاد کیا۔

(۴) لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ۔(الفتح: ۱۸)	بے شک اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب وہ اس پیڑ کے نیچے تمہاری بیعت کرتے تھے۔

غور فرمائیں کہ تعمیم کے بعد تخصیص فرمائی گئی اور ان سے نقص و عیب کی نفی فرمائی، رضی اللہ عنہم اجمعین۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جل مجدہ الکریم ان نفوس قدسیہ کی محبت سے ہمیں مستفید فرمائے۔ آمین۔

دنیاو آخرت میں سرداری میرے حضور ﷺ کی

حضور سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمادی کہ آپ ﷺ اولاد آدم کے سردار ہیں گویا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

انا سید ولد آدم یوم القیامۃ واول من ینشق عنہ القبر واول شافع واول مشفع۔	بروز قیامت میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور سب سے پہلے میری ہی قبر کھولی جائے گی، میں ہی پہلا سفارش کرنے والا ہوں گا اور پہلے میری ہی سفارش قبول کی جائے گی۔

سیدنا رسول اللہ ﷺ کا (یوم القیامہ) فرما کر سرداری کو روز قیامت سے مقید کرنا، باوجودیکہ آپ ﷺ دنیاو آخرت میں اولاد آدم کے سردار ہیں تو اس تقیید کا سبب یہ ہے کہ بروز قیامت آپ ﷺ کی سیادت ہر ایک پر ظاہر ہو جائے گی اور کوئی منکر یا جھگڑا کرنے والا باقی نہیں رہے گا۔ یعنی وہاں آپ ﷺ کی سیادت ہر ایک کو مسلم ہو گئی، کوئی اس مسئلہ میں الجھے گا نہیں جبکہ دنیا میں روسائے کفار اور زعمائے مشرکین آپ ﷺ سے جھگڑتے رہے۔ یہ تقیید اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے معنی کے قریب تر ہے:

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔(غافر: ۱۶)	آج کس کی بادشاہی ہے ایک اللہ سب پر غالب کی۔

حالانکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بادشاہی اس سے پہلے دنیا میں بھی بدستور ہے اور جو کوئی دنیا میں بادشاہت کا مدعی ہے یا کسی کی طرف اس کی اضافت ہوتی ہے تو یہ مجازاً ہے۔ آخرت میں وہ بیگانہ ہو جاتا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا یہ فرمانا "میں اولاد آدم کا سردار ہوں" فخر کے طور پر نہیں بلکہ مسلم کے علاوہ دیگر روایات میں آپ ﷺ سے فخر کی نفی کی تصریح موجود ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

انا سید ولد آدم ولا فخر۔ میں اولاد آدم کا سردار ہوں لیکن مجھے فخر نہیں۔

یہ مشہور حدیث ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فرمانے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں؟

(۱) تحدیث نعمت کے طور پر، جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ اور اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو۔ (الضحیٰ: ۱۱)

(۲) یہ ایک ایسا بیان ہے جس کی امت کو تبلیغ کرنا آپ ﷺ پر ضروری ہے، تاکہ وہ حضور ﷺ کی صحیح معرفت حاصل کر کے اس کے مقتضا کے مطابق اعتقاد رکھ سکیں اور عمل پیرا ہو سکیں، نیز آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ کے مطابق تعظیم و توقیر بجا لائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا ہے۔ یہ مبارک حدیث اس امر پر واضح دلیل ہے کہ حضور ﷺ کو جمیع مخلوق پر فضیلت حاصل ہے، کیونکہ اہل سنت کا مذہب ہے کہ آدمی ملائکہ سے افضل ہیں اور لامحالہ حضور پرنور شافع یوم النشور ﷺ آدمیوں سے اور دیگر جمیع مخلوق سے افضل و اعلیٰ ہیں۔

(شرح النووی علی مسلم: ۱۵/ ۳۷)

سرکار ﷺ کے اوصاف حمیدہ

امام عزالدین ابن عبدالسلام نے اس مسئلہ میں ایک مستقل رسالہ تصنیف

فرمایا ہے' جس کا نام "بدایہ السول فی تفضیل الرسول "(۱) رکھا۔ اس میں انہوں نے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جمیع مخلوقات پر فضیلت کی وجوہات ذکر کیں' ہم ان میں سے بعض ذکر کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

(۱) حضور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ذیشان ہے:

وبیدی لواء الحمد یوم القیامۃ ولافخر۔	اور حمد کا جھنڈا بروز قیامت میرے ہاتھ میں ہوگا اور مجھے فخر نہیں۔

(۲) ارشاد گرامی ہے:

آدم فمن دونہ تحت لوائی یوم القیامۃ ولا فخر۔ (سنن الترمذی: ۵/۲۸۸' مسند امام احمد: ۱/۲۸۶)	آدم اور آدم علیہ کے سوا سب قیامت کے دن میرے جھنڈے تلے ہوں گے لیکن مجھے فخر نہیں۔

(۳) اسی طرح یہ امر بھی آپ ﷺ کی تخصیص و تفضیل پر دال ہے کہ آپ ﷺ پہلے شفاعت کرنے والے ہوں گے اور سب سے پہلے آپ ﷺ کی ہی شفاعت قبول کی جائے گی۔

(۴) حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی خصوصی دعا امت کے نام وقف کردی' جب ہر نبی کو ایک حتمی قبول ہونے والی دعا عطا کی گئی' تو ہر نبی نے دنیا میں وہ دعا کرلی' جبکہ حضور پرنور شافع یوم النشور ﷺ نے اپنی اس دعا کو اپنی امت کی شفاعت کے لیے ذخیرہ کرلیا۔

(۵) اللہ رب العزت نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کی قسم اٹھائی۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۔(الحجر: ۷۲)	اے محبوب تمہاری جان کی قسم بے شک وہ اپنے نشہ میں بھٹک رہے ہیں۔

---

(۱) یہ رسالہ ۱۴۱۷ھ میں استاذ حسین محمد شکری کی تحقیق و تعلیق سے شائع ہوا۔ "سب رسولوں سے اعلیٰ ہمارا نبی" کے نام سے اس کا ترجمہ مفتی محمد خان قادری نے کیا ہے۔

کسی کی زندگی کی قسم اٹھانا اس امر پر دال ہے' کہ اس کی مبارک زندگی کو قسم اٹھانے والے کے ہاں شرف و قدر اور عزت و مرتبہ حاصل ہے اور یقیناً حضور سرور کائنات ﷺ کی ہی حیات مبارکہ اس قابل ہے کہ اس کی قسم اٹھائی جائے' کیونکہ اس میں عام و خاص برکات اکمل طریقے سے موجود ہیں' جو کسی اور کے لیے ثابت نہیں۔

(۶) اللہ تعالیٰ جل مجدہ الکریم نے اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی نداء میں بھی تعظیم و توقیر کی' اور آپ ﷺ کو سب سے زیادہ محبوب اسم گرامی اور عمدہ وصف کے ساتھ ندا دی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"یاایھا النبی" اور "یاایھا الرسول" یہ سرکار دو عالم ﷺ کا خاصہ ہے جو کسی اور کے لیے ثابت نہیں' بلکہ یہ ثابت ہے کہ ہر نبی کو اس کے ذاتی اسم کے ساتھ ندا دی گئی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) يَاآدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ۔

(۲) يَاعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ۔

(۳) يَامُوْسٰى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ۔

(۴) يَانُوْحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ۔

(۵) يَادَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ۔

(۶) يَااِبْرَاهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا۔

(۷) يَالُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ۔

(۸) يَازَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ۔

(۹) يَايَحْيٰى خُذِ الْكِتَابَ۔

یہ کسی پر مخفی نہیں کہ آقا جب اپنے کسی ایک غلام کو اعلیٰ ترین وصف اور عمدہ خصلت کے ساتھ بلائے' اور دوسروں کو ان کے ذاتی ناموں سے بلائے' جو کسی وصف

اور خصلت کو ظاہر نہ کرے تو یقیناً اول الذکر اپنے آقا کے ہاں آخر الذکر والوں سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ پہ فائز ہو گا اور اس کے نزدیک زیادہ معزز اور مقرب ہو گا۔ یہ بات عرف سے بھی معلوم ہے کہ جس کو افضل وصف اور خصلت سے بلایا جائے تو یہ اس کی تعظیم اور احترام میں مبالغہ ہوتا ہے۔

بقول قائل ۔

لا تدعنی الا بیا عبدها
فانه احسن اسمائی

تم مجھے صرف یاغلام کہہ کر پکارو' یہی میرا حسین نام ہے۔

(۷) ہر نبی کا معجزہ اپنی میعاد پر ختم ہو گیا' اور سید الاولین والآخرین کا معجزہ یعنی قرآن مبین قیامت تک باقی ہے۔

(۸) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر کا سلام بھیجنا اور کھجور کے تنے کا آپ ﷺ کے فراق میں رونا' سیدنا رسول اللہ ﷺ کی عظمت و فضیلت پر دال ہے۔ ایسا امر کسی اور نبی کے لیے ثابت نہیں۔

(۹) اللہ تعالیٰ ہر نبی کے لیے اس کی امت کے اعمال 'احوال اور اقوال کے مطابق اجر لکھتا ہے اور آپ ﷺ کی امت اہل جنت کا نصف ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کی امت سب سے بہتر امت ہے جو لوگوں کے لیے ظاہر کی گئی 'اور وہ معارف 'احوال 'اقوال اور اعمال سے متصف ہونے کی بناء پر سب سے بہتر ہے۔

(۱۰) کوئی معرفت' حالت 'عبادت اور بات بلکہ کوئی شے ایسی نہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب حاصل کیا جاتا ہو اور اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دلالت نہ فرمائی ہو اور اس کی طرف دعوت نہ دی ہو' جب نبی کریم ﷺ نے ان تمام امور کو بخوبی سرانجام دیا ہے تو آپ ﷺ کے لیے اس کا بھی اجر ہے اور قیامت تک اس پر عمل پیرا ہونے والوں کا بھی اجر ہے کیونکہ حضور سید دوعالم صلی اللہ علیہ

وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

من دعا الی ھدی کان له اجره واجر من عمل به الی یوم القیامه۔(صحیح مسلم: ۴/۲۰۶)	جو شخص ہدایت کی طرف بلائے' تو اس کے لیے اس کا بھی اجر ہے اور قیامت تک اس پر عمل پیرا ہونے والے کا بھی۔

آپ ﷺ کے علاوہ کوئی بھی نبی اس رتبہ پر فائز نہیں ہوا۔

حدیث میں وارد ہے:

الخلق کلھم عیال الله فاحبھم الیه انفعھم لعیاله۔	جمیع مخلوق اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے' تو اس کی بارگاہ میں زیادہ محبوب وہی ہے جو اس کے عیال کو زیادہ نفع پہنچائے۔

(امام طبرانی نے اس کو کبیر میں روایت کیا' ابو علی اور بزار نے اپنی مسند میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔ "عیال الله" کا معنی "فقراء الی الله" ہے یعنی جمیع مخلوق اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عاجز اور محتاج ہے۔ یہ حدیث فضائل میں عمل کی صلاحیت رکھتی ہے)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نفع اہل جنت کے نصف تک جاری ہے اور دیگر انبیاء کا نفع دوسرے نصف کے ایک ایک جز تک جاری ہے تو یقیناً حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب خداوندی میں بھی مقام و مرتبہ آپ ﷺ کے نفع کی مقدار کے مطابق ہوگا' لہٰذا ملاحظہ ہو کہ

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا کوئی بھی عارف ہے تو اس کی معرفت کے اجر کے برابر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اجر ہے' کیونکہ اس کی معرفت آپ ﷺ کے معارف کی طرف منسوب ہے۔

(۲) امت مسلمہ کا کوئی صاحب حال ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کے اجر کے برابر اجر ہوگا اس لیے کہ اس کے حال کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے احوال سے ہے۔

(۳) کوئی بھی صاحب کلام ہے' جس کے ساتھ وہ اللہ کی بارگاہ میں قرب حاصل کرتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس قول کے اجر کی مثل اجر ضرور ہو گا کیونکہ وہ احسن قول آپ ﷺ کے مقالات مبارکہ اور تبلیغ رسالت کی طرف منسوب ہے۔

(۴) نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' آزاد کرنا' جہاد' بھلائی' ذکر' صبر اور عفو و درگزر جیسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قریب کرنے والے اعمال میں سے کوئی عمل بھی ایسا نہیں' جس کے عامل کے اجر کی مثل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اجر ثابت نہ ہو' اس لیے کہ عمل کا اجر آپ ﷺ کے اعمال سے مطابقت کی بنا پر ہے۔

(۵) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رشد و ہدایت کے ساتھ امت مسلمہ کا کوئی بھی فرد جس درجہ علیا اور مرتبہ منیہ پر پہنچے' تو اس کے برابر اجر حضور سرور عالم ﷺ کے لیے ہو گا' اس لیے کہ اس کی نسبت آپ ﷺ کے درجہ و مرتبہ کی طرف ہو گی۔

لہٰذا جو کوئی امت کو ہدایت کی طرف بلائے' یا کوئی اچھا طریقہ ایجاد کرے' تو اس کے لیے اس پر عمل کرنے والے کا اجر ہو گا۔ اور عاملین کی تعداد کے مطابق ہو گا' پھر لامحالہ سیدنا رسول اللہ ﷺ کے لیے اجر کئی گنا بڑھتا رہے گا' کیونکہ آپ ﷺ نے ہی اس نیک کام کی نشاندہی کی اور اس کی طرف رہنمائی فرمائی۔

اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام شب معراج ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر رشک کرتے ہوئے رو پڑے' کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی امت جنت میں داخل ہو گی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت سے کہیں زیادہ ہو گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رونا حسد کی بنا پر نہ تھا جیسا کہ بعض نادانوں کا خیال ہے' بلکہ آپ کا رونا اس عظیم مرتبہ کے مقدر میں نہ ہونے کی وجہ سے تھا۔

(ہدایہ السول فی تفضیل الرسول: ۳) •

اسی معنی کے حوالے میں (مولف) نے اپنے والد محترم امام حبیب علوی بن عباس حسنی کو یوں فرماتے ہوئے سنا۔

والمرء في ميزانه حسناته
فاقدر بذا قدر النبي محمد

جس شخص کے نامہ اعمال میں جس قدر نیکیاں ہیں وہ اسی کے مطابق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر کرتا ہے۔

نوید مغفرت

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ۔(الفتح: ۲)	تاکہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں کے اور تمہارے پچھلوں کے۔

اس آیہ کریمہ پر کئی نادان بڑی فرحت و مسرت محسوس کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسی بشریت عادیہ ثابت کی جائے جو فضیلت اور خصوصیت سے خالی ہو اور مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ حضور ﷺ اور دوسرے بشر برابر برابر ہیں' جو امور ان سے سرزد ہونے جائز ہیں وہ بلا قید و شرط نبی ﷺ سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں۔ اس ناقص معنی کا اس آیت سے استدلال کر کے وہ بڑے خوش ہوتے ہیں اور ڈینگیں مارتے ہیں۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا کوئی بھی منکر نہیں اور نہ ہی کوئی آپ ﷺ کی الوہیت کا معتقد ہے اور بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے خاص بندے ہیں لیکن اللہ کی جمیع مخلوق سے افضل و اعلیٰ اور برتر ہیں۔

بلاشک و شبہ حضور نبی کریم ﷺ بشر ہیں لیکن آپ ﷺ مقام و مرتبہ'

خصائص و فضائل' مناقب و محاسن اور احوال کے لحاظ سے عام بشر سے مختلف ہیں' جیسا کہ اپنے مقام پر مقرر اور ثابت ہے۔ اور اس کا منکر صرف وہی ہے جو بصارت و بصیرت سے بیگانہ اور اندھا ہے اور جس کی نیت اور ارادہ میں فساد ہے۔ والعیاذ باللہ۔

آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گناہ کا سرزد ہونا جائز ہے' اس لیے کہ مغفرت گناہ کے بعد ہوتی ہے۔ بعض علماء اسی کے قائل ہیں اور نبی کریم ﷺ سے صغائر کا صدور جائز ہونے کی تائید کرتے ہیں' اور استدلال ان آیات و احادیث سے کرتے ہیں جن کا ظاہر اسی معنی میں مفید ہے مثلاً:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔ (محمد: ۱۹)	اور اے محبوب اپنے خاصوں اور عام مسلمان مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو۔
وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ (الانشرح: ۲-۳)	اور تم پر سے تمہارا وہ بوجھ اتار لیا جس نے تمہاری پیٹھ توڑی تھی۔
عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ۔ (التوبہ: ۴۳)	اللہ تمہیں معاف کرے تم نے انہیں کیوں اذن دے دیا۔
لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ (الانفال: ۶۸)	اگر اللہ پہلے ایک بات لکھ نہ چکا ہوتا تو اے مسلمانو تم نے جو کافروں سے بدلے کا مال لے لیا اس میں تم پر بڑا عذاب آتا۔
عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى۔ (عبس: ۱-۲)	تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا اس پر کہ اس کے پاس وہ نابینا حاضر ہوا۔

اور اس سلسلے میں احادیث رسول ﷺ بھی وارد ہیں' جیسا کہ حضور ﷺ

کی دعاؤں میں مذکور ہے: مثلاً

اللھم اغفرلی ماقدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت---	اے اللہ مجھے بخش دے جو میں نے پہلے کئے اور جو بعد میں ہوں' جو میں نے پوشیدہ کئے اور جو اعلانیہ کئے---

اسی طرح کی اور بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں وارد ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے:

انه لیغان علی قلبی فاستغفر الله۔	بے شک میرے دل پر ابر چھا جاتا ہے تو میں اللہ سے استغفار کرتا ہوں۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

انی لاستغفر الله واتوب الیه فی الیوم اکثر من سبعین مرة۔	میں ایک دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے استغفار اور توبہ کرتا ہوں۔

صحیح مفہوم

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "لیغفر لک الله ما تقدم من ذنبک وما تاخر" کے چند جوابات نقل کئے جاتے ہیں' جو شیخ امام قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ نے دیئے ہیں:

(۱) اس سے مراد آپ ﷺ کی امت ہے۔

(۲) اس سے مراد وہ امور ہیں جو بھول اور نسیان سے واقع ہوئے۔

(۳) مغفرت سے مراد حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو عیوب سے پاک رکھنا ہے۔

(۴) نبی کریم ﷺ کو جب یہ کہنے کا حکم ہوا:

وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا	اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا۔ میں تو اسی کا

نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ -(الاحقاف: ۹) تابع ہوں جو مجھے وحی ہوتی ہے اور میں نہیں مگر صاف ڈر سنانے والا۔

تو اس پر کفار خوشی و مسرت سے تلملا اٹھے 'تو اللہ کریم نے یہ آیہ کریمہ نازل فرمائی:

لیغفرلک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر -(الفتح: ۲) تاکہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں کے اور تمہارے پچھلوں کے۔

نزول آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہر حال میں مغفور ہیں 'اگر آپ ﷺ سے کوئی گناہ سرزد ہو بھی جائے تو اس پر مواخذہ نہیں ہو گا۔

امام عبدالعزیز دباغ کا نفیس جواب

امام عارف باللہ عبدالعزیز دباغ رحمتہ اللہ علیہ نے اس کا بڑا نفیس جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

اس آیت کا ما قبل ہے:

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا- بے شک ہم نے تمہارے لیے روشن فتح فرمادی۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ذیشان میں فتح سے مراد مشاہدہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ۔ اللہ جل شانہ کی اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر خاص رحمت ہے کہ اس نے آپ ﷺ سے حجاب ہٹا دیا اور اپنے مشاہدہ سے عزت و کرامت بخشی۔ آپ ﷺ نے بھی حق کو حق سے کماحقہ دیکھا' فتح مبین سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔ بچپن سے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حجاب کا ازالہ مقدر میں ہوا۔ یہ فتح ہر نبی کے لیے ثابت ہے 'بلکہ ہر عارف کے لیے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس میں خصوصیت آپ ﷺ کے کمال قوت و طاقت اور عقل و روح 'نفس و ذات اور

بھید کی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر ہے جو کسی غیر کے لیے ثابت نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: "ما تقدم من ذنبک وما تاخر" میں "ذنب" سے مراد اس کا سبب ہے 'یعنی گناہ کا سبب جو کہ غفلت اور حجاب کا آڑے آنا ہے 'جو ابتدائی تربیت میں ہوتا ہے اور "ماتقدم" اور "ما تاخر" اس کے زوال سے کنایہ ہے اور غفران سے مراد ازالہ ہے۔

گویا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "بے شک ہم نے تمہارے لیے روشن فتح فرمادی" تاکہ کلی طور پر حجاب آپ سے زائل ہو جائے اور آپ پر ہماری نعمت تام ہو جائے 'اور آپ ﷺ مکمل طور پر ہدایت و نصرت کے پیکر بن جائیں کیونکہ زوال حجاب کی نعمت سے بڑھ کر کوئی نعمت اور معارف کی ہدایت سے بڑھ کر کوئی ہدایت نہیں 'اور نہ اس حالت سے بڑھ کر کوئی نصرت ہے۔ یہ امام عارف شیخ عبدالعزیز دباغ کے کلام سے ماخوذ ہے 'جس کو شیخ احمد مبارک نے جمع کیا۔ (الابریز: ۸۰)

میں (مولف) کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے جو ہمارے نبی ﷺ کو استغفار کا حکم دیا اور آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعاو سوال کرتے وقت اس کی تصریح فرمائی 'وہ حضور ﷺ کی کمال درجے کی تواضع ہے 'عبودیت کاملہ کا کامل اقرار ہے 'اللہ تعالیٰ جل شانہ کی بارگاہ عالیہ کا محتاج اور ضرورت مند ہونے کا اقرار ہے 'اس سبحانہ و تعالیٰ کے فضل و کرم سے بے پرواہ ہونے کی نفی ہے اور اللہ کے انعامات پر ناشکری کی نفی ہے۔ گویا کہ آپ ﷺ کی زبان حال یوں گویا ہے: کہ اللہ تعالیٰ نے جو مجھے فضل و ثواب 'اعلیٰ درجات اور ارفع مقامات سے نوازا ہے 'میں ان پر شکر گزار ہوں 'اور میں ہمیشہ اس کے فضل و کرم میں رغبت رکھتا ہوں اور اس کی خوشنودی میں جلدی کرتا ہوں 'اسی کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہوں 'ہردم نیکیوں میں لگا رہتا ہوں اور نیک کاموں میں بہت جلدی کرتا ہوں۔ اس کی وضاحت آپ ﷺ نے اس فرمان ذیشان میں فرمائی:

اَنَا اَخْشَاكُمُ اللّٰهَ وَاَتْقَاكُمْ وَاَعْلَمُكُمْ بِهٖ۔ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں، تم سب سے زیادہ متقی اور تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جاننے والا ہوں۔

اس فرمان عالیشان میں جیسے تعلیم امت ہے، کہ وہ آپ ﷺ کی اقتدا اور اتباع کریں، ویسے ہی اس میں اللہ تعالیٰ کا دائمی عمل کے ساتھ شکر بجالانا بھی ہے اور کیونکر نہ ہو؟ جبکہ وہ خود فرماتے ہیں:

اَفَلَآ اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا۔ کیا میں شکر گزار بندہ نہ بن جاؤں۔

امام شاذلی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی:

اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ فَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً۔ بے شک میرے دل پر (انوار کے غلبہ سے) ابر آجاتا ہے تو میں ایک دن میں اللہ سے ستر بار استغفار کرتا ہوں۔

تو اس کا معنی مجھ پر خاصا مشکل ہو گیا یعنی اس میں مجھے اضطراب رہا، تو میں عالم خواب میں سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوا، تو آپ ﷺ مجھے فرما رہے تھے: اے مبارک یہ غین (پردہ) انوار کا ہے اغیار کا نہیں۔

(دیکھئے مولف کی کتاب الانسان الکامل: ۹۹-۱۰۱)

امام جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ کا کلام

امام حافظ جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے اس آیت پر کلام کے بارے میں ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا، جس کا نام "المحرر فی قولہ تعالی: لیغفرلک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر" رکھا۔ اس کتاب کی تحقیق کرنے والے استاد حسین شکری مقدمہ میں فرماتے ہیں:

امابعد!

یہ امام حافظ جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ کا بڑا قیمتی رسالہ ہے، جس میں انہوں نے متقدمین علماء کی اس مسئلہ میں نقول کا خلاصہ، اسلاف کا موقف اور ان کی آرا و اقوال کو نہایت سنجیدگی سے قلمبند فرمایا۔ اس آیت کے معنی و مراد میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں اور بعض نے تو مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں زبان درازی کی حد کر دی، اور وہ امور آپ ﷺ کے لیے ثابت کرنے کی بہت جلدی کی، جن کی اس مسئلہ میں آیت وارده نفی کرتی ہے۔

تو اس امام رحمتہ اللہ علیہ نے سابقین کے اقوال و آراء کو جمع کیا، جو نبی ﷺ کے متعلق تھے اور ان کے ضعف اور رد کی وجوہات کو بیان کیا۔ پھر اس آیت کے مرادی معنی کے بیان میں خوب وضاحت کی، تو آپ کا یہ بیان مومنوں کے دلوں کے لیے نہایت شافی ثابت ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا گناہ سے استغفار کرنے کا مسئلہ بھی اس آیت میں وارده مسئلہ سے متعلق ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں وارد ہے:

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ۔ اور اے محبوب اپنے خاصوں کے گناہوں کی معافی مانگو۔

اس کا جواب علامہ آلوسی نے (روح المعانی: ۲۴/ ۷۷) میں یوں بیان فرمایا کہ

"امور دین پر متوجہ ہو جاؤ، اور ہر اس امر کو چھوڑ دو جو تمہاری طرف منسوب ہو تو گناہ شمار ہو اگرچہ وہ فی الواقع گناہ نہ بھی ہو۔"

اور علامہ ایک قول یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ

لِذَنْبِ اُمَّتِكَ فِيْ حَقِّكَ۔ اپنے حق میں اپنی امت کے گناہوں کے لیے استغفار کرو۔

میں نے اس سلسلے میں بے شمار تالیفات کو دیکھا لیکن اس مسئلہ میں کسی کی بحث

اتنی کامل اور مضبوط نہیں تھی جتنی امام حافظ سیوطی کی بحث ہے' سو ان سطور کے جو ہمارے عالم سید محمد بن علوی مالکی حسنی کے ہاتھ کی تحریر ہیں' جہاں انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام شریف کی طرف گناہ کی نسبت اور اس آیت کے مقصد پر خوب کلام فرمایا' اور اس بحث سے متعلق ائمہ سابقین کے اقوال کو جمع کیا' اور اس کو اپنی کتاب (محمد ﷺ الانسان الکامل: ۹۹-۱۰۱) میں ایک مستقل بحث کا درجہ دیا۔ سید محمد بن علوی حفظہ اللہ تعالیٰ نے ان اقوال کو ذکر کرنے کے بعد اپنے الفاظ میں خلاصہ اور نتیجہ یوں بیان فرمایا کہ

"جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کو استغفار کا حکم فرمایا اور آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا اور سوال کرنے میں اس کی تصریح فرمائی' یہ رسول اکرم ﷺ کی کمال تواضع' عبودیت کاملہ کا کامل اقرار اور اپنے پروردگار کی بارگاہ کا محتاج اور ضرورت مند ہونے کا مکمل اعتراف اور اقرار ہے' نیز اس جل شانہ کے فضل و کرم سے بے پرواہی کی نفی اور اس کے انعامات پر ناشکری کی مکمل نفی کا اقرار ہے---اور اس میں تعلیم امت بھی ہے تاکہ وہ آپ ﷺ کی اقتداء اور اتباع کریں اور اللہ جل شانہ کے لیے دائمی عمل کے ساتھ کامل شکر کا بجالانا بھی۔"

دیکھئے (المحرر فی قوله تعالى: "ليغفر لك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر" للسيوطي بتحقيق الاستاذ حسين محمد علي شكري: ۷-۹)

ابر نور بر قلب حضور ﷺ

امام مسلم نے کتاب الذکر والدعاء---باب استحباب الاستغفار---میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا کہ صحابی رسول ﷺ حضرت اغر مزنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ وَاِنِّيْ	بیشک میرے دل پر بھی (انوار کے غلبہ

سے) ابر چھا جاتا ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے ایک دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔ لَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةً.(صحیح مسلم: ٦٧٢٣)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے غلطی اور گناہ کے صدور اور وقوع معصیت کے جواز کے قائلین اس حدیث کے سہارے بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہمارا مدعا ثابت ہوا۔ ان کا یہ کہنا بالکل ظاہر نص پر مبنی ہے۔ حالانکہ یہ تصور فاسد ہے اور ان نصوص قطعیہ کے معارض اور مخالف ہے جو نبی ﷺ کے لیے ثبوت عصمت اور شیطان، نفس دہوا اور وساوس سے حفاظت کے علم یقینی کا فائدہ دیتی ہیں بلکہ ان تمام نقائص سے مبرا ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں، جن کا اطلاق عام بشر پر جائز ہے تاکہ مقام توحید، تنزیل ووحی کے مقام اور ان احکام شریعہ کی کامل حفاظت ہو جن کی ذمہ داری نبھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے قلب سلیم اور عقل کریم کو ظرف، قبول کرنے کا اہل اور منتقل کرنے کا مصدر اور محفوظ و مامون مرجع بنایا جو امت کے جمیع قلوب کا معیار، تمام مفاہیم کا صحیح اور علوم و معارف کے پرکھنے کی کسوٹی ہے۔

امام نووی رحمتہ اللہ علیہ کا کلام

مذکورہ حدیث کے تحت امام یحییٰ بن شرف نووی رحمتہ اللہ علیہ رقمطراز ہیں کہ غین کا معنی ابر اور بادل ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ چیز ہے جو دل پر حجاب بنے۔ قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کمی اور غفلت ہے کیونکہ نبی ﷺ کی شان اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں ہمیشہ اور ہر لحہ رطب اللسان رہیں اور جب آپ ﷺ سے (دوسری منصبی ذمہ داریوں میں مشغولیت کے باعث) اس میں کمی یا غفلت واقع ہوتی تو آپ ﷺ اس انقطاع کو گناہ شمار کرتے اور اس پر استغفار کرتے۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ ﷺ امت کے بعض احوال سے باخبر ہونے پر کبیدہ خاطر ہوتے تو ان کے لیے استغفار

کرتے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ آپ ﷺ امت مسلمہ کے معاملات اور مصلحتوں میں غور و فکر' دشمنان اسلام سے جنگ کی تدبیر یا ان کی مدارات اور تالیف جیسے امور میں مشغول ہونے کے باعث ذکر الٰہی نہ کرپاتے 'تو آپ ﷺ اسے اپنے عظیم مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ذنب خیال کرتے اور اس پر استغفار فرماتے۔ اگرچہ یہ امور فی نفسہ بہت بڑی نیکی اور فضیلت کے حامل ہیں لیکن باوجود اس کے یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضوری' مشاہدہ' مراقبہ اور ماسوائے فراغت کے ارفع مقام اور اعلیٰ درجہ سے نزول ہے' تو اسی لیے آپ ﷺ استغفار فرماتے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس ابر سے مراد وہ سکینہ (سکون و اطمینان) ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے قلب انور کو معمور فرمایا تھا' جس کا غماز یہ فرمان خداوندی ہے:

فَاَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ عَلَيۡهِمۡ۔ تو ان پر اطمینان اتارا۔

(الفتح: ۱۸)

اور آپ ﷺ کا استغفار کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف احتیاج اور عبودیت کے اظہار' نہایت خشوع اور خضوع اور کماحقہ شکر ادا کرنے کے لیے تھا۔ محاسبی کا کہنا ہے کہ انبیاء اور ملائکہ علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت سے زیادہ خوفزدہ رہتے ہیں' اگرچہ وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ و مامون ہیں اور یہ بھی منقول ہے کہ جب آپ ﷺ پر خشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کے دل پر ایک ابر آجاتا ہے اور آپ ﷺ کا استغفار کرنا نعمتوں پر شکر کی وجہ سے ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ بعض اوقات صاف اور شفاف دلوں میں بھی کچھ نفسانی خواہشات اور خیالات جنم لیتے ہیں' ان کو ابر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(صحیح مسلم بالنووی: ۱۷/ ۲۳-۲۴)

اور بالفاظ دیگر ہمارا یوں کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ بعض اوقات منصب رسالت کی ذمہ داریوں مثلاً تبلیغ و تعلیم' دعوت حق اور اصلاح و ارشاد نیز لوگوں کے معاملات'

اپنے نجی معمولات ' اپنوں کے حقوق کی تدبیر اور دشمنان اسلام سے جنگ کی تدبیر اور کبھی ان کی تالیف و مدارات وغیرہ امور میں مشغول رہنے کی وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دائمی ذکر الٰہی ' مشاہدۂ حق کے استغراق اور بارگاہ الوہیت کی حضوری میں فرق آجاتا ' حالانکہ یہ امور بجالانا بھی ضروری تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کا مکلف بنایا تھا اور مومنوں پر ان کی جانوں سے بڑھ کر آپ ﷺ کو ولایت حاصل تھی اور آپ ﷺ میں ان تمام امور کو کماحقہ سرانجام دینے میں کامل استعداد تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب حضور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے بلند و بالا مقام و مرتبہ اور معرفت اتم کو دیکھتے تو اس حال کو اپنے رفیع مقام کے پیش نظر ہیچ تصور کرتے اور اس پر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے کیونکہ آپ ﷺ کے ارفع و اعلیٰ مقام کا تقاضا یہ تھا کہ ہمہ وقت آپ ﷺ کا قلب انور اللہ تعالیٰ کے لیے ماسوا سے خالی رہے اور مشاہدہ حق میں استغراق قائم و دائم رہے۔ حدیث کی یہ توجیہہ سب سے بہتر ہے اور یہی مشہور ہے۔

سطور بالا میں حدیث کے جس معنی کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے ' کثیر حضرات نے اسی کا قصد کیا اور یہ امور تبلیغ کے علاوہ دیگر معاملات میں ضعف اور سہو کے جواز پر مبنی ہے اور ارباب قلوب و معرفت کا موقف یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اس سے بھی منزہ ہیں اور سہو یا ضعف کی حالت کی بجائے حدیث کے یہ معنی مزید بہتر ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت پر کثرت شفقت کے سبب ان کے معاملات کے اہتمام میں متفکر رہتے ' جس سے آپ ﷺ کی طبیعت کبیدہ خاطر ہو جاتی اور آپ ﷺ ان کے لیے استغفار فرماتے۔

کہتے ہیں کہ غین (ابر) سے مراد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی سکینہ (اطمینان و وقار) ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب انور کو ڈھانپ لیتی ' جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ تو اللہ نے اس پر اپنا سکینہ (اطمینان) (التوبہ: ۴۰) اتارا۔

اور اس وقت آپ ﷺ کا استغفار کرنا اللہ تعالیٰ کی احتیاج اور عبودیت کے اظہار کے لیے ہوتا۔

ابن عطاء کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار کرنا تعلیم امت کی خاطر ہوتا' تاکہ وہ استغفار کو لازم پکڑیں۔ بعض کا کہنا ہے: تاکہ وہ خوف الٰہی سے ہمیشہ لرزتے رہیں' کہیں امن کی بنیاد پر غفلت میں نہ پڑ جائیں۔

ہو سکتا ہے کہ جب آپ ﷺ پر خشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا تو اس وقت ایک ابر قلب انور پر آجاتا ہو' تو اس وقت آپ ﷺ اللہ کا شکر ادا کرنے اور اپنی عبودیت کے اظہار کے لیے استغفار کرتے ہوں۔ جیسے آپ ﷺ نے فرمایا:

اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا۔ کیا میں شکر گزار بندہ نہ بن جاؤں۔

امام ابوالحسن شاذلی رحمتہ اللہ علیہ کا اس حدیث کے بارے میں کلام پہلے گزر چکا ہے کہ وہ حالت خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت باسعادت سے مشرف ہوئے اور آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ یہ ابر' انوار کا ہے نہ کہ اغیار کا۔

(تفصیل کے لیے مولف کی کتاب "الانسان الکامل" ملاحظہ ہو)

اللہ جل جلالہ نے حضور ﷺ کا بار غم دور کر دیا

اللہ تعالیٰ و سبحانہ جل مجدہ الکریم کا ارشاد گرامی ہے:

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ۔ (الانشراح: ۲-۳) اور تم پر سے تمہارا وہ بوجھ اتار لیا جس نے تمہاری پیٹھ توڑی تھی۔

اس نص میں بھی اہل فتنہ بہت غلو سے کام لیتے ہیں تاکہ اپنی سابق مراد حاصل ہو لیکن صحیح تر وہی معنی ہے جو اہل حق نے بیان فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے قبل از نبوت ہی

آپ ﷺ کی فتنوں سے حفاظت کا ذمہ اٹھالیا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ ﷺ کی پشت مبارک گراں بار ہوتی۔

ایک قول یہ ہے کہ بار رسالت نے آپ ﷺ کی پشت مبارک گراں بار کر دی' یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اس کی تبلیغ کا فریضہ بخوبی سرانجام دے دیا اور دوسرے قول کے مطابق اس آیت کی مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کو جو قلبی طور پر فکرو حیرت اور طلب شریعت کا بار دامن گیر تھا' ہم نے اسے اتار دیا۔ بایں صورت کہ اس شریعت کو تمہارے لیے نافذ کر دیا اور تیسرا قول یہ ہے کہ ہم نے تم سے تمام تر بوجھ ہلکے کر دیئے بایں طور پر کہ تمہاری حفاظت کا ذمہ اٹھالیا اور چوتھا قول یہ ہے کہ ہم نے تم سے جاہلانہ امور و رسوم کا بوجھ اتار دیا۔

اور "انقض ظهرك" کا معنی یہ ہے کہ اگر بوجھ اتار نہ دیا جاتا تو قریب تھا کہ تمہاری پیٹھ گراں بار ہو جاتی یا وضع سے مراد اللہ کی عصمت اور گناہوں سے کفایت ہے' کہ اگر یہ نہ ہوتی تو تمہاری پشت گراں بار ہوتی یا اس سے مراد بار رسالت ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب انور کا وہ فکر و ملال' جو امور جاہلیت سے ہوتا تھا۔ یعنی زمانہ جاہلیت کی رسوم سے طبیعت نازک کبیدہ خاطر ہو جاتی اور اس کبیدگی کو یہاں وزر سے تعبیر کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عظمت و حفاظت سے آگاہ کر دیا۔ جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت کا ملال جاتا رہا۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ کا صحیح مفہوم

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ	اللہ تمہیں معاف کرے تم نے انہیں کیوں اذن دے دیا جب تک نہ کھلے تھے تم

صَدَقُوا وَ تَعلَمَ الكَاذِبِينَ۔ پر سچے اور ظاہر ہوئے تھے جھوٹے۔

(التوبہ: ۴۳)

قرآن حکیم کی اس نص سے بعض لوگ استدلال کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے گناہ کا سرزد ہونا جائز ہے کیونکہ معافی گناہ کے بعد ہی ہوتی ہے۔ لیکن درست وہی مفہوم ہے جو اہل حق نے بیان فرمایا کہ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے کوئی ممانعت نہیں ہوئی تھی، یعنی اللہ جل شانہ نے انہیں اس امر سے پہلے منع نہیں فرمایا تھا کہ جس کا خلاف کرنے کو گناہ شمار کیا جائے اور نہ ہی اللہ سبحانہ نے اسے گناہ شمار کیا بلکہ علماء نے تو اسے عتاب بھی شمار نہیں کیا اور جنہوں نے پہلے مفہوم کا قصد کیا وہ سخت غلطی پر ہیں۔

حق بات یہ ہے کہ جب تک کسی معاملہ میں وحی نازل نہ ہو اس وقت تک حضور نبی کریم ﷺ کو اس کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے اور عمل آپ ﷺ کی اپنی صوابدید پر موقوف ہوتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ جل شانہ نے فرمایا:

فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ۔ تو ان میں جسے تم چاہو اجازت دے دو۔

(النور: ۶۲)

جب آپ ﷺ نے انہیں اجازت دے دی تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کے دلی ارادے سے آگاہ کر دیا کہ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو بھی انہوں نے رک جانا تھا اور ساتھ نہیں جانا تھا اور یوں ان کا نفاق اور اطاعت رسول کا جھوٹ واضح ہو جاتا اور آپ ﷺ کے اس فعل پر کوئی حرج نہیں اور یہاں "عفا" بہ معنی "غفر" نہیں ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

عَفَا اللّٰهُ لَكُمْ عَنْ صَدَقَةِ الْخَيْلِ وَالرَّقِيقِ۔ اللہ تمہیں معاف فرمائے گھوڑے اور غلام کا صدقہ تم پر لازم نہیں۔

یعنی ان پر یہ فعل بالکل واجب اور لازم نہیں (قاضی قشیری) علماء فرماتے ہیں

کہ جو یہ کہے کہ "عفو" یعنی معافی گناہ کے صدور کے بعد ہی ہوتی ہے' وہ کلام عرب سے ناواقف ہے۔ اور یہ بھی منقول ہے کہ "عفا اللہ عنک" کا معنی یہ ہے کہ "تمہیں کوئی گناہ نہیں۔" داودی کا کہنا ہے کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و عظمت اور قدر و منزلت کا اظہار ہے۔ مکی کہتے ہیں کہ یہ جملہ کلام عرب میں ایک محاورہ ہے جو بطور استفتاح کہا جاتا ہے' جیسے "اصلحک اللہ" (اللہ تیری اصلاح فرمائے) اور "اعزک اللہ" (اللہ تجھے عزت بخشے)

سمرقندی نے بیان کیا ہے کہ اس کا معنی "اللہ تعالیٰ تجھے محفوظ فرمائے" ہے۔

نسبت ضلالت اور عصمت رسول ﷺ

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔ (الضحیٰ: ۷)

اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی۔

وہ فتنہ پرور لوگ جن کی آنکھوں پر اللہ تعالیٰ نے پردہ اور دلوں پر مہر لگا دی' وہ مقام رسالت و نبوت کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک بشر خیال کرتے ہیں' جو زمین پر چلتا ہے' کھانا کھاتا ہے' بازار جاتا ہے' بوجھ اٹھاتا ہے اور اس سے گناہ اور غلطیاں سرزد ہوتی ہیں' وہ گمراہ تھے (معاذ اللہ) اللہ نے انہیں ہدایت دی' محتاج تھے تو انہیں غنی کیا اور یتیم تھے تو انہیں پناہ دی' الی آخرہ۔ ازیں قسم کی باتوں سے آپ ﷺ کو عام لوگوں سے خلط ملط کر دیتے ہیں' اور سہارا قرآن و سنت میں وارد ہونے والی ان نصوص کے ظاہر کا لیتے ہیں' جن میں سے ایک یہی مذکورہ آیت ہے۔

اس آیت کریمہ کا صحیح معنی بیان کرنے سے قبل ہم یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ علما کا اس پر اتفاق ہے کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم قطعاً ایک لمحہ بھی گمراہ

نہیں ہوئے۔"

قاضی عیاض کی "الشفاء" میں ہے کہ حق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبل از نبوت بھی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی جہالت اور اس بارے میں کسی امر میں شک کرنے سے معصوم ہیں اور اخبار و آثار اس کی خوب تائید کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام ولادت سے لے کر ہی ایسے نقائص سے مبرا اور منزہ ہیں' اور ان کی پرورش توحید و ایمان پر ہوئی ہے' بلکہ انوار معارف کی جلوہ گاہوں اور لطف و سعادت کے جھرمٹ میں ہوئی ہے اور کسی خبر نگار سے یہ منقول نہیں کہ کوئی ایک نبی پہلے کفر و شرک سے معروف ہو اور بعد ازاں توحید کے دامن میں جا بسا ہو۔ یہ عصمت انبیاء علیہم السلام کی قوی دلیل ہے۔

قاضی قشیری نے انبیاء علیہم السلام کے تنزیہہ پر ان آیات ربانیہ سے استدلال کیا ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ۔ (الاحزاب: ۷)	اور اے محبوب یاد کرو جب ہم نے نبیوں سے عہد لیا اور تم سے...

اور:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ۔ (آل عمران: ۸۱)	اور یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے ان کا عہد لیا جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول کہ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمائے تو تم ضرور ضرور اس پر ایمان لانا ضرور ضرور اس کی مدد کرنا۔

اللہ تعالیٰ نے میثاق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تطہیر بیان کی' اور قبل از خلقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے میثاق لینا بعید از فہم ہے' پھر آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کی ولادت باسعادت کے ہزاروں سال پہلے نبیوں سے وعدہ لیا کہ ان پر ایمان لانا اور مدد کرنا۔ توجس کی تطہیر اللہ جل شانہ بیان کرے اس ہستی پر شرک یا کسی اور گناہ کا اطلاق کیسے روا ہو سکتا ہے۔ یقیناً ایک ملحد کے سوا کوئی بھی اس کو جائز نہیں ٹھہراتا۔

اس کلام کا یہی مقصود ہے اور یہ کیسے ممکن ہے جبکہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صغر سنی میں ہی شق صدر کر کے قلب انور نکالا اور چاک کر کے اس سے ایک سیاہ لوتھڑا نکال دیا' اور کہا کہ یہ شیطان کا حصہ ہے۔ پھر قلب انور کو خوب دھو کر حکمت و ایمان سے لبریز کر دیا' جیسا کہ اخبار و احادیث سے ظاہر ہے۔ (الشفا للقاضی عیاض: القسم الثالث---الباب الاول: ۲/۱۰۹)

آیت کی صحیح تفسیر

علامہ نبہانی "انوار محمدیہ" میں یوں رقمطراز ہیں کہ اس آیت کا قول یہ ہے کہ "تجھے امور نبوت سے بے خبر پایا۔" اس معنی کی تائید اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ۔ (الشوریٰ: ۵۲)	اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے نہ احکام شرع کی تفصیل۔

یعنی قبل از وحی آپ قرات قرآن اور خلق خدا کو ایمان کی دعوت دینے کے طریقے کو نہیں جانتے تھے' یہ علامہ سمرقندی کا قول ہے۔

قاضی ابو بکر فرماتے ہیں کہ اس ایمان سے مراد فرائض و احکام ہیں' ورنہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام پہلے سے ہی اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان رکھتے تھے بعد میں وہ فرائض و احکام نازل ہوئے جن کو پہلے آپ ﷺ نہیں جانتے تھے تو ان سے مکلف ہونے سے گویا ایمان کے تقاضوں میں زیادتی ہو گئی۔ (الانوار المحمدیہ للنبہانی: ۴۰۱)

میں (مولف) نے (الانسان الکامل) میں جلیل القدر ائمہ کے اقوال کو جمع کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ ﷺ کو امور نبوت سے بے خبر پایا تو ان کی طرف

ہدایت دی۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ آپ ﷺ کو گمراہوں میں پایا تو تمہیں اس سے محفوظ رکھا اور تیسرا قول ہے کہ تمہیں اپنی شریعت سے ناواقف پایا یعنی تم اسے نہیں پہچانتے تھے تو تمہیں اس کی طرف ہدایت بخشی' یہاں ضلال بہ معنی حیرانی ہوگا' اس لیے حضور ﷺ نے غار حرا میں خلوت اختیار کی' تاکہ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہونے کا رستہ تلاش کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اسلام کی طرف ہدایت دی اور ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ حق کی معرفت نہیں رکھتے تھے تو تمہیں اس کی طرف ہدایت دے دی۔ یہ معنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں داخل ہے۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ۔ (النساء: ۱۱۳) — اور تمہیں سکھا دیا جو کچھ تم نہ جانتے تھے۔

امام جعفر بن محمد صادق رحمتہ اللہ علیہ سے یہ معنی مروی ہے کہ تمہیں ازل میں اپنی محبت کی معرفت سے ناآشنا پایا تو تمہیں اپنی معرفت سے آگاہ کر کے احسان عظیم کیا۔

امام حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرات یوں ہے: "ووجدک ضال فھدی" یعنی گمراہ نے تمہیں پایا تو تمہارے ساتھ ہدایت حاصل کی۔ یہ قرات شاذہ ہے۔

میرے نزدیک اس کا یہ معنی زیادہ ظاہر ہے کہ تمہیں احکام منزلہ کے بیان اور لوگوں کو ہدایت اور تبلیغ کرنے کی کیفیت میں متحیر پایا تو تمہیں اس کی ہدایت بخشی جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (النحل: ۴۴) — اور اے محبوب! ہم نے تمہاری طرف یہ یادگار اتاری کہ تم لوگوں سے بیان کر دو جو ان کی طرف اترا اور کہیں وہ دھیان نہ کریں۔

بعد ازاں میں نے یہ معنی حضرت جنید کے کلام میں بھی دیکھا۔

حضرت جنید اس کا معنی یوں بیان فرماتے ہیں کہ جو تمہاری طرف اترا اس کے بیان میں تجھے متحیر پایا تو تمہیں اس کے بیان کی ہدایت کردی جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وانزلنا الیک الذکر۔۔۔۔الایہ۔

اور ایک معنی یہ ہے کہ تمہیں اس حال میں پایا کہ کوئی بھی تمہاری نبوت سے واقف نہ تھا تو تمہیں ظاہر فرمادیا اور سعادت مندوں کو تمہارے ذریعے ہدایت بخشی۔

ابن عطاء فرماتے ہیں کہ "تمہیں اپنی معرفت کی محبت میں خود رفتہ پایا۔۔۔۔۔"

واضح رہے کہ ضال کا معنی محبت بھی آتا ہے' جیسے قرآن حکیم میں وارد ہے:

إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ۔ آپ اپنی اسی پرانی خود رفتگی میں ہیں۔

(یوسف: ۹۵)

یعنی محبت قدیمہ۔۔۔ یہاں ضلال بہ معنی گمراہی مراد نہیں ہوگا کیونکہ اگر اللہ کے نبی کے بارے میں یہ کہیں تو صریح کفر ہے۔ ایسے ہی یہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ ہم تو اسے صریح خود رفتہ پاتے ہیں۔

(یوسف: ۳۰)

یعنی واضح محبت۔۔۔ اور ضلال بہ معنی نسیان بھی آتا ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ۔(البقرۃ: ۲۸۲) کہ کہیں ان میں ایک عورت بھولے تو اس ایک کو دوسری یاد دلاوے۔

یعنی بھول جانے کی صورت میں۔

اسی طرح اللہ جل شانہ کے اس ارشاد گرامی:

مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتَابُ وَلَا الْاِيْمَانُ ۔(الشوریٰ: ۵۲)
اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے نہ احکام شرع کی تفصیل۔

کا صحیح معنی یہی ہے کہ نزول وحی سے پہلے آپ قرآن پڑھنا نہ جانتے تھے اور نہ اس سے واقف تھے کہ مخلوق خدا کو ایمان کی طرف دعوت کس طرح دینی ہے۔

بعض ائمہ جو یہ فرماتے ہیں کہ اس ایمان سے مراد فرائض اور احکام شریعہ کی تفصیل ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کی توحید پر کامل ایمان رکھتے تھے۔ یہ فرائض بعد میں نازل ہوئے جو پہلے آپ کے علم میں نہ تھے، تو اس تکلیف شرعی سے ایمان کا تقاضا اور بڑھ گیا۔ یہی سب سے بہتر توجیہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی اسی توجیہ سے متعلق ہے:

وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغَافِلِيْنَ ۔(یوسف: ۳)
اگر چہ بے شک اس سے پہلے تمہیں خبر نہ تھی۔

علامہ ازہری کہتے ہیں کہ یہاں غافلین کا معنی ناسین ہیں یعنی بھولنے والا۔ جیسے فرمان باری تعالیٰ ہے:

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا ۔
کہ کہیں ان میں ایک عورت بھولے۔

یاد رہے کہ یہاں غافلین کا وہ معنی نہیں ہوگا جو پروردگار عالم کے اس فرمان میں غافلین کا معنی ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غَافِلُوْنَ ۔(یونس: ۷)
اور وہ جو ہماری آیتوں سے غفلت کرتے ہیں۔

بلکہ ابو عبد اللہ ہروی نے اس کا معنی یوں بیان کیا ہے کہ "اس سے پہلے آپ قصہ یوسف کو نہیں جانتے تھے، پھر ہماری وحی سے آپ اس سے خبردار ہو گئے۔"

(الانسان الکامل: ۹۷-۹۸)

بفضل خدا جل جلالہ ثابت قدم مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اللہ تعالیٰ وسبحانہ وجل شانہ فرماتے ہیں:

وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ	اور وہ تو قریب تھا کہ تمہیں کچھ لغزش
الَّذِيٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ	دیتے ہماری وحی سے جو ہم نے تم کو بھیجی کہ
عَلَيْنَا غَيْرَهُۥ وَإِذًا لَّاتَّخَذُوكَ	تم ہماری طرف کچھ اور نسبت کرو اور ایسا
خَلِيلًا - وَلَوْلَآ أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ	ہو تا تو وہ تم کو اپنا گہرا دوست بنا لیتے اور اگر
كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْـًٔا	ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ
قَلِيلًا - إِذًا لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ	تم ان کی طرف کچھ تھوڑا سا جھکتے اور ایسا
الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا	ہو تا تو ہم تم کو دونی عمر اور دوچند موت کا مزہ
تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا - وَإِنْ	دیتے پھر تم ہمارے مقابل اپنا کوئی مددگار نہ
كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ	پاتے اور بے شک قریب تھا کہ وہ تمہیں
لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ	اس زمین سے ڈگا دیں کہ تمہیں اس سے
خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا - سُنَّةَ مَن قَدْ	باہر کر دیں اور ایسا ہوتا تو وہ تمہارے پیچھے نہ
أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِن رُّسُلِنَا وَلَا	ٹھہرتے مگر تھوڑا دستور ان کا جو ہم نے تم
تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا -	سے پہلے رسول بھیجے اور تم ہمارا قانون بدلتا
(بنی اسرائیل: ۷۳-۷۷)	نہ پاؤ گے۔

اس آیہ مقدسہ کا ظاہر نہایت مشکل ہے اور اس کا مفہوم اخذ کرنے میں لوگوں کی درج ذیل چار قسمیں ہیں:

(۱) پہلی قسم کے لوگ وہ ہیں جن کے قدم راہ راست سے پھسل گئے اور سوچیں بھٹک گئیں اور ہلاکت اور انتہائی مشقت کے گہرے گڑھے میں جا گرے' نیز بعید نہیں کہ یہ تصور انہیں برے عقیدے تک پہنچائے' جس کی غایت زندقہ اور الحاد ہے۔

(۲) یہ وہ گروہ ہے جو اس امر میں تردد کا شکار رہا اور خوف خدا انہیں برا عقیدہ اپنانے سے مانع رہا لیکن وہ ہمیشہ قلق و اضطراب میں مبتلا رہے اور حقیقت تک رسائی کے لیے سوال و جواب اور علمی بحثوں کے درپے رہے اور ایمان کی پختگی انہیں بد عقیدگی سے مانع رہی' کیونکہ پختہ ایمان ان کی عقلوں کا محافظ اور تقویٰ و پارسائی ان کے دلوں کی ڈھارس بنا رہا۔

(۳) تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کے دل میں یہ مفہوم گردش کرتا رہا اور عقلوں پر یہ تصور جھپٹتا رہا' لیکن ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل ایمان اور آپ ﷺ کے ساتھ محبت و تعلق اور تعظیم و توقیر انہیں غیروں کی طرح کچھ کہنے سے مانع رہا اور ان کے دلوں پر ساقط روایات کا وسوسہ رہنے کے باوجود ان کی زبانیں اس کے تلفظ سے قاصر رہیں' اور اس بارے میں کچھ کلام نہ کیا اور یہ لوگ اپنے دلوں میں اضطراب کے باوجود ایسے راہ راست کی جستجو میں سرگرداں رہے جس سے ان روایات کے التباس کا حل اور اشتباہ کا ازالہ ہو سکے۔

(۴) چوتھی قسم کے وہ حضرات ہیں جن کے پائے استقامت کو ذرہ بھر بھی لغزش نہ آئی اور دل مطمئن رہے' کوئی چیز ان کو اضطراب کا شکار نہ کر سکی' کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جن کی طرف صحت مفہوم کے لیے رجوع کیا جاتا ہے اور ثابت قدمی کے لیے انہیں کے دامن سے وابستگی رکھی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ میزان حق ہیں' انہیں کا بیان مسلم اور انہیں کی اقتداء ضروری ہے۔ یہ وہی علما ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معرفت اور علم میں رسوخ کی دولت سے مالا مال ہیں۔ انہیں کے حق میں اللہ جل شانہ کا ارشاد گرامی ہے:

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ (آل عمران: ۷)	اور اس کا ٹھیک پہلو اللہ ہی کو معلوم ہے اور پختہ علم والے کہتے ہیں' ہم اس پر ایمان لائے۔

یہ جماعت اس بحث کی اصلاً محتاج نہیں ہوتی' اور ہمیں ضروری ہے کہ استفادہ کے لیے انہیں کی طرف رجوع کریں۔ ابھی ہم ذیل میں اختصار اور اقتصار کے تناسب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے برادر محترم ڈاکٹر علامہ شیخ عوید مطرفی کی تحریر کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر عوید مطرفی کی کتاب "السیف المسلول فی الذب عن الرسول ﷺ -"

آیت کے مشکل ہونے کا سبب

ان تصورات اور بے چینیوں کو جنم دینے والا سبب آیہ کریمہ کا ظاہر ہے' مثلاً آیت کریمہ میں لفظ "کاد" سے تعبیر ہوئی' پھر لفظ "الفتنة" کی اضافت اس ضمیر خطاب کی طرف جس میں رسول اللہ ﷺ مخاطب ہیں اور "لتفتری علینا غیرہ" میں خطاب کا رخ حضور ﷺ کی طرف' اور "ولولا ان ثبتنا ک لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا" میں یہ وعید ہے کہ اگر آپ ﷺ ان کی طرف میلان اور رغبت کریں تو دنیا و آخرت میں عذاب دو چند۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسی غفلت سے کوسوں دور رکھا۔ یہ امور ان تصورات اور خدشات کا اشارہ کرتے ہیں۔

(۵) سب سے پہلے ہم بعض الفاظ کا حل اور ان آیات کی ترکیب کو ذکر کرتے ہیں' کیونکہ کسی بھی آیت کا معنی اس کی لغوی ترکیب' نظم بیانی اور سیاق معنوی سے اخذ ہوتا ہے' لہذا ہم کہتے ہیں کہ پہلی آیت کا آغاز فعل ماضی یعنی "کاد" کے ساتھ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتنے کے قریب ہو گئے تھے بلکہ اس معنی کا وہم بھی نہیں ہوتا نہ قریب سے نہ بعید سے' جیساکہ ان لوگوں کا خیال ہے جن کی تحقیق سے کوئی واسطہ نہیں۔

اگرچہ یہ فعل "کاد" افعال مقاربہ میں سے ہے جو نحویوں کی اصطلاح میں خبر کا زمانہ وقوع اسم سے قریب ہونے کو مفید ہے' لیکن عربی استعمال میں "کاد" کا

اسلوب ثابت ہے کہ اس کی خبر کبھی واقع ہوتی ہے اور کبھی واقع نہیں ہوتی' بلکہ کبھی کبھی اس کی خبر کا وقوع محال ہوتا ہے' جیساکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں ہے:

يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْءُ۔ قریب ہے کہ اس کا تیل بھڑک اٹھے۔

(النور: ۳۵)

واضح ہو کہ عبارت میں اس فعل کا مجرد وجود وقوع خبر کے حتمی ہونے پر دال نہیں' بلکہ فائدہ یہ ہے کہ اس کی دلالت اسم اور خبر کے زمانے میں تقارب پر ہے۔ علاوہ ازیں ہر ایک دوسرے سے بے ربط اور جدا ہے۔ فعلاً اتصال بھی نہیں اور نہ ہی اس میں مباشرت ہے۔

وقوع خبر اور اسم کے زمانہ میں فرضی تقارب (قریب ہونا) پر دلالت ہے' اس سے مراد وقوع خبر نہیں' اور نہ ہی اس پر دلالت ہے جیساکہ اس سے متصف ہونے کو بھی مفید نہیں' کیونکہ کوئی بھی چیز متصف نہیں ہوتی' مگر اپنے فعل اور لابس سے۔

اسی لیے ماہرین علماء لغت کا کہنا ہے کہ "کاد" جب نفی سے خالی واقع ہو تو اس کی خبر واقع نہیں ہوتی۔ جیسے "کاد یفعل" کا معنیٰ "لم یفعل" ہے۔

اور یہ آیہ کریمہ جس کے متعلق ہماری بحث ہے' اسی قبیلے سے ہے اور "کاد" نفی سے خالی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فتنہ میں واقع ہونے کی نفی کو مفید ہے۔

واضح ہوا کہ ائمہ لغت نے نفی سے خالی "کاد" کی تصریح محض عربی استعمال سے کر دی ہے' لہٰذا یہ تصریح آیہ کریمہ میں مذکورہ امور کی رسول ﷺ سے نفی کا فائدہ دیتی ہے اور آپ ﷺ کی ان امور سے برات کو مفید ہے' اور یہ کہ آپ ﷺ نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس میں مشرکین سے طمع ہو' بلکہ آپ ﷺ نے تو ان کی کسی پیش کش کو قبول نہیں کیا۔

اس معنیٰ کی مزید تاکید اس سے ہوتی ہے جو امام ابن ابی حاتم نے ضحاک کے

طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ

کل شیئی فی القرآن "وان کَادُوْا" و "یُکَادُ" فانہ لا یکون ابدا۔	قرآن میں جہاں بھی "وان کادوا" اور "یکاد" وارد ہے' اس کا وقوع کبھی نہیں ہوتا۔

اسی طرح امام طبرانی نے بھی اپنی سند کے ساتھ ضحاک کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت کیا ہے:

وکل شیئی فی القرآن "کَادَ" او "کَادُوْا" او "لَوْ" فانہ لا یکون وھو مثل قولہ: (اَکَادُ اُخْفِیْھَا)(طہٰ: ۱۵)	قرآن میں جہاں بھی "کاد" اور "کادو" یا "لو" کا استعمال ہوا ہے' اس کا وقوع نہیں ہوتا' اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: (قریب تھا کہ میں اسے سب سے چھپاؤں)

اس معنی کی مزید تائید ماہرین لغت عربیہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ "کاد" کے فعل سے جب وقوع خبر کا قریب ہونا مراد ہو تو اس فعل ماضی پہ "قد" لایا جاتا ہے۔

اور یہ "قد" اس آیہ کریمہ میں واقع نہیں ہوا' لہٰذا دلالت اس امر پہ ہوئی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے فتنے سے محفوظ و مامون اور ان کی رغبت سے کوسوں دور ہیں' بلکہ ان سے سخت منافرت رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے متمنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: "لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا" میں "کاد" فعل ماضی "قد" سے مقترن ہے' اس کے باوجود آپ ﷺ کی طرف میلان کا قرب مراد نہیں ہوگا' کیونکہ اللہ جل شانہ کا اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے محفوظ رکھنا اور ان کے مکر و فریب سے بچائے رکھنا ثابت ہے' اور اس

امر کا تحقق بفضلہ تعالیٰ اس وقت سے ہے جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا' بلکہ یہ امر ان کے انکار رسالت سے پہلے کا متحقق ہے' یعنی جب آپ ﷺ انہیں کے درمیان ہی پرورش پا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے فتنوں سے آپ ﷺ کو محفوظ رکھا۔ بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں امر الٰہی کا اعلان فرمایا اور انہیں اس امر کی دعوت دی کہ خلوص عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور ہر وہ امر جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر و شرک کا التباس ہے' اسے ترک کر دیا جائے۔

اللہ رب العزت نے اپنے اس ارشاد گرامی میں آپ ﷺ کے ان سے عصمت کا اعلان فرمایا ہے:

يَاۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔	اے رسول! پہنچا دو جو کچھ اترا تمہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ایسا نہ ہو تو تم نے اس کا کوئی پیغام نہ پہنچایا اور اللہ تمہاری نگہبانی کرے گا لوگوں سے۔

(المائدہ: ٦٧)

اور اس قول پر کہ "کاد" اپنے دیگر افعال کی طرح ہے' جن کی نفی نفی اور اثبات اثبات ہے تو اس فرمان خداوندی "لقد کدت ترکن الیھم" میں حضور ﷺ کا ان کی طرف ذرہ بھر میلان بھی اس جہت سے نہ سمجھا جائے گا کیونکہ "لولا" امتناعیہ کا یہ تقاضا ہے۔

یعنی یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کی طرف عدم میلان کا تقاضا کرتا ہے جیسا کہ امام سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "معترک الاقران فی اعجاز القرآن" میں تصریح کی ہے۔

لہٰذا اس اسلوب قرآنی کا حاصل یہ ہوا' جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے:

"لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا" اور "وان کادوا لیفتنونک" کہ اس کی دلالت اس امر پر ہے کہ جب ان مشرکوں نے سیدنا رسول اللہ ﷺ کو اپنے مکرو فریب کے ساتھ یرغمال بنانے کی کوشش کی' توانہوں نے اپنی تمام تر سرگرمیوں کو رسول اللہ ﷺ کو اپنے حقیقی مشن سے باز رکھنے کے لیے صرف کردیا یعنی توحید باری تعالیٰ کی دعوت اور صرف اسی کی ہی خلوص عبادت سے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی گفتگو کے پیچ و تاب' طرح طرح کی دھمکیوں' چغل خوریوں' سینہ زوری اور ترغیب و ترہیب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتنے کا شکار کرلیں گے اور انہیں اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے' یہ خیال ان کے ذاتی تجربے اور محض خام خیالی پر مبنی تھا اور وہ خیال کرتے تھے کہ اس معاملے میں وہ اپنی قوم کے سرداروں سے خوب داد حاصل کرلیں گے کیونکہ انہیں ناز تھا کہ ان کے دام مکرو فریب کے آگے پہاڑ بھی ثابت قدم نہیں رہ سکتے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اس کی یوں خبر بیان فرمائی ہے:

وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ۔ (ابراہیم: ۴۶)	اور بے شک وہ اپنا سا مکر چلے اور ان کا مکر اللہ کے قابو میں ہے اور ان کا مکرو فریب کچھ ایسا نہ تھا کہ اس سے یہ پہاڑ ٹل جائیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے مکرو فریب سے دفاع کیا اور ایسا تحفظ فرمایا کہ حضور ﷺ ان کی امیدوں سے کوسوں دور رہے' اپنی دعوت کے کمال درجے پر ڈٹے رہے اور انتہائی خلوص کے ساتھ راہ حق پر قائم رہے' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اور آپ کی دعوت کا خوب تزکیہ فرمایا اور واضح فرمادیا:

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ	اور بے شک تم ضرور سیدھی راہ بتاتے

مُّسْتَقِيمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِي لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ۔ — ہو، اللہ کی راہ کہ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں۔

(الشوریٰ: ۵۲، ۵۳)

سید نا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت حق کی نشرو اشاعت اور اس کے ساتھ تمسک پر اپنے پختہ عزم کا ثبوت دیا اور اللہ رب العالمین کے امر پر خلوص کے ساتھ ڈٹ جانے کو سچا ثابت کیا، جب قریش اپنی مساعی مذمومہ سے دل برداشتہ ہو گئے تو انہوں نے آخری یہ حربہ کیا کہ وہ حضرت ابو طالب کے پاس آئے اور ان سے احتجاج کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں اور پجاریوں کو مشرک اور ان کے اس عمل کا رد کرتے ہیں، تو انہیں اس مشن سے روک دیا جائے، تو حضرت ابو طالب نے آپ ﷺ کو بلایا اور ان کے مطالبہ سے خبردار کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان لیا کہ ان کا چچا مدد کرنے سے قاصر ہے، پھر بھی رسول اللہ ﷺ نے امر ربی پر اپنی استقامت اور عزم کا عالی ہمت کے ساتھ یوں اعلان فرمادیا اور لوگوں کے بر طرف ہونے کی کوئی پرواہ نہ کی، فرمایا:

يَا عَمِّ! وَاللّٰهِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِينِي وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي عَلٰى أَنْ أَتْرُكَ هٰذَا الْأَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ أَوْ أَهْلِكَ فِيهِ مَا تَرَكْتُهٗ۔ — چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو میں یہ دعوت حق ترک نہیں کروں گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے غالب کردے یا مخالفین کو ہلاک کردے۔

اس شاندار توجیہ کی طرف اس سے قبل امام ابو بکر باقلانی نے بھی انہی "نکت الانتصار لنقل القرآن" میں اشارہ فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "وان کادوا لیفتنونک" میں یہی کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے یہ مشرکین کے مکرو فریب سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا اور دوسرے

مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ۔ (النساء: ۱۱۳)	اور اے محبوب! اگر اللہ کا فضل و رحمت تم پر نہ ہوتا تو ان میں کے کچھ لوگ یہ چاہتے کہ تمہیں دھوکا دے دیں۔

یہ سب کچھ سیدنا رسول اللہ ﷺ کی تسکین خاطر کے لیے ہے۔

رہی ہماری زیر بحث آیات میں سے آیت ثانیہ یعنی "لو لا ان ثبتناک..." تو اس کا آغاز حرف شرط یعنی "لولا" سے ہو رہا ہے' جو غیر کے ثبوت کے لیے شیئی کی نفی پر دال ہے تو معنی یہ ہوا کہ یہ ماضی میں وقوع خبر کے امتناع کا تقاضا کرتا ہے اس لیے کہ وصف ایسے جملہ سے ملا ہوا ہے جس کی شرط ماضی میں ہے اور اس جملہ کی خبر حدوث میں سابق ہے۔

تو مطلب یہ ہوا کہ اس کا جواب شرط کبھی واقع نہیں ہوتا اور اس کا مضمون مطلقا اور قطعا حاصل نہیں ہوتا' اس لیے کہ یہ ماضی میں اس جملہ شرطیہ کے وقوع پر معلق ہے جس کا وقوع عربی محاوروں میں اس اسلوب پر ہوتا رہتا ہے' یعنی ماضی میں جواب شرط سے پہلے بھی' لہٰذا شرط "لولا" کے جواب کا وقوع قطعا متمنع ہے۔ اس لیے کہ اس کی شرط قبل از جواب واقع ہے۔

اس آیت کریمہ میں "لولا" کے اسلوب کو ما قبل کا اسلوب بنایا ہے' جو اس وقوع میلان کے قطعا متمنع ہونے کو مفید ہے' جو اس جملہ میں شرط "لولا" کے جواب کی صورت میں موجود ہے۔ اس لیے کہ سیدنا رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثابت قدمی کی دولت میسر ہے' جیسا کہ "لولا" کی شرط کے جملہ میں ظاہر ہے اور رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا تحقق اس سے کہیں پہلے کا ہے جب مشرکوں نے فتنہ ڈالنے اور اس پر لائحہ عمل تیار کرنے کی ٹھان لی تھی ہے وحی کے ذریعے' جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو چن لیا اور جمیع لوگوں کی طرف رسول

بنا کر مبعوث فرمایا' اور چاہے آپ ﷺ کی عالی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ اور حضور ﷺ کے لیے بعثت کے بعد ان مشرکوں سے عصمت کی ضمانت ثابت ہے۔

حاصل بحث

اس علمی تحلیل کے بعد ان الفاظ کی لغوی دلالت واضح ہو گئی جن سے بعض لوگوں کے اذہان میں اشکال پیدا ہوا تھا کہ ان آیات میں صیغہ خطاب سے روئے سخن کس کی طرف ہے' اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس کا تحقق کیسے صحیح ہے؟ لہٰذا واضح ہوا کہ جس اشکال نے جنم لیا تھا' اس کا یہاں کوئی محل نہیں اور نہ کوئی ایسی وجہ' بلکہ عربی دانوں کے ہاں نہ یہ وضعاً مقبول ہے نہ درایۃً۔

اور یہ بھی واضح ہوا کہ ان آیات کریمہ کی دلالت اپنے الفاظ اور منطوق عبارت کے صریح معنی کے ساتھ اسی امر پر ہے کہ مشرکوں کا فتنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دام میں نہ لے سکا اور نہ ہی آپ ﷺ نے کسی امر میں ان کی طرف میلان کیا' ان امور میں سے جن کی وہ تمنا رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کی نظر میں وسائل' کوششوں اور سرگرمیوں کی بناء پر یہ فتنہ متصور تھا جو ان کے اپنے ہی خیال' حساب اور تخمینہ کا بنایا ہوا ہوائی قلعہ تھا لیکن سیدنا رسول اللہ ﷺ ان کے فتنہ سے اس قدر محفوظ رہے کہ ان کی طرف میلان کرنے سے کوسوں بعید رہے اور اللہ تعالیٰ جل شانہ کے فضل وکرم سے ان کے مکرو فریب سے معصوم رہے۔

امام برہان الدین بقاعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ بھی ان ادلہ واضحہ میں سے ایک ہے جن میں نبی کریم ﷺ کی خصوصیات کا تذکرہ ہے یعنی آپ ﷺ کے جوہر کی شرافت' عنصر کی پاکیزگی' عقل سلیم کا صحیح رجحان اور بنیادی نفاست پسندی وغیرہ کیونکہ یہ آیت اس امر پر دال ہے کہ اگر حضور نبی کریم ﷺ کو اپنے حال پر بھی چھوڑ دیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے جو آپ ﷺ کی طبیعت وجبلت میں زائد اوصاف کاملہ یعنی ثابت قدمی وغیرہ پیدا فرمائے ہیں' ان کے علاوہ بھی آپ ﷺ کا ان کی طرف رجوع محال

ہے کیونکہ نبوت کا حال ان سب سے اعلیٰ اور برتر ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی نفیس توجیہ

حبر الامہ الاسلامیہ، ترجمان القرآن العظیم سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا موقف یہ ہے کہ یہ آیات کریمہ اس قبیل سے ہیں کہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، اور اسی کی تحذیر مقصود ہے، کیونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبلغ ہیں۔ علامہ قرطبی نے "الجامع لاحکام القرآن" میں آپ رضی اللہ عنہ کے اس فرمان کو ذکر کیا ہے:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم معصوما، ولكن هذا تعريف للامة لئلا يركن احد منهم الى المشركين فى شيئى من احكام الله تعالى وشرائعه۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم ہیں، اور یہ تعریف امت کی ہے تاکہ ان کا کوئی فرد بھی اللہ تعالیٰ کے احکام و شرائع میں سے کسی ایک میں بھی مشرکین کی طرف رجحان نہ کرے۔ (الجامع لاحکام القرآن: ۱۰/۳۰۰)

بے شک ان آیات میں خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ ﷺ کی امت ہے، کیونکہ یہ غیر صحیح اور ناممکن ہے کہ کفار آپ ﷺ کو فتنہ کا شکار کر سکیں، اس امر کے بارے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی طرف وحی فرمایا اور نہ ہی آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ پر افترا باندھنا ممکن ہے اور نہ ہی ان مشرکوں کی طرف رجوع کرنا اور نہ ہی ان میں سے کسی کی اطاعت کرنا اور یہ آیہ مقدسہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے:

لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ (الزمر: ۶۵)

کہ اے سننے والے اگر تو نے اللہ کا شریک کیا تو ضرور تیرا سب کیا دھرا اکارت جائے گا اور ضرور تو ہار میں رہے گا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا محال ہے' لہٰذا آیت تحذیر امت کے قبل سے ہے کہ کہیں کسی سے اپنے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے حصول اور آداب کی مخالفت واقع نہ ہو جائے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے کسی حکم سے روگردانی ہو۔

سبحان اللہ! یہ حبر الامہ الاسلامیہ' ترجمان القرآن العظیم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی شاندار توجیہ ہے' جس سے طبیعت خوش ہوتی ہے' دل مطمئن ہوتا ہے اور اعضاء کو سکون ملتا ہے کہ اس آیہ کریمہ میں خطاب سے مراد آپ ﷺ کی امت ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی دین میں فقاہت ہے جو انہیں رسول اللہ ﷺ کی دعا کی برکت سے حاصل ہوئی' جو ان کے بارے میں حضور ﷺ نے بایں الفاظ فرمائی:

اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِيْلَ۔ — اے اللہ انہیں دین کی سمجھ اور تاویل کا علم عطا فرما۔

ہماری مذکورہ بحث سے واضح ہو چکا ہے کہ یہ آیات کریمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کفار کے موقف کے بیان میں وارد ہیں' اور قرآن عظیم کے بارے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول ﷺ پر نازل فرمایا' تو ان آیات سے ان کا کفر اور اشراک باللہ باطل' اور ان کے ذاتی عناد' مکر و فریب' اندرون خانہ خبیث پالیسیوں اور بیمار دلوں کے فساد کا انکشاف کیا گیا اور امت کو امور دین میں کفار کی طرف میلان کرنے سے خبردار کیا گیا۔

اور یہ آیات کریمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت قدمی اور اطمینان قلبی کی زیادتی کا باعث ہیں' کہ جب آپ ﷺ کفار و فجار کے مقابلے میں ہوں اور مشرکوں کے تشدد اور گھیراؤ میں ہوں' تو اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم اور عنایت عظیمہ کو یاد فرمائیں' تاکہ اس سے دل کو تقویت ملے اور کمربستہ رہیں' نیز مومنوں کے دل مطمئن

رہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ثابت ہے اور وہی دفاع کرتا ہے۔

اور البتہ دشمنوں کو معلوم ہو جائے کہ انہیں آپ ﷺ پر کوئی چارہ نہیں اور نہ ہی انہیں آپ ﷺ کو دعوت حق، تبلیغ رسالت اور اقامت حجت سے روکنے کی طاقت ہے۔

اور اس میں حضور نبی کریم ﷺ کے، اپنے پروردگار کی بارگاہ میں ارفع و اعلیٰ مرتبہ کا اظہار ہے اور جمیع لوگوں کی زندگی میں آپ ﷺ کی عظمت کا بیان ہے۔

دونی عمر اور دوچند موت کا مزہ

رہا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان، جو ان آیات میں مذکور ہے:

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا۔	تو ہم تمہیں دونی عمر اور دو چند موت کا مزہ دیتے------(الایہ)

تو یہ آیہ کریمہ اپنے سے ماقبل آیت میں مذکورہ فعل کی جزا کے بیان میں وارد ہوئی، اور وہ غیر قرآن کا افتراء ہے، جس کا اس آیت میں تذکرہ ہے:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ۔	اور وہ تو قریب تھا کہ تمہیں کچھ لغزش دیتے، ہماری وحی سے جو ہم نے تم کو بھیجی کہ تم ہماری طرف سے کچھ اور نسبت کر دو۔

جبکہ رسول اللہ ﷺ ایسا کام نہیں کر سکتے اور نہ اس کا وہم ہو سکتا ہے بلکہ آپ ﷺ کے قلب انور پر کبھی کسی ایسے وسوسے نے جنم ہی نہیں لیا، کیونکہ آپ ﷺ ایسے تمام امور سے اللہ تعالیٰ کی عصمت و حفاظت کے ساتھ معصوم ہیں اور اپنے پروردگار کے پیغامات کی تبلیغ کے مکلف ہیں، ارشاد خداوندی ہے:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔(انعام: ۱۲۵)

اللہ خوب جانتا ہے جہاں اپنی رسالت رکھے۔

لہٰذا یہ آیہ مقدسہ اسی معنی پر مبنی ہو گی جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ "یہ آپ ﷺ کی امت کی تعریف ہے تاکہ ان میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے احکام و شرائع میں سے کسی ایک میں بھی مشرکین کی طرف میلان نہ رکھے۔"

یہ جمیع مومنین کے لیے سخت وعید اور تحذیر ہے' چاہے حکام ہوں یا محکوم۔ ہر زمانے اور ہر جگہ میں مشرکین کی طرف میلان سے سخت ممانعت ہے' بصورت دیگر شدید وعید کا مژدہ۔ کیونکہ کفار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں' اس لیے مومنوں کو تعطیل و تاخیر کے کسی امر میں بھی ان کی طرف جھکنے سے منع فرمادیا' تاکہ محض احکام خداوندی کا نفاذ ہو۔

جب سیدنا رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ متقی' اللہ سے ڈرنے والے اور اسے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں تو لامحالہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا خوف بھی اسی قدر زیادہ ہو گا۔ بزار نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر یوں التجا اور دعا کیا کرتے:

اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَّلَا تَنْزِعْ مِنِّيْ صَالِحَ مَا اَعْطَيْتَنِيْ۔

اے اللہ! مجھے ایک لحہ بھی میرے نفس کے سپرد نہ کر' اور نہ ہی مجھ سے وہ صلاحیت واپس لے جو تو نے مجھے عطا کی ہے۔

لہٰذا یہ آیہ کریمہ بندوں کو ان کے اعمال پر جزا دینے میں اللہ تعالیٰ کے طریقے کو بیان کرتی ہے' کیونکہ ہر بندہ اس قدر جزا دیا جائے گا جس قدر اس کی طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں اور فضیلتیں پیدا کی ہیں' اور جس قدر اسے عزت و کرامت بخشی اور کسی بشر کو اتنی خوبیوں سے نہیں نوازا گیا' جتنی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی طبیعت

ں پیدا فرمائی ہیں‘ یعنی آپ ﷺ کی رسالت‘ حسن ادب‘ خلق عظیم‘ خشیت الٰہی‘ قویٰ‘ رحمت عامہ‘ جود و سخاوت‘ قوت صبر اور عظیم شجاعت وغیرہ‘ یہ تمام حضور ﷺ کے خاصہ و عامہ امور ہیں۔

اس آیہ کریمہ میں عذاب کی سخت اور رعب دار تہدید و وعید وارد ہے جو آیہ کریمہ میں مذکور امر یعنی میلان سے انتہائی تحذیر ہے اور امت مسلمہ کے ہر ایک فرد کو شامل ہے۔

تو اس آیہ مقدسہ میں نبی کریم ﷺ کو خطاب کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبلغ ہیں‘ اور دوسری وجہ تحذیر کی زیادتی ہے‘ اور اس میں اس شخص کے لیے سخت وعید کا بیان ہے جو اس معاملہ میں کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔ اگر حضور نبی کریم ﷺ کی اللہ تعالیٰ کے ہاں عظیم قدر و منزلت اور عظمت کے باوجود ان کا یہ فعل فرض کیا جائے‘ تو ان کا یہ فعل جدلاً ہو گا کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ایسا کبھی نہیں کیا‘ تو ان کو بھی یہ امر پہنچے گا جس کی آیہ کریمہ میں وعید ہے گویا کہ اس کا مقصد امت کے لیے سخت وعید اور تحذیر ہے۔

اور ممکن ہے کہ یہ "ایاک اعنی‘ واسمعی یا جارہ" کے قبیل سے ہو‘ ورنہ سیدنا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایسے تمام افعال کو کرنے سے معصوم اور محفوظ ہیں۔ امام قرطبی بھی اپنی تفسیر میں اس آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ "یہ انتہائی وعید ہے کیونکہ درجہ جتنا بلند ہو‘ مخالفت کے وقت عذاب بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔" فرمان باری تعالیٰ ہے:

يَانِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضَاعَفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ۔(الاحزاب: ۳۰)	اے نبی کی بیبیو! جو تم میں صریح حیا کے خلاف کوئی جرات کرے‘ اس پر اوروں سے دونا عذاب ہو گا۔

امام زرقانی "شرح المواہب اللدنیہ" میں اس آیت پر تعلیقاً رقمطراز ہیں:
"نیکو کار کا گناہ دوسروں سے بڑا ہوتا ہے' کیونکہ اس کی شرافت و کرامت کا یہ حق ہے کہ وہ ایسے امر کے قریب نہ جائے جو قابل ملامت ہو' بلکہ اپنے آپ کو بے فائدہ امور سے بھی بچائے۔ اگرچہ وہ بہت چھوٹے ہوں۔"

علامہ ابن قیم جوزیہ "مدارج السالکین" میں لکھتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے قلب انور کا ذرہ بھر بھی دشمنوں کی طرف جھکنا پسند نہ کیا اور آپ ﷺ کو اس سے کامل پناہ دی۔"

میرے نزدیک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول زیادہ نفیس اور پسندیدہ ہے جو انہوں نے ان آیات کریمہ میں خطاب سے مراد کے بارے میں کہا ہے' کیونکہ وہ ان اوہام کو عصمت کی کمان سے باہر پھینک دیتے ہیں' جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل کو مختص فرمایا تو لامحالہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا اس میں حظ وافر اور کامل حصہ ہے۔

اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ جل شانہ نے جمیع اقوال و افعال اور احوال نیز تمام تصرفات میں مومنوں کا قائد بنایا ہے' اور ان تمام امور میں آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کو مومنوں کے لیے بہترین نمونہ بنایا' علاوہ ان امور کے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص ہیں' پروردگار عالم کا ارشاد گرامی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۔(الاحزاب: ۲۱)	بے شک تمہیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے اس کے لیے کہ اللہ اور پچھلے دن کی امید رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرے۔

اور امت مسلمہ کو یہ حکم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول' فعل

اور تقریر کو لازم پکڑ لے اور جس سے آپ ﷺ منع فرمائیں' باز رہے' ارشاد باری تعالیٰ جل جلالہ ہے:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ	اور جو کچھ تمہیں رسول عطا فرمائیں وہ
وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا	لو اور جس سے منع فرمائیں' باز رہو اور اللہ
اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔	سے ڈرو' بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے۔
(الحشر: ۷)	

یہ آیات بینات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشرکوں کی طرف میلان کے قطعاً محال ہونے پر دال ہیں' اور یہ جھکاؤ کسی ایک ادنیٰ سے امر میں بھی نہیں ہو سکتا' کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حیات مبارکہ میں طرز عمل' لوگوں کی حیات و آخرت میں عظیم مرتبہ کا حامل ہے' اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو لوگوں کے لیے بھلائی اور نجات کے راستے کا ہادی اور قائد بنایا ہے اور یہ عقلاً بھی تسلیم نہیں کہ آپ ﷺ ضلالت و گمراہی کے امور میں ان مشرکوں کے مشارک یا تابع ہو جائیں۔ آپ ﷺ کی تو وہ ذات گرامی ہے جو ہر ضرر رساں امر سے امت کی تحذیر میں مبالغہ فرماتی ہے' جس کا باعث امت پر وہ کمال شفقت و رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے قلب اطہر میں ودیعت فرمائی' اور ان کی نجات اور سلامتی پر شدید حرص ہے جیسا کہ حدیث صحیح میں ثابت ہے جس پر شیخین (بخاری و مسلم) کا اتفاق ہے' اور یہاں الفاظ صحیح مسلم کے پیش نظر ہیں' کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَنَا اٰخُذُ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ'	میں تمہیں کمر سے پکڑ کر آگ سے کھینچ
هَلُمَّ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ'	رہا ہوں (اور کہہ رہا ہوں) آگ سے بچو'
فَتَغْلِبُوْنِيْ تَقْحَمُوْنَ فِيْهَا۔	آگ سے بچو اور تم ہو کہ زبردستی اس میں
(متفق علیہ)	گرتے ہی جا رہے ہو۔

تحذیر خدا جل جلالہ برائے مصطفیٰ ﷺ

یہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، لفظ تحذیر پر مشتمل ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقوں سے متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔ (المنافقون: ۴)

وہ دشمن ہیں تو ان سے بچتے رہو، اللہ انہیں مارے کہاں اوندھے جاتے ہیں۔

اور یہودیوں سے متنبہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں فرمایا:

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ۔

اور یہ کہ اے مسلمان اللہ کے اتارے پر حکم کر اور ان کی خواہشوں پر نہ چل اور ان سے بچتا رہ کہ کہیں تمہیں لغزش نہ دے دیں کسی حکم میں جو تیری طرف اترا۔

(المائدہ: ۴۹)

اور اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مشرکوں سے متنبہ فرمایا کہ

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (یونس: ۱۰۵)

اور یہ کہ اپنا منہ دین کے لیے سیدھا رکھ۔ سب سے الگ ہو کر اور ہرگز شرک والوں میں نہ ہونا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۔

تو کافروں کا کہنا نہ مان اور اس قرآن سے ان پر جہاد کر بڑا جہاد۔

(الفرقان: ۵۲)

یہاں نہی سے مراد تحذیر ہے' جیساکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان عالیشان ہے:

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا-(الدھر: ۲۴)

تو اپنے رب کے حکم پر صابر رہو اور ان میں کسی گنہگار یا ناشکرے کی بات نہ سنو۔

اور اسی طرح ہی درج ذیل آیہ مقدسہ میں اللہ تعالیٰ نے کافروں اور منافقوں کی اطاعت سے نہی کے اسلوب پر تحذیر فرمائی' اور حکماً فرمایا کہ ان کی ایذا کی قطعاً پرواہ نہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو اور دعوت حق اور تبلیغ رسالت میں ڈٹے رہو' نیز ان کے قول و فعل کی ایذا سے مکمل اعراض کر دیہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی ان پر حجت قائم ہو جائے' وہی ذات ان کے شر سے آپ ﷺ کو کافی ہوگی اور ان کے مقابل آپ ﷺ کی نصرت کو کافی ہوگی' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَدَعْ اَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا- (الاحزاب: ۴۸)

اور کافروں اور منافقوں کی خوشی نہ کرو اور ان کی ایذا پر درگزر فرماؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور اللہ بس ہے کار ساز۔

بعض لوگوں نے اس تحذیر سے یہ سمجھا ہے کہ یہ عتاب کی صورت میں وارد ہے' کیونکہ عموماً تحذیر وقوع مصیبت کے بعد محذر اور ناصح کی طرف سے ہوتی ہے' لیکن سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی نسبت یہ محال ہے' اور کیوں نہ ہو؟ جبکہ آپ ﷺ وہ مربی اعظم ہیں جو لوگوں کو ادب کی تعلیم دیتے ہیں' بھلائی کا حکم دیتے ہیں' برائی سے منع فرماتے ہیں' نیک کاموں پر برانگیختہ کرتے ہیں' برے کاموں سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ان کے جمیع دینی' دنیاوی' تعبدی اور عادی امور و احوال میں ان کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

عین ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حق میں یہ تحذیر اس امر پر محمول ہو کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و تربیت اور توجیہ کے قبیل سے ہے' نیز آپ ﷺ کے

لیے اللہ تعالیٰ رعایت' عنایت اور غیرت پر تنبیہ کے باب سے ہے۔

اور اللہ جل شانہ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مشرکوں یہودیوں اور منافقوں سے متنبہ فرمایا ہے اور آیات سابقہ انہی میں سے ہیں۔

اور یہ سب کچھ آپ ﷺ کی تعلیم و تربیت اور تنبیہ کے باب سے ہے' نیز آپ ﷺ کے دشمنوں کا بیان اور ان کی دسیسہ کاریوں کا کشف ہے' اور ان کے قلبی فساد اور بغض و حسد پر آپ ﷺ کو مطلع فرمانا ہے نیز آپ ﷺ کی دعوت حق پر تنبیہ کرنا ہے تاکہ آپ ﷺ کی توجہ اور محبت ان سے ہٹ جائے' اور اس لیے بھی کہ آپ ﷺ کا قلب و نفس ان کی ہدایت کی محبت سے متعلق نہ ہو' کیونکہ وہ فی الواقع اس تعلق کے اہل نہیں ہیں' اس لیے پروردگار عالم جل جلالہ نے آپ ﷺ کو ان کی نسبت واضح فرمایا:

إِنْ تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ۔ (النحل: ۳۷)	اگر تم ان کی ہدایت کی حرص کرو تو بے شک اللہ ہدایت نہیں دیتا جسے گمراہ کرے۔

اور

وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ۔ (یوسف: ۱۰۳'۱۰۴)	اور اکثر آدمی تم کتنا ہی چاہو ایمان نہیں لائیں گے اور تم اس پر ان سے کچھ اجرت نہیں مانگتے' یہ تو نہیں مگر سارے جہان کو نصیحت۔

اور

وَإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ	اور اگر وہ تمہیں فریب دینا چاہیں تو بے شک اللہ تمہیں کافی ہے' وہی ہے جس نے

بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ -(الانفال: ۶۲) تمہیں زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا۔

باذن خدا جل جلالہ مالک ہیں محمد مصطفےٰ ﷺ

امام مسلم نے "کتاب الایمان" میں ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح حدیث روایت کی کہ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب یہ آیہ مقدسہ نازل ہوئی:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ - (الشعراء: ۲۱۴) اور اے محبوب اپنے قریب تر رشتہ داروں کو ڈراؤ۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا:

يَافَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ، يَاصَفِيَّةُ بِنْتُ عَبْدِالْمُطَّلِبِ، يَابَنِيْ عَبْدِالْمُطَّلِبِ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا سَلُوْنِيْ مِنْ مَّالِيْ مَاشِئْتُمْ -(رواہ مسلم)

اے فاطمہ بنت محمد، اے صفیہ بنت عبدالمطلب، اے بنو عبدالمطلب! میں اللہ سے کسی چیز کا تمہارے لیے مالک نہیں ہوں، مجھ سے میرے مال سے جو چاہتے ہو مانگ لو۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَامَعْشَرَ قُرَيْشٍ اشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ لَآ اَغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا يَابَنِيْ عَبْدِالْمُطَّلِبِ لَآ اَغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا، يَاعَبَّاسَ بْنَ عَبْدِالْمُطَّلِبِ...

اے گروہ قریش! اپنی جانوں کو اللہ سے خرید لو، میں اللہ تعالیٰ کی کوئی چیز تم سے باز نہیں رکھ سکتا، اے بنو عبدالمطلب! میں اللہ تعالیٰ کی کوئی چیز تم سے نہیں ہٹا سکتا، اے عباس بن عبدالمطلب... (تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۳۶۲، رواۃ مسلم فی کتاب الایمان)

اس طرح کی دیگر احادیث بھی جو اس باب میں وارد ہیں، صریح اور واضح دلالت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے لیے کسی چیز کے مالک نہیں، یا اللہ کے

سوا کوئی چیز ان سے دور نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے خود مقرر فرمایا۔ یہ دین اسلام کے ان حقائق میں سے ایک حقیقت ثابتہ اور بنیادی قواعد میں سے ایک مسلم قاعدہ ہے' جس پر ایمان لانا اور دل سے تصدیق کرنا ضروری ہے' اور بلاشک وشبہ اس کا کامل اعتقاد رکھنا نہایت ضروری اور اہم ہے اور نہ ہی کوئی موحد مومن اس میں شک کر سکتا ہے۔

لیکن بعض جہلاء نے اسے غیر محل میں استعمال اور غیر محمل پر محمول کرتے ہوئے اس سے استدلال یہ کیا کہ نبی کریم ﷺ جمیع بنی نوع بشر کی طرح ایک بشر ہیں' برابر برابر ہیں' نہ ضرر کے مالک نہ نفع کے' اور نہ ہی کسی کو نفع دے سکتے ہیں' بلکہ یوں کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو نفع نہیں دے سکتے یعنی نہ خیر حاصل کر سکتے ہیں نہ شر دفع کر سکتے ہیں۔ بالخصوص بعد از وصال تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ آپ ﷺ دوسرے زیر زمین مردوں کی طرح ایک میت ہیں (جیسا کہ "انک میت وانھم میتون" کی بحث میں گزر گیا)

مگر یہ مغرور اس باب میں وارد ہونے والی ان دوسری نصوص کو بھول گیا یا بھلا دیا گیا بلکہ اندھا کر دیا گیا' جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نفع دینے پر صریح اور واضح دلالت کرتی ہیں' یعنی نیکیوں اور بھلائیوں کا حصول' شرور و آفات کا دفع کرنا اور ارض وسما والے زندوں اور مردوں کے لیے منافع اور نیکیوں کا پہنچانا۔

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان' اذن اور قدرت تمکین سے ہے جو اس کے پیارے نبی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جاری و ساری ہے' تاکہ آپ ﷺ اس گراں قدر اور بلند مقام پر فائز رہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ جس طرح چاہے' جسے چاہے اور جس وقت چاہے' اپنا فضل عطا فرما دیتا ہے۔

اس حقیقت کے بیان میں وارد ہونے والی نصوص کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ جو علم کے جھوٹے دعویدار عام لوگوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کرام نفع و ضرر دیتے ہیں' یہ ان کی جہالت اور محض تعصب ہے اور مومن بھائیوں میں اختلاف ڈالنے کا قصد ہے۔ اس کو وہ اپنے حصول مقصد کا وسیلہ بناتے ہیں یعنی مسلمان بھائیوں کی تکفیر کرنا۔ ورنہ کوئی جاہل سے جاہل مسلمان بھی یہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ کوئی نبی' ولی اور زندہ یا مردہ نفع و ضرر کا خود مالک ہے' ہاں عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے ہاتھ پر چاہتا ہے نفع و ضرر جاری فرما دیتا ہے' چاہے نبی ہو یا ولی' بادشاہ ہو یا امیر' صالح ہو یا بدکار۔ جبکہ ہر تاثیر میں موثر حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یہی اہل السنہ والجماعہ کا عقیدہ ہے' جو سلف صالحین رضی اللہ عنھم اور ان کے پیروکاروں سے لے کر آج تک ہے اور قیامت تک رہے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ بھی خبر دی ہے کہ انبیاء کے ابدال سے ہماری مدد کی جاتی ہے' ہمیں ان کے ذریعے رزق دیا جاتا ہے اور انہی کے سبب سے ہم سے بلائیں دور کی جاتی ہیں' لہٰذا وہ دین و دنیا کے امور میں ہمارا وسیلہ ہیں' اللہ تعالیٰ انہی کے سبب امت کو برائی سے پھیر دیتا ہے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں' دیکھیں اللہ تعالیٰ فرشتوں کے حق میں فرماتا ہے:

فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا۔ (النزعت: ۵) پھر کام کی تدبیر کریں۔

اور فرماتا ہے:

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا۔ (الذریت: ۴) پھر حکم سے بانٹنے والیاں۔

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ امر کون کی تدبیر اور ارزاق کی تقسیم کرتے ہیں' باوجودیکہ مدبر اور مقسم اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے مذکورہ افعال کی قسم اٹھائی' حالانکہ یہ اس کے بندے ہیں اور اسی کا ہی ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔

معلوم ہوا کہ حقیقی ناصر' مغیث اور دافع البلاء صرف اللہ وحدہ لا شریک کی ہی

ذات ہے' اور نصرو اغاثہ' دفع شر اور جلب خیر کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء اور اولیاء کی طرف کرنا نسبت مجازی ہے' بایں معنی کہ وہ اس میں واسطہ ہیں اور فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ کی ہی ذات ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ جُندٌ لَّكُمْ يَنصُرُكُم مِّن دُونِ الرَّحْمَٰنِ ۚ إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ ۔ أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ۔ (الملک: ۲۰-۲۱)	یا وہ کون سا تمہارا لشکر ہے کہ رحمٰن کے مقابل تمہاری مدد کرے کافر نہیں مگر دھوکے میں۔ یا کون سا ایسا ہے جو تمہیں روزی دے اگر وہ اپنی روک لے بلکہ وہ سرکش اور نفرت میں ڈھیٹ بنے ہوئے ہیں۔

اور جیسے اللہ تعالیٰ نے دونوں نسبتوں کو ایک آیت میں جمع کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۔ (الانفال: ۱۷)	اور اے محبوب وہ خاک جو تم نے پھینکی تم نے نہ پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی۔

امام نووی اور حدیث سابق

اگر منکر نصوص وارده میں غور و فکر سے کام لے' تو معلوم ہو گا کہ وہ ان حقائق سے خارج نہیں' حدیث سابق میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یوں فرمانا کہ "میں اللہ سے کسی چیز کا تمہارے لیے مالک نہیں' اور نہ ہی میں تم سے کچھ دور کر سکتا ہوں۔" تو اس کا معنی امام نووی (شرح النووی: ۳ / ۸۰) میں بیان فرماتے ہیں کہ "میری قرابت داری پر بھروسہ نہ رکھنا' بے شک میں اس مکروہ چیز کو دور کرنے پر قادر نہیں جس کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں پہنچانے کا ارادہ فرمایا ہے۔" اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ "میں تم سے کسی چیز کو دور نہیں کر سکتا۔" یعنی میں تم سے وہ مکروہ چیز یا برائی ہٹا نہیں سکتا جس کے ہٹانے کا اللہ نے ارادہ نہیں فرمایا۔ نہ میں تمہیں نفع دے سکتا ہوں جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہیں ضرر دینے کا ہے' اور نہ ہی میں تمہیں

ضرر دے سکتا ہوں جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہیں نفع دینے کا ہے۔ کل امر اللہ کا ہی ہے' لیکن میں اللہ تعالیٰ کے اذن و ارادہ سے تمہیں نفع دینے پر قادر ہوں اور اس کا مالک ہوں۔ لہذا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی چیز کے نہ مالک ہیں اور نہ ہی کسی ایسی چیز سے بے پرواہ کر سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور قضاو قدر کے متضاد ہو' لیکن اللہ تعالیٰ کے اذن اور فضل و کرم سے ان سب امور کے مالک ہیں اور اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی مراد میں سے ہر وہ کام جس کا ارادہ فرمائیں' کر سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ کوئی بھی مسلمان جو قرآن پڑھتا اور سمجھتا ہے' وہ اس حقیقت مسلمہ کا انکار نہیں کر سکتا' کیونکہ قرآن حکیم اس مسئلہ کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرما رہا ہے' چنانچہ فرمان خداوندی ہے:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۔ (یونس: ۴۹)	تم فرماؤ میں اپنی جان کے برے بھلے کا (ذاتی) اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے۔ ہر گروہ کا ایک وعدہ ہے جب ان کا وعدہ آئے گا تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹیں نہ آگے بڑھیں۔

اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان عالیشان کے قبیل سے ہے' جو حضرت نوح علیہ السلام سے حکایت ہے:

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ۔ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِىْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ	بولے اے نوح تم ہم سے جھگڑے اور بہت ہی جھگڑے تو لے آؤ جس کا ہمیں وعدہ دے رہے ہو اگر تم سچے ہو۔ فرمایا وہ تو اللہ تم پر لائے گا اگر چاہے اور تم تھکا نہ سکو گے اور تمہیں میری نصیحت نفع نہ دے گی اگر میں تمہارا بھلا چاہوں جبکہ اللہ تمہاری

اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔(هود: ۳۲، ۳۳، ۳۴) گمراہی چاہے۔ وہ تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف پھرو گے۔

لہٰذا ایک مسلمان پر ضروری ہے کہ جب بھی اس مقام میں کلام کرنے کا ارادہ کرے تو ان حقائق کا لحاظ رکھے اور مسئلہ کو اسی طریقے سے تعبیر کرے جس طریقے سے قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے تعبیر فرمایا یعنی نفی اور اثبات کو جمع فرمایا، پھر کہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے اذن کے سوا کسی کے مالک نہیں۔" اور "آپ ﷺ اللہ کے ارادے کے سوا کسی کو نفع و ضرر نہیں دیتے۔" نہ یہ کہ کلام و نفی تام کے ساتھ مطلق رکھے اور کہے کہ "وہ کسی کے مالک نہیں۔" اور "کچھ نفع نہیں دے سکتے۔" وغیرہ وغیرہ۔ جیسا کہ ایسے کلمات ہم کثیر ایسے حضرات سے سنتے رہتے ہیں، جو اس مسئلہ کو تعبیر کرتے ہوئے سیدنا رسول اللہ ﷺ کے ادب کا قطعاً کوئی خیال نہیں رکھتے، بلکہ سخت بے ادبی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ایسے ہی ان کی عادت مسئلہ بشریت میں بھی جاری ہے، جس کو ہم نے "قل انما انا بشر" کی بحث میں ذکر کیا ہے کہ وہ بشریت کا قول مطلق رکھتے ہیں، اور آپ ﷺ کی شان اقدس میں بشریت کے عوارض، امراض اور دیگر لوازمات کو برقرار رکھتے ہیں، اور اس مسئلہ میں دیگر ان نصوص وارده کو بالکل ہضم کر جاتے ہیں جن میں آپ ﷺ کے ان فضائل و خصائص، خصوصیات اور مناقب و محاسن کا ذکر ہے، جن سے آپ ﷺ کی خصوصی بشریت سب سے فائق اور ممتاز ہو جاتی ہے، حالانکہ اس مقام پر ان کا ذکر کرنا واجب ہے تاکہ ذہن میں تنقیص و تحقیر یا افراد بشر میں پوری برابری کا تصور جنم نہ لے۔ کہاں کیچڑ اور کہاں کہکشاں، کہاں زمین اور کہاں آسماں اور کہاں ظلمت اور کہاں نور تاباں۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الزمر: ۹)
کیا برابر ہیں جاننے والے اور نہ جاننے والے۔

مسئلہ تلاوت قرآن اور درود بر محمد مصطفیٰ (علیہ التحیہ والثناء)

بلاشبہ قرآن اللہ تعالیٰ جل شانہ کا کلام ہے اور سب سے افضل کلام ہے۔ اس کے اور صلوۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان مقارنت حق بات ہے، لیکن بعض لوگوں سے ہم اکثر سنتے ہیں کہ وہ اس سے باطل امر کا ارادہ رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں صراط مستقیم کی ہدایت دے اور ان کے باطن کو نبی کریم علیہ افضل الصلوۃ واتم التسلیم کی محبت سے منور فرمائے۔

ہم انہیں دیکھتے اور سنتے ہیں کہ یہ اس شخص پر بڑی شدت سے اعتراض کرتے ہیں جسے وہ امام اہل ارض و سما سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی آلہ وصحبہ پر درود و سلام کے نذرانے نچھاور کرنے میں مصروف پاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ تلاوت قرآن اور ذکر الٰہی نبی ﷺ پر درود و سلام پڑھنے میں مشغول ہونے سے افضل ہے۔ یہ سن کر ایک سادہ لوح انسان اس قوی دلیل و برہان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے حیرت و سکوت اور تعجب کی دنیا میں کھو جاتا ہے، کیونکہ اس دلیل کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی عقل مند کلمہ گو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس کی مخالفت کرنے کی مجال رکھتا ہے، بلکہ عوام المسلمین جو علم سے نابلد ہیں وہ بھی قرآن حکیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے درمیان فرق کو سمجھتے اور پہچانتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ امر اتنا ظاہر اور واضح ہے کہ جس میں قطعاً شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں، ہاں ایک بد باطن یا جاہل مرکب کا معاملہ اور ہے، جو قرآنی اور اسلامی حقائق سے کوسوں دور ہو۔ والعیاذ باللہ۔

میرا خیال ہے کہ اس معترض کی نیت بری اور ارادہ خبیث ہے، اور وہ یہ ہے

کہ اس نے محض اس محب صادق کو نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود سلام پڑھنے میں مشغول ہونے سے منع کرنے کا ارادہ کیا' اور اس پر اس حقیقت صادقہ سے استدلال کیا تاکہ اس کے ذریعے وہ اپنے فاسد مطلوب تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے' جو محض بغض و حسد کی پیداوار ہے۔ یہ اس کے بارے میرا گمان ہے' اگر اس کی نیت ایسی نہیں تو میں اللہ تعالیٰ سے سوء ظن کی مغفرت مانگتا ہوں حالانکہ اس منکر معترض کو معلوم نہیں کہ جن مقامات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کی نص وارد ہے وہاں بہرصورت درود شریف پڑھنا ہی افضل ہے اور کوئی کلام اس کے قائم مقام نہیں ہو گا' اور اس کے علاوہ دیگر مقامات پر تلاوت قرآن افضل ہے اور مناسب یہ ہے کہ تلاوت قرآن اور درود شریف دونوں میں کثرت کی جائے۔ حالانکہ کسی محروم کے سوا اس میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔

علامہ ابن حجر اور مسئلہ تلاوت و صلوۃ

علامہ ابن حجر ہیتمی شرح "العباب" میں فرماتے ہیں کہ "اس عام ذکر سے تلاوت قرآن افضل ہے جو کسی وقت یا محل سے مختص نہیں' اور وہ ذکر جو نص شرعی کے وارد ہونے سے کسی وقت یا محل سے خاص ہو' اگرچہ بظاہر اس کی سند ضعیف ہی ہو تو وہ افضل ہے' اس لیے کہ شارع نے اس پر نص فرمائی ہے۔"

اور علامہ حاشیہ "ایضاح المناسک" کے چھٹے باب میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول پر رقمطراز ہیں کہ مسئلہ ثالثہ' مستحب ہے کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی طرف متوجہ ہو تو راستے میں آپ ﷺ پر درود و سلام کی کثرت کرے' اور جب مدینہ منورہ کے مبارک درختوں' حرم مدینہ اور معروف مقامات پر نظر پڑے تو آپ ﷺ پر درود و سلام میں اور زیادتی کرے' اور اللہ تعالیٰ سے سوال کرے کہ وہ اسے حضور پرنور ﷺ کی زیارت سے نفع بخشے اور یہ عمل قبول فرمائے۔ علامہ فرماتے ہیں کہ امام نووی کا کہنا ہے "درود و سلام کی کثرت کی

جائے۔۔۔الخ" آیا یہاں درود و سلام میں اشتغال تلاوت قرآن سے افضل ہے یا اس کا عکس؟ اور ایسے ہی شب جمعہ اور اس کے دیگر مواقع کے بارے سوال پیدا ہوتا ہے' جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کی کثرت کا تقاضا ہے' یا یہ کہ دونوں امر برابر ہیں' جبکہ احتمال ہر ایک کا ہے تو شب جمعہ کے بارے ان کا کلام دیگر مخصوص مواقع کی طرف بھی مشیر ہے اور ظاہر ہے کہ شب جمعہ میں درود و سلام کی کثرت ہی افضل ہے' کیونکہ یہ ذکر اس مخصوص محل میں مطلوب ہے' اور وہ کہتے ہیں کہ تلاوت قرآن اس ذکر سے افضل ہے جو مختص نہ ہو' اور جو مختص ہو تو وہی افضل ہے۔ اور اس مسئلے کا تعلق بھی اسی قاعدہ سے ہے۔ (حاشیہ الایضاح لابن حجر الہیتمی : ۴۹۰)

امام غزالی اور مسئلہ قرات و درود

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمیع مخلوق کے لیے تلاوت قرآن افضل ہے' مگر وہ شخص جو بارگاہ خداوندی تک رسائی کے لیے سلوک کی منازل طے کر رہا ہو تو اس کی ذکر پر مداومت افضل ہے۔

اور "ذخیرۃ المعاد" میں فرماتے ہیں کہ بعض عارفین کا کہنا ہے کہ ذاکر کے اختلاف کے اعتبار سے حال بھی مختلف ہوتا ہے' تو جب وہ قرآن سے سچی محبت پائے تو وہ ہی افضل ہے اور اگر کسی اور ذکر سے زیادہ لگاؤ پائے تو وہ افضل ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہی راہ معتدل ہے' کیونکہ اس میں شک نہیں کہ جب نفس رعونت وغیرہ کی میل کچیل سے پاک اور اغیار اور شہوات کی گرد سے بالکل خالی ہو جائے اور اس کی بصیرت سے کثافتوں کا وہ پردہ اٹھ جائے' جو نور بصیرت کی حقائق تک رسائی کو مانع تھا' تو وہ اسرار و غیوب کی گہرائی تک کا ادراک کر لیتا ہے اور اس نفس کے لیے اللہ تعالیٰ کے اذن سے ان چیزوں کا انکشاف ہو جاتا ہے' ایسے پاکیزہ نفس والا شخص اب اس وقت کو پہنچ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے کیا طلب کرتا ہے؟ یعنی قرات قرآن' ذکر یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام۔ کیونکہ اس وقت وہ ان لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے جن کے

بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا	اور جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی
لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔(العنکبوت: ۶۹)	ضرور ہم انہیں اپنے راستے دکھادیں گے۔

لہٰذا چاہیے کہ وہ کھلے ہوئے دروازوں سے بارگاہ عالیہ کے قرب میں داخل ہو جائے، جونہی عنایت و بخشش کا مژدہ سنانے والا اپنے تمام امور کے ملاحظہ کے لیے ندا دے تو وہ اس وقت اسی میں مستغرق رہے جو اس وقت کا تقاضا ہے۔ اور اس کے حق میں بہتر یہی ہے کہ وہ عالی ہمت اور حضور قلب سے تلاوت قرآن پر متوجہ رہے، یہ قرآن جو اس ہستی پر دلالت کی جمیع اصناف کو جامع ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے نازل فرمایا، اور قرآن کے حقوق کی رعایت کرے، تلاوت کا حق ادا کرے اور اس حرم کی حاضری کی حفاظت کرے جس کے لیے اسے بلایا گیا۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا طالبین کے لیے کامیاب ذریعہ ہے، اور سابقین کے مقامات تک پہنچانے میں سب اسباب سے زیادہ نافع ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ جب بھی کمال حضور ممکن ہو تو اس مبارک ہستی صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ کرتے ہوئے درود و سلام میں خوب اشتغال کے ساتھ برکت حاصل کی جائے اور اس بارگاہ عالیہ کا وہ حقیقی ادب بجالایا جائے جو سلطان حقیقی کا تقاضا ہے۔

اور جو انہوں نے ذکر کیا کہ وقت سے مخصوص اذکار میں اشتغال اس وقت تلاوت میں اشتغال سے بہتر ہے۔ یہ قرآن کریم کی جمیع اذکار پر ذاتی فضیلت کے منافی نہیں، جیسا کہ سنت مطہرہ کی کتب میں اپنے محل پر وارد احادیث ثابتہ سے ظاہر ہے کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا ثواب، تلاوت قرآن میں اشتغال کے ثواب سے زیادہ ہے، جیسا کہ ائمہ مسلمین کا بیان ہے۔ اس کی حقیقت اور راز یہ ہے کہ تمام اذکار اللہ تعالیٰ نے ان امراض کے علاج کے لیے انعام فرمائے ہیں، جو مخلوق کے باطنوں میں پوشیدہ ہیں اور یہ امراض دل کی تختیوں پر غیروں کے اثرات

وارد ہونے سے جنم لیتے ہیں۔ اور ایک طبیب دوا کے موقع' دوا کی اثر اندازی اور بیماری کو بالکلیہ مناسب طریقے سے ختم کرنے کو جانتا ہے کیونکہ وہ اس بیماری کے اسباب سے واقف ہوتا ہے تو لامحالہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طبیب اعظم اور حکیم اکرم ہیں' اس لیے آپ ﷺ کی اتباع کا درجہ بہت اعلیٰ وارفع ہے' نہ کہ وہ جو کوتاہ نظروں کا خیال ہے کیونکہ ان کے یہ جمیع ظنون و خیالات غیر معصومہ ہیں تو جس ذات کو اللہ تعالیٰ نے تمام احوال اور علوم و ظنون میں معصوم رکھا اور خود تمام امور میں اس پیارے صلی اللہ علیہ وسلم کا متولی بنا' اس مبارک ذات صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان بعون بعید ہے جو خطا اور لغزش کا ہدف ہیں اور جن کے لیے اللہ جل شانہ نے طرح طرح کے متشابہات رکھے تاکہ ان کی آزمائش اور امتحان ہو۔ تو جو بھی اس پر ایمان لایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معرفت صادقہ سے سرشار ہونے والے جمیع عارفین کے امام ہیں۔ وہ معرفت صادقہ جس کے ذریعے ہر دور میں ہر انسان کی اصلاح کی جاتی ہے اور جس کے ذریعے اس کا وقت اور حال اس سے تقاضا کرتا ہے نیز جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی فراوانی ہوتی ہے اور وہ نعمتیں پوری ہوتی ہیں جو اس پر ظاہری و باطنی طور پر اور دنیا و آخرت میں ہمیشہ رہتی ہیں' اس شخص کے مفہوم' علوم و ظنون اور کشوفات سے یہی تصریح ہوتی ہے اور وہ اعتراف کرتا ہے کہ علوم و اعمال کا رستہ ہو یا اذکار کا' دعوت کا سلسلہ ہو یا فہم دین کا' سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے روگرداں ہونے والا بہرحال محروم' بدبخت' گمراہ اور گمراہ کن ہوتا ہے نیز اتباع کا تارک اور بدعت سے لگاؤ رکھنے والا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ ہمیں اپنے پیارے رسول مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی توفیق بخشے اور ہمیں ان لوگوں میں رکھے جنھوں نے آپ ﷺ کی کامل پیروی کو حرز جاں بنایا۔ (ذخیرۃ المعاد)

اسی حیثیت کے پیش نظر بعض ائمہ نے ذکر کیا کہ ایک فاسق آدمی کے لیے

تلاوت قرآن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا افضل ہے' کیونکہ یہ حصول رضائے الٰہی میں اس کی سفارش کرتا ہے اور اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور اسے اخروی سعادت مندوں کی جماعت میں داخل کر دیتا ہے اور قرآن حکیم اگرچہ اس سے افضل ہے' لیکن یہ قرب خداوندی کا محل ہے اور بارگاہ خداوندی کی حضوری داخل ہونے والے کو سرے سے ہی فنا کر دیتی ہے کہ کہیں وہ سوءادب کی جسارت نہ کر بیٹھے' اور جو وہاں سوءادب کی جسارت کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی لعنت' دوری اور غضب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ قرآن کے حاملین اہل اللہ ہیں' اور چیونٹی کے حمل سے بھی چھوٹی چیز پر ان کا اتنا مواخذہ ہوتا ہے جو دوسروں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ محض فضل و کرم کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی عنایت انہیں شامل ہو جائے اور اس سے بچا لے۔

واضح ہو کہ فاسق کے حق میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا' تلاوت قرآن سے زیادہ نفع بخش ہے۔ نہ یہ بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا قرآن سے افضل ہے بلکہ قطعاً قرآن ہی افضل اور اعظم ہے' اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ فاسق قرات قرآن کا اہل نہیں۔ اس لیے کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ وہ قرآن پڑھے اور قرآن اسے لعنت کرے' جیسا کہ حدیث میں وارد ہے:

رُبَّ قَارِئٍ لِلْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ يَلْعَنُهٗ۔ بہت سے قرآن کے قاری ایسے ہیں کہ قرآن انہیں لعنت کرتا ہے۔

اور بالخصوص یہ بات ہے کہ قرآن نبوت کا مرتبہ ہے' جو کامل طہارت' صفائی قلب' آداب حسنہ کی بجا آوری اور اخلاق روحانیہ کا پیکر ہونے کا تقاضا کرتی ہے' اسی لیے عام لوگوں کو تلاوت قرآن مضر ہے کیونکہ وہ ان لوازمات سے بہت دور ہوتے ہیں۔

اور جہاں تک نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کا تعلق

ہے تو اس میں درود شریف کا تلفظ ہی ہے' اور پڑھنے والے کی اتنی حالت کافی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم کی غماز ہو' مثلاً طہارت حسیہ' یعنی کپڑے' جسم اور مکان پاک ہو اور اس کا پڑھنا شرع میں موجود الفاظ کے ساتھ بغیر لحن کے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جل شانہ نے پڑھنے والے کو یہ ضمانت دی ہے کہ وہ آپ ﷺ پر ایک مرتبہ درود پڑھے تو اسے اجر کبیر اور فضل عظیم حاصل ہو گا' جس کی تفصیل حدیث شریف میں موجود ہے۔

یاد رہے کہ یہ قائل (مولف) کا اپنا اجتہاد ہے' جتنا ان پر نصوص شرعیہ کے حوالے سے واضح ہوا اور جو کچھ اس قرات و درود کی باہمی فضیلت کے مسئلہ کی تحقیق میں سمجھا' اور جس قدر ان کی مقارنت سمجھ میں آئی' ورنہ جیسے ہم نے پہلے ذکر کیا کہ قرآن ہی افضل اور اعظم ہے' اور بڑا ذیشان اور معزز ہے۔ اس میں نہ شک کی گنجائش ہے نہ خلاف کی مجال اور اس میں کوئی بھی مخالف نہیں ہو سکتا' مگر ملحد' زندیق یا جاہل کا معاملہ اور ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کریم اور کلام عظیم پر جرات کرنے والا ہو۔

لطیفہ

حضرت شہاب رملی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ آیا استغفار میں مشغول رہنا افضل ہے یا نبی کریم ﷺ پر درود و سلام پڑھنے میں مشغول رہنا' یا کیا ان دونوں میں فرق ہے کہ جس پر طاعات یعنی فرمانبرداریوں کا غلبہ ہو اس کے لیے درود افضل ہے اور جس پر گناہ غالب ہوں اس کے لیے استغفار افضل ہے؟

تو آپ رحمتہ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ حضور نبی کریم ﷺ پر درود و سلام پڑھنے میں مشغول رہنا' استغفار میں اشتغال سے مطلقاً افضل ہے۔

(سعادۃ الدارین فی الصلوۃ علی سید الکونین: ۳۹-۴۱)

تیسرا باب

فقہ

(کتاب و سنت کی روشنی میں)

اعمال حسب استطاعت کرو

اس سلسلے میں سب سے پہلے درج ذیل احادیث کا مفہوم سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

(۱) امام مسلم نے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور یہ حدیث محدثین کے ہاں حولاء اسدیہ کی حدیث کے نام سے معروف ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے لفظ ہیں کہ حولاء بنت تویت بن حبیب بن اسد بن عبد العزی' ان کے پاس آئی اور ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ تو میں نے عرض کیا یہ حولاء بنت تویت ہے جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ یہ رات بھر نہیں سوتی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَاتَنَامُ اللَّيْلَ؟ خُذُوْا مِنَ الْعَمَلِ مَا تُطِيْقُوْنَ فَوَاللّٰهِ لَا يَسْأَمُ اللّٰهُ حَتّٰى تَسْأَمُوْا۔

کیا تو رات بھر نہیں سوتی؟ بس اپنی طاقت کے مطابق عمل کرو۔ اللہ کی قسم تم اکتا جاؤ گے اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا۔

(شرح النووی علی مسلم: ۶/۷۳)

(۲) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہی ایک حدیث یوں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے اور میرے پاس ایک عورت بیٹھی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ عورت کون ہے؟ میں عرض گزار ہوئی کہ یہ وہ عورت ہے جو رات بھر سوئے بغیر نماز پڑھتی رہتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَلَيْكُمْ مِنَ الْعَمَلِ مَا تُطِيْقُوْنَ فَوَاللّٰهِ لَا يَمَلُّ اللّٰهُ حَتّٰى تَمَلُّوْا وَكَانَ اَحَبُّ الدِّيْنِ اِلَيْهِ مَادَاوَمَ عَلَيْهِ صَاحِبُهٗ۔

اپنی طاقت کے مطابق عمل لازم پکڑو۔ اللہ کی قسم تم تھک جاؤ گے اللہ تعالیٰ نہیں تھکتا اور اس کو سب سے زیادہ پسندیدہ وہی عمل ہے جس پر عامل ہمیشگی اختیار کرے۔

(۳) امام بخاری نے بھی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کو نقل کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس بنو اسد کی عورت بیٹھی تھی۔ اسی اثناء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کون عورت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ فلانہ' یہ رات بھر نہیں سوتی اور نماز میں مشغول رہتی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَهْ عَلَيْكُمْ مَا تُطِيْقُوْنَ مِنَ الْاَعْمَالِ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوْا۔ (صحیح بخاری: ۲/۶۷)

چھوڑو' اپنی طاقت کے مطابق عمل لازم کرو بے شک اللہ تعالیٰ نہیں اکتائے گا اور تم اکتا جاؤ گے۔

اس سلسلے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعدد واقعات مروی

ہیں۔ جن میں سے چند کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

(۱) حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا معمول تھا کہ رات بھر نماز میں مشغول رہتی۔ جب تھک جاتی تو دونوں ستونوں کے درمیان باندھی ہوئی رسی کا سہارا لے لیتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حَلُّوْهُ لِيُصَلِّ اَحَدُكُمْ نِشَاطَهٗ فَاِذَا كَسَلَ اَوْ فَتَرَ فَلْيَقْعُدْ۔ (صحیح مسلم: ۶/ ۷۳)	اسے کھول دو۔ چاہیے کہ کوئی ایک اپنی خوشی کے مطابق نماز پڑھے اور جب تھک جائے تو بیٹھ جائے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہمیشہ دن کا روزہ اور رات کا قیام لازم رکھتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے منع کیا اور فرمایا:

اِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَّلِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا۔ (صحیح مسلم: ۸/ ۴۲)	بے شک تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے، تیری ملاقات کے لیے آنے والے کا تجھ پر حق ہے اور تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے۔

(۳) حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کا حال بھی حضرت عبداللہ کی مانند تھا۔ تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے انہیں اس سے منع فرمایا۔ جیسا کہ ابو نعیم نے (حلیۃ الاولیاء: ۱/ ۱۸۸) میں روایت کیا۔

(۴) ان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا بھی شمار اسی صف میں ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال کے بارے میں دریافت کیا۔ جب انہیں ان کی خبر دی گئی تو انہوں نے انہیں ہلکا جانا۔ پھر کسی ایک نے تمام راتوں کا قیام بغیر سوئے اپنے اوپر لازم کر لیا۔ اور دوسرے نے تمام زمانے کا روزہ بغیر افطار کیے لازم کر لیا اور تیسرے نے عورتوں سے مکمل جدائی کی ٹھان لی کہ کبھی نکاح نہیں کرے گا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا:

اَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا، اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّىْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ، لٰكِنِّىْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ، وَاُصَلِّىْ وَاَرْقُدُ، وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِىْ فَلَيْسَ مِنِّىْ۔

(صحیح بخاری: ۹/۹۰، صحیح مسلم: ۹/۱۷۵)

تم لوگوں نے یوں یوں کہا ہے۔ سنوا اللہ کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ متقی ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو جو کوئی میری سنت سے روگرداں ہو گا وہ مجھ سے نہیں۔

(۵) حضرت عثمان بن مظعون اور ان کے ساتھ رضوان اللہ علیہم اجمعین، جنہوں نے اپنے اوپر بہت سی شہوات اور عورتوں کو حرام ٹھہرالیا، اور بعض نے یہ تہیہ کرلیا کہ اس کا ذکر بھی نہیں کریں گے۔

مذکورہ روایات کا صحیح مفہوم

مذکورہ بالا اخبار و امثال اپنے ظاہر کے اعتبار سے یہ واضح کرتی ہیں کہ عبادت میں تشدد اور بندگی میں سخت محنت شریعت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ممنوع قرار پائی ہے۔ حالانکہ یہ ملت اسلامیہ حنفیہ کا موقف نہیں۔ اور یہ حضرات جنہوں نے عبادت میں نہایت جدوجہد کی، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منع کردہ افعال کے مرتکب ہوئے۔ لہٰذا ان کے فعل سے عبرت نہیں بلکہ حق بات وہ ہے جو رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔

اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ ان روایات کا ظاہر اصلاً مراد نہیں اور نہ ہی اس عمل کی ذاتی نفی مقصود ہے۔ جیسا کہ بعض منکرین نے سمجھا جو عبادت، ذکر اور بندگی میں کوشش کرنے والوں پر اعتراض کرتے ہیں۔

اب ان مذکورہ تمام روایات کے بالترتیب جوابات پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) حدیث حولاء: بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کثرت صلاۃ سے منع نہیں کیا' بلکہ حسب استطاعت عمل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے اور یہ تلقین کی ہے کہ کہیں عامل اکتا کر عمل ترک نہ کردے۔

(۲) حدیث زینب: اس کی حقیقت یہ ہے کہ زینب نماز پڑھتی پڑھتی تھک ہار جاتی اور باندھی ہوئی رسی کو پکڑ کر عمل جاری رکھتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس سے منع فرمایا' اور اس میں کوئی اختلاف بھی نہیں۔

(۳) حدیث عبداللہ بن عمرو: بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حال سے واقف ہوئے کہ یہ اپنے اوپر لازم کیے ہوئے امور کو ہمیشگی کے ساتھ سرانجام نہیں دے سکیں گے تو ان کو رخصت کی طرف ہدایت فرمائی اور یہ علتیں بھی بیان فرمائیں کہ نفس اور بیوی کا بھی اس پر حق ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی بینائی کمزور اور جسم لاغر ہو جاتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنی ہی محنت پر دلالت فرمائی' جس سے طبیعت میں ملال اور سستی نہ پیدا ہو' اور نہ ہی کوئی چیز دیگر حقوق شرعیہ کی ادائیگی میں مخل ہو۔ نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دلالت مطلقاً عمل کی ممانعت پر ہے۔

(۴) حدیث ابو درداء: انہوں نے حقوق واجبہ کو ترک کر کے عبادت کا التزام کر لیا تھا تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے انہیں منع کر دیا۔ یہ روایت بھی اسی امر پر دال ہے کہ عبادت میں اتنا تشدد' جو حقوق شرعیہ میں فتور پیدا کرے' وہ منع ہے نہ کہ مطلقاً۔

(۵) حدیث جماعت صحابہ: ان حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو قلیل سمجھا اور خیال یہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مغفور ہیں۔ اس لیے عبادت میں سخت محنت نہیں فرماتے تو انہوں نے اپنے اوپر وہ لازم کر لیا جو اللہ تعالیٰ نے واجب نہیں کیا تھا اور آسان طریقہ سے اعراض کر لیا۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس سے زجر و توبیخ کی اور اپنی سنت کی طرف رہنمائی فرمائی اور

فرمایا کہ جس نے میری سنت سے اعراض کیا' وہ میرے بتائے ہوئے راستے پر نہیں اور نہ ہی میری ہدایت پر پختہ ہے۔ جیسا کہ اس جماعت صحابہ نے گمان کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دلالت اس امر پر نہیں کہ جو شخص حسب استطاعت عمل کرے' غیر واجبہ امور کو واجب نہ کرے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو نہ چھوڑے' وہ بھی جائز نہیں۔

(۶) حدیث عثمان بن مظعون و دیگر صحابہ: ان حضرات نے اپنے آپ پر وہ کچھ حرام کر لیا جو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیا تھا اور اپنے اوپر وہ واجب کر لیا جس کو اللہ تعالیٰ نے واجب نہیں کیا تھا تو انہیں اس سے منع کر دیا گیا۔ اس کی دلالت بھی مطلقاً محنت کی نفی اور اس عمل کی حرمت پر نہیں۔ بلکہ اس طریقے کے التزام سے ممانعت ہے جو ایک ایسے امر بدعت تک پہنچا دے جس کا تعلق شریعت سے نہ ہو۔

تحقیق مقام

امام علامہ برکالی کی گفتگو

امام علامہ برکالی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الطریقہ المحمدیہ" میں پختہ اور مفید تحقیق پیش کی ہے' جس سے ان احادیث اور اسلاف کے مجاہدات کے درمیان تعارض ختم ہو جاتا ہے۔

علامہ ذکر فرماتے ہیں کہ عبادت میں سخت محنت کی ممانعت ان دو علتوں کے پیش نظر ہے:

(۱) ایسا تشدد' جس سے ہلاکت نفس' دوسرے کے واجب حق کا ضائع ہونا' عبادت کا ترک یا اس کے دوام کا ترک لازم آئے۔

(۲) کیونکہ ہمارے آقا و مولا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی

تائید اور تقویت میسر ہے' جو امت کے کسی فرد کو حاصل نہیں۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والے' سب سے زیادہ متقی اور سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جاننے والے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بخل اور خیر خواہی کے ترک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کوتاہی اور سستی کا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی امور دین میں جہالت کا۔ پس اگر عبادت اور قرب خداوندی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بڑھ کر کوئی اور راستہ افضل اور نفع بخش ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اسے اپنا لیتے یا بیان فرماتے اور اس کی تلقین فرماتے۔ لہٰذا قطعاً ضروری ہے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے' وہ معرفت خداوندی کی طرف سب سے زیادہ افضل اور اقرب ہے۔

اور جو ان حضرات سے مروی ہے کہ انہوں نے عبادت میں شدت اختیار کی' ان کے اس عمل کے درج ذیل احتمالات ہیں:

(۱) قلبی امراض کے علاج کے لیے۔

(۲) یا عبادت ان کی عادت اور طبیعت تھی۔ جیسے صحت مند کے لیے غذاء۔

(۳) یا وہ اس میں لذت پاتے تھے اور کوئی حق ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ نہ مداومت ترک کرتے تھے اور نہ ہی یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ افضل البشر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور فرمان سے افضل ہے۔

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کمال کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں اس لیے کوئی شئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قلبی توجہ سے مانع نہیں ہو سکتی۔ نہ مخلوق سے گفتگو' نہ کھانا پینا' نہ سونا اور نہ ہی عورتوں سے میل جول۔ گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جلوت و خلوت برابر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض ظاہری عبادات پر اکتفاء کرنا اس لیے ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے لیے افضل ہیں اور حضور سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا لذت پانا دائمی ہے' نہ کہ ظاہری عبادات

سے مختص۔

پھر علامہ برکالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

فلا یخلوا ما نقل عن السلف من التشدید عن العلتین المذکورتین' وھذا ھوالمحمل الصحیح الحق الصریح' فلا تفرط ولا تفرط وابتغ بین ذلک سبیلا۔

اسلاف سے جو مجاہدات میں شدت منقول ہے وہ ان مذکورہ دو علتوں سے خالی نہیں اور اس کا صحیح اور واضح محمل یہی ہے کہ نہ افراط کرے نہ تفریط بلکہ اعتدال کی راہ پکڑے۔

(الطریقہ المحمدیہ)

علامہ نابلسی کی گفتگو

علامہ نابلسی رحمۃ اللہ علیہ "الطریقہ المحمدیہ" کی شرح (الحدیقہ الندیہ: ۱/ ۲۲۸) میں رقم طراز ہیں کہ جو سلف صالحین سے عبادات میں محنت' ریاضات اور مجاہدات وارد ہیں' وہ قطعا دین محمدی کے کچھ بھی مخالف نہیں۔ بلکہ وہ بھی قرآن وسنت میں اس شخص کے حق مین وارد ہیں جو ان کی قدرت رکھتا ہے اور اس محنت کے لیے فراغت پا سکتا ہے۔ نہ یہ کہ اس پر واجب ہے کیونکہ یہ ایک نفلی عبادت ہے جو اس عبادت پر زائد ہے جس کا وہ مکلف ہے اور اس پر ثواب پائے گا۔

جیساکہ قرآن وسنت کی روشنی میں اس شخص کے حق میں عمل میں میانہ روی اختیار کرنا وارد ہے جو کثرت عبادت کی قدرت نہیں رکھتا یا اس پر کسی کوتاہی اور عدم دوام کا خدشہ ہو۔ دین میں نرمی بھی ہے اور سختی بھی۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ فرماتا ہے:

اِتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ۔ (آل عمران: ۱۰۲)

اللہ سے ڈرو جیساکہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔

اور فرمایا:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ تو اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔

(التغابن: ١٦)

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایسی محنت وارد ہے۔ مثلاً وصال کاروزہ، بھوک کی کثرت، حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیٹ مبارک پر پتھر بھی باندھ لیتے اور اسی طرح رات کے لمبے قیام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک پاؤں کو ورم آجاتا اور اسی طرح قیام و صیام کی کثرت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات امہات المومنین کے بارے میں بھی وارد ہے۔ جیساکہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی باندھی ہوئی رسی کا ذکر پہلے گزر گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر شفقت فرماتے ہوئے اسے کھولنے کا حکم دیا۔

اور اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت عبادت سے منع فرمایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس کے بدلنے کو گناہ نہ سمجھا بلکہ بڑھاپے میں فرمایا کہ میری محبت تھی کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی رخصت کو قبول کرلیا ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم رخصت پر محمول ہے اور فعل عزیمت پر۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فقط امر کو ہی دین نہیں ٹھہرایا۔

جو بھی سابقہ آیات و احادیث میں غور و فکر کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ سب کچھ اللہ جل شانہ اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر رحمت اور شفقت ہے اور مومنوں کے لیے رخصت ہے کہ ان پر دین میں کوئی مشقت نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ۔(المائدة: ٨٧) حرام نہ ٹھہراؤ وہ ستھری چیزیں کہ اللہ نے تمہارے لیے حلال کیں۔

یعنی ان کی حرمت کا اعتقاد نہ رکھو باوجودیکہ تمہیں ان میں رخصت ہے۔ اگر

وہ ان کو حرام نہ ٹھہرائیں اور ویسے ہی ان کا کھانا پینا ترک کر دیں تو ایک فانی شے کے بارے میں زاہد کہلائیں گے اور ان کے اس فعل میں قطعاً گناہ نہیں ہو گا۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان عالی شان ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔(الاعراف: ۳۲)	تم فرماؤ کس نے حرام کی اللہ کی وہ زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی اور پاک رزق۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی جو حدیث کے آخر میں ہے کہ:

فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ۔	جو میری سنت سے کنارہ کش ہوا وہ مجھ سے نہیں۔

یعنی جس نے ایک امر میں میرے فعل اور رخصت کے جواز کا اعتقاد نہ رکھا' اور سخت کام کو ہی لازم پکڑا' یہ فرمان دراصل صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس قول کے مقابلہ میں ہے:

فَاَيْنَ نَحْنُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔	کہاں ہم اور کہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس سے وہ شرعی رخصت کو ترک کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا جو اوپر مذکور ہے۔

حاصل کلام

بے شک سلف صالحین نے اپنے بارے عزائم کو اختیار کیا کیونکہ وہ حضرات عالی ہمت اور عزیمتوں پر عمل کرنے والے تھے اور رخصت شرعیہ کی صحت کے معترف تھے۔ اس کے باوجود وہ لوگوں کو رخصت سے نکال کر عمل پر برانگیختہ کرتے تھے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی کرتے کہ رخصت کا حکم فرماتے اور خود عزائم پر عمل کرتے' جیسا کہ صوم وصال کے واقعہ سے ظاہر ہے۔

ارشاد الساری اور قیام نبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام فرمانے اور مبارک پاؤں میں ورم آ جانے والی حدیث کے تحت "ارشاد الساری شرح صحیح بخاری" میں ہے کہ حدیث میں غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ انسان کو اپنے آپ پر عبادت میں شدت لازم کرنی چاہیے۔ اگرچہ اس کے بدن پر گراں ہی گزرے لیکن مناسب یہ ہے کہ محنت کو اس حد تک مقید رکھے کہ کہیں تنگ دلی کی نوبت نہ آئے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک حالت تمام احوال سے اکمل ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت اطہر پر عبادت کی وجہ سے ملال نہیں آتا۔ اگرچہ وہ بدن پر گراں ہی گزرے، بلکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ — میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے لوگوں کو ضروری ہے کہ جب ملال یا تنگ دلی کا خدشہ ہو تو مناسب طریقے سے محنت کو مقید رکھیں اور دلی اکتاہٹ کی نوبت نہ آئے۔ البتہ عبادت میں محنت کرنا افضل ہے۔ کیونکہ جب اس مغفور (بخشی ہوئی) ہستی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ ہے تو اس کی کیفیت کیا ہونی چاہیے جس کے اخروی حال کی خبر نہیں، جس کی پیٹھ کثافتوں سے بوجھل ہے اور عذاب نار سے مامون نہیں؟ (ارشاد الساری شرح صحیح بخاری)

اور بالکل اسی طرح ہی "المواہب اللدنیہ" کے مقصد اول میں منقول ہے۔

امام نووی "الاذکار" میں

امام نووی رحمتہ اللہ علیہ کی کتاب "الاذکار" میں ہے کہ

"سلف صالحین کی اپنی اپنی بساط کے مطابق عادات مختلف تھیں۔ یعنی ختم قرآن

کرنے کی مدت کے اعتبار سے 'ان میں سے ایک جماعت کا وطیرہ یہ تھا کہ وہ ہر دو ماہ میں ختم قرآن کرتے 'اور بعض دوسروں کا عمل ہر ایک ماہ میں قرآن پاک ختم کرنا ہے اور اکثر بزرگوں کا یہ عمل منقول ہے کہ وہ ہر سات راتوں میں قرآن پاک ختم کرتے اور کچھ ہر چھ راتوں میں۔ کچھ پانچ راتوں میں اور کچھ چار راتوں میں قرآن پاک ختم کرتے۔ اور اکثر کا معمول ہر تین راتوں میں قرآن پاک ختم کرنا ہے اور بیشتر بزرگان دین کا معمول یہ ہے کہ وہ ہر ایک دن اور رات میں قرآن پاک ختم فرماتے۔

صوفیاء کی ایک جماعت ہر ایک دن اور رات میں دو قرآن پاک ختم فرماتے۔ اور کچھ ہر دن رات میں تین قرآن پاک پڑھتے۔ اور بعض بزرگوں کا تو ایک دن رات میں آٹھ قرآن پاک پڑھنے کا معمول تھا۔ چار رات میں اور چار دن کو۔ اور جو حضرات اس طرح رات دن میں اکثر قرآن پاک ختم فرماتے 'ان میں سید جلیل بن کاتب صوفی رحمتہ اللہ علیہ کا نام قابل ذکر ہے۔

سید جلیل احمد دورقی اپنی سند کے ساتھ منصور بن زاذان سے ایک عابد تابعی کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ وہ ظہر تا عصر ایک قرآن پاک ختم کرتے اور اسی طرح مغرب تا عشاء ایک قرآن پاک ختم کر لیتے اور رمضان المبارک میں مغرب تا عشاء دو قرآن پاک اور کچھ زائد تلاوت کر لیا کرتے تھے اور وہ لوگ رمضان المبارک میں نماز عشاء کو چوتھائی رات گزر جانے تک موخر کرتے تھے اور ابن ابی داؤد نے اپنی صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ مجاہد رمضان المبارک میں مغرب تا عشاء قرآن پاک پڑھ لیا کرتے تھے۔

اور وہ قابل رشک حضرات جو ایک رکعت میں پورا قرآن پاک پڑھ لیا کرتے تھے 'ان کی کثرت شمار سے باہر ہے۔ ان سعادت مندوں میں حضرت عثمان بن عفان ' تمیم داری اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کے اسماء مبارکہ قابل ذکر و تحسین ہیں۔

مختار یہ ہے کہ اشخاص کے مختلف ہونے سے یہ سلسلہ بھی مختلف رہا۔ یعنی جس

شخص پر باریک بینی کی بناء پر قرآن حکیم کے لطائف و معارف ظاہر ہوتے ہوں وہ اسی قدر قرات پر اکتفا کرتا جس سے اسے کمال فہم حاصل ہو جائے۔ اور اسی طرح جو علم کی نشر و اشاعت، نظام حکومت یا دیگر دینی مہمات اور عوام المسلمین کی مصلحتوں میں مشغول ہوتا، وہ اسی قدر قرات پر اکتفا کرتا کہ جس سے اس کی ذمہ داریوں میں خلل نہ آئے اور اس کا کمال فوت نہ ہو۔ اور جو ان مذکورہ افراد میں سے نہ ہوتا، وہ قرات قرآن میں طبیعت پر ملال اور قرات میں تیزی آئے بغیر جہاں تک ممکن ہوتا، خوب کثرت کرتا۔ (الاذکار للنووی)

امام نووی "شرح صحیح مسلم" میں

امام نووی رحمتہ اللہ علیہ "شرح صحیح مسلم" میں حدیث عبداللہ بن عمرو کی شرح میں فرماتے ہیں کہ

روزانہ قرآن پڑھنے کے بارے میں سلف صالحین کی عادات مختلف تھیں۔ ان کے احوال، افہام اور وظائف کے اعتبار سے۔ بعض ہرماہ میں قرآن ختم کرتے، بعض بیس دنوں میں، بعض دس دنوں میں، بعض یا اکثر سات دنوں میں، اکثر تین دنوں میں اور کثیر تعداد ان کی ہے جو ہر ایک دن رات میں قرآن پاک ختم فرماتے۔ بعض ہر ایک رات میں اور بعض ایک رات دن میں تین قرآن پاک اور بعض آٹھ قرآن پاک کی تلاوت فرماتے۔ یہی اکثر تعداد ہم تک پہنچی ہے۔

مختار یہی ہے کہ وہ اکثر تلاوت قرآن کرتے اور اس قدر کرتے جس پر دوام ممکن ہو۔ دوام کی قدر اس کے ظن غالب پر مبنی ہے جو وہ حالت نشاط وغیرہ میں نبھا سکے۔ یہ اس وقت ہے جب اس کا کوئی اور وظیفہ عامہ یا خاصہ نہ ہو کہ جس سے وہ کثرت قرآن کے سبب معطل ہو جائے۔ اگر اس کا کوئی اور وظیفہ عامہ ہے جیسے حکومت اور تعلیم وغیرہ۔ تو اس صورت میں وہ اسی قدر قرات لازم کرے جس پر وہ خوشی سے دوام اختیار کر سکے اور اس کے کمال وظیفہ میں بھی کوئی خلل نہ آنے پائے۔

اور جو اسلاف سے مروی ہے وہ اسی قاعدہ پر مبنی ہے۔(شرح صحیح مسلم از امام نووی)

اور امام سیوطی رحمتہ اللہ علیہ کی "الاتقان فی علوم القرآن" میں بھی اسی طرح ہی ہے۔

خلاصہ کلام

اس مقام کی تحقیق میں خلاصہ کلام یہ ہے جو میں (مولف) نے علماء کرام کی اتباع میں اختیار کیا ہے کہ رات بھر کا قیام' دن رات میں ایک بار یا متعدد بار قرآن پاک کی قرات' ہزار رکعات کی ادائیگی یا اس سے بھی زائد اور اس طرح کے مجاہدات اور ریاضات بدعت نہیں اور نہ ہی شریعت میں ان کی کوئی ممانعت ہے بلکہ ایک احسن اور قابل رشک امر ہے۔ لیکن چند شرائط سے مشروط ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

(۱) کثرت عبادت سے دل پر ملال نہ آئے جس سے عبادت کی لذت اور دل کی حضوری فوت ہو جائے۔ یہ اس حدیث سے ماخوذ ہے:

لِيُصَلِّ اَحَدُكُمْ نِشَاطَهٗ۔ تم میں سے ہر ایک کو اپنی خوشی کے مطابق نماز پڑھنی چاہیے۔

یعنی جتنی دیر دل خوش اور طبیعت مسرور رہے۔

(۲) اپنے آپ پر ایسی مشقت لازم نہ کرے جس کا بار اٹھانے کا متحمل نہ ہو بلکہ اپنی طاقت کے مطابق عمل کرے۔ یہ اس حدیث سے ماخوذ ہے:

عَلَيْكُمْ مِنَ الْاَعْمَالِ مَا تُطِيْقُوْنَ۔ تم اپنی طاقت کے مطابق عمل لازم پکڑو۔

(۳) اس کے سبب سے کوئی ایسا امر فوت نہ ہو جو اس سے اہم ہو۔ مثلاً ایک شخص کا رات بھر کا قیام صبح کی نماز فوت کر دے تو اس کے لیے ایسا قیام جائز نہیں۔ کیونکہ فرض کی ادائیگی نفل کی ادائیگی سے اہم ہے اور امام مالک کی وہ روایت اس پر دال ہے جو انہوں نے ابو بکر بن سلیمان بن ابی حثمہ سے روایت کی کہ:

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے صبح کی نماز میں سلیمان بن ابی حثمہ کو مفقود پایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صبح بازار کی طرف گئے۔ سلیمان کا گھر مسجد اور بازار کے درمیان تھا۔ لہٰذا آپ رضی اللہ عنہ کا شفاام سلیمان پر گزر ہوا۔ آپ نے ان سے پوچھا نماز صبح میں سلیمان نظر نہیں آیا؟ وہ کہنے لگی کہ وہ شب بھر عبادت میں مصروف رہا ہے اور نیند کا اس پر غلبہ ہو گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے نماز صبح باجماعت ادا کرنا شب بھر قیام سے محبوب ہے۔

اور اسی طرح جو شخص رات کا قیام اور دن کا روزہ اس انداز سے لازم کر لے کہ جس سے نماز باجماعت' نماز جنازہ اور تدریس و تصنیف کے حوالے سے علم کی نشرو اشاعت وغیرہ کے امور فوت ہو جائیں' تو یہ اس کے لیے مناسب نہیں۔

(۴) اس نفلی عبادت کے سبب کوئی شرعی حق ضائع نہ ہونے پائے۔ مثلاً بیوی کا حق' اولاد کا حق اور مہمان کا حق وغیرہ۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمرو اور ابو درداء رضی اللہ عنہما کے واقعہ سے ماخوذ ہے۔

(۵) اس میں رخصت شرعی کا ابطال نہ ہو۔ یعنی شرعی رخصت کو باطل نہ ٹھہرائے اور نہ ہی رخصت پر عمل کرنے والے کو بیکار سمجھے۔ یہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی حدیث سے ماخوذ ہے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو قلیل سمجھا۔

(۶) اس میں کسی ایسے امر کا واجب کرنا نہ ہو جو شریعت میں واجب نہیں اور نہ ایسے امر کی حرمت ہو جو شریعت میں حرام نہیں۔ یہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ماخوذ ہے۔

(۷) عبادات کے ارکان کا حق ادا کرے۔ یہ جائز نہیں کہ نماز کی رکعات کی کثرت کرتا جائے اور انہیں مرغ کے چونچ مارنے کی طرح ادا کرے۔ یا قرات قرآن کی کثرت بغیر تدبر اور ترتیل کے کرے۔ حضور سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ

فرمان عالیشان اسی کا غماز ہے:

لَایَفْقَهُ الْقُرْآنَ مِنْ قَرَاَهُ فِیْ اَقَلِّ مِنْ ثَلَاثٍ۔	وہ شخص قرآن پاک کو سمجھ نہیں سکتا جو اسے تین دن سے کم مدت میں پڑھے۔

اس روایت کو ابو داؤد اور ترمذی وغیرہ نے عبداللہ بن عمرو کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور اسی پر اعتماد کرتے ہوئے ایک جماعت نے تین دن سے کم مدت میں ختم قرآن کو مکروہ قرار دیا اور بعض نے یہ اختیار کیا کہ یہ نفی ثواب کی نہیں بلکہ قرآن سمجھنے کی ہے۔ امام ترمذی اپنی "جامع" میں فرماتے ہیں کہ بعض اہل علم حضرات تین دن سے کم مدت میں قرآن نہیں پڑھتے تھے اور ان کا اعتماد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی مذکورہ حدیث پر ہے۔ اور بعض علماء اس میں رخصت دیتے ہیں اور ان کا استدلال اس روایت سے ہے جو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ وتر کی آخری رکعت میں پورا قرآن پاک پڑھتے تھے اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کعبہ میں دو رکعت میں پورا قرآن پڑھا۔ علماء کے نزدیک قرات میں ترتیل زیادہ پسند ہے۔

(۸) جو عبادت اختیار کرے اس پر دوام حاصل کرے بغیر عذر کے ترک نہ کرے۔ یہ نبی کریم رؤف رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان ذیشان سے ماخوذ ہے:

اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰهِ اَدْوَمُهَا وَاِنْ قَلَّ۔	اللہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ پسندیدہ عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے' اگرچہ تھوڑا ہی ہو۔

اس حدیث کو امام مسلم نے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ نیز امام بخاری اور امام مسلم وغیرہما نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت کی ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یَاعَبْدَاللّٰهِ لَاتَکُنْ مِثْلَ فُلَانٍ	اے عبداللہ اس شخص کی مانند نہ ہو

كَانَ يَقُوْمُ مِنَ اللَّيْلِ فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ۔	جو رات بھر قیام کرتا ہے' پھر اسے ترک کر دیتا ہے۔

(۹) اس کی عبادت میں محنت کسی مسلمان کو پریشان نہ کرے' جیسے نماز باجماعت میں لمبی سورتوں یا پورے قرآن کی قرات کی کوشش کرنا۔ گویا یہ عمل مقتدیوں کی پریشانی کا سبب بنتا ہے۔ کیونکہ ان میں کمزور' ناتواں اور مصروف لوگ بھی ہوتے ہیں۔ یہ بخاری اور مسلم کی اس روایت سے ماخوذ ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ فَإِنَّ فِيْهِمُ الضَّعِيْفَ وَالسَّقِيْمَ وَالْكَبِيْرَ وَإِذَا صَلَّى لِنَفْسِهِ فَلْيُطَوِّلْ مَاشَاءَ۔	جب تم میں سے کوئی لوگوں کو نماز پڑھائے تو ہلکی ہلکی پڑھائے۔ کیونکہ ان میں کمزور' ناتواں اور بوڑھے حضرات بھی ہیں اور جب تنہا پڑھے تو جتنی چاہے لمبی کرے۔

اسی طرح امام بخاری اور مسلم رحمتہ اللہ علیہما نے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالیہ میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ فلاں ہمیں نماز اتنی لمبی پڑھاتا ہے کہ میں نماز میں قائم نہیں رہ سکتا۔ تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وعظ کے معاملہ میں اس دن سے بڑھ کر غضبناک نہیں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِيْنَ' مَنْ يُّصَلِّيْ بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ' فَإِنَّ فِيْهِمُ الْكَبِيْرَ وَالضَّعِيْفَ وَذَا الْحَاجَةِ۔	اے لوگو! تم میں کچھ بھگانے والے بھی ہوتے ہیں' لہذا جو بھی لوگوں کو نماز پڑھائے تو ہلکی ہلکی پڑھائے۔ کیونکہ ان میں کمزور' بوڑھے اور مصروف لوگ بھی ہوتے ہیں۔

اور ایسے ہی بخاری و مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ہمیں حضرت معاذ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور قرات کافی لمبی کی۔ تو ایک آدمی لوٹ گیا۔ حضرت معاذ کو اس کے بارے خبر دی گئی تو انہوں نے کہا وہ منافق ہے۔ جب اس شخص کو اس بات کا علم ہوا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور حضرت معاذ کے اس قول کی خبر دی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا:

اَتُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ فَتَّانًا يَا مُعَاذُ؟ اِذَآ اَمَمْتَ بِالنَّاسِ فَاقْرَءْ بِالشَّمْسِ وَضُحٰهَا، وَ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى، وَاقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ، وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى۔

اے معاذ! کیا تو فتنہ ڈالنا چاہتا ہے؟ جب بھی تو لوگوں کی امامت کرے تو وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا اور سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى، اور اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ اور وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى کی قرات کر۔

(متفق علیہ)

اسی سلسلے میں کثیر روایات وارد ہیں۔

(۱۰) کثرت عبادت کی محنت کا یہ اعتقاد نہ جنم دے کہ یہ اس قلیل عمل سے افضل ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول تھا۔

پس جس شخص میں یہ مذکورہ شرائط موجود ہوں، وہ عبادت میں خوب محنت کرنے کا حقدار ہے اور بلا مبالغہ ریاضات اور مجاہدات کرنے والے پہلے بزرگان دین ان شروط کے جامع تھے۔ لہذا ان کے لیے یہ جائز ٹھہرا اور اس پر کسی کو انکار بھی نہیں۔ ہاں البتہ جس میں کوئی شرط مفقود ہو، وہ عمل میں اعتدال سے کام لے اور یہ میانہ روی ہی اس کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ یہی وہ معتدل راہ ہے جس پر ہر انصاف پسند راضی ہے اور اس میں نہ وہ افراط ہے نہ تفریط، جس کی طرف ہر روگردان دھیان دیتا ہے۔ امید ہے کہ اس قابل تحسین تحقیق کے بعد اسلاف میں سے کسی بھی بزرگ کے بارے میں تمہیں خدشہ لاحق نہیں ہوگا۔ پس اسے مضبوطی سے تھام لے اور شکر

کرنے والا ہو جا۔

(ملخص من کتاب اقامة الحجة علی ان الاکثار فی العبادة لیس ببدعة للامام ابی الحسنات عبدالحیٔ لکھنوی الہندی: ۱۵۳)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور عبادت میں محنت

جمیع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ وہ اپنی تمام تر کوشش عبادت میں خرچ کرتے تھے اور اپنی تمام تر پونجی اور کاوشیں جہاد' ذکر الٰہی اور فرمانبرداری میں صرف کرتے تھے۔ جن میں درج ذیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسماء مبارکہ قابل ذکر ہیں:

(۱) حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہمیشہ روزہ رکھتے اور شروع رات میں تھوڑا سا ستانے کے بعد شب بھر کا قیام فرماتے۔ نماز پڑھتے اور ایک رکعت میں پورا قرآن پڑھ جایا کرتے۔

(۲) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہمیشہ روزہ رکھتے اور شب بھر کا قیام فرماتے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما شب بھر کا قیام فرمایا کرتے تھے۔

(۴) حضرت تمیم بن اوس بن خارجہ رضی اللہ عنہ ایک رکعت میں قرآن پاک ختم فرمایا کرتے اور رات بھر بیدار رہتے۔

(۵) حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کا شب بھر بیداری کا معمول تھا۔

(۶) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہر روز قرآن پاک ختم فرماتے تھے۔

سیرت صحابہ کی کتابوں میں ان حضرات کے مناقب دیکھیں تو اس طرح کے اور بھی بے شمار شواہد ملتے ہیں۔

تابعین رضی اللہ عنہم کی عبادت میں محنت

کثیر تابعین سے بھی اسی طرح کی محنت ثابت ہے جن میں سے چند حضرات کے اسماء ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

(۱) حضرت عمیر بن ہانی رضی اللہ عنہ ہر روز کئی ہزار تسبیحات پڑھا کرتے تھے۔

(۲) حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ پوری پوری رات ہی رکوع اور سجدہ میں بسر کر دیا کرتے اور گھر میں جو طعام اور کپڑے زائد ہوتے وہ صدقہ کر دیا کرتے اور پھر یوں دعا کیا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ مَنْ مَاتَ جُوْعًا فَلَا تُؤَاخِذْنِيْ بِهٖ وَمَنْ مَاتَ عُرْيَانًا فَلَا تُؤَاخِذْنِيْ بِهٖ۔ اے اللہ جو بھوکا یا عریاں مر گیا اس کا مجھ سے مواخذہ نہ فرمانا۔

آپ رضی اللہ عنہ بڑے باشعور تھے۔ لوگ اپنے جمیع معاملات آپ سے دریافت کرتے۔

(۳) حضرت عامر بن عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ نے اپنے آپ پر ہر دن رات میں ایک ہزار رکعات لازم کر رکھی تھی۔

(۴) حضرت مسروق بن عبدالرحمن ابو عائشہ ہمدانی کوفی رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام ذہبی "العبر باخبار من غبر" میں فرماتے ہیں کہ حضرت مسروق اس قدر نماز پڑھتے کہ آپ کے پاؤں میں ورم آجاتا۔ حج کرنے جاتے تو نہ سوتے مگر سجدہ کی ہی حالت میں اور اسی طرح ہی امام یافعی کی "مرآۃ الجنان" میں بھی ہے اور "تاریخ ابن کثیر" میں امام احمد کا قول ہے کہ حضرت مسروق حج کرنے گئے تو آپ نہ سوئے مگر پیشانی کے بل سجدہ کی ہی حالت میں۔ حتیٰ کہ واپس لوٹ آئے اور آپ اس قدر نماز پڑھتے کہ آپ کے پاؤں میں ورم آجاتا۔ حضرت مسروق کی بیوی کا کہنا ہے کہ ان کی

پنڈلیاں لمبی نماز کی وجہ سے ہمیشہ سوجی ہی رہتی ہیں۔

(۵) حضرت اسود بن یزید نخعی رضی اللہ عنہ ایک رات دن میں سات سو رکعت پڑھا کرتے تھے۔ اور رمضان المبارک میں ہر دو راتوں میں قرآن پاک ختم فرماتے۔

(۶) حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے پچاس سال عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی اور ہمیشہ روزہ رکھا۔

(۷) حضرت عروہ بن زبیر بن عوام ابو عبداللہ اسدی مدنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام ذہبی (العبر: ۱/ ۱۱۰) میں فرماتے ہیں کہ ان کا معمول تھا کہ ہر روز مصحف سے چوتھائی قرآن پاک کی تلاوت کرتے اور رات کو اسی کے ساتھ قیام فرماتے۔ آپ نے یہ عمل ترک نہیں کیا سوا ایک رات کے، جس رات آپ کا پیر کاٹ دیا گیا۔

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ نے اس رات بھی اپنا وظیفہ ترک نہیں کیا۔

واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ حضرت عروہ کے پیر میں موذی خارش پڑ گئی تو ولید بن عبدالملک نے انہیں کہا کہ اسے کاٹ دو۔ ورنہ یہ بیماری سارے جسم کو برباد کر دے گی۔ جب کاٹنے والے کو بلایا گیا تاکہ اسے کاٹ دے تو لوگوں نے حضرت عروہ سے کہا کہ ہم تمہیں شراب پلا دیتے ہیں تاکہ درد محسوس نہ ہو۔ تو آپ نے فرمایا میں عافیت کی امید پر اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کا نہ ارتکاب کرتا ہوں نہ اس سے مدد چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہم تمہیں مرقد (نیند لانے والی دوا) پلا دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ قطعاً پسند نہیں کہ میرا عضو کاٹ دیا جائے اور میں اس کی درد سے غافل رہوں۔ پس میں برداشت کروں گا اور عبرت حاصل کروں گا۔ تو کچھ لوگ آپ کے پاس آئے۔ آپ نے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ آپ کو پکڑے رکھیں گے کیونکہ درد بسا اوقات صبر کو مات کر جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ میں اپنے آپ کو کافی رہوں گا۔ لہٰذا چھری سے آپ کا ٹخنہ کاٹ دیا گیا۔ جب چھری کی دھار ہڈی پر

پہنچی، تو آری رکھ کر آپ کا پیر کاٹ دیا گیا اور آپ رضی اللہ عنہ تسبیح و تہلیل اور اللہ اکبر کے ہی اوراد میں مشغول تھے اور کسی نے آپ کو پکڑ کر نہیں رکھا تھا۔ پھر لوہے کے ایک برتن میں آپ کے لیے تیل کو جوش دے کر اس سے زخم کو داغ دیا گیا اور اوپر پٹی باندھ دی گئی۔ تو آپ رضی اللہ عنہ کو افاقہ ہوا اور انہوں نے اپنے مبارک چہرے سے پسینہ پونچھ دیا اور یہ آیہ کریمہ تلاوت فرمائی:

لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا۔(الکھف: ۶۲) — بے شک ہمیں اپنے اس سفر میں بڑی مشقت کا سامنا ہوا۔

جب آپ رضی اللہ عنہ نے اپنا پیر ان کے ہاتھوں میں دیکھا تو اسے لے کر اپنے ہاتھ میں پلٹا پھر فرمایا:

اَمَا وَالَّذِىْ حَمَلَنِىْ عَلَيْكَ اِنَّهٗ لَيَعْلَمُ اَنِّىْ مَا مَشَيْتُ بِكَ اِلٰى حَرَامٍ۔ — قسم ہے اس ذات کی، جس نے مجھے تم پر سوار کیا تھا، بیشک وہ جانتا ہے کہ میں نے کس قدر تیرے ساتھ حرم کعبہ کا سفر کیا ہے۔

(۸) حضرت صلہ بن اشیم رضی اللہ عنہ۔

(۹) حضرت ثابت بن اسلم بنانی رضی اللہ عنہ۔ یہ بزرگ ایک رات دن میں قرآن پاک پڑھا کرتے اور ہمیشہ روزہ دار رہتے۔ پچاس سال آپ نے مسلسل رات بھر کا قیام فرمایا تو اللہ جل شانہ نے انہیں یہ کرامت اور عظمت بخشی کہ انہیں دفن کے بعد قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا گیا۔

(۱۰) حضرت علی بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم، یہ بلند پایہ ہستی کثرت عبادت کے سبب "سجاد" اور "زین العابدین" کے لقب سے معروف تھی۔

(۱۱) حضرت قتادہ بن دعامہ رضی اللہ عنہ۔

(۱۲) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ۔ یہ ایک رکعت میں قرآن پڑھا کرتے تھے۔

(۱۳) حضرت محمد بن واسع رضی اللہ عنہ۔

(۱۴) حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ۔

(۱۵) حضرت سلیمان بن طرخان رضی اللہ عنہ۔ انہوں نے چالیس سال عشاء اور صبح کی نماز ایک وضو سے پڑھی۔

(۱۶) حضرت منصور بن زاذان رضی اللہ عنہ۔ یہ ہر رات دن میں قرآن پاک پڑھا کرتے تھے۔

(۱۷) حضرت علی بن عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہم۔ یہ بزرگ کثرت نماز کی وجہ سے "سجاد" کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

(۱۸) امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ۔ ان کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے چالیس سال عشاء کے وضوء سے فجر کی نماز ادا کی اور ہر رات اور دن میں ایک ایک مرتبہ قرآن پاک پڑھتے اور رمضان المبارک میں دو دو مرتبہ۔

ابن مبارک فرماتے ہیں کہ یہ چاروں بزرگ ائمہ میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے دو رکعتوں میں قرآن پاک ختم کیا۔ یعنی حضرت عثمان بن عفان، تمیم داری، سعید بن جبیر اور ابو حنیفہ رضی اللہ عنہم۔

امام ابو حنیفہ کی پارسائی

ابن مبارک کی مذکورہ شہادت کے علاوہ امام نووی کی "تہذیب الاسماء واللغات" میں امام ابو حنیفہ کے متعلق چند معاصرین بزرگوں کے اقوال بطور شہادت موجود ہیں۔ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) حضرت ابرہیم بن عکرمہ سے مروی ہے کہ "میں نے ابو حنیفہ سے بڑھ کر کوئی فقیہ دیکھا ہے نہ پارسا۔"

(۲) حضرت سفیان بن عینیہ سے مروی ہے کہ "ہمارے دور میں ابو حنیفہ سے بڑھ کر کوئی عبادت گزار مکہ مکرمہ میں نہیں آیا۔"

(۳) حضرت یحییٰ بن ایوب زاہد فرماتے ہیں کہ "ابو حنیفہ رات کو نہیں سوتے تھے۔"

(۴) حضرت ابو عاصم نبیل فرماتے ہیں کہ "ابو حنیفہ کثرت نماز کے سبب وتد (میخ) کے نام سے موسوم تھے۔"

نماز میں خشوع و خضوع اور خشیت الٰہی کی یہ کیفیت تھی کہ آپ رضی اللہ عنہ کے رونے اور گڑگڑانے سے پڑوسیوں کو آپ پر رحم آجاتا اور حفاظت کے لیے دوڑ آتے اور جس جگہ آپ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا وہاں آپ نے سات ہزار مرتبہ قرآن پاک ختم کیا۔

(۵) امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کو حضرت حسن بن عمارہ نے غسل دیا اور بوقت وصال انہوں نے ہی یہ کہا کہ "اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔ تم نے تیس سال افطار نہیں کیا اور نہ ہی چالیس برس تمہارے پہلو نے ٹیک لگائی۔"

اتباع التابعین و اتباعہم کا حال

اسی طرح ہی اکثر اتباع التابعین اور ان سے بعد والے بزرگوں کے بارے میں ثابت ہے جن میں سے ان چند بزرگوں کے نام نہایت قابل ذکر ہیں:

(۱) حضرت سعد بن ابراہیم بن عبد الرحمٰن بن عوف زہری رحمتہ اللہ علیہ۔ یہ بزرگ ہمیشہ روزہ دار رہتے اور روزانہ قرآن پاک ختم فرماتے۔

(۲) حضرت ابراہیم بن ادھم رحمتہ اللہ علیہ۔

(۳) حضرت شعبہ بن حجاج رحمتہ اللہ علیہ۔

(۴) حضرت واصل بن عبد الرحمٰن بصری رحمتہ اللہ علیہ۔

(۵) حضرت وکیع بن جراح کوفی رحمتہ اللہ علیہ۔

یہ سب حضرات بڑے بلند پایہ زاہد اور عبادت گزار تھے۔ ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے اور رات کو قیام فرماتے۔ اور ہر روز ایک قرآن پاک ختم کرتے۔

(۶) حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ۔ یہ ہر روز ختم قرآن کی سعادت سے بہرور ہوتے اور ماہ رمضان المبارک میں ساٹھ قرآن پاک ختم کرتے اور ساری قرات نماز کی حالت میں ہی کرتے۔

(۷) حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ۔ ان کے بارے میں ان کے بیٹے کا کہنا ہے کہ میرے والد ہر دن اور رات میں تین سو رکعات نماز پڑھتے تھے۔ جب کوڑے لگنے کی وجہ سے آپ مریض ہو گئے اور جسم ناتواں ہو گیا تو آپ ہر دن اور رات ایک سو پچاس رکعات نماز پڑھتے تھے اور آپ کی عمر اس وقت اسی برس کے قریب تھی۔ اور آپ ہر روز قرآن حکیم کے ساتویں حصے کی تلاوت کرتے اور اسی طرح ہر سات دنوں میں پورا قرآن پاک ختم کرتے تھے اور آپ کا یہ ختم قرآن پاک ہر سات راتوں میں ہوتا۔ دن کی نمازوں کی قرات اس کے علاوہ ہے۔ آپ نماز عشاء کے بعد تھوڑی سی نیند کرتے۔ پھر اٹھ کر صبح تک نماز اور دعا میں مشغول رہتے۔

(۸) حضرت احمد بن محمد بن سہل بن عطاء ابو العباس رحمتہ اللہ علیہ۔

(۹) حضرت منصور ابو عتاب سلمی کوفی حافظ رحمتہ اللہ علیہ۔

(۱۰) حضرت سلیم بن عترت جیبی تابعی رحمتہ اللہ علیہ۔

(۱۱) حضرت مسعر بن کدام ہلالی کوفی رحمتہ اللہ علیہ۔ جو بڑے پایہ کے محدث ہوئے ہیں۔

(۱۲) حضرت حسن بن صالح بن حیّ ثوری ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ۔

(۱۳) حضرت ابو بشر احمد بن محمد ابن حسنویہ الحسنوی عابد نیشاپوری رحمتہ اللہ علیہ۔

(۱۴) حضرت جعفر بن حسن درزیجانی۔ مقری زاہد فقیہ حنبلی رحمتہ اللہ علیہ۔

یہ سب حضرات ایسے ہیں، جن کی قرات قرآن میں محنت بہت مشہور ہے۔ یہ کم از کم ایک رات میں ایک مرتبہ قرآن پاک ختم کرتے، جبکہ بعض حضرات رات اور دن میں دو دو اور تین تین مرتبہ قرآن پاک ختم کرتے۔

(۱۵) امام ابو محمد عبداللہ بن ادریس بن یزید اودی کوفی رحمتہ اللہ علیہ - یہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشہور اور زیادہ کثرت فرمانے والے ہیں۔ ان کے بارے میں امام نووی رحمتہ اللہ علیہ (شرح صحیح مسلم: ۱/ ۷۸-۷۹) میں فرماتے ہیں کہ ان کی امامت' جلالت' یقین' فضیلت' تقویٰ اور عبادت پر اتفاق ہے۔ ہم نے ان کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹی سے کہا' جب وہ حضور موت کے وقت روئی۔۔۔ کہ "تومت رو' میں نے اس گھر میں چار ہزار مرتبہ قرآن پاک ختم کیا ہے۔"

(۱۶) امام ابو بکر بن عیاش رحمتہ اللہ علیہ' ان کے بارے میں بھی امام نووی رحمتہ اللہ علیہ (شرح صحیح مسلم: ۱/ ۷۹) میں فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کے بیٹے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ مجھے میرے والد نے کہا کہ بے شک تمہارے باپ نے کوئی فحش برائی نہیں کی اور تیس سال سے ہر روز ایک قرآن پاک ختم کرنا اس کا معمول ہے۔ اور ہم نے ان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اے بیٹا! اس کمرہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے سے ڈرنا۔ بے شک میں نے اس میں بارہ ہزار مرتبہ قرآن پاک ختم کیا ہے اور ہم نے ان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹی سے بوقت وصال کہا جب وہ رو رہی تھی۔۔۔ کہ اے بیٹی نہ رو۔ کیا تو ڈر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دے گا۔ میں نے اس کونے میں چوبیس ہزار مرتبہ قرآن پاک ختم کیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ (تہذیب التھذیب: ۱۲/ ۳۶) میں ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "انہوں نے ستر سال روزہ رکھا اور رات کو قیام کیا اور رات کو کسی نے ان کو سوتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

قرات قرآن میں اسلاف کے احوال کا خلاصہ

امام نووی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک جماعت ہر دو ماہ میں قرآن پاک ختم کرتی' کچھ ہر ایک ماہ میں' کچھ دس راتوں میں' کچھ ہر آٹھ راتوں میں اور کچھ ہر سات راتوں میں قرآن پاک ختم کرتے۔ یہ اکثر اسلاف کا معمول ہے۔ جبکہ کچھ ہر چھ

راتوں میں' کچھ ہر پانچ راتوں میں' کچھ ہر چار راتوں میں اور اکثر حضرات ہر تین راتوں میں اور بیشتر ایسے ہیں جو ہر ایک رات اور دن میں قرآن پاک ختم کرتے اور ایک جماعت ہر ایک دن اور رات میں دو اور کچھ تین قرآن پاک ختم کرنے کا معمول رکھتے تھے۔ اور بعض کا تو یہ معمول تھا کہ ہر دن اور رات میں آٹھ قرآن پاک ختم کرتے' چار دن کو اور چار رات میں۔ رات دن میں ختم کرنے کی یہ اکثر تعداد ہے' جو ہم تک پہنچی۔

اور وہ حضرات جن کا ایک رکعت میں یا ایک دن رات میں قرآن پاک ختم کرنے کا معمول تھا' ان کی تعداد شمار سے باہر ہے۔ ان سعادت مند حضرات میں سے حضرت عثمان بن عفان' تمیم داری اور سعید بن جبیر کے نام قابل ذکر ہیں' جنہوں نے کعبہ میں ایک رکعت میں قرآن پاک ختم کیا اور ان میں سے مجاہد اور امام شافعی وغیرہما وہ بزرگ ہیں جو ایک رات اور دن میں قرآن حکیم ختم کرتے اور ابراہیم بن سعد سے مروی ہے کہ میرے والد گرامی پیٹھ اور پنڈلیاں کپڑے سے باندھ لیا کرتے تھے اور وہ کپڑا انہیں کھولتے تھے جب تک قرآن پاک ختم نہ کرلیں۔

اور جو خوش بخت حضرات ایک رات میں تین قرآن پاک ختم کرتے' ان میں حضرت مسلم بن عتر رضی اللہ عنہ کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مصر کے قاضی رہے ہیں۔ ابن ابی داؤد نے روایت کیا ہے کہ "وہ ایک رات میں چار قرآن پاک ختم کرتے" اور ابو عمر کندی نے بھی اپنی کتاب "قضاۃ مصر" میں ان کے بارے میں روایت کیا ہے کہ "وہ ایک رات میں چار قرآن پاک ختم فرمایا کرتے تھے۔"

اور جو حضرات ہفتہ میں قرآن پاک ختم کرتے تھے' ان کی تعداد کثیر ہے۔ حضرت عثمان بن عفان' عبداللہ بن مسعود' زید بن ثابت اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ منقول ہے اور اسی طرح تابعین کی ایک جماعت کے بارے میں

بھی یہی منقول ہے۔ جیسے عبدالرحمٰن بن یزید، علقمہ اور ابراہیم رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہم۔

مختار یہی ہے کہ یہ معمول اشخاص کے حوالے سے مختلف رہا۔ یعنی جس شخص پر دقیق نظر کے باعث قرآن حکیم کے لطائف و معارف ظاہر ہوتے۔ وہ اسی قدر قرات پر اکتفا کرتا، جس کو وہ صحیح طور پر سمجھ سکے۔ اور اسی طرح جو شخص علم دین کی نشرو اشاعت، نظام حکومت یا دیگر دینی مہمات اور دیگر مسلمانوں کی مصلحتوں میں مشغول ہوتا تو وہ اسی قدر قرات پر اکتفا کرتا، جس سے اس کی ذمہ داریوں میں خلل نہ واقع ہو اور نہ اس کا کمال فوت ہو۔ اور جو ان مذکورہ افراد میں سے نہ ہوتا، وہ اس کی کثرت میں ہر ممکن کوشش کرتا، اور صرف اس سے بچتا کہ کہیں یہ عمل طبیعت میں کبیدگی اور قرات میں تیز رفتاری کی حد تک نہ پہنچادے۔

(التبیان فی آداب حملہ القرآن: ۱۱-۱۲، اور الاذکار: ۹۵-۹۶)

توثیق مصادر

امام لکھنوی فرماتے ہیں کہ یہ تمام صحابہ، تابعین اور اتباع التابعین رضی اللہ عنہم فقہاء، محدثین اور ائمہ مجتہدین ہیں جنہوں نے عبادت میں مجاہدہ کا حق ادا کیا اور حق بندگی ادا کرنے میں بلا کی محنت اختیار کی۔ اس وجہ سے وہ حضرات اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے اور وہ بلند پایہ مردان درویش ٹھہرے جن کے ذکر سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے اور ان کے احوال کی سماعت سے زحمت دور ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان بزرگوں کی اقتداء کا شرف بخشے اور کامل ہدایت سے نوازے اور ہمیں بھی ان کے ساتھ درجات عالیہ پر فائز فرمائے۔ آمین۔

میں نے امام ذہبی کی "العبر" اور "سیر اعلام النبلاء"، امام یافعی کی "مراۃ الجنان" اور "الارشاد والتطریز بذکر فضل الذکر و تلاوۃ القرآن العزیز"، امام نووی کی "تہذیب الاسماء واللغات"، ابو نعیم اصبہانی کی "حلیۃ الاولیا" اور سمعانی کی کتاب "الانساب" کا خوب مطالعہ کیا ہے اور ان کے علاوہ دیگر تواریخ اور اسماء الرجال کی

کتب کا بھی مطالعہ کیا۔ بعض ان سے زائد مواد پر مشتمل ہیں اور بعض ان کے عین مطابق۔ تو میں نے مجاہدہ کرنے والے حضرات کا ذکر اتنی زیادہ کثرت سے پایا کہ جس کا حصر ناممکن ہے۔ اور ایک انسان اس کے شمار کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لہٰذا ہم نے جو ذکر کیا' اس کا اکتفاء ہم نے صرف اتنے ہی پر کیا جتنے پر فاضل مصنف نے کفایت کی لیکن ایک جاہل اور ہٹ دھرم کو کوئی چیز نفع نہیں دیتی۔ اگر چہ ہم یہاں بحث طویل ہی کر دیں۔

خود ساختہ وہم کا صریح رد

اگر کوئی کہہ دے کہ یہ مناقب و محاسن' جن کا ان کے حالات میں ذکر کیا گیا ہے' یہ بغیر سند مسلسل کے مذکور ہیں۔ پھر ان پر اعتماد کیسا؟ کیونکہ اس باب میں ان واقعات کی تعبیر یا مشاہدہ سے ہو گی یا خبر مسلسل سے۔

تو اس سلسلے میں ہماری گزارش ہے کہ:

(۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نے "الحلیۃ" سے متصل اور مسلسل سندیں نقل کی ہیں' جو ہمیں کفایت کرتی ہیں۔

(۲) ان مناقب کو ذکر کرنے والے حضرات ایسے نہیں ہیں کہ جن پر اعتماد نہ ہو' یا وہ شخصیات نقل میں حجت نہ ہوں' بلکہ وہ سب کے سب اسلام کے ائمہ اور ستون ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے اقوال کی طرف مشکلات میں رجوع کیا جاتا ہے۔ ان کی اخبار کو قطعی سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً امام ابو نعیم' علامہ ابن کثیر' علامہ سمعانی' حافظ ابن حجر مکی' حافظ ابن حجر عسقلانی' امام سیوطی' ملا علی قاری' شمس الائمہ کردری' امام نووی' شیخ عبدالوہاب شعرانی اور شیخ الاسلام ذہبی اور دیگر وہ حضرات جو ان کے ہم پایہ اور معاصرین ہیں۔

ان لوگوں پر یہ بہتان باندھنا ہے کہ انہوں نے اپنی تصانیف میں وہ کچھ درج کر دیا' جو جھوٹ ہے؟ یا انہوں نے اس نقل پر اعتماد کیا جو جھوٹے لوگوں سے منقول ہے؟

حاشا و کلا بخدا ایسا نہیں۔ وہ بڑے محتاط ائمہ ہیں۔ اپنی تحریروں میں محض نقش و نگار سے کام نہیں لیتے، بلکہ تحقیق کا مغز صفحہ قرطاس پر لاتے ہیں۔ اگر اس بارے میں تمہیں کوئی شک لاحق ہو تو "طبقات" کی طرف رجوع کرو، تم پر ان ثقہ لوگوں کی صداقت کے احوال منکشف ہو جائیں گے۔ اگر ہم اس اعتبار سے دیکھنا شروع کر دیں تو تاریخ اور اسماء رجال کی کتابوں سے اعتماد اٹھ جائے گا۔ کیونکہ وہ اکثر علماء کے مناقب بغیر سند مسلسل کے لکھتے ہیں۔ بلکہ نہایت اختصار سے کام لیتے ہیں۔ اگر کوئی اس بارے میں شک کرے تو قطعاً معلوم ہو گا کہ وہ متعصب، سینہ زور اور خطاب کی حد سے خارج ہے اور سخت ڈانٹ ڈپٹ بھی اس کی شان کے لائق ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اگر تو کہے کہ بعض مجاہدات ایسے ہیں، جن کا واقع ہونا عقل کو تسلیم نہیں تو میں کہتا ہوں کہ ایسے مجاہدات کا وقوع اگرچہ عوام سے خاصہ بعید ہے لیکن اہل اللہ سے بعید نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے انہیں قوت ملکیہ عطا کی ہے جس کے ساتھ انہوں نے ایسی صفات تک رسائی حاصل کی ہے۔ اس کا انکار صرف وہی کرے گا جو کرامات کے صدور اور خوارق عادات کے ظہور کا منکر ہو۔

جب تیرا اس مسئلہ میں زیادہ ہی بحث اور تحقیق کا ارادہ ہو تو تجھے لازم ہے کہ علامہ محقق محدث امام ابوالحسنات محمد عبدالحئ لکھنوی ہندی کی عظیم تالیف اقامہ الحجہ علی ان الاکثار فی التعبد لیس ببدعہ کا مطالعہ کرے، جو علامہ عبدالفتاح ابوغدہ کی تحقیق سے شائع ہوئی۔ انشاء اللہ تعالیٰ کافی تشفی ہو گی اور بہت فائدہ ہو گا۔ یہ قابل اعتماد ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر وسیع رحمت فرمائے، آمین۔

حضور سید عالم ﷺ کا قیام لیل

موطا امام مالک، صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، جامع ترمذی اور سنن

نسائی میں ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی رمضان المبارک میں کیا کیفیت ہوتی؟ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

مَا كَانَ يَزِيدُ فِيْ رَمَضَانَ وَلَا فِيْ غَيْرِهِ عَلَى إِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً يُصَلِّيْ أَرْبَعًا فَلَا تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُوْلِهِنَّ ثُمَّ يُصَلِّيْ أَرْبَعًا فَلَا تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُوْلِهِنَّ ثُمَّ يُصَلِّيْ ثَلَاثًا۔	رمضان ہو یا غیر رمضان' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ چار رکعت نماز پڑھتے اور اس نماز کے حسن اور طول کی بابت مت پوچھو پھر چار رکعت نماز پڑھتے اور ان کے حسن اور طول کی بات مت پوچھو' اس کے بعد تین رکعت (وتر) پڑھتے۔

(موطا' باب صلاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی الوتر: ۱/۲۴۶' صحیح بخاری' کتاب التہجد' باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم باللیل: ۳/۴۱' صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین' باب صلاۃ اللیل: ۶/۴۶)

اس روایت کے ظاہر سے بعض حضرات نے یہ اخذ کیا کہ یہی سنت مشروعہ ہے' کیونکہ اس حدیث شریف میں ما کان کے لفظ سے حصر وارد ہے۔ پھر بعض متعصبین کی سمجھ اس سے بھی بڑھ گئی اور کہنے لگے کہ اس تعداد پر زیادتی کرنا دین میں بدعت ہے اور جو اس پر زیادتی کرے وہ بدعتی اور سنت کا مخالف ہے۔ اور کبھی کبھی اسے گمراہ تک کے لقب سے نواز دیتے ہیں اور دلیل یہ کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

بلاشبہ یہ سوچ سمجھ بالکل فاسد ہے اور کم عقلی اور محدود فکر کی دلیل ہے اور درج ذیل امور سے اس فاسد اور غیر معتبر رائے کا مردود اور لاشئی ہونا واضح ہو جاتا ہے:

(۱) اس سلسلے میں خود ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات مختلف

ں جو اسی قدر تعداد رکعات پر متفق نہیں بلکہ اس کے علاوہ بھی تعداد وارد ہے اور
ام روایات صحیح میں ہیں' کسی ایک کو دوسری پر فضیلت بھی نہیں۔

قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن ہشام نے ام
مومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے:

قِيَامُ النَّبِيِّ ﷺ بِتِسْعِ رَكْعَاتٍ۔	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نو رکعت پڑھتے۔

اور عروہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا:

بِإِحْدٰى عَشَرَةَ مِنْهُنَّ الْوِتْرُ يُسَلِّمُ مِنْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَكَانَ يَرْكَعُ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ إِذَا جَاءَهُ الْمُؤَذِّنُ۔	حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وتر سمیت گیارہ رکعت پڑھتے اور ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرتے اور جب موذن آتا تو (سنت) فجر کی دو رکعت پڑھتے۔

اور ام المومنین سے ہشام بن عروہ وغیرہ کی روایت ہے:

ثَلَاثَ عَشَرَةَ بِرَكْعَتَيِ الْفَجْرِ۔	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو رکعت سمیت کل تیرہ رکعت پڑھتے۔

اور ام المومنین رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے:

كَانَ لَا يَزِيدُ فِي رَمَضَانَ وَلَا غَيْرِهِ عَلٰى إِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً أَرْبَعًا أَرْبَعًا وَثَلَاثًا۔	رمضان ہو یا غیر رمضان' آپ صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے' چار رکعت پڑھتے' پھر چار رکعت پڑھتے اور تین رکعت (وتر) پڑھتے۔

اور ام المومنین رضی اللہ عنہا سے یہ بھی مروی ہے:

كَانَ يُصَلِّي ثَلَاثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً ثَمَانِيًا ثُمَّ يُوتِرُ ثُمَّ	آپ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ رکعت پڑھتے تھے۔ پہلے آٹھ رکعت پڑھتے' پھر وتر

يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ ثُمَّ يُصَلِّي رَكْعَتَي الْفَجْرِ. | پڑھتے پھر دو رکعت پڑھ کر بیٹھے رہتے، پھر فجر کی دو رکعت ادا فرماتے۔

اور دوسری حدیث میں اس کی وضاحت وارد ہے کہ فجر کی دو رکعتیں الگ ہیں۔ گویا صحیح بخاری میں ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

إِنَّ صَلَاتَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاللَّيْلِ سَبْعٌ وَتِسْعٌ. | حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز سات اور نو رکعت ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے اس کے بعد ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو ذکر کیا:

إِنَّ صَلَاتَهُ ﷺ مِنَ اللَّيْلِ عَشَرَةَ رَكْعَةً وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْفَجْرِ سُنَّةَ الصُّبْحِ. | بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز تیرہ رکعت ہے اور فجر کے بعد مزید دو رکعت صبح کی سنت ہیں۔

اور زید بن خالد کی حدیث میں ہے:

إِنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ ثُمَّ طَوِيلَتَيْنِ. | حضور صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعت ہلکی ہلکی پڑھتے اور پھر دو رکعت لمبی لمبی۔

اور حدیث کے آخر میں ذکر کیا:

فَتِلْكَ ثَلَاثَ عَشَرَةَ. | یہ تیرہ رکعت ہوئیں۔

قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس، زید اور عائشہ رضی اللہ عنہم میں سے ہر ایک کی خبر اپنے اپنے مشاہدہ پر مبنی ہے۔ علماء کا یہی کہنا ہے۔ رہا حدیث عائشہ میں اختلاف کا پایا جانا، تو ایک قول کے مطابق یہ اختلاف ام المومنین سے ہی وارد ہے اور یہ بھی منقول ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا سے روایت کرنے والوں سے اختلاف وارد ہے۔ بہرحال ممکن ہے کہ گیارہ رکعت والی خبر ہی زیادہ غالب ہو۔

اور باقی روایات کی خبر کبھی کبھی واقع ہوئی ہو۔ لہٰذا اکثر تعداد فجر کی دو رکعت سمیت پندرہ اور اقل سات ہے۔ یہ وقت کی وسعت یا تنگی کے پیش نظر قرات کی طوالت کے سبب کمی و بیشی ہوتی رہتی۔ جیساکہ حذیفہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی حدیث میں وارد ہے۔

یا یہ فرق بعض اوقات نیند، عذر مرض وغیرہ کی وجہ سے واقع ہوتا یا آخر عمر شریف میں کبھی کبھی ایسا ہوتا، جیساکہ ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

فَلَمَّا اَسَنَّ صَلّٰی سَبْعَ رَکْعَاتٍ. جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی عمر شریف میں تھے تو سات رکعت پڑھتے۔

یا ممکن ہے کہ سیدہ رضی اللہ عنہا قیام لیل کے شروع میں دو ہلکی رکعت کا کبھی کبھی شمار کرتیں۔ جیساکہ زید بن خالد کی روایت ہے اور ام المومنین کی اپنی روایت بھی اس کے بعد "مسلم" میں ہے۔ اور کبھی فجر کی دو رکعت کا شمار کر لیتیں اور کبھی انہیں حذف کر دیتیں یا ان میں سے ایک کو شمار کرتیں۔ یعنی پہلی دو ہلکی رکعت کو یا فجر کی دو رکعت کو۔ اور کبھی کبھی عشاء کے قیام کو بھی ساتھ شمار کرتیں اور کبھی اسے حذف کر دیتیں۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ بلا خلاف اس میں کوئی حد ہے نہ حصر، کہ اس پر نہ زیادتی کی جائے نہ کمی۔ یقیناً رات کی نماز بہت بڑی نیکی ہے۔ جتنی اس میں زیادتی ہوگی، اتنا ہی اجر زیادہ ہوگا۔ البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل میں اختلاف ہے جو آپ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے اختیار فرمایا۔

(صحیح مسلم بالنووی: ٦/١٦)

(٢) یہ تعداد جس کو ان لوگوں نے سنت سمجھا اور اس کی علاوہ کو بدعت ٹھہرایا، حالانکہ اس معینہ تعداد کے علاوہ بھی نصوص وارد ہیں۔ مثلاً حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعت پڑھائیں جس کے لفظ یہ ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے ہمیں ماہ رمضان میں آٹھ رکعت اور وتر پڑھائے۔ جب دوسری رات ہم مسجد میں اس امید پر جمع ہوئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے۔ ہم صبح تک انتظار کرتے رہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ہم مسجد میں اس امید پر اکٹھے ہوئے تھے کہ آپ ہمیں نماز پڑھائیں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنِّیْ خَشِیْتُ اَوْ کَرِهْتُ اَنْ تُکْتَبَ عَلَیْکُمُ الْوِتْرُ۔	مجھے یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں تم پر وتر واجب نہ ہو جائیں۔

(صحیح ابن حبان: ۶/۵)

ہمارے شیخ علامہ شیخ محمد زکریا کاندھلوی شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ حدیث جابر محل کلام ہے کیونکہ اس کا مدار عیسیٰ بن جاریہ پر ہے جس میں کلام ہے۔

(اوجز المسالک: ۲/ ۳۸۶)

اور ہمارے شیخ علامہ شیخ محمد یوسف بنوری شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ یہ تو مسلم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعت نماز تراویح پڑھائی لیکن یہ کسی روایت میں ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں نماز تراویح اور تہجد علیحدہ علیحدہ پڑھی ہو۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں تراویح اور تہجد میں فرق نہیں تھا۔ یعنی جیسا کہ آج ہمارے یہاں مساجد میں ہوتا ہے کہ ابتدائے رات میں نماز تراویح کی باقاعدہ جماعت ہوتی ہے اور آخری عشرہ میں نصف رات کے بعد دوسری مرتبہ نماز تہجد کی جماعت کھڑی ہوتی ہے۔ مگر دراصل بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تراویح پڑھائیں اور رکعات کو لمبا کیا۔ رکعات میں فرق نہیں رکھا بلکہ وقت اور صفت میں فرق تھا۔ لہٰذا نماز تراویح ابتدائے رات کو مسجد میں باجماعت ہے جبکہ تہجد آخر رات میں۔ گھر میں بغیر جماعت کے پڑھی جاتی ہے۔ (معارف السنن شرح الترمذی: ۷/ ۵۴۴)

(۳) اس باب میں اور بھی نص وارد ہے جو بیس رکعت تراویح کو مفید ہے اور یہی تعداد ممالک اسلامیہ میں مشہور ہے اور اسی پر اکثر لوگوں کا عمل ہے اور حرمین شریفین میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر آج تک اسی تعداد پر عمل ہو رہا ہے۔ اور مشرق و مغرب کے بڑے بڑے شہروں میں اسی پر عمل ہے۔ بہرحال ہم امام کے ساتھ گیارہ، آٹھ یا دس رکعت پڑھ کر نکل جانے والے کا رد نہیں کرتے لیکن حقیقتاً رد ان کے اس دعوے کا ہے کہ یہی تعداد سنت ہے اور اس کے علاوہ سب بدعت ہے۔ اور جس نے اس سے تعداد زیادہ کی اور تراویح کے نام پر بیس رکعت پڑھیں وہ بدعتی ہے۔ حالانکہ یہ دعویٰ خود بدعت ہے جس کی مکمل تردید ضروری ہے۔ اور یہ بھی اس دعوے کی ایک شق ہے کہ جس نے امام اول کے ساتھ دس رکعت پڑھیں پھر اس کے ساتھ پھر گیا تو اس کے لیے شب رمضان کے قیام کی فضیلت ثابت نہیں۔ یعنی اس کے لیے نماز تراویح کا ثواب نہیں۔ ان کا مقصود یہ ہے کہ اسے ثواب اور اجر تو ہو گا لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس نے نماز تراویح پڑھی۔

اس صورت کا انکار دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر جرات کرنا ہے۔ جو خود عین بدعت اور پرلے درجے کی جہالت ہے۔

بیس رکعت تراویح کا ثبوت

جب یہ معلوم ہوا تو جان لو کہ مرفوع حدیث وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیس رکعت پڑھیں۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "نبی کریم ﷺ رمضان المبارک میں وتر کے علاوہ بیس رکعت پڑھا کرتے تھے۔"

اس کو ابن ابی شیبہ، امام طبرانی اور حافظ بیہقی نے روایت کیا ہے اور فقیہ ابو الفتح سلیم بن ایوب رازی نے "کتاب الترغیب" میں اسے روایت کرنے کے بعد کہا کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھتے۔"

(المصنف: ۶/ ۳۹۴، معجم الطبرانی الکبیر: ۱۱/ ۳۱۱ اور سنن البیہقی: ۲/ ۴۹۶)

امام لکھنوی کہتے ہیں کہ اسے عبد بن حمید نے اپنی مسند میں ابو نعیم سے 'ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان سے سنداً اور متناً نقل کیا ہے۔

امام بغوی نے اسے معجم میں منصور بن ابی مزاحم سے 'ابو شیبہ ابراہیم سے نقل کیا ہے اور امام طبرانی نے بھی اسے ابو شیبہ کے طریق سے نقل کیا ہے۔

حافظ ابن حجر "تخریج احادیث الرافعی" میں فرماتے ہیں:

امام رافعی کے قول: کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دو راتیں بیس بیس رکعت پڑھائیں' تیسری رات لوگ جمع ہوئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہ لائے' پھر صبح کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مجھے ڈر تھا کہ تم پر فرض نہ ہو جائے) کی صحت پر اتفاق ہے' اور یہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ صحیح ہے۔ امام بخاری نے یہ اضافہ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا تو معاملہ اسی طرح تھا۔

جہاں تک تعداد کا تعلق ہے تو ابن حبان نے "صحیح" میں حدیث جابر سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ رکعت اور وتر پڑھائے تو یہ امام رافعی کے قول کے مباین ہے۔ ہاں بیس رکعت کی تعداد دوسری حدیث میں وارد ہے جس کو امام بیہقی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں بغیر جماعت کے بیس رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے۔"

حافظ بیہقی کہتے ہیں کہ اس میں ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان متفرد ہیں جو کہ ضعیف ہیں۔

موطا' مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "لوگ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس جمع ہو جاتے اور وہ انہیں بیس رکعت پڑھایا کرتے۔" (تخریج احادیث الرافعی)

علامہ زیلعی کی "تخریج احادیث الہدایہ" میں ہے کہ ابن ابی شیبہ نے مصنف

میں اور امام طبرانی نے اور ان سے حافظ بیہقی نے ابراہیم بن عثمان ابو شیبہ کی حدیث کو حکم سے 'مقسم سے 'حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں نماز وتر کے علاوہ بیس رکعت پڑھا کرتے تھے۔"

فقیہ ابو الفتح سلیم بن ایوب رازی نے اپنی کتاب "الترغیب" میں یہ اضافہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر تین رکعت پڑھتے تھے۔ یہ امام ابوبکر بن ابی شیبہ کے دادا ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان کے طریق سے معلوم ہے کیونکہ اس کے ضعف پر اتفاق ہے۔ ابن عدی نے "الکامل" میں اسے ضعیف کہا۔

امام سبکی شافعی کی "شرح المنہاج" میں ہے کہ یہ منقول نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان راتوں میں کتنی رکعت پڑھیں 'کیا وہ بیس تھیں یا اس سے کم' لیکن ہمارا مذہب یہ ہے کہ نماز تراویح بیس رکعت ہے 'اس لیے کہ امام بیہقی وغیرہ نے صحیح سند کے ساتھ سائب بن یزید سے روایت کیا ہے:

كُنَّا نَقُوْمُ فِيْ عَهْدِ عُمَرَ بِعِشْرِيْنَ رَكْعَةً وَالْوِتْرَ — ہم عہد فاروقی میں بیس رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے۔

اور میں نے سعید بن منصور میں بیس اور چھتیس رکعت نماز کے آثار دیکھے ہیں۔ لیکن وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ کے بعد کی بات ہے۔

علامہ ابن حجر ہیتمی شافعی کی "شرح المشکوۃ" میں ہے کہ ہمارے بعض ائمہ کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیس رکعت پڑھائیں۔ شاید کہ انہوں نے مصنف ابن ابی شیبہ کی اس روایت سے اخذ کیا ہو کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں بیس رکعت پڑھتے" اور امام بیہقی کی اس روایت سے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دو راتیں بیس رکعات دس سلاموں کے ساتھ پڑھائیں" اور "تیسری رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہ لائے۔" لیکن یہ

دونوں روایتیں ضعیف ہیں۔ صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں ہے کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں آٹھ رکعت اور وتر پڑھائے" لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہے کہ تراویح بیس رکعات ہیں۔

امام جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ کی "المصابیح فی صلوۃ التراویح" میں ہے کہ جو صحیح، حسن اور ضعیف احادیث رمضان المبارک کے قیام اور اس کی ترغیب میں وارد ہیں۔ وہ تعداد کی تخصیص کے بغیر ہیں اور یہ ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس رکعت پڑھیں اور بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے راتوں کو نماز پڑھی اور تعداد کا ذکر نہیں فرمایا۔ پھر چوتھی رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم تاخیر سے تشریف لائے اور فرمایا کہ "مجھے ان کے فرض ہونے کا خدشہ ہوا۔"

خلاصہ کلام

(۱) بلاشبہ رمضان المبارک کا قیام سنت موکدہ ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دلائی اور اس سلسلے میں پہلے ذکر کی گئی احادیث کے علاوہ بھی کثیر احادیث وارد ہیں اور بعض میں اس کے سنت ہونے کی تصریح ہے، چنانچہ علامہ عقیلی نے اسے روایت کیا اور ضعیف کہا اور ابن خزیمہ نے اپنی "صحیح" میں اسے درج کیا اور امام بیہقی اور خطیب نے بھی روایت کیا اور علامہ اصبہانی نے کتاب "الترغیب" میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا:

خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی آخر یوم من شعبان فقال: یاایھا الناس قد اظلکم شھر عظیم مبارک شھر فیہ لیلۃ خیر من الف شھر جعل اللہ صیامہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری دن ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تمہارے پاس ایک عظیم اور مبارک مہینہ تشریف لا رہا ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزے

فریضۃ وقیام لیلہ تطوعا من تقرب فیہ بخصلۃ من الخیر کان کمن ادی فریضۃ فیما سواہ۔ ومن ادی فریضۃ فیہ کان کمن ادی سبعین فریضۃ فیما سواہ۔

فرض کیے ہیں اور اس کی رات کا قیام نفل ٹھہرایا جو اس میں ایک نفلی نیکی کرے گا تو وہ دوسرے مہینوں میں فرض ادا کرنے کے برابر ہے اور جو اس میں فرض ادا کرے گا تو وہ اس کے باقی مہینوں میں ستر فرض ادا کرنے کے برابر ہو گا۔

ابن ابی شیبہ، امام نسائی، ابن ماجہ اور امام بیہقی نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کا ذکر کیا اور فرمایا:

شھر فرض اللہ صیامہ، و سننت انا قیامہ، فمن صامہ وقامہ ایمانا واحتسابا خرج من ذنوبہ کیوم ولدتہ امہ۔

اس ماہ کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے اور اس کی رات کا قیام میں نے سنت ٹھہرایا تو جس نے اس کے روزے اور قیام ایمان اور ثواب کی نیت سے لازم کیا تو وہ اپنے گناہوں سے ایسے نکلا جیسے اس کی والدہ نے اسے آج جنم دیا۔

امام بیہقی نے ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل رمضان لم یات فراشہ حتی ینسلخ۔

جونہی رمضان المبارک داخل ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بستر کے قریب نہ آتے، حتیٰ کہ رمضان گزر جاتا۔

اصبہانی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جونہی آخری عشرہ کی پہلی رات آتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آستین چڑھا لیتے اور کمر کس کر باندھ لیتے۔ گھر سے نکل جاتے اور شب بھر بیداری فرماتے۔ کسی نے پوچھا کہ کمر کس کر

باندھنے کا کیا مطلب ہے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان راتوں میں عورتوں سے جدا رہتے۔

امام بخاری و مسلم 'ابوداؤد 'نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جونہی رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تو اپنی کمر کس کر باندھ لیتے اور شب بھر بیدار رہتے اور اپنے اہل کو بیدار فرماتے۔"

(۲) رمضان المبارک کا قیام باجماعت سنت موکدہ ہے 'کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض راتوں کو باجماعت قیام فرمایا۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرض ہونے کا خوف نہ ہوتا تو اس پر ہمیشگی فرماتے۔ تو یہ امر بھی ایسا ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حکماً ہمیشگی فرمائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس پر حکماً ہمیشگی فرمائیں ' وہ سنت ہے جیسا کہ اس کی تفصیل گزر گئی۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے نماز تراویح باجماعت پڑھنے کا حکم فرمایا اور مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ امام مقرر کیا۔ اس امر پر وہ خوش ہوئے اور اچھا عمل قرار دیا۔

(۳) بے شک نماز تراویح بیس رکعت پڑھنا سنت موکدہ ہے۔ کیونکہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے اس پر ہمیشگی فرمائی۔ اگرچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ہمیشگی نہیں فرمائی۔

○۔سوال: خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی بیس رکعت پر ہمیشگی ثابت نہیں۔

☆ - جواب: تشریعی ہمیشگی قطعاً ثابت ہے جو کہ بہرصورت لازم ہے جس کی تفصیل اوپر گزر گئی۔

○ - سوال: یہ مبارک حدیث "علیکم بسنتی و سنہ الخلفاء الراشدین" (تم پر میری اور خلفاء راشدین کی سنت لازم ہے) اس امر کے لزوم پر دال ہے جو خلفاء اربعہ کا معمول ہے اور بیس رکعت تراویح کا معاملہ ایسا نہیں 'کیونکہ

وہ خلفاء کے دور میں نہیں تھی' تو پھر کیسے لازم ٹھہریں۔

☆-جواب: یہ لام جو جمع پر داخل ہے' دراصل عہد کے لیے نہیں استغراق کے لیے ہے اور استغراق بھی انفرادی ہے نہ کہ مجموعی۔ گویا کہ یہ لام استغراق افراد کے لیے ہے جیسا کہ توضیح اور تلویح وغیرہما کتب فقہ میں ثابت ہے۔

حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا اور اقوال ائمہ

اور جو وہ ذکر کرتے ہیں کہ بیس رکعت والی روایت اس حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے مخالف ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان ہو یا غیر رمضان' بیس رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے" تو اس پر مفصل کلام گزر گیا۔

امام ابو عبداللہ قرطبی

امام قرطبی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایات کثیر علماء پر مشکل ہو گئیں۔ حتیٰ کہ بعض نے تو ان کی حدیث کو اضطراب کی طرف منسوب کر دیا۔ لیکن یہ تب ہو سکتا ہے جب ان سے روایت کرنے والا ایک فرد ہو اور انہوں نے بھی ایک ہی وقت کی خبر دی ہو۔ بہرحال حق بات یہ ہے کہ جو بھی ام المومنین رضی اللہ عنہا نے اس بارے میں روایت کیا' وہ متعدد اوقات اور مختلف احوال پر محمول ہے جو رضا و رغبت اور بیان جواز کے اعتبار پر دال ہے۔ اس کو علامہ ابن حجر نے "فتح الباری" میں ذکر کیا۔

اس سے یہ بات اظہر من الشمس ہوئی کہ "کان لا یزید....." والی حدیث مطلقاً زیادتی کی نفی پر دلالت نہیں کرتی۔ اگرچہ ایک ہی وقت کے بارے خبر ہو' بلکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غالب معمول کی خبر ہے۔

ایک وہم کا رد

بعض حضرات نے احادیث زیادت کا یہ کہہ کر رد کر دیا کہ اگر رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم سے یوں واقع ہوتا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر مخفی نہ ہوتا۔

اس کا جواب علامہ لکھنوی نے یوں دیا ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ "اگر یوں واقع ہوتا تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر مخفی نہ رہتا" بڑی عجیب بات ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی دو رکعت کے علاوہ تیرہ رکعت نماز حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر پڑھی۔ تو پھر اس کا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر مخفی رہنا کوئی بعید نہیں۔

امام بخاری، مسلم، ابو داؤد، بیہقی، امام احمد، امام حاکم، ابو علی، بزار، ابن عدی، نسائی اور سعید بن منصور نے نماز چاشت کے بارے میں نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار نماز چاشت ادا کی۔ باوجودیکہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر یہ مخفی رہا۔ حتیٰ کہ امام بخاری نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں:

مَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ يُسَبِّحُ سُبْحَةَ الضُّحٰى۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی نماز چاشت پڑھتے نہیں دیکھا۔

اور امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن شقیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا:

اَکَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي الضُّحٰى؟ قَالَتْ: لَا اِلَّا اَنْ يَّجِيْءَ مِنْ مَّغِيْبِهٖ۔

کیا نبی کریم ﷺ چاشت کی نماز پڑھتے تھے؟ تو انہوں نے کہا نہیں، مگر یہ کہ آپ ﷺ کسی سفر سے واپس تشریف لائیں۔

امام جلال الدین سیوطی

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بعض رسائل میں یہ وضاحت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ہی نہیں ہوتے تھے، بلکہ جمیع اوقات میں کچھ وقت ان کے پاس ہوتے۔ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسافر ہوتے اور کبھی مقیم۔ نیز دوران اقامت بھی کبھی مسجد وغیرہ میں ہوتے۔ اور

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف فرما ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نو بیویاں ہیں اور ان سب کے لیے وقت کا حصہ مقرر ہوتا تو اس اعتبار سے نماز چاشت کا وقت بھی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس کبھی کبھی گزرتا اور ان اوقات میں انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز چاشت پڑھتے نہ دیکھا ہوگا تو فرمادیا: "میں نے نہیں دیکھا۔"

لہٰذا معلوم ہوا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا انکار' ایک فعل نبوی کا ہے اور اس کا بھی ایک وقت میں حصر ہے تو یہ ماسوا کی نفی پر دال نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس رکعت مسجد میں' یا کسی اور بیوی کے گھر میں پڑھی ہوں اور یہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر مخفی رہا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں گیارہ رکعت ہی پڑھی ہوں اور اس پر زیادتی نہ کی ہو۔ تو ان کی یہ خبر اپنے علم کے اعتبار سے ہے۔ (تحفۃ الاخبار باحیاء سنہ سید الابرار: ۱۳۴)

متعدد روایات کا صحیح مفہوم

مسئلہ صلوۃ اللیل میں اختلاف مذکور ہوا اور اس سلسلے میں نبی کریم رؤف رحیم علیہ الصلوۃ والتسلیم سے متعدد روایات منقول ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ہر صحابی نے اپنے مشاہدہ کے مطابق خبر دی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے تیرہ رکعت اور ایک روایت میں وتر کے علاوہ بیس رکعت کی خبر دی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آٹھ رکعت اور وتر کا کہا۔ حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ نے تیرہ رکعت کا بیان کیا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سات رکعت سے لے کر پندرہ رکعت تک مختلف روایات ہیں۔

یہ تناقض نہیں کیونکہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کی گیارہ رکعت والی خبر غالب ہے۔ اور باقی روایات ان امور سے متعلق ہیں جو بعض اوقات کبھی کبھی وقوع پذیر ہوئے' لہٰذا اکثر تعداد فجر کی دو رکعت سمیت پندرہ اور کم سے کم سات ٹھہری اور یہ

تفاوت وقت کی وسعت یا تنگی کے اعتبار سے ہے۔ لمبی قرات بھی اس کا ایک سبب ہے' جیسا کہ حذیفہ اور ابن مسعود کی حدیث میں وارد ہے یا نیند یا عذر مرض وغیرہ کالاحق ہونا ہے یا اخیر عمر شریف میں بعض اوقات کمی کرنا ہے' جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم معمر ہوئے تو سات رکعت پڑھتے یا سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا قیام لیل کی پہلی دو ہلکی رکعتوں کو شمار کر لیتیں۔ جیسا کہ زید بن خالد نے اسے روایت کیا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو بعد میں ذکر کیا۔ یہ مسلم میں ہے اور آپ رضی اللہ عنہا کبھی فجر کی دونوں رکعتوں کو شمار کرتیں اور کبھی حذف کر دیتیں یا ایک کو شمار کر لیتیں۔ نیز کبھی کبھی عشاء کی دو رکعت (سنتوں) کو بھی ساتھ شمار کرتیں اور کبھی حذف کر دیتیں۔ یہ اختلاف اس باب میں وارد ہے لیکن یہ کوئی ایسا اختلاف نہیں جو مذموم اور ممنوع ہو۔ بشرطیکہ ایک حقیقت علمیہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اخذ' رد' استنباط اور تصحیح و ترجیح میں بحث علمی کے قواعد کا پورا پورا لحاظ ہو۔ اور یہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے فعل مبارک کی تحقیق ہے اور اس عمل کی جو انہوں نے اپنی ذات کے لیے اختیار کیا۔ لہذا یہ صحیح نہیں کہ اس اختلاف کو انکار کی حد تک بڑھا دیا جائے اور جو اس عمل خیر میں زیادتی کرے' بندگی میں کوشش اور عبادت میں کثرت کرے' اس پر شد و مد سے انکار کیا جائے۔ کیونکہ بعض نام نہاد اہل علم اس اختلاف کو وسیلہ بناتے ہیں تاکہ گیارہ رکعت سے زائد پڑھنے والے پر رد و انکار اور بدعت' ضلالت اور فسق کا حکم ثبت کیا جائے اور کہتے ہیں کہ دین میں زیادتی بدعت ہے اور اس کا نام تراویح نہیں بلکہ بعض کا حال تو اتنا قابل تماشا ہے کہ وہ اس پر ثواب اور قبولیت کا بھی حکم صادر کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور وہ بے دھڑک پکار اٹھتے ہیں کہ ان زائد رکعات پر تراویح کا ثواب نہیں ملے گا اور ثواب محض نماز پر ہے۔ بلاشبہ یہ تقسیم اختراعی اور من گھڑت ہے اور اس کا مقصد محض بیس رکعت پڑھنے والوں کا رد ہے۔ یقیناً یہ نظریہ

ایک کم عقل اور محدود فکر کی فاسد سوچ کا نتیجہ ہے۔ نہ اسے حکمت شرعیہ کی پہچان ہے اور نہ ہی شریعت اسلامیہ کی روح سے شناسائی۔ ذرا غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس کا یہ موقف خود عین بدعت اور عنوان ضلالت ہے۔ اس باب میں جو اختلاف علماء ذکر فرماتے ہیں اس لیے نہیں کہ ایک عمل کی حد بندی کی جائے اور زیادتی پر بدعت و ضلالت کا حکم لگایا جائے یا اس سے کثرت کرنے والے پر بدعتی اور گمراہ کا حکم نافذ کیا جائے۔ بلکہ اس اختلاف کا مقصد صرف اور صرف نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے فعل مبارک کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنا ہے جو انہوں نے اپنی ذات کے لیے اختیار کیا۔ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب بے شمار امور میں اختلاف ہے جس کا منشاء طلب حقیقت اور ہر اس قول 'فعل یا تقریر کی معرفت ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے۔ تاکہ اس اصول پر مبنی سنت مطہرہ کی خدمت ہو جائے۔

بہر حال نماز جو تراویح' قیام لیل یا کسی اور نام سے موسوم ہو' بلاشبہ بھلائی میں زیادتی اور نیکی کی کثرت ہے۔ اسی مسئلہ پر عظیم امام قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ نے تنبیہ فرمائی ہے۔ گویا کہ انہیں مابعد ہونے والے کا کشف ہوا اور بلاشبہ ہمارے نزدیک یہ کرامت سے خالی نہیں۔ نہ یہ عجب ہے اور نہ ہی اولیاء اللہ پر بھاری۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں "بلا خلاف امر یہ ہے کہ اس مسئلہ میں حد بندی نہیں کہ جس پر نہ زیادتی ہو نہ کمی۔ بے شک رات کی نماز نیکی ہے۔ جتنی اس میں زیادتی کی جائے گی' اجر و ثواب زیادہ ہو گا۔ البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک فعل اور اختیار کردہ عمل میں اختلاف ہے۔" واللہ اعلم بالصواب۔ (شرح النووی' علی صحیح مسلم : ۲/ ۱۸)

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی توفیق سے ہے اور وہی صراط مستقیم کی ہدایت دینے والا ہے۔

مسلمان اور کافر میں فرق

حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "انسان اور کفرو شرک میں فرق نماز نہ پڑھنا ہے۔"

امام مسلم نے اپنی صحیح کے کتاب الایمان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:

اَنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ اَوِالْكُفْرِ تَرْكَ الصَّلٰوةِ	بے شک انسان اور کفرو شرک میں نماز نہ پڑھنے کا واضح فرق ہے۔

(صحیح مسلم بالنووی: ۲/۷۰)

نیز اصحاب سنن نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

اسی سلسلہ میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

العهد الذی بيننا وبينكم الصلاة فمن تركها فقد كفر۔	ہمارے اور تمہارے درمیان نماز فاصل ہے۔جس نے اسے ترک کیا' بلاشبہ کفر کیا۔

علامہ شوکانی کہتے ہیں کہ اس حدیث کو اصحاب خمسہ نے روایت کیا اور امام نسائی اور عراقی نے اس کی تصحیح کی۔ نیز ابن حبان اور امام حاکم نے اسے روایت کیا۔

(نیل الاوطار: ۲/ ۱۵)

ہم کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ لہٰذا اس میں ایک قول کا اطلاق صحیح نہیں کہ ایک قول پر حکم لگایا جائے اور دوسرے قول کو نظر انداز کر دیا جائے۔ لہٰذا واعظ اور مفتی پر ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو جمیع اطراف سے بغور دیکھے اور جمیع نصوص و روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فتویٰ دے اور اس مسئلہ میں علماء کی آراء کا بھی پورا پورا لحاظ رکھے۔ تاکہ تمام مفاہیم اس پر واضح ہو جائیں جو ان نصوص سے مستنبط ہیں اور علمی بحث کے میدان میں بھی ہر گوشہ پر نظر ہو جائے۔ پھر اس کے بعد جس قول کی

ترجیح یا تصحیح چاہے' کرے۔ انصاف پسند علماء کی یہی شان ہے۔ امام شوکانی کا شمار بھی انہیں میں ہے جنہوں نے جمہور کی طرح اس مسئلہ میں اختلاف دیکھا تو تمام نصوص کو اکٹھا کیا اور ہر ایک فریق کے لیے ایک خاص باب مرتب کیا اور فرمایا (باب حجۃ من كفر تارك الصلٰوة) پھر اس کے بعد کہا (باب حجۃ من لم يكفر تارك الصلٰوة) پہلے باب میں مذکورہ حدیث جابر کی تشریح کی کہ "انسان اور کفرو شرک کے درمیان نماز نہ پڑھنے کا فرق ہے۔" یہ حدیث اس امر پر دال ہے کہ نماز نہ پڑھنا کفر کے موجبات سے ہے اور مسلمانوں میں اس شخص کے کفر کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں جو اس کے وجوب کا منکر ہو۔ علاوہ اس کے جو ابھی نو مسلم ہو یا اسے مسلمانوں کی صحبت میسر نہ آئی ہو جس میں اسے نماز کے وجوب کی تبلیغ کی گئی ہو۔ اگر کوئی شخص محض سستی کی بنا پر نماز کا تارک ہو اور اس کے وجوب کا اعتقاد رکھتا ہو' جیسا کہ اکثر و بیشتر لوگوں کا حال ہے ائمہ کا اس میں اختلاف ہے۔ سلف و خلف میں سے عترت و جمہور خصوصاً امام مالک و شافعی کا مذہب یہ ہے کہ ایسا شخص کافر نہیں بلکہ فاسق ہے۔ اگر ترک نماز سے توبہ کر لے تو فبہا ورنہ ہم اسے شادی شدہ زانی کی طرح حد لگا کر قتل کر دیں گے لیکن اس کا قتل تلوار سے ہو گا۔

اسلاف کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ اس کی تکفیر کی جائے اور یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور امام احمد بن حنبل سے مروی دو روایات میں سے ایک ہے۔ عبداللہ بن مبارک اور اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی قول ہے۔ بعض اصحاب شافعیہ کے مذکورہ قول کی یہی وجہ ہے۔

امام ابو حنیفہ بمع اہل کوفہ کی جماعت اور مزنی صاحب شافعی کا مذہب یہ ہے کہ اس کی نہ تکفیر کی جائے اور نہ ہی قتل کیا جائے بلکہ تعزیر لگائی جائے اور قید کر دیا جائے' یہاں تک کہ وہ نماز پڑھنے لگے۔

یہ جو علامہ شوکانی نے ذکر کیا' بعینہ وہی ہے جو امام نووی نے حدیث کی شرح میں

ذکر کیا۔ پھر اس کے بعد تفصیلاً کہا کہ تارک نماز کے کفر کے قائلین کی دلیل مذکورہ حدیث جابر کا ظاہری مفہوم ہے اور کلمہ توحید پر قیاس ہے اور اسے قتل نہ کرنے کے قائلین کی دلیل یہ حدیث ہے:

لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِاِحْدٰى ثَلَاثٍ......

کسی مسلمان کا خون روا نہیں مگر بایں صورت کہ تین امور میں سے کوئی ایک پایا جائے......

اور ان تین امور میں نماز کا ذکر نہیں۔

جمہور جو اس کی تکفیر کے قائل نہیں' ان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء: ۴۸)

بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے اور کفر سے نیچے جو کچھ ہو' جسے چاہے' معاف فرمادیتا ہے۔

اور حضور پر نور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مژدۂ جاں فزا:

مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔

جس نے کہا "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" وہ جنت میں داخل ہوا۔

اور:

مَنْ مَّاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔

جو یہ جانتا ہوا مرا کہ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" وہ جنت میں داخل ہوا۔

اور:

وَلَا يَلْقَى اللّٰهَ تَعَالٰى عَبْدٌ بِهِمَا غَيْرَ شَاكٍّ فَيُحْجَبُ عَنِ الْجَنَّةِ۔

بغیر شک کے دو معبودوں کی عبادت کرنے والے سے اللہ تعالیٰ ملاقات نہیں فرمائے گا اور اسے جنت سے روک دیا جائے گا۔

اور:

حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ — اللہ نے اس پر جہنم حرام کر دیا جس نے کہا "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

وغیر ذلک اور اس کے قتل کے قائلین کی دلیل یہ ارشاد ربانی ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ۔ — پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔

(التوبہ: ۵)

اور حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کا ارشاد گرامی:

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ و یقیموا الصلوۃ ویوتوا الزکوۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماءھم واموالھم۔ — مجھے لوگوں سے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتی کہ وہ کہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ یہ کرنے لگیں تو ان کے خون اور مال مجھ سے محفوظ ہو گئے۔

اور انہوں نے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان:

بین العبد وبین الکفر ترک الصلوٰۃ۔ — بندے اور کفر کے درمیان نماز نہ پڑھنے کا فرق ہے۔

کو اس معنی پر محمول کیا کہ ترک نماز سے آدمی کافر کی سزا کا مستحق ہوتا ہے جو کہ قتل ہے۔ یا وہ مستحل(۱) پر محمول ہوگا یا اس کے ساتھ کفر کی تاویل کی جائے گی یا یہ کہ اس نے کفار جیسا کام کیا۔ واللہ اعلم۔ (شرح مسلم للنووی: ۲/۷۰)

ہم کہتے ہیں کہ عدم تکفیر کی دلیل حدیث ابن محیریز ہے کہ قبیلہ بنو کنانہ کے ایک مخدجی نامی شخص نے شام کے ایک ابو محمد نامی شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "وتر واجب

(۱) ترک نماز کو جائز سمجھنے والا۔

ہے۔" مخدجی کہتے ہیں کہ میں عبادہ بن صامت کے پاس گیا اور انہیں اس کی خبر دی تو عبادہ نے فرمایا کہ ابو محمد نے غلطی کی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

خمس صلوات کتبهن الله	پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر
علی العباد' من اتی بهن لم	فرض کی ہیں۔ جس نے ان کی پابندی کی اور
یضیع منهن شیئا استخفافا	ان میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی تو اس کیلئے اللہ
بحقهن کان له عند الله عهد	کا وعدہ ہے کہ اسے جنت میں داخل کرے گا
ان یدخله الجنة' ومن لم یات	اور جس نے ان کی ادائیگی نہ کی تو اس کیلئے
بهن فلیس له عند الله عهد	اللہ کا وعدہ نہیں' اگر چاہے تو اسے عذاب
ان شاء عذبه وان شاء غفر له۔	دے اور چاہے تو اسے بخش دے۔

امام احمد' ابوداؤد' نسائی اور ابن ماجہ نے اسے روایت کیا اور اس میں کہا:

ومن جاء بهن قد انتقص	اور جس نے ان کو ادا کیا' اور ان کو ہلکا
منهن شیئا استخفافا	سمجھتے ہوئے کچھ کوتاہی کی۔
بحقهن۔	

علامہ شوکانی کہتے ہیں کہ "اس حدیث کو اسی طرح امام مالک نے موطا میں' ابن حبان اور ابن سکین نے بھی نقل کیا اور ابن عبدالبر کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح ثابت ہے۔ امام مالک کی اس روایت میں کوئی اختلاف نہیں۔"

مخدجی کے نام میں اختلاف ہے اور ان کا شمار صحابہ میں ہے۔

حضرت عبادہ کا قول "کذب ابو محمد" کا معنی ہے کہ ابو محمد نے غلطی کی۔ اس سے حقیقت کذب مراد لینا جائز نہیں۔ کیونکہ وہ فتویٰ ہے اور فتویٰ میں جو غلطی کرے' اسے جھوٹ نہیں کہا جاتا۔ مصنف نے اس حدیث کو اس لیے پیش کیا ہے تاکہ تارک نماز کے عدم کفر اور مستحق نار نہ ہونے پر استدلال کیا جائے جس پر صریح

دال یہ قول ہے:

ان شاء عذبہ وان شاء غفر لہ۔ — اگر چاہے تو اسے عذاب دے اور چاہے تو اسے معاف فرمادے۔

تارک نماز کی عدم تکفیر پر جمہور علماء کی ایک قوی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں فرماتے ہوئے سنا:

ان اول مایحاسب بہ العبد یوم القیامۃ الصلوۃ المکتوبۃ فان اتمھا والاقیل: انظروا ھل لہ من تطوع؟ فان کان لہ تطوع اکملت الفریضۃ من تطوعہ ثم یفعل بسائر الاعمال المفروضہ مثل ذلک۔ — بروز قیامت سب سے پہلے بندے سے فرض نماز کا حساب ہوگا۔ اگر وہ پوری ہوئی تو فبہا، ورنہ کہا جائے گا کہ دیکھو اس کے کوئی نفل ہیں؟ اگر نفل ہوئے تو ان سے فرض پورے کیے جائیں گے۔ پھر اسی طرح سب اعمال مفروضہ سے کیا جائے گا۔

اس کو اصحاب خمسہ نے روایت کیا۔

علامہ شوکانی کہتے ہیں کہ اس حدیث کو ابوداؤد نے تین طرق سے نقل کیا۔ دو طرق ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے متصل ہیں اور تیسرا طریق حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے۔ ان جمیع طرق میں کوئی طعن نہیں اور نہ ہی اس پر کوئی کلام۔ نیز منذری میں بھی یہاں کوئی ایسا امر نہیں جو ضعف ثابت کرے۔ اور امام نسائی نے اسے ایک طریق سے نقل کیا ہے جس کی سند جید ہے اور رجال صحیح کے ہیں۔ جیسا کہ حافظ عراقی نے کہا اور ابن قطان نے اس کی تصحیح کی۔ امام حاکم نے مستدرک میں حدیث نقل کر کے فرمایا کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ شیخین نے اسے نقل نہیں کیا۔

اور حدیث اس امر پر دال ہے کہ جو نقص فرائض میں واقع ہو، اسے نوافل سے پورا کر دیا جائے گا اور مصنف اسے عدم کفر پر استدلال کے لیے لائے ہیں۔ کیونکہ فرائض کا نقصان عام ہے۔ چاہے نقصان فی الذات ہو یعنی بعض فرائض کا ترک یا صفت میں نقصان ہو جیسے اذکار و ارکان کا پوری طرح ادا نہ کرنا۔ اور نوافل سے اس کمی کو پورا کیا جائے گا۔ دراصل یہ اس بات کی خبر دینا ہے کہ نوافل پر ثواب ملتا ہے جبکہ کفر اس کے منافی ہے۔ (نیل الاوطار: ۲/ ۱۸)

صاحب منتقی الاخبار کے اس باب کی تمام نصوص کو وارد کیا ہے اور فرمایا کہ یہ مذہب مضبوط ہے۔ اس پر شاہد یہ چند روایات ہیں:

(۱) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من شهد ان لااله الاالله وحده لاشريك له وان محمدا عبده ورسوله وان عيسى عبدالله وكلمته القاها الى مريم وروح منه' والجنه والنار حق ادخله الله الجنة على ما كان من العمل - (بخاری و مسلم)	جس نے یہ گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو احد اور لاشریک ہے اور بے شک محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور عیسیٰ اللہ کے بندے اور کلمہ ہیں جسے اس نے مریم کی طرف القاء کیا اور اللہ کی روح ہیں۔ جنت اور دوزخ حق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے عمل کے اعتبار سے جنت میں داخل فرمائے گا۔

(۲) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نبی کریم رؤف رحیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے پیچھے سوار تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے معاذ! عرض کیا: لبيك يارسول الله وسعديك تین مرتبہ کہا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما من عبد يشهد ان لا اله الا الله وان محمد عبده ورسوله الاحرمه الله على النار.	جس نے بھی یہ گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں تو اللہ نے اسے دوزخ پر حرام کردیا۔

عرض کیا یارسول اللہ کیا میں اس کی لوگوں کو خبر نہ دوں کہ وہ خوش ہو جائیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابھی باز رہو۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال باکمال کے بعد حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس خوف سے اس کی خبر دے دی کہ کہیں خبر نہ دینے پر گناہ نہ ہو۔ (بخاری ومسلم)

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اسعد الناس بشفاعتي من قال لا اله الا الله خالصا من قلبه-(بخاری)	میری شفاعت سے سب سے بڑا سعادت مند وہ ہے جس نے خلوص قلب سے کہا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اور جمہور نے تکفیر والی احادیث کو کفران نعمت پر محمول کیا ہے یا اس معنی پر کہ وہ کفر کے قریب ہوا۔ نماز کے علاوہ بھی ایسی احادیث وارد ہیں جن سے یہی مراد ہے۔ (نیل الاوطار: ۲/ ۱۹)

امام شوکانی کی نفیس رائے

علامہ شوکانی نے جہاں تارک نماز کے قتل و تکفیر کے قول کی تائید کی' وہاں اس مسئلہ میں اپنی رائے کا بھی ذکر کیا اور کہا (یہ حق ہے) لیکن کفر کے قائلین کی نسبت بڑی عمدہ اور معتدل توجیہ پیش کی کہ جب کفر کو چند قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض قسمیں مغفرت و بخشش سے مانع نہیں۔ گویا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی رائے اس قسم پر محمول کی جائے تاکہ نصوص میں مطابقت ہو جائے۔ اور کہتے ہیں کہ

کفر کی یہ قسم حصول مغفرت اور مستحق شفاعت ہونے میں مانع نہیں۔ اگر ہم کہیں کہ تارک نماز کافر ہے تو یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے اہل قبلہ کا کفر۔ یعنی یہ کفر ہلکا ہے بخلاف اس کے کہ جو ایمان کا انکار کرے اور اللہ سے کفر کرے، جو پوری ملت اسلامیہ سے کفر کرتا ہے اور یہ کفر نہ مغفرت کو قبول کرتا ہے نہ شفاعت کو۔

علامہ شوکانی کا بیان ہے "حق ہے کہ تارک نماز کافر ہے اور قتل کیا جائے۔ بہرحال اس کا کفر، کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت شارع علیہ الصلوۃ والسلام نے تارک نماز پر اس اسم کا طلاق کیا، بلکہ بندے اور اس اسم کے اطلاق کے جواز کے درمیان نماز کو حائل رکھا۔ لہذا نماز کا ترک اس کے جواز اطلاق کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن ہمیں کوئی ایسا معارضہ لازم نہیں جسے پہلوں نے وارد کیا ہو۔ کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ مسلم ہے کہ کفر کی بعض انواع مغفرت و شفاعت سے مانع نہیں۔ جیسے اہل قبلہ کا کفر بعض ایسے گناہوں کے سبب جن کو شارع علیہ الصلوۃ والسلام نے کفر کہا۔ لہذا ایسی تاویلات کی ضرورت نہیں جن کے مصائب میں لوگ گرفتار ہوں۔ رہا اس کا قتل کرنا، تو یہ حدیث:

امرت ان اقاتل الناس۔ — مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں سے جہاد کروں۔

وجوب قتل کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ جہاد بے نمازی کو مستلزم ہے۔(نیل الاوطار: ۲/ ۱۳)

میں (مولف) کہتا ہوں یہ امر آسان ہے جو مجھ پر ظاہر ہوا کہ جب کفار کی اس نوع کو مغفرت و شفاعت شامل اور حاصل ہے تو ان پر عدم کفر اور ملت سے عدم خروج کا حکم لگانا کیا بعید ہے۔ یہ اس لیے کہ امر بالکل الگ ہے کیونکہ کفار کو تو شافعین کی شفاعت نفع نہیں دے گی۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ۔(المدثر: ۴۸) — تو انہیں سفارشیوں کی سفارش کام نہ دے گی۔

اور اس لیے بھی کہ مغفرت کسی شرک کو حاصل نہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد گرامی ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ۔ (النساء: ۴۸)

بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے اور کفر سے نیچے جو کچھ ہو جسے چاہے معاف فرما دیتا ہے۔

تو معاملہ اس طرف راجع ہے کہ وہ معروف معنی میں کافر یا مشرک نہیں جس کے اطلاق میں لوگ آج پڑے ہوئے ہیں۔ اور نصوص کے ظواہر پر اعتماد کرتے ہوئے یہ حکم لگا رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے ایسے فتنے اور مصائب رونما ہوتے ہیں جن کی انتہاء قتل و غارت کی گرم بازاری پر ہے۔ اور جان و مال اور عزت و آبرو کا عدم تحفظ اسی کا مرہون منت ہے۔ دلیل یہ ہے کہ یہ کافر ہیں اور ہر کافر پر کفار کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی کوئی عزت اور ذمہ داری نہیں۔ ان کا خون اور آبرو حلال' مال غنیمت اور عورتیں باندیاں ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

پس علامہ شوکانی کا قول' اس کی تقسیم' غلطی پہ تنبیہ اور حق کی نشاندہی' یہ اس قول کے قائلین کی نسبت رحمت عظیمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر وسیع رحمت فرمائے۔

قضا نماز کا مسئلہ

نماز بھول جائے تو یاد آنے پر پڑھ لے

امام بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

مَنْ نَسِيَ صَلٰوةً فَلْيُصَلِّ إِذَا ذَكَرَهَا لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذٰلِكَ۔

جو نماز بھول جائے تو یاد آنے پر اسے ادا کرلے اس کا یہی کفارہ ہے۔

(صحیح بخاری' کتاب مواقیت الصلوۃ' باب من نسی صلوۃ فلیصل اذا ذکرھا)

صحیح مسلم کی روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث، جس میں صحابہ کی نیند اور نماز کے فوت ہونے کا ذکر ہے، اس میں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ نَسِيَ الصَّلٰوةَ فَلْيُصَلِّهَآ اِذَا ذَكَرَهَا فَاِنَّ اللّٰهَ قَالَ: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ قَالَ يُوْنُسُ وَكَانَ ابْنُ شِهَابٍ يَقْرَؤُهَا لِلذِّكْرٰى۔	جو نماز بھول جائے تو جب یاد آئے اسے پڑھ لے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔" راوی یونس بیان کرتے ہیں کہ ابن شہاب اس آیت کو للذکری پڑھا کرتے تھے۔

(صحیح مسلم کتاب المساجد و مواضع الصلوۃ باب قضاء الصلوۃ واستحباب تعجیل قضاءها)

امام نووی اور مذکورہ حدیث

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی "جو شخص نماز بھول جائے تو یاد آتے ہی پڑھ لے" اس امر پر دال ہے کہ فوت ہونے والی فرض نماز کی قضا واجب ہے، چاہے عذر کی وجہ سے ترک ہوئی جیسے نیند اور نسیان یا بغیر عذر کے۔ بے شک حدیث شریف میں نسیان کی قید ہے تاکہ سبب ظاہر ہو جائے۔ کیونکہ جب قضا معذور پر واجب ہے تو غیر معذور پر تو بطریق اولیٰ واجب ہو گی۔ یہ ادنیٰ سے اعلیٰ پر تنبیہ ہے۔

رہا حضور سید دو عالم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی "یاد آتے ہی اسے پڑھ لے" تو یہ استحباب پر محمول ہے۔ جبکہ صحیح مذہب کے مطابق عذر کی بناء پر فوت ہونے والی نماز کی قضا میں تاخیر جائز ہے جس کا بیان اور دلیل مذکور ہوئی۔ بعض اہل ظاہر نے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ بلا عذر فوت ہونے والی نماز کی قضاء واجب نہیں اور گمان یہ کیا کہ اس کا ترک بہت بھاری ہے جو محض قضاء سے اس کی معصیت کے وبال سے نہیں نکلتا۔ اور یہ قائل کی خطا اور جہالت ہے۔ واللہ اعلم۔ (شرح النووی علی صحیح مسلم: ۵/۱۸۳)

حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ

حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قائل نے ظاہر کلام سے دلیل پکڑی اور کہا کہ جان بوجھ کر نماز ترک کرنے والا قضا نہیں کرے گا کیونکہ شرط کا انتفاء مشروط کے انتفاء کو مستلزم ہے۔ تو لازم آتا ہے کہ جو بھولا نہیں وہ نماز نہ پڑھے۔ اور فرماتے ہیں کہ جس نے کہا کہ جان بوجھ کر چھوڑنے والا بھی قضا کرے گا' تو یہ کلام کے مفہوم سے ماخوذ ہے۔ اور یہ ادنیٰ سے اعلیٰ پر تنبیہ کرنے کے باب سے ہے۔ کیونکہ جب بھول جانے والے پر قضا واجب ہے اور اس کے ساتھ گناہ ساقط اور نقصان اٹھ جاتا ہے تو عامد یعنی جان بوجھ کر ترک کرنے والا بطریق اولیٰ قضا کرنے والا ہو گا۔ بعض کا دعویٰ ہے کہ قصداً چھوڑنے والے پر قضا واجب ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان "نسیی" سے ماخوذ ہے' کیونکہ نسیان کا اطلاق ترک پر بھی ہوتا ہے چاہے ترک بھول سے ہو یا نہ ہو۔ بطور استشہاد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ۔(الحشر: ۱۹) — جو اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ نے انہیں بلا میں ڈالا۔

اور یہ فرمان باری تعالیٰ:

نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ۔ (التوبہ: ٦٧) — وہ اللہ کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ نے انہیں چھوڑ دیا۔

فرماتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا یہ ارشاد: "لا كفّارة لها" اس کی تائید کرتا ہے اور سونے والے اور بھولنے والے پر کوئی گناہ نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بحث ضعیف ہے۔ کیونکہ سونے والے کے متعلق تو خبر ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا كفّارة لها" (اس کا کفارہ نہیں) اور کفارہ کبھی کبھی خطا سے بھی ہوتا ہے۔ جیسے قصداً امر سے اور جو یہ کہتا ہے کہ قصداً ترک کرنے والا قضا نہ کرے گا' کیونکہ اس کا حال بھولنے والے سے کم تر ہے۔ بلکہ

کہتا ہے کہ اگر اس کے لیے قضا جائز ہو تو وہ اور بھولنے والا برابر ہیں۔ حالانکہ بھولے والے پر کوئی گناہ نہیں بخلاف قصداً ترک کرنے والے کے 'قصداً ترک کرنے والے کا حال بھولنے والے سے بدتر ہے' تو پھر یہ دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ البتہ یہ کہنا ممکن اور بجا ہے کہ قصداً نماز نہ پڑھنے والے پر گناہ باقی ہے۔ جب نماز کا وقت نکل جائے 'اگرچہ وہ اس کی قضا کر دے' بخلاف بھولنے والے کے 'کیونکہ اس پر مطلقاً کوئی گناہ نہیں اور قصداً تارک پر قضا کا واجب ہونا خطاب اول سے ثابت ہے۔ کیونکہ وہ نماز سے خطاب کیا گیا جو اس کے ذمہ باقی ہے۔ گویا وہ اس پر قرض ہے اور قرض ادائیگی کے بغیر ساقط نہیں ہوتا۔ ہاں نماز کا وقت مقررہ نکل جانے پر وہ گنہ گار تو ہو گا لیکن اس سے ادائیگی کی طلب ساقط ہو جائے گی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جس شخص نے رمضان المبارک میں قصداً روزہ افطار کر دیا تو اس پر قضا واجب ہے باوجود اس کے کہ افطار کا گناہ اس پر باقی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (فتح الباری: ۲/ ۹۰-۹۱)

امام بدر الدین عینی

امام بدر الدین عینی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمہور کا موقف یہ ہے کہ قصداً نماز چھوڑنے والے پر بھی قضا واجب ہے اور داؤد سے حکایت ہے کہ ایک جماعت قصداً تارک نماز پر قضا کے واجب نہ ہونے کی قائل ہے۔ (ابن حزم نے ان میں پانچ صحابہ کو شمار کیا) کیونکہ شرط کے انتفاء سے مشروط کا انتفاء لازم آتا ہے۔ لہٰذا اس حدیث سے لازم آتا ہے کہ جو بھولا نہیں وہ یاد آنے پر بھی نماز نہ پڑھے۔ پھر اس کے بعد علامہ جواباً یوں رقم طراز ہیں کہ حدیث میں نسیان کی قید 'اس لیے ہے کہ اکثر نماز فوت ہونے کا یہی سبب ہے۔ ثانیاً اس لیے کہ وہ خاص سبب پر وارد ہے۔ جیسے وہاں بھولی ہوئی نماز کی قضا کا حکم ہی دریافت طلب تھا۔ ثالثاً یہ کہ جب معذور پر قضا واجب ہے تو غیر معذور پر تو بطریق اولیٰ واجب ہے اور یہ ادنیٰ کے ساتھ اعلیٰ پر تنبیہ کے قبیلے سے ہے۔ اور جہاں تک مفہوم مخالف کا تعلق ہے تو اس کے اعتبار کی شرط عدم

خروج۔ سبب خاص پر وارد نہ ہونا اور مفہوم موافق کا نہ ہونا ہے۔

(عمدۃ القاری: ۵ / ۹۳)

علامہ شوکانی

علامہ شوکانی کہتے ہیں کہ میں قصداً تارک نماز پر وجوب قضا کے قائلین سے شدید بحث کا حامل نہیں۔ کیونکہ میدان مناظرہ میں نفاق جنم لیتا ہے لیکن ایسی عظیم اصل ہوتے ہوئے اس پر اعتماد ضروری ہے۔ البتہ حدیث شریف:

فَدَيْنُ اللّٰهِ اَحَقُّ اَنْ يُّقْضٰى۔ اللہ کے قرض کا زیادہ حق ہے کہ اسے ادا کیا جائے۔

محل نظر ہے۔ اس اعتبار سے کہ اسم جنس (دین) مضاف ہے جو عموم کا تقاضا کرتا ہے لیکن ان قائلین نے اس اصل کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی اور محض اپنے اسی قول کو حرف آخر سمجھا کہ بھولنے والے پر قضا کے وجوب کے سلسلے میں جو احادیث وارد ہیں' ان کے مفہوم خطاب سے ہی قصداً تارک پر قضا کا وجوب ماخوذ ہے۔ کیونکہ یہ ادنیٰ کے ساتھ اعلیٰ پر تنبیہ کے قبیل سے ہیں۔ لہٰذا ان کی دلیل صرف طرز کلام سے ماخوذ ہے اور اولیٰ کا مطلوب پر قیاس ہے۔ حالانکہ یہ مردود ہے کیونکہ عمداً تارک نماز پر قضا واجب نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کا حال بھولنے والے سے کمتر ہے۔ بلکہ عامد پر قضا واجب نہ ہونے کو مانع یہ ہے کہ اس شخص سے گناہ ساقط نہیں ہو گا لہٰذا قضاء میں کوئی فائدہ نہیں۔ اب کسی نص کے بغیر اس کے لیے قضا کا ثابت کرنا عبث اور بے جا ہے۔ بخلاف بھولنے اور سو جانے والے کے' کیونکہ حضرت شارع علیہ السلام نے ان دونوں کو قضا کا حکم صادر فرمایا بلکہ تصریح فرمادی کہ ان دونوں کا کفارہ قضا ہی ہے' اس کے علاوہ کوئی کفارہ نہیں۔

عامد پر وجوب قضا کے قائلین کی ایک دلیل یہی حدیث ہے:

لَا كَفَّارَةَ لَهَا اِلَّا ذٰلِكَ۔ اس کا کفارہ قضا ہی ہے۔

جو اس امر پر دال ہے کہ حدیث میں عامد (جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والا) مراد ہے۔ کیونکہ نائم اور ناسی (سونے اور بھولنے والا) پر کوئی گناہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ناسی سے مراد تارک ہے چاہے ترک نسیان سے ہو یا نہ۔ اور بطور استشہاد یہ آیہ مقدسہ پیش کرتے ہیں:

نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ۔ — جو اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ نے انہیں چھوڑ دیا۔

اور:

نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ۔ — وہ اللہ کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ نے انہیں چھوڑ دیا۔

مخفی نہیں کہ یہ کلام اس امر کو مستلزم ہے کہ نائم اور ناسی پر قضا واجب نہیں۔ اس لیے کہ ان پر کوئی ایسا گناہ نہیں جس کا وہ کفارہ دیں۔ حالانکہ احادیث صحیحہ ان دونوں پر وجوب قضا کی تصریح کرتی ہیں۔ اسی لیے حافظ ابن حجر نے "فتح الباری" میں اس استدلال کو ضعیف قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ کفارہ کبھی خطا فعل سے بھی ہوتا ہے۔ جیسے عمداً فعل سے۔ منقول ہے کہ کفارہ سے مراد اس امر کا بجالانا مراد ہوتا ہے۔ نیز اس بات پر تنبیہ ہوتی ہے کہ اس امر کو بجالائے بغیر محض توبہ واستغفار کافی نہیں۔

اور ابن دقیق عید نے انصاف کیا ہے کہ ان کے تمام دلائل کا رد کر دیا۔ البتہ جو حدیث ہم نے پہلے ذکر کی ہے کہ فدین الله احق ان یقضی یہ اپنے عموم کے اعتبار سے محل نظر ہے۔ بلاشبہ جو خطاب اول کی دلیل سے وجوب قضا کا قائل ہے وہ خطاب اول جو وجوب ادا پر دال ہے' تو حقیقتاً اس کے پاس عامد پر وجوب قضا کے بارے میں کوئی ایسی دلیل نہیں جو ہمارے موقف کو مانع ہو' کیونکہ وہ کہتا ہے کہ جان بوجھ کر نماز ترک کرنے والے کو نماز کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے اور اس پر اس کی ادائیگی واجب ہے تو گویا یہ اس پر قرض ہوا اور قرض ادا کیے بغیر ساقط نہیں ہوتا۔ اس

معرفت کے بعد تمہیں معلوم ہو گا کہ بلاشبہ یہ مقام بہت مشکل ہے اور امام نووی رحمتہ اللہ علیہ "شرح صحیح مسلم" میں قائل کا یہ قول "کہ عامد پر قضا واجب نہیں" نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ قائل کی غلطی اور جہالت ہے' جس کی وجہ صرف مذموم افراط ہے۔(نیل الاوطار للشوکانی: ۲/۳۶)

شیخ سبکی اور شوکانی کا رد

شیخ محمود سبکی رحمتہ اللہ علیہ نے "شرح سنن ابی داؤد" میں علامہ شوکانی کا تعاقب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ تارک صلوۃ کے بارے میں دو امر ثابت ہیں:

(۱) نماز کے عمدا ترک پر گناہ ثابت ہے اور گناہ چاہے صغیرہ ہو یا کبیرہ' توبہ سے رفع ہو جاتا ہے اور توبہ متحقق نہیں ہوتی جب تک اپنے ذمہ واجب امر کی قضا نہ کی جائے۔ البتہ اس میں کوئی نزاع نہیں کہ عمدا نماز ترک کرنے والا جب اسے قضا کرتا ہے تو تاخیر کا گناہ اس سے ساقط نہیں ہوتا۔ اور تاخیر کا گناہ ساقط نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قضاء میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اس سے وہ قضا کی طلب ساقط ہو جاتی ہے جو ناسی اور نائم کے حال سے بطریق اولی ثابت ہے۔

اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی:

فدین اللہ احق ان یقضی۔　اللہ تعالی کے قرض کا زیادہ حق ہے کہ اسے پورا کیا جائے۔

کے عموم سے شوکانی کے اس قول کا رد بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ "عمدا تارک صلوۃ کی قضا میں کوئی فائدہ نہیں اور نص کے بغیر اس کا ثابت کرنا عبث اور بے مقصد ہے۔" نیز شوکانی کا یہ قول کہ "ابن دقیق عید نے انصاف کیا ہے کہ ان کے جمیع دلائل کو رد کر دیا" مشعر ہے کہ انہوں نے اس موقف سے رجوع کر لیا کہ عمدا تارک نماز پر قضا واجب نہیں۔

(۲) مکلف کے ذمہ میں نماز واجب ہو جاتی ہے۔ جونہی اس نماز کا وقت آتا ہے، اب اس ذمہ سے بری ہونے کی چند صورتیں ہیں:

(۱) اداء۔ (۲) عجز۔ (۳) صاحب حق اپنا حق ساقط کردے۔

اب ادا تو وقت میں نہ ہو سکی اور عجز متحقق نہیں کیونکہ وہ اصل عبادت پر قدرت رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ وقت کی فضیلت کے ادراک سے عاجز ہے کیونکہ وقت ادا جاتا رہا۔ اور صاحب حق کا اپنا حق ساقط کردینا صراحتاً پایا گیا نہ ضمناً۔ لہٰذا وقت ضائع کر بیٹھنے والا شخص اپنے ذمہ میں ثابت امر کو ساقط کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور جب وہ کسی نوع سے بھی ذمہ سے بری نہیں ہوا تو گویا وہ امر اس کے ذمہ میں باقی ہے جس کی ادائیگی اس سے مطلوب ہے۔ تو ضروری ہے کہ وہ اس امر کو بجالائے تاکہ ذمہ سے بری ہو سکے۔ اگر عامد سے قضا کرنا صحیح نہیں تو شارع کی اس سے طلب ایک محال امر کی طلب ہے۔

قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بھول جانے والے کے قضا کرنے میں اختلاف نہیں۔ البتہ بعض حضرات نے یہ کہا کہ کثیر نمازوں کا تارک قضا نہ کرے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کثیر نمازوں کی قضا میں مشقت ہے۔ جیسا کہ حائضہ کے بارے میں یہ فرق کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ روزہ کی قضا کرے اور نماز کی قضا نہ کرے۔ کیونکہ نمازوں کے تکرار کی وجہ سے ان کی قضا میں اسے مشقت ہے۔ اور جان بوجھ کر نماز کو ترک کرنے والے کے قضا کرنے میں کوئی اختلاف نہیں۔

امام مالک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا یہ قول ہے کہ عمداً نماز کا تارک قضا نہ کرے حالانکہ آپ سے یہ نقل صحیح نہیں اور نہ ہی کسی اور اہل علم سے اس قول کا منقول ہونا صحیح ثابت ہے۔ علاوہ داؤد اور ابو عبدالرحمٰن شافعی کے، اور یہ دونوں حضرات حدیث میں حجت نہیں۔ کیونکہ اگر ہم دلیل خطاب سے کلام نہ کریں تو واضح ہے اور اگر اس کو پیش کریں تو حدیث کا مقتضا وہ نہیں بلکہ اس کا مقتضا ادنیٰ سے اعلیٰ پر

تنبیہ کرنا ہے کیونکہ جب ناسی (بھولنے والا) گناہ نہ ہونے کے باوجود قضا کرتا ہے تو متعمد (قصداً تارک) تو اس کے زیادہ لائق ہے۔ پس عمداً ترک کرنے والے کی قضاء میں اختلاف ایسا ہی ہے جیسے قتل عمد کے کفارہ میں اختلاف۔

آیت اور حدیث سے استدلال کا دارومدار مختلف ہے کہ کیا یہ دلیل خطاب سے ثابت ہے یا اس کے مفہوم سے؟ بعض علماء نے عامد کی قضا کو درج ذیل احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ کیا ہے:

(۱) فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا۔ جب فائتہ نماز اسے یاد آئے تو چاہیے کہ وہ اسے پڑھ لے۔

کیونکہ اس کی نماز سے غفلت ناسی کی طرح ہی ہے چاہے وہ جہالت کی وجہ سے ہو یا قصداً۔ جب اسے اس کا ترک یاد آجائے تو اس کی قضاء اسے لازم ہے۔

(۲) لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذَلِكَ۔ اس (قضاء) کے علاوہ اس (فائتہ) کا کوئی کفارہ نہیں۔

کیونکہ کفارہ گناہ پر ہی ہوتا ہے اور گناہ قصداً ترک میں ہی ہے۔" من الابی شرح مسلم۔" (المنہل العذب المورود شرح سنن ابی داؤد للسبکی: ۴/ ۲۶۔۲۷)

فقہاء ائمہ کے اقوال

امام نووی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معتمد علماء کا اس پر اجماع ہے کہ عمداً نماز ترک کرنے والے پر اس کی قضا لازم ہے۔ اور ابو محمد علی بن حزم نے ان کے خلاف کہا کہ وہ اس نماز متروکہ کی قضا پر بالکل قدرت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس کا یہ فعل صحیح ہوگا' بلکہ وہ اچھے کاموں اور نفلی نماز میں کثرت کرے تاکہ اس کا میزان بروز قیامت وزنی ہو سکے۔ نیز اللہ تعالیٰ سے استغفار اور توبہ کرے۔ یہ ابو محمد علی بن حزم کا قول ہے جو کہ اجماع کے خلاف اور حجت دلیل سے باطل ہے اور ان کا استدلال جس کلام سے ہے' اس میں اس پر قطعاً کوئی دلالت نہیں۔

اور وجوب قضا پر واضح دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مروی یہ حدیث ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کے دن میں ہم بستری کرنے والے کو حکم دیا کہ وہ روزہ بھی رکھے اور کفارہ بھی دے۔ یعنی اس دن کے بدلے جسے اس نے قصداً جماع سے فاسد کیا۔" (اسے امام بیہقی اور ابو داؤد نے جید سند کے ساتھ روایت کیا) کیونکہ جب بھول کر ترک کرنے والے پر قضا واجب ہے تو قصداً تارک پر بدرجہ اولیٰ واجب ہوگی۔ (المجموع شرح المہذب: ۳/۷۶)

شیخ ابن تیمیہ اور شیخ محمد بن ابراہیم کا فتویٰ

شیخ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ جو شخص قصداً نماز اور روزہ ترک کرے 'کیا وہ اس کی قضا کرے گا؟

اکثر علماء کا یہ قول ہے کہ وہ اسے قضا کرے گا اور بعض نے کہا کہ وہ قضا نہ کرے گا اور نہ ہی وقت کے بعد اس کا یہ فعل صحیح ہو گا۔ جیسے حج کی وقت گزر جانے کے بعد قضاء نہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ان امراء سے کہا جنہوں نے نماز کو وقت سے موخر کیا:

فصلوا الصلوه لوقتها واجعلوا صلوتكم معهم نافلة — نماز بروقت پڑھو اور اپنی نماز کو ان کے ساتھ نفل بناؤ۔

(مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۲/۱۸)

اس کے بعد انہوں نے وہ دلائل پیش کیے اور نصوص وارد کیں 'جن سے عدم قضاء کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ یہاں ہم تھوڑی دیر رک کر شیخ کے اس قول پر غور کرتے ہیں کہ "اکثر علماء کا یہ قول ہے کہ وہ اسے قضا کرے گا۔" باوجود اس کے کہ خود شیخ عدم قضا کے قائل ہیں لیکن یہ اس اقرار کو مانع نہ ہو سکا کہ وجوب قضا کے قائلین اکثر ہیں اور اکثر جمہور ہوتے ہیں۔

اسی طرح مفتی اکبر علامہ فقیہ شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ اپنے "فتاویٰ" میں کہتے

ہیں کہ دوسرے مسئلہ کے جواب: جب کوئی شخص ایک نماز قصداً محض سستی کی بناء پر ترک کردے اور نماز کا ضروری وقت نکل جائے تو جمہور علماء کے نزدیک اس پر اس فائتہ نماز کی قضا واجب ہے اور اس بارے میں یہ ضرور ہے کہ قضا سے اس کے بروقت ادا نہ کرنے کے گناہ کی تلافی ممکن نہیں کیونکہ معاملہ اس سے کہیں عظیم ہے۔

(فتاویٰ ورسائل الشیخ محمد بن ابراہیم آل الشیخ: ۲/۱۰۶)

اور یہ بھی شیخ محمد بن ابراہیم کے انصاف، عقل، فقہ اور امانت کی انتہاء ہے کہ ان کا مذہب بھی اس اقرار کو مانع نہ ہو سکا کہ وجوب قضا کا قول، جمہور علماء کا قول ہے۔

بہرحال یہ تو فقہاء اور اہل انصاف و امانت کے موقف کے نمونے تھے جہاں انہوں نے اس مسئلہ کو ذکر کیا اور اس میں اختلاف کی طرف اشارہ کیا۔ اور ہم اپنے دور کے ان فقہاء کے لیے یہ نصوص پیش کرتے ہیں جو فتویٰ اور وعظ و ارشاد کے مسند پر فائز ہیں۔ تاکہ ان کے لیے عبرت اور راہنمائی کا ساماں ہو جائے۔ یعنی جب ان سے دریافت کیا جائے اور جب وہ خطبہ دیں اور وعظ و ارشاد کا فریضہ سرانجام دیں تو ان پر ضروری ہے کہ وہ بغیر کسی تعصب اور تشدد کے، علماء کے اقوال کو بیان کریں اور جواب میں سائل پر سب کچھ واضح کر دیں جو بھی اس مسئلہ میں وارد ہے اور انہیں اختیار کا حق دیں اور اقتداء کا رستہ ان کے لیے کھول دیں۔ خصوصاً ان مسائل میں جن میں اختلاف ہے اور جن میں ہر ایک کا فہم اور استنباط دلیل سے صحیح ثابت ہے اور محض ہوس یا افتراء سے نہیں اور قطعاً ایسا صادر ہونا ان سے متصور بھی نہیں۔

دعا میں ہاتھ اٹھانے کا مسئلہ

امام بخاری و مسلم نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث روایت کی ہے:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی موقع

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِيْ شَيْئٍ مِّنْ دُعَائِهِ اِلَّا فِي الْاِسْتِسْقَاءِ فَاِنَّهُ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ اِبْطَيْهِ۔

پر دعا میں اس قدر ہاتھ بلند نہ کرتے مگر استسقاء میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ بلند کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کی مبارک بغلوں کی سفیدی (کی جگہ) دکھائی دیتی۔

امام بخاری نے اسے کتاب الاستسقاء' باب رفع الامام یدہ فی الاستسقاء (۲ / ۵۱۷) اور کتاب المناقب' باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۶ / ۵۶۷) میں اور امام مسلم نے کتاب صلوۃ الاستسقاء' باب رفع الیدین بالدعاء فی الاستسقاء (۶ / ۱۹۰) میں نقل کیا۔

جو لوگ دعا میں ہاتھ اٹھانے کے منکر ہیں خصوصاً نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا انکار کرتے ہیں' ان کی دلیل یہ مندرجہ بالا حدیث ہے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ یہ ان احادیث صحیحہ کے معارض ہے جن کی صحت پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے۔ جیسا کہ اس بحث میں تم پر واضح ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

یہ "دعا میں ہاتھ اٹھانے کا مسئلہ" ایک مسئلہ فرعیہ ہے۔ اور "دعا" کا مسئلہ دین کے مسائل مشروعہ میں سے ایک ہے۔ لیکن اس مسئلہ کی کیفیت میں کلام ہے۔ اور اس میں کلام بھی کچھ زیادہ ہی ہے اور جدال و خصام بھی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم ہو کہ دعا ہر حال اور ہر زمان و مکان میں کتاب و سنت سے مشروع اور مطلوب ہے۔ اور کتاب و سنت میں دس نصوص ایسی ہیں جو اس کی مشروعیت' طلب اور اس کے فضائل اور امور متعلقہ پر دلالت کرتی ہیں۔ جس کا انکار کوئی طالب علم بھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی مسلمان اس میں شک کر سکتا ہے۔ لیکن بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ اس کے سبب جدال و کلام کی ایسی کثرت ہے جو باہمی بغض و عناد' قطع تعلق اور لڑائی جھگڑے کا باعث ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے ایک شخص کو سنا ہے کہ جو ایک دعا میں ہاتھ اٹھانے والے کو کہہ رہا تھا کہ "تو گمراہ اور بدعتی ہے..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی سنت کا مخالف ہے اور سنت کا مخالف فاسق' فاجر یا ظالم ہے۔" (اللہ کا شکر ہے کہ اس نے کافر نہیں کہا) پھر وہ مخالف سنت کی سزا میں وارد ہونے والی نصوص کو پیش کرنے لگا۔ حالانکہ ہر ایک کو وہ یاد ہیں' ان پر ایمان ہے اور قطعاً انکار نہیں۔ ہم ایک محفل میں تھے کہ ہم نے دعا کی اور حاضرین میں سے ایک نے اپنے ہاتھ اٹھا لیے تو ایک اور شخص چلا چلا کر اس کا انکار کرنے لگا۔ لوگ بڑے پریشان ہوئے۔ قریب تھا کہ کوئی جھگڑا ہو جاتا ایک اور شخص کھڑا ہوا جو اس سے کچھ مودب تھا۔ وہ یہ کہتا ہوا محفل سے نکل گیا کہ میں ان بدعتیوں کے ساتھ دعا نہیں کرتا۔ لاحول ولا قوة الا بالله العلی العظیم' انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بھائیو! اس اختلاف اور تفرقہ پر ذرا غور کرو۔ جو ایک ایسے اختلافی فرعی مسئلہ کے سبب سے رونما ہوا جس کی اصل یعنی دعا کے مشروع ہونے پر اتفاق ہے۔ معلوم ہوا کہ اس تمام تر معاملہ کا سبب یہ ہے کہ عوام المسلمین میں سے کوئی اہل ہو یا نا اہل' ایک یا دو آیات بمع ایک دو احادیث یاد کر کے اپنے اہل علم ہونے کا دعویٰ کر دیتا ہے اور کسی ایک سنے ہوئے مسئلہ کو لے کر وہ بڑی شد و مد سے وعظ و تبلیغ شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ وہ حکمت ارشاد سے ناواقف اور حسن وعظ سے بیگانہ ہوتا ہے لیکن اس کو ایسا جنون طاری ہوتا ہے کہ ہر وقت ڈنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے تاکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نام پر ہر ملنے والے کو دے مارے۔ اے اللہ ہمیں ہدایت کاملہ عطا فرما اور عافیت ہمارا مقدر بنا۔ میں نے یہ چند سطور تحریر کی ہیں تاکہ اس مسئلہ میں جو خدشات پیدا ہوئے ہیں' ان کا ازالہ ہو جائے اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی سیدھے راستے کی ہدایت دینے والے ہیں۔

دعا میں ہاتھ اٹھانے پر دال احادیث کے مصادر

دعا میں ہاتھ اٹھانے کے بارے میں عموماً اور خصوصاً نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے میں کثیر احادیث وارد ہیں۔ جن میں صحیح بھی ہیں اور مقبول بھی۔ حفاظ نے

اپنی اپنی تصنیفات میں ان کے مخصوص ابواب قائم کیے ہیں۔

ان میں امام محمد بن اسماعیل بخاری کا نام سرفہرست ہے جنہوں نے اپنی صحیح بخاری میں کتاب الدعوات کے تحت "باب رفع الایدی فی الدعاء" کا عنوان قائم کیا اور اس میں وہ احادیث ذکر کیں جو اس موضوع پر دلالت کرتی ہیں۔ جو بعد میں انشاء اللہ تعالیٰ صفحہ قرطاس پر پیش کی جائیں گی اور دیگر احادیث بھی ذکر کی جائیں گی۔

حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دعا میں ہاتھ اٹھانے کے ثبوت میں بے شمار احادیث ہیں' امام منذری نے انہیں ایک الگ رسالہ میں جمع کیا ہے۔ امام نووی نے (الاذکار: ۳۴۴) اور (شرح المہذب: ۳/ ۴۴۸-۴۵۰) میں سب کو ذکر کیا اور اسی طرح امام بخاری نے بھی انہیں "الادب المفرد" میں ذکر کیا۔

(فتح الباری: ۱۱/ ۱۴۲)

بلکہ حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ نے "تقریب النووی" کی شرح "تدریب الراوی" میں بیان کیا ہے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانے کی احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معنوی تواتر کے ساتھ ثابت ہیں۔ حافظ موصوف کا تواتر کی بحث میں کہنا ہے کہ "اس کی ایک قسم یہ ہے جس کا معنیٰ متواتر ہو' جیسے دعا میں ہاتھ اٹھانے کی احادیث اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سو کے قریب احادیث مروی ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعا میں ہاتھ اٹھانے کا ثبوت ملتا ہے اور میں نے انہیں ایک رسالہ میں جمع کیا ہے لیکن وہ مختلف واقعات سے متعلق ہیں اور ہر واقعہ متواتر ہے۔ البتہ ان میں قدر مشترک یعنی دعا کے وقت ہاتھ اٹھانا' مجموعہ کے اعتبار سے متواتر ہے۔"

(المنح المطلوبہ فی استحباب رفع الیدین فی الدعاء بعد الصلوات المکتوبۃ للشیخ الحافظ احمد بن الصدیق الغماری المغربی بتعلیق العلامۃ المحقق شیخنا الشیخ عبد الفتاح ابو غدۃ: ص ۳)

دعا میں ہاتھ اٹھانے کی احادیث کو امام عبدالرزاق صنعانی نے "مصنف" میں' ابو داؤد نے "سنن" میں' ابن ماجہ نے "سنن" میں' نسائی نے "المجتبی" میں' طیالسی نے "مسند" میں' ابن جارذو نے "المنتقی" میں' امام حاکم نے "مستدرک" میں' طبرانی نے "معاجم" میں اور مجد ابن تیمیہ نے "المنتقی" میں ذکر کیا ہے۔ان کے علاوہ دیگر محدثین نے بھی ان احادیث کو ذکر کیا ہے۔

اس موضوع پر رسائل مفردہ

اس موضوع پر تمام جلیل القدر علماء نے لکھا ہے جن میں ان ائمہ کے نام قابل ذکر ہیں:

(۱) حافظ امام ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری کی کتاب "قرۃ العینین۔"

(۲) امام کبیر حافظ احمد بن حسین بیہقی کا رفع یدین کے مسئلہ میں ایک رسالہ ہے۔

(۳) امام محقق علامہ کبیر تقی بن سبکی کا بھی رسالہ رفع یدین کے مسئلہ میں ہے۔

(۴) امام حافظ منذری کا ایک خاص رسالہ اس موضوع پر ہے۔

(۵) امام حافظ متفنن جلال عبدالرحمن سیوطی نے "فض الوعاء فی رفع الیدین فی الدعاء" کے عنوان سے ایک رسالہ تحریر فرمایا۔

متاخرین میں سے ان حضرات کے اسماء سر فہرست ہیں:

(۱) امام علامہ سید محمد بن مقبول اھدل یمنی کا رسالہ "منیہ رفع الیدین فی الدعاء بعد الصلوات المکتوبہ۔"

(۲) حافظ احمد بن صدیق غماری مغربی کا رسالہ "المنح المطلوبہ فی استجباب رفع الیدین فی الدعاء بعد الصلوت المکتوبہ۔"

(۳) حافظ شیخ حبیب سالم بن جندان کا رسالہ "جلاء العینین فی رفع الیدین۔"

(۴) علامہ محقق شیخ نعمان محمد طاش کندی کا ایک رسالہ ہے جس میں انہوں نے ہر دعا کے وقت ہاتھ اٹھانے کے مسنون ہونے پر محدثین اور فقہاء کے دلائل ذکر کیے ہیں۔

موضوع سے متعلق احادیث

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے۔ جاننا چاہیے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانے کے ثبوت میں عموماً خصوصاً احادیث وارد ہیں۔ دعا جو بھی ہو اور جس وقت ہو' چاہے نماز پنجگانہ کے بعد ہو یا کسی اور موقع پر' بہرحال ہاتھ اٹھانے احادیث سے ثابت ہیں۔ عموم کے اعتبار سے تو یہ ہے کہ "صحیح بخاری' باب رفع الایدی فی الدعا" میں وارد ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اور اپنے مبارک ہاتھ اٹھائے حتیٰ کہ میں نے آپ کی بغلوں کی سفیدی (کی جگہ) دیکھی۔" اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَبْرَأُ اِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ.	اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں اس سے بری ہوں جو خالد (بن ولید) نے کیا۔

امام ابو عبداللہ بخاری فرماتے ہیں کہ یحیٰ بن سعید اور شریک دونوں نے انس (رضی اللہ عنہم) سے سنا کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ اٹھائے حتیٰ کہ میں نے آپ کی بغلوں کی سفیدی (کی جگہ) دیکھ لی۔"

(صحیح بخاری' کتاب الدعوات' باب رفع الایدی فی الدعاء: ۷ / ۱۴۴)

امام بخاری نے "الادب المفرد" میں ایک باب قائم کیا ہے جس میں اس موضوع کی جملہ احادیث کو ذکر کیا اور امام نووی نے بھی "شرح المہذب" میں اسی طرح اہتمام کیا ہے۔ "الادب المفرد" میں امام بخاری کی ذکر کردہ احادیث میں سے چند یہ ہیں:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

قدم الطفيل بن عمرو علي النبي صلى الله عليه وسلم	طفیل بن عمرو نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوئے کہ قبیلہ

فقال: ان دوسا عصت فادع اللہ علیہا، فاستقبل القبلۃ ورفع یدیہ وقال اللھم اھد دوسا۔ — دوس نے نافرمانی کی ہے، آپ اس کے لیے بددعا فرمائیں تو آپ ﷺ نے قبلہ رو ہو کر ہاتھ اٹھائے اور یوں دعا کی: "اے اللہ! قبیلہ دوس کو ہدایت دے۔"

یہ روایت صحیحین میں بھی موجود ہے لیکن اس میں ہاتھ اٹھانے کا ذکر نہیں۔

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ طفیل بن عمرو نے ہجرت کی اور اپنے ہمراہ ہجرت کرنے والے شخص کا واقعہ ذکر کیا۔ اس میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ وَلِيَدَيْهِ فَاغْفِرْ وَرَفَعَ يَدَيْهِ۔ — اے اللہ! اس کے ہاتھوں کو بھی بخش دے، اور آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ اٹھائے۔

اس روایت کی سند صحیح ہے۔ امام مسلم نے بھی اسے روایت کیا ہے لیکن اس کے آخر میں ہاتھ اٹھانے کا ذکر نہیں۔ حافظ فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔ نیز ابوعوانہ، امام حاکم، ابن حبان اور امام احمد نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

(فضل اللہ الصمد: ۲/ ۷۱)

(۳) ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے طویل حدیث مروی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا رات کو بقیع میں جانا اور اہل بقیع کے لیے دعا اور استغفار کرنا مذکور ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بقیع تشریف لائے اور کافی دیر کھڑے رہے پھر اپنے مبارک ہاتھوں کو تین مرتبہ اٹھایا، پھر واپس لوٹے اور فرمایا کہ:

ان جبریل علیہ السلام اتانی فقال: ان ربک یامرک ان — جبریل علیہ السلام میرے پاس تشریف لائے اور کہا کہ تمہارا رب تمہیں حکم فرماتا

تاتی اهل البقیع و تستغفر لهم۔(رواه مسلم)	ہے کہ تم اہل بقیع کے پاس جاؤ اور ان کے لیے استغفار کرو۔

(۴) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بدر کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی تعداد ایک ہزار اور اپنے اصحاب کی تعداد تین سو تیرہ دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ رو ہوئے اور اپنے مبارک ہاتھ پھیلا کر یوں دعا کرنے لگے:

اللهم انجز لی ما وعدتنی	اے اللہ! میرے ساتھ کیے ہوئے وعدہ
اللهم ات ما وعدتنی۔	کو پورا فرما' اے اللہ! پورا فرما جو تو نے مجھ سے وعدہ کیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ پھیلائے ہوئے اپنے پروردگار سے دعا کرتے رہے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک شانوں سے گر گئی۔(رواہ مسلم)

(۵) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ جمرہ کو سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے بعد تکبیر کہتے۔ پھر آگے بڑھتے حتیٰ کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے اور کافی دیر کھڑے رہتے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے۔ پھر وسطیٰ کو رمی کرتے پھر بائیں جانب ہو کر قبلہ رو ہوتے اور کافی دیر کھڑے رہتے اور ہاتھ اٹھ کر دعا کرتے' پھر جمرہ عقبہ کو رمی کرتے اور اس کے پاس نہ ٹھہرتے۔ پھر واپس لوٹ آتے اور فرماتے: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے۔(رواہ البخاری)

(۶) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر میں صبح کی اور وہ برچھیاں وغیرہ لے کر نکل آئے تو نبی کریم ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر یوں فرمایا:

الله اکبر خربت خیبر۔	اللہ اکبر! خیبر برباد ہو گیا۔

(رواہ البخاری)

(۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ذکر فرمایا کہ ایک شخص لمبا سفر کرے پھر گرد آلود اور پراگندہ حال میں اپنے ہاتھ آسمانوں کی طرف پھیلا کر کہے: اے میرے رب! اے میرے رب! اور اس کا کھانا پینا حرام ہو تو اس کی دعا کہاں قبول ہو گی۔ (رواۃ مسلم)

(۸) حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو عمرو بن عوف کے ہاں صلح کرانے کے لیے تشریف لے گئے۔ جب نماز کا وقت ہوا تو موذن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اگر آپ جماعت کرائیں تو میں تکبیر کہوں۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ حضرت سہل کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے جماعت شروع کرا دی اور دوران نماز ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور صف میں شریک ہو گئے۔ حضرت ابوبکر کی ادھر کوئی توجہ نہ تھی۔ تو لوگوں نے ہاتھ پر ہاتھ مارنا شروع کر دیے۔ جب حضرت ابوبکر متوجہ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اشارہ فرمایا کہ اپنی جگہ قائم رہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی۔ (رواۃ البخاری و مسلم)

(۹) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ولید کی بیوی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور اپنے شوہر کی شکایت کی کہ وہ اسے مارتا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو اس کے پاس چلی جا اور اسے ایسے ایسے کہہ دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہ عورت چلی گئی پھر واپس آئی اور کہنے لگی کہ وہ پھر مجھے مارتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو جا اور اسے ایسے ایسے کہنا۔ پھر اس نے عرض کیا کہ وہ مجھے مارتا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک ہاتھ بلند کرتے ہوئے یوں کہا:

اللھم علیک الولید۔ اے اللہ! ولید کا برا ہو۔

(رواہ البخاری)

(۱۰) محمد بن ابراہیم تیمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے ایک شخص نے خبر دی کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو احجار الزیت کے پاس ہتھیلی پھیلا کر دعا کرتے ہوئے دیکھا۔(رواۃ البخاری)

(۱۱) حضرت ابو عثمان بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قنوت میں اپنے ہاتھ اٹھایا کرتے تھے۔(رواۃ البخاری)

(۱۲) حضرت اسود سے مروی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ قنوت میں اپنے ہاتھ بلند کیا کرتے تھے۔(رواۃ البخاری)

(۱۳) ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہاتھ اٹھا کر یوں دعا کرتے ہوئے دیکھا:

انما انا بشر فلا تعاقبنی ایما رجل من المومنین اذیتہ اوشتمتہ فلا تعاقبنی فیہ۔	(اے اللہ) بے شک میں انسان ہوں تو مجھ پہ عقاب نہ فرمانا' کسی ایمان والے شخص کو میں نے اذیت دی ہو یا اسے رنجیدہ کرنے والی بات کی ہو تو اس کے بارے میں مجھے عقاب نہ فرمانا۔

اور ایک روایت میں ام المومنین کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہاتھ اس قدر بلند فرمائے رکھتے کہ میں اکتا جاتی۔

(المصنف لعبد الرزاق: ۲/ ۲۵۱ میں اسی طرح ہے)

(۱۴) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی واپسی کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر ہاتھ بلند کر کے دعا کرتے دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک بغلیں ظاہر ہو گئیں۔

امام نووی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے "کتاب رفع الیدین" میں ان احادیث کو صحیح اسناد کے ساتھ روایت کیا ہے۔ پھر ان کے آخر میں فرماتے ہیں

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے یہ احادیث صحیح مروی ہیں اور اس مسئلہ میں میری ذکر کردہ احادیث کے علاوہ بھی کثیر احادیث مروی ہیں اور میں نے صرف اسی قدر پر اکتفا کیا ہے اور مقصود صرف یہی ہے کہ معلوم ہو جائے کہ جو شخص ہاتھ اٹھانے کا حصر صرف ان مقامات میں کرے جن میں احادیث وارد ہیں تو وہ فحش غلطی کر رہا ہے۔ واللہ تعالی اعلم۔ (المجموع شرح المہذب: ۳/۵۰۸-۵۱۱)

(۱۵) شیخ عبد الرزاق "المصنف" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ نے فرمایا:

ان ربکم حیی کریم ثم یستحیی اذا رفع العبد یدیه ان یردھما صفرا حتی یجعل فیھما خیرا۔	بیشک تمہارا پروردگار ہمیشہ زندہ اور بہت بڑا سخی ہے۔ جب بندہ اپنے ہاتھ بلند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ انہیں خالی لوٹانے میں حیاء فرماتے ہیں اور ان میں بھلائی ڈال دیتے ہیں۔

اور شیخ حاشیہ پہ فرماتے ہیں کہ اسے "د" نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا اور امام طبرانی نے حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اسے نقل کیا ہے اور اس کی سند میں متروک ہے۔ (المجمع: ۱/۱۶۹، المصنف: ۲/۳۵۱)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں یہ احادیث صحیح ثابت ہیں۔ ایک یہ جو امام بخاری نے رسالہ "رفع الیدین" میں نقل کی کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہاتھ اٹھا کر عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرماتے ہوئے دیکھا اور ایک امام مسلم نے جو واقعہ کسوف کے بارے میں حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مبارک ہاتھ اٹھا کر دعا فرما رہے تھے اور یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بھی کسوف کے بارے میں ایسے ہی مبارک ہاتھ اٹھا کر دعا فرما رہے تھے اور یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بھی کسوف کے بارے میں ایسے ہی

ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے اس قدر اپنے ہاتھ بلند فرمائے کہ میں نے آپ کی بغلوں کی سفیدی دیکھ لی اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے حضرت ابراہیم اور عیسیٰ علیہم السلام کا قول ذکر کیا پھر اپنے مبارک ہاتھ بلند کیے اور یوں عرض گزار ہوئے:

اللھم امتی امتی۔ — اے اللہ! میری امت میری امت۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ و سلم کے مبارک چہرے کے پاس سے ایسی گنگناہٹ سنائی دیتی جیسے شہد کی مکھی کی گنگناہٹ۔ ایک دن اللہ جل شانہ نے آپ صلی اللہ علیہ و سلم پر وحی نازل فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ و سلم کچھ دیر ٹھہرے پھر فوراً خوشی و مسرت کے آثار آپ صلی اللہ علیہ و سلم کے چہرے پر نمایاں ہو گئے اور ان آیات کی تلاوت کی:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ...... — بے شک مراد کو پہنچے ایمان والے......

(المومنون: ۱-۱۰)

یہاں سے لے کر دس آیات کی تلاوت فرمائی اور فرمایا:

من اقام ھذہ العشر ایات دخل الجنہ۔ — جو ان دس آیات پر کاربند رہا' وہ جنت میں داخل ہوا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے قبلہ رو ہو کر ہاتھ بلند کیے اور یہ دعا کی:

اللھم زدنا ولا تنقصنا' واکرمنا ولا تھنا' واعطنا ولا تحرمنا' واثرنا ولا توثر علینا' اللھم ارحمنا وارض عنا۔ — اے اللہ! ہمیں زیادہ عطا فرما کمی نہ فرما' ہمیں عزت دے ذلت نہ دے' ہمیں عطا فرما محروم نہ رکھ اور ہمیں غالب فرما مغلوب نہ رکھ۔ اے اللہ! ہم پہ رحم فرما اور ہم سے راضی رہ۔

اس حدیث کو امام ترمذی' احمد' نسائی اور حاکم نے نقل کیا۔

اور حضرت اسامہ کی حدیث میں ہے کہ میں عرفات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ آپ ﷺ کی اونٹنی نے گردن ہلائی تو نکیل گر گئی تو آپ ﷺ نے اسے ایک ہاتھ سے پکڑا اور آں حالیکہ دوسرا ہاتھ بلند کیا ہوا تھا۔ اس کو امام نسائی نے جید سند کے ساتھ نقل کیا۔

اور امام ابو داؤد نے جید سند کے ساتھ حضرت قیس بن سعد کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ بلند کیے اور یوں دعا کی:

اللهم صلواتك ورحمتك على آل سعد بن عبادة۔	اے اللہ! سعد بن عبادہ کی آل پر تیری مہربانیاں اور رحمتیں ہوں۔

اور اس مسئلہ میں بے شمار احادیث مروی ہیں۔

اور اس مسئلہ کے خلاف میں حضرت عمارہ بن رویبہ کی جو حدیث پیش کی جاتی ہے' جسے امام مسلم نے اپنی "صحیح" میں روایت کیا۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ دعا میں ہاتھ اٹھانے کی ممانعت میں اس حدیث سے تمسک کا کوئی معنی نہیں جبکہ اس کا جواز احادیث سے ثابت ہے۔ امام ابو داؤد اور ترمذی وغیرہ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث نقل کی اور اسے حسن کہا:

ان ربكم حيي كريم يستحيي من عبده اذا رفع يديه اليه ان يردهما صفرا۔	بے شک تمہارا پروردگار ہمیشہ زندہ اور بڑا سخی ہے۔ جب بندہ اس کی بارگاہ میں ہاتھ بلند کرتا ہے تو وہ انہیں خالی لوٹانے سے حیاء فرماتا ہے۔

اور اس حدیث کی سند جید ہے۔ (فتح الباری: ۱۱/ ۱۷۲)

امام جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ نے "فض الوعاء" میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث نقل کی ہے جسے امام طبرانی نے "الکبیر" میں نقل کیا کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مارفع قوم اکفهم الی الله عزوجل یسالونه شیئا الا کان حقا علی الله ان یضع فی ایدیهم الذی یسالونه۔	لوگ جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کچھ مانگنے کے لیے اپنی ہتھیلیاں بلند کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ضرور بر ضرور ان کے ہاتھ میں وہ چیز رکھتا ہے جس کا وہ سوال کرتے ہیں۔

اس حدیث کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

اقوال علماء کا خلاصہ

امام نووی رحمتہ اللہ علیہ حدیث استسقاء کی شرح میں رقم طراز ہیں کہ ہمارے اصحاب اور دیگر علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ ہر دعا میں ہاتھ بلند کرنا سنت ہے۔ البتہ اتنا ضروری ہے کہ جب دعا کسی مصیبت کے ہٹانے کے لیے ہو جیسے قحط سالی وغیرہ تو ہتھیلیوں کی پشت آسمان کی طرف کرے اور جب دعا کسی چیز کے حصول کے لیے ہو تو ہتھیلیوں کے باطن آسمان کی طرف کرے۔ ان کی دلیل یہی حدیث استسقاء ہے جس میں ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا استسقاء کے علاوہ بھی کئی مقامات پر دعا میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہے جو شمار سے باہر ہیں۔ اور میں نے ان میں سے تقریباً تیس احادیث جمع کی ہیں جو صحیحین میں یا کم از کم کسی ایک میں موجود ہیں اور انہیں "شرح المهذب" کے باب "صفۃ الصلاۃ" کے آخر میں ذکر کیا ہے۔ (شرح النووی علی مسلم: ۶/۱۹۰)

امام نووی "شرح المهذب" میں فرماتے ہیں کہ نماز کے علاوہ دعا میں ہاتھ اٹھانے کے استحباب میں اختلاف ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ جان لو یہ مستحب ہے۔ اس کی تفصیل ہم بعد میں ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(المجموع شرح المهذب للنووی: ۳/۵۰۷)

امام نووی نے "الاذکار" میں باقاعدہ ایک باب "باب رفع الیدین فی الدعاء

ثم مسح الوجہ بہما" کے عنوان سے قائم کیا ہے۔

شیخ محمد بن علان صدیقی "شرح الاذکار" میں فرماتے ہیں: مصنف کا قول ہے کہ بغیر کسی قید کے ہر دعا میں آسمان کی طرف ہاتھ بلند کرنے میں بے شمار احادیث وارد ہیں اور جو شخص ان کے حصر کا دعویٰ کرے وہ فحش غلطی پر ہے۔

پھر "السلاح" کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ کسی کا یہ فتویٰ "کہ دعا کے بعد جو اپنے ہاتھوں سے چہرے کا مسح کرتا ہے' وہ جاہل ہے" اس امر پر محمول ہے کہ وہ ان احادیث پر مطلع نہیں۔ (الفتوحات الربانیہ علی الاذکار النوویہ: ۷/ ۲۵۷)

اور استسقاء کی قید کے بغیر ہر دعا کے وقت ہاتھوں کو بلند کرنا ثابت ہے۔ اور فقہاء و محدثین میں سے تمام اکابر علماء امت اور ائمہ دین نے اس قول کی تائید کی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی عظیم کتاب "فتح الباری" میں حدیث استسقاء کی شرح میں فرماتے ہیں کہ مصنف (امام بخاری) نے اس حدیث سے ہر دعا میں ہاتھ اٹھانے پر استدلال کیا ہے اور اس موضوع پر متعدد احادیث وارد ہیں جن کو امام منذری نے الگ ایک رسالہ میں جمع کیا ہے اور امام نووی نے ان میں سے تقریباً تیس احادیث "شرح المہذب" کے باب "صفۃ الصلاۃ" میں نقل کی ہیں۔

(فتح الباری: ۲/ ۵۰۷' الدعوات: ۱۱/ ۱۴۲)

"تحفۃ الاحوذی" میں فرماتے ہیں کہ دعا کے وقت ہاتھ اٹھانے کے ثبوت میں صحیح اور صریح کثیر احادیث وارد ہیں جیسا کہ تم نے باب "ما یقول اذا سلم" میں جان لیا۔ (تحفۃ الاحوذی: ۹/ ۳۲۹)

حدیث انس رضی اللہ عنہ کا جواب

جو حدیث بظاہر دعا میں رفع یدین کی نفی کو مفید ہے' وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایرفع یدیہ فی شیئی من دعائہ الا فی الاستسقاء فانہ کان یرفع یدیہ حتی یری بیاض ابطیہ۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی دعا میں اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے مگر استسقاء میں اور ہاتھ اس قدر بلند فرماتے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی (کی جگہ) دکھائی دیتی۔ (بخاری و مسلم)

علماء نے اس حدیث کے متعدد جوابات دیئے ہیں' جن میں سے حافظ غماری رحمتہ اللہ علیہ کا قول قابل ترجیح ہے جو انہوں نے امام حافظ سیوطی رحمتہ اللہ علیہ کے قول پر "تعلیقا" ذکر کیا لہٰذا پہلے امام سیوطی رحمتہ اللہ علیہ کا قول ملاحظہ ہو' چنانچہ حافظ سیوطی "تدریب الراوی" میں متواتر کی بحث میں فرماتے ہیں:

"اس کی ایک قسم وہ ہے جس کا معنی متواتر ہو جیسے دعا میں رفع یدین کی احادیث اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سو کے قریب ایسی احادیث مروی ہیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعا میں ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے۔ میں نے انہیں ایک رسالہ میں جمع کیا ہے لیکن وہ مختلف واقعات سے متعلق ہے اور ہر واقعہ متواتر نہیں۔ البتہ ان میں قدر مشترک "یعنی دعا کے وقت ہاتھ اٹھانا" مجموع کے اعتبار سے متواتر ہے۔"

حافظ غماری فرماتے ہیں کہ یہ حدیث انس پر مقدم ہیں اور جمہور ائمہ حدیث کے نزدیک ان پر عمل کو اولویت اور ترجیح حاصل ہے۔ کیونکہ حدیث انس میں جو ہے کہ انہوں نے استسقاء کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا میں رفع یدین کرتے نہیں دیکھا' وہ ان کے علم کے مطابق ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی اور نے بھی نہیں دیکھا۔ یعنی رویت انس کی نفی۔ رویت غیر کی نفی کو مستلزم نہیں۔

مزید بر آنکہ یہ حدیث نافی ہے اور دیگر احادیث مثبتہ ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ مثبت نافی پر مقدم ہوتی ہے۔ جیسا کہ کتب اصول میں موجود ہے اور یہی صحیح اور مشہور

ہے جس پر جمہور کا عمل ہے۔ کیونکہ انسان کی غفلت کثیر ہے اور اس لیے بھی کہ جمہور کا موقف علم کی زیادتی اور تاسیس کو مفید ہے جبکہ وہ موسس نہیں اور نافی اصل کو مضبوط یعنی اس کی تاکید کرتی ہے۔ اب اس کے بعد کوئی خفا باقی نہیں رہا کیونکہ اس میں واضح کی وضاحت ہے۔

حافظ ابن حجر "فتح الباری" میں بیان کرتے ہیں کہ ایک جماعت نے تاویل کر کے احادیث مثبتہ اور حدیث انس نافی میں مطابقت قائم کی ہے کہ حدیث نفی کو مخصوص جہت پر محمول کیا جائے یا ہاتھ بلند کرنے میں مبالغہ پر عمل کیا جائے۔ جس پر یہ ارشاد گرامی واضح دلالت کرتا ہے:

حتی یری بیاض ابطیہ۔ — حتیٰ کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی (کی جگہ) دکھائی دیتی تھی۔

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ دعا میں رفع یدین کے مسئلہ میں اکثر احادیث جو وارد ہیں' ان میں بوقت دعا ہاتھ پھیلانے کا ذکر ہے۔ اور استسقاء میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین فرمایا' اس میں یہاں تک مبالغہ فرمایا کہ ہاتھوں کو چہرے کے مقابل اٹھایا اور اس وقت آپ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی گئی۔ یا اس سے مراد خاص استسقاء میں ہاتھ اٹھانے کا یہ انداز ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء میں اپنی ہتھیلی کی پشت سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔"

سنن ابوداؤد میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث موجود ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استسقاء میں اس طرح دعا فرمایا کرتے تھے' اور اپنے ہاتھوں کو پھیلایا اور ان کے باطن کو زمین کی طرف کر دیا' حتیٰ کہ میں نے آپ کی بغلوں کی سفیدی (کی جگہ) دیکھ لی۔"

(المنح المطلوبہ فی استحباب رفع الیدین فی الدعاء بعد الصلوات المکتوبہ للغماری: ۳۵)

دعا میں ہاتھ اٹھانے کا استحباب

علامہ محقق شیخ عبد الفتاح ابو غدہ فرماتے ہیں کہ یوں کہنا ہی مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ سے طلب حاجات کی دعا میں ہاتھ بلند کرنا مطلقاً مستحب ہے۔ نہ کوئی استثناء ہے اور نہ ہی کوئی وقت کی قید۔ اس کی اصل مالک بن یسار سکونی، ابو بکرہ ثقفی اور سلمان رضی اللہ عنہم کی احادیث ہے۔

میں (مالکی) کہتا ہوں کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی حدیث تو پہلے گزر گئی اور حضرت مالک بن یسار سکونی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو امام احمد نے "مسند" میں اور امام ابو داؤد نے "سنن" میں نقل کیا جس کے الفاظ یہ ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا سالتموا الله فاسالوه ببطون اكفكم ولا تسالوه بظهورها۔	جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اپنی ہتھیلیوں کے باطن سے کرو نہ کہ ان کی پشتوں سے۔

امام ابو داؤد مالک کے بارے خاموش ہیں اور وہ ان کے نزدیک صالح الحدیث ہے۔ اور حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا، جس کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سلوا الله ببطون اكفكم ولاتسالوه بظهورها۔	اللہ تعالیٰ سے اپنی ہتھیلیوں کے باطن سے سوال کرو اور ان کی پشتوں سے سوال نہ کرو۔

اس حدیث کے رجال عمار بن خالد واسطی کے علاوہ سب صحیح کے رجال ہیں اور عمار بھی ثقہ ہیں۔ مجمع الزوائد (۱۰/ ۱۶۹) میں ایسے ہی ہے۔

شیخ ابو غدہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول وہ دعائیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصاً ہاتھ بلند فرمائے جیسے نماز میں

دعائے قنوت' دعائے استسقاء' کعبہ دیکھتے وقت کی دعا' صفا پر دعا' جمعرات کو رمی کرتے وقت دعا اور عرفات میں دعا وغیرہ۔ ان میں ہاتھ بلند کرنا مستحب ہے۔

رہی وہ دعائیں جو متکررہ یعنی بار بار آنے والے اوقات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں جیسے صبح و شام کی دعا' طلوع شمس کے وقت کی دعا' سونے اور بیدار ہونے کے وقت کی دعا' کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد کی دعا وغیرہ وغیرہ تو خصوصاً ان دعاؤں میں رفع یدین کے استحباب کا حکم نہیں بلکہ اس امر میں مطلق اباحت ہے جب تک کوئی مانع نہ ہو یا رفع یدین کے عدم جواز پر کوئی خاص دلیل وارد نہ ہو۔

اذکار میں رفع یدین مطلقاً جائز نہیں جیسا کہ ظاہر ہے۔ چاہے اذکار اوقات متکررہ میں منقول ہوں یا غیر میں۔ (تحقیق العلامہ الشیخ ابو غدہ للمنیع المعلوبہ: ۵۵)

سید محمد صدیق حسن خان قنوجی (نزل الابرار) کے آداب دعا کے باب میں فرماتے ہیں کہ کیا دعا میں ہاتھ بلند کیے جائیں یا بچھائے جائیں؟ پھر اس مسئلہ میں وارد ہونے والی تمام احادیث نقل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حاصل کلام یہ ہے کہ دعا میں ہاتھ بلند کرنا دعا کے احسن آداب میں سے ایک ہے۔ چاہے دعا جو بھی ہو اور جس وقت ہو' پنجگانہ نمازوں کے بعد ہو یا اس کے علاوہ' اس پر احادیث کا عموم دال ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ حافظ ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ کا نمازوں کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانے کا انکار کرنا ان کا وہم ہے۔ ہم نے اس مسئلہ میں اپنی تالیفات میں پوری تحقیق کی ہے اور مسئلہ کو اتنا واضح کیا ہے کہ اس پر کوئی خفاء نہیں رہا۔

علامہ قسطلانی رحمتہ اللہ علیہ "ارشاد الساری شرح صحیح البخاری" میں فرماتے ہیں کہ تمام دعاؤں میں ہاتھ بلند کرنے کا استحباب صحیح ہے۔ اسے شیخین وغیرہما نے روایت کیا ہے۔

صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث لا یرفع الا فی الاستسقاء کی تاویل کی جائے گی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء کے علاوہ

ہاتھ بلند کرنے میں مبالغہ نہیں کیا اور دیگر مقامات پر حضور پرنور ﷺ کا ہاتھ بلند کرنا ثابت ہے۔

پھر سید قنوجی جمیع احادیث کو جمع کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر دعا میں ہاتھ اٹھانا مستحب ہے علاوہ اس کے جو ایسے امر سے مقید ہو جو ہاتھ نہ اٹھانے کا تقاضا کرے۔ جیسے رکوع و سجود و نحوھا کی دعا۔

امام نووی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مذکورہ حدیث انس کے ظاہر سے یہ وہم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء کے علاوہ ہاتھ بلند نہیں فرمائے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں بلکہ استسقاء کے علاوہ دیگر مقامات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعا میں ہاتھوں کو بلند کرنا ثابت ہے۔ اور ایسے مواقع شمار سے باہر ہیں۔ میں نے ان میں سے تقریباً تیس احادیث ایسی جمع کی ہیں جو صحیحین میں یا کم از کم ایک صحیح میں موجود ہیں اور میں نے انہیں "شرح المہذب" کے باب "صفۃ الصلوۃ" کے آخر میں ذکر کیا ہے۔

اور اس حدیث کی اس طرح تاویل کی جائے گی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے استسقاء کے علاوہ کسی اور موقع پر ہاتھ بلند کرنے میں اس قدر مبالغہ نہیں فرمایا حتی کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی (کی جگہ) دکھائی دی۔ یا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس موقع کے علاوہ ہاتھ اٹھائے ہوئے نہیں دیکھا اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھا ہے۔ لہٰذا دیگر مقامات میں رفع یدین کو ثابت کرنے والے کثیر ہیں بلکہ وہ جماعتیں ہیں جنہوں نے اکٹھے دیکھا تو یہ فرد واحد (انس) پر مقدم ہوں گے کیونکہ ممکن ہے کہ وہ وہاں حاضر نہ ہوں اور اس حدیث کی یہ تاویل کرنا ضروری ہے۔ (شرح النووی علی مسلم: کتاب الاستسقاء: ۶/ ۱۹۰)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری: کتاب الدعوات "باب رفع الایدی فی الدعاء" (۱۱/ ۱۴۲-۱۴۳) میں اور شیخ امام عینی نے عمدۃ القاری شرح البخاری (۷/ ۵۱)

اور (۲۲/ ۳۰۰) میں اسی طرح کی تاویل ذکر کی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے انکار کا جواب

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں، امام مسلم نے جو عمارہ بن رویبہ (براء موحدہ مصغرہ) کی حدیث نقل کی ہے کہ انہوں نے بشر بن مروان کو ہاتھ بلند کیے ہوئے دیکھا تو اس کا انکار کیا اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ صرف انگشت شہادت اٹھاتے اور اس پر زیادتی نہ فرماتے۔ طبری نے کسی پہلے بزرگ کے بارے میں بیان کیا ہے کہ انہوں نے اس کے ظاہر کو ہی لیا۔ اور فرماتے ہیں کہ سنت یہی ہے کہ دعا کرنے والا ایک انگلی سے اشارہ کرے اور بایں وجہ اس کا رد کیا کہ یہ دوران خطبہ خطیب کے حق میں وارد ہے اور یہ سیاق حدیث میں ظاہر ہے لہٰذا دعا میں ہاتھ بلند کرنے کی ممانعت میں اس سے تمسک کا کوئی معنی نہیں جبکہ اس کے جواز میں احادیث ثابت ہیں۔

پھر حافظ فرماتے ہیں کہ طبری نے کہا کہ حضرت ابن عمر اور جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہما دعا میں ہاتھ اٹھانے کو مکروہ سمجھتے تھے۔ اور حضرت شریح نے ایک ہاتھ بلند کر کے دعا کرتے ہوئے دیکھا تو اس سے کہا: "تو ہاتھوں سے کس کو پکڑ رہا ہے؟" (تیری ماں نہ ہو) اور طبری نے اس روایت کی اسناد نقل کیں۔

حافظ مزید فرماتے ہیں کہ طبری نے جو ابن عمر سے نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے کندھوں کے برابر تک ہاتھ اٹھانے کا انکار کیا۔ اور فرماتے ہیں کہ ہاتھوں کو سینے کے مقابل رکھے۔ طبری نے اسے بھی اسی طرح بیان کیا ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ دعا کی صفت ہے۔ ابو داؤد اور امام حاکم نے ان سے ایک اور طریق سے نقل کیا ہے کہ سوال کرتے وقت تم اپنے ہاتھ کندھوں تک اٹھاؤ۔ استغفار میں صرف ایک انگلی سے اشارہ کرو اور گڑگڑاتے ہوئے اپنے ہاتھ پھیلا دو۔ اور امام طبری نے انہی سے ایک اور طریق سے روایت کیا ہے کہ آپ ہاتھ اس قدر بلند کرتے

کہ ہاتھ سر سے تجاوز کر جاتے۔

مذکورہ روایت کے خلاف حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث مروی ہے۔ اسے امام بخاری نے "الادب المفرد" میں قاسم بن محمد کے طریق سے نقل کیا کہ میں نے "قاص" کے پاس ابن عمر کو کندھوں کے برابر ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے دیکھا۔ ہاتھوں کے باطن اوپر اور پشتیں زمین کی طرف تھیں۔ (فتح الباری: ۱۱/ ۱۷۲)

علامہ زرکشی کتاب "الازھیہ" میں اس کا رد کرتے ہیں جو ابن عمر سے دعا میں ہاتھ اٹھانے کی کراہت مروی ہے اور فرماتے ہیں کہ جو سہیلی نے "الروض الانف" میں ابن عمر کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ایک جماعت کو دعا میں ہاتھ اٹھائے ہوئے دیکھا اور کہا کیا انہوں نے ہاتھ اٹھائے ہیں؟ اللہ انہیں قطع کرے۔۔۔ بخدا اگر وہ زور زور سے چلاتے بھی رہیں تو وہ اس سے اللہ تعالیٰ کے قرب کو بڑھا نہیں سکتے۔ حافظ شمس الدین ذہبی فرماتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق صحیح روایت اس کے خلاف ہے۔ یحییٰ بن سعید انصاری قاسم سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابن عمر کو "قاص" کے پاس اپنے ہاتھ کندھوں تک اٹھا کر دعا کرتے ہوئے دیکھا اور اس کی سند اظہر من الشمس ہے۔

ہر مطالعہ کرنے والے پر واضح ہے کہ اس مسئلہ میں ائمہ حدیث کی اتنی نقول وارد ہیں جو حد شمار سے باہر ہیں۔ (المنح المعلوبہ: ٦١)

دعا میں ہاتھ اٹھانے کی کیفیت

امام ابوداؤد اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک دوسرے طریق سے نقل کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "طلب حاجات میں ہاتھ کندھوں تک اٹھائے جائیں۔ استغفار میں ایک انگلی سے اشارہ کیا جائے اور بارگاہ خداوندی میں گڑگڑاتے وقت ہاتھوں کو پھیلایا جائے۔"

امام طبری نے آپ رضی اللہ عنہ سے ہی نقل کیا ہے کہ ہاتھوں کو اتنا بلند کیا

جائے کہ سر سے تجاوز کر جائیں اور امام بخاری نے "الادب المفرد" میں قاسم بن محمد کے طریق سے نقل کیا ہے کہ

رایت ابن عمر یدعوا عند القاص یرفع۔	میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کو قاص کے پاس دعا کرتے ہوئے دیکھا۔
یدیه حتی یحاذي بهما منکبیه' باطنهما مما یلیه۔	کہ آپ نے اپنے کندھوں کے برابر ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔
وظاهرهما مما یلي وجهه۔	ہاتھوں کا باطن پچھلی طرف اور پشت آگے چہرے کی طرف تھی۔

اور امام احمد نے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ

کان النبي صلی الله علیه وسلم واقفا بعرفه یدعو هکذا۔۔۔ ورفع یدیه حیال ثندوته۔۔۔	نبی کریم ﷺ وقوف عرفہ کے موقع پر اس طرح دعا کر رہے تھے کہ آپ ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھ پستانوں والی جگہ کے گوشت تک بلند کیے ہوئے تھے۔

امام عبدالرزاق ابن ہمام نے باب "رفع الیدین فی الدعاء" میں نقل کیا ہے کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کے لیے بد دعا کی تو اپنے مبارک ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے (عمرو نے مجھے ہاتھ اٹھانے کا اشارہ کیا) ادھر اونٹنی چلنے لگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہاتھ سے اسے روکا اور دوسرا آسمان کی طرف بلند رکھا۔"

(المصنف: ۲/ ۲۴۷)

امام عبدالرزاق نے "المصنف" میں اسی طرح عروہ سے روایت کیا ہے کہ "بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک اعرابی قوم کے پاس سے گزرے جو مسلمان تھے اور گروہ بندی نے انہیں خستہ حال کر دیا تھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک چہرے کی طرف اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے ان کے لیے دعا

فرمائی۔ ایک اعرابی عرض گزار ہوا "یا رسول اللہ مدد کیجئے --- میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں" تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے تک اپنے ہاتھ اٹھائے اور آسمانوں کی طرف مزید بلند نہ کیے۔" (المصنف: ۲/۲۵۱)

امام بدر الدین عینی "عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری" میں فرماتے ہیں کہ کسی نے ہاتھ اٹھا کر پھیلانے کو اختیار کیا ہے۔ پھر اس کی صفت میں حضرات کا اختلاف ہے۔ کسی نے کہا کہ ہاتھوں کو سینے کے برابر تک بلند کیا جائے اور ہاتھوں کے باطن چہرے کی جانب ہوں۔ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہاتھوں کو سینے کے برابر بلند کرے تو وہ دعا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ہتھیلیوں کے باطن سے دعا کیا کرتے تھے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور ان حضرات کی دلیل یہ روایت ہے کہ صالح بن کیسان نے محمد بن کعب قرظی سے ' ابن عباس سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا سالتم الله عزوجل	جب تم اللہ عزوجل شانہ سے سوال کرو
فاسالوه ببطون اكفكم ولا	تو اپنی ہتھیلیوں کے باطن سے سوال کرو اور
تسالوه بظهورها وامسحوا	پشت سے سوال نہ کرو اور انہیں اپنے
بها وجوهكم۔	چہروں پر مل لو۔

اور کسی نے چہروں تک ہاتھ اٹھانے کو اختیار کیا اور یہ ابن عمر اور ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور کسی نے ہاتھوں کو چہرے کے مقابل تک اس طرح اٹھانے کو اختیار کیا کہ ان کی پشتیں چہروں سے ملی ہوں اور کسی نے یہ اختیار کیا کہ رغبت میں ہاتھوں کے باطن آسمان کی طرف کیے جائیں اور خوف میں زمین کی طرف اور بعض نے کہا کہ ہر حال میں ہاتھوں کے باطن آسمان کی طرف کیے جائیں۔

(عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری: ۲۲/۳۰۰)

دعا کے بعد ہاتھوں کا منہ پر ملنا

امام عبد الرزاق نے "المصنف" میں معمر سے، زہری سے روایت کیا ہے:

كَانَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ عِنْدَ صَدْرِهِ فِي الدُّعَاءِ ثُمَّ يَمْسَحُ بِهِمَا وَجْهَهُ.	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں اپنے ہاتھ مبارک سینے تک اٹھاتے پھر مبارک چہرے پر مل لیتے۔

عبد الرزاق فرماتے ہیں کہ بسا اوقات میں نے معمر کو ایسا کرتے دیکھا اور میں بھی ایسے ہی کرتا ہوں۔

یحیٰ بن سعید سے مروی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما قاص کے ساتھ اپنے ہاتھ پھیلا لیتے تھے اور مذکور ہے کہ سابقین دعا کرتے تھے پھر ہاتھوں کو اپنے چہروں پر لوٹاتے تاکہ دعا اور برکت حاصل ہو۔ علامہ عبد الرزاق فرماتے ہیں کہ میں نے معمر کو دیکھا کہ وہ ہاتھوں کو سینے کے پاس رکھ کر دعا کرتے پھر چہرے پر مل لیتے۔ حاشیہ میں اس قول پر یہ تعلیق ہے کہ "تاکہ دعا اور برکت ان کے چہروں پر وارد ہو" اور زوائد میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ "دعا کے بعد جب اپنے ہاتھ لوٹائے تو اس خیر و برکت کو اپنے چہرے پر ڈال کر فارغ ہو۔"

علامہ متقی ہندی نے "کنز الایمان" میں دو طریق سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث امام طبرانی سے نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان ربكم حيي كريم يستحيي ان يرفع العبد يديه فيردهما صفرا لا خير فيهما، فاذا رفع احدكم يديه فليقل: 'ياحيي ياقيوم لا اله الا انت (ثلاث مرات) ثم اذا رد يديه	بے شک تمہارا پروردگار زندہ اور سخی ہے۔ بندہ جب ہاتھ بلند کرتا ہے تو وہ انہیں بغیر خیر ڈالے لوٹانے سے حیاء فرماتا ہے۔ جب کوئی تم میں سے اپنا ہاتھ اٹھائے تو تین مرتبہ یوں کہے: "اے حی قیوم! تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔" پھر جب ہاتھ واپس

فلیفرغ ذلک الخیر علی وجهه۔	لوٹائے تو چاہیے کہ اس خیر کو اپنے چہرے پر ڈالے اور فارغ ہو جائے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا دعوت الله فادع ببطون کفیک ولا تدع بظهورهما' فاذا فرغت فامسح بهما وجهک۔	جب تو اللہ سے دعا کرے تو اپنی ہتھیلیوں کے باطن سے کر اور ان کی پشتوں سے نہ کر اور جب تو دعا سے فارغ ہو جائے تو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اپنے چہرے پر مل لے۔

حافظ ہیثمی کہتے ہیں کہ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا اور اس کی سند ضعیف ہے۔ (مجمع الزوائد: ۱۱/ ۲۷۴) میں ایسے ہی ہے۔ ابن جوزی کا قول ہے کہ یہ صحیح نہیں' اس میں صالح بن حسان متروک ہے اور ابن حبان کا قول ہے کہ وہ موضوعات روایت کرتا ہے لیکن اس کا شاہد ہے جیسا کہ (فیض القدیر: ۱/ ۳۴۵) میں ہے۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

کان رسول الله ﷺ اذا رفع یدیه فی الدعاء لم یحطهما حتی یمسح بهما وجهه۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں جب اپنے ہاتھ بلند فرماتے تو انہیں اپنے چہرے پر ملے بغیر نیچے نہ کرتے۔

حافظ ابن حجر "بلوغ المرام" میں فرماتے ہیں کہ اس کے شواہد ہیں 'جن میں سے ایک ابوداؤد کی نقل کردہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ ہے۔ ان کے مجموعہ کا یہ تقاضا ہے کہ حدیث حسن ہے۔

امام سیوطی رحمتہ اللہ علیہ "فض الوعاء" میں فرماتے ہیں کہ ترمذی کے بعض نسخوں میں ہے کہ یہ صحیح ہے۔

امام داؤد نے اپنی "سنن" کے "باب الدعاء" میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تستروا الجدر' من نظر فی	دیواروں کی اوٹ میں نہ چھپو۔ جس نے
کتاب اخیه بغیر اذنه فانما	بلا اجازت اپنے بھائی کی بیاض میں دیکھا تو وہ
ینظر فی النار' وسلوا الله	جہنم میں دیکھتا ہے۔ اور اللہ سے سوال کرو تو
ببطون اکفکم ولا تسالوه	اپنی ہتھیلیوں کے باطن سے کرو نہ کہ ان کی
بظهورها' فاذا فرغتم	پشتوں سے اور جب تم فارغ ہو جاؤ تو انہیں
فامسحوابهاوجوهکم۔	اپنے چہروں پر مل لو۔

امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ یہ حدیث محمد بن کعب کے علاوہ جتنے طرق سے بھی مروی ہے وہ سب بے اصل ہیں اور سب سے عمدہ طریق یہی ہے اور یہ بھی ضعیف ہے۔

(بذل المجہود: ۷ / ۳۴۴)

دعا میں ہاتھ بلند کرنے اور چہرے پر پھیرنے کی حکمت

صاحب "تحفہ الاحوذی" فرماتے ہیں کہ ابن الملک نے کہا کہ یہ طریقہ نیک فال کے طور پر ہے۔ گویا کہ اس کی ہتھیلیاں برکات سماویہ اور انوار الہیہ سے بھر گئیں اور "السبل" میں فرماتے ہیں کہ دعا سے فراغت کے بعد ہاتھوں کے چہرے پر مسح کرنے کے جواز پر دلیل حدیث شریف میں ثابت ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب ہاتھوں کو خالی نہیں لوٹاتے تو گویا کہ ان پر رحمت برسی ہے اور مناسب یہی ہے کہ اس رحمت کو چہرے پر پہنچایا جائے جو کہ اشرف الاعضاء ہے اور تکریم کا زیادہ حق رکھتا ہے۔

صاحب "المنح" فرماتے ہیں کہ اگر یہ اعتراض ہو کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی جہت میں نہیں تو پھر دعا میں آسمان کی طرف ہی ہاتھ اٹھانے کا کیا معنیٰ؟

تو اس کا جواب "اتحاف السادۃ المتقین" میں طرطوشی سے منقول ہے جو درج

ذیل دو وجہ پر مشتمل ہے۔

(ا) بے شک یہ عبادت کا محل ہے۔ جیسے نماز میں کعبہ کی طرف متوجہ ہونا اور سجود میں زمین پر پیشانی رکھنا۔ باوجود اس کے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ بیت اللہ اور سجود کے محل سے بھی پاک ہے 'گویا کہ آسمان دعا کا قبلہ ہے۔

(۲) بے شک آسمان رزق اور وحی کے نزول کا مقام اور رحمت و برکت کی جگہ ہے۔ بایں معنی کہ اس سے بارش زمین پر نازل ہوتی ہے جس سے نبات نکلتی ہے اور یہ ملاء اعلیٰ کا مسکن ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو اسے ان کی طرف القاء کرتا ہے اور وہ اسے اہل زمین کی طرف القاء کر دیتے ہیں۔ اور اسی طرح ہی اعمال اٹھائے جاتے ہیں۔ اسی میں ہی انبیاء ہیں اور اسی میں ہی وہ جنت ہے جو آخری تمنا ہے۔ تو جب یہ ایسے عظیم امور کا معدن اور قضاء و قدر کے نفاذ کا مقام ہے تو تمام سرگرمیاں اسی کی طرف مصروف ہیں اور دعا کرنے والے اسی کی عزت و حرمت کا پاس اور لحاظ کرتے ہیں۔

نیز فرماتے ہیں کہ قاضی ابن قریعہ نے بڑا نفیس جواب دیا ہے جب انہوں نے ایک رات وزیر مہلبی کی حویلی میں نماز ادا کی۔ اور ابو اسحاق صابی (مجوسی) انہیں دیکھ رہا تھا۔ قاضی نے محسوس کر لیا۔ جب انہوں نے سلام پھیرا تو اسے کہا: اے صابیہ کے بھائی تجھے کیا ہے کہ مجھے ترچھی نظر سے دیکھتا ہے 'کیا تجھے اس صاف ستھری شریعت سے لگن ہو گئی ہے؟ کہنے لگا نہیں 'بلکہ میں نے تمہارا عیب پکڑ لیا ہے' آپ نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ کہنے لگا کہ میں نے تمہیں دیکھا ہے کہ تم اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتے ہو اور اپنی پیشانی زمین کی طرف جھکاتے ہو 'لہذا تمہارا مطلوب کہاں ہے؟

تو قاضی ابن قریعہ نے فرمایا کہ ہم اپنے ہاتھ ارزاق کے مطالع (نکلنے کی جگہ) کی طرف بلند کرتے ہیں اور اپنی پیشانیاں اجساد کے مصارع (گرنے کی جگہ) کی طرف جھکاتے ہیں۔ فلسفہ یہ ہے کہ پہلے ہم اپنے رزق کی التجا کرتے ہیں پھر دوسرے عمل سے

ہم مصارع کے شر سے دفاع چاہتے ہیں۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا:

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ۔(الذریت: ۲۲) اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور جو تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ جل شانہ نے فرمایا:

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ۔(طہٰ: ۵۵) ہم نے زمین ہی سے تمہیں بنایا اور اسی میں تمہیں پھیر لے جائیں گے۔

تو حلبی نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے دور میں تیری مثل کوئی پیدا نہیں کیا۔(المنح المطلوبہ للغماری: ۶۱-۳۶)

نماز کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانا

نماز کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانے کا مسئلہ دراصل مذکورہ مسئلہ کے تابع ہے لیکن لوگوں کا اس میں شدید اختلاف ہے۔ انکار اور اعتراض کا سلسلہ ان میں بڑی شد و مد سے جاری ہے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ چند سطور میں دو نقطوں کے تحت اس مسئلہ کی بھی وضاحت کر دوں۔

(۱) اصول میں یہ ضابطہ مرقوم ہے کہ ایک آیت یا حدیث جب کسی امر کو اپنے عموم سے شامل ہو تو وہ اس امر کے جواز پر دلالت ہے اور پہلی بحث میں بے شمار صحیح اور غیر صحیح احادیث گزر چکی ہیں۔ جو اپنے عموم کے اعتبار سے دعا میں ہاتھ اٹھانے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں اور یہ حکم اپنے عموم کے لحاظ سے نماز کے بعد ہاتھ اٹھانے کے جواز کو بھی شامل ہے۔ اور کسی طرح بھی اس کو بدعت کا نام دینا جائز نہیں۔ لہٰذا نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا ان احادیث کے عموم سے مشروع ہے۔ اور یہ منکرین جو ایسی دلیل پر اکتفا نہیں کرتے، جو مسئلہ کو اپنے عموم کے لحاظ سے شامل ہو اور اس مسئلہ سے متعلق خاص دلیل طلب کرتے ہیں۔ انہیں دین میں بہت بڑا نقصان لازم آتا ہے اور بسا اوقات وہی انہیں ضلالت و گمراہی کے اندھے کنوئیں میں ڈال دیتا ہے اور انہیں

خبر بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اگر ہر واقعہ اور حادثہ اس امر سے مشروط ہو کہ اس پر خاص دلیل وارد ہو تب اس کا جواز ثابت ہو گا اور بدعت کی اس سے نفی ہو گی۔ تو کتاب و سنت کے تمام تر عمومات معطل ہو کر رہ جائیں گے اور ان سے دلیل پکڑنا باطل ہو جائے گا۔ اور بلا محالہ یہ بڑے بڑے دلائل شریعہ کا انہدام اور احکام کا دائرہ تنگ کرنے کے مترادف ہے۔ نیز اس سے لازم آتا ہے کہ شریعت کے احکام کافی نہیں ہیں جو مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ جنم لینے والے حوادثات کا حل پیش کر سکیں۔ اور یہ لوازم شریعت کی قدر و منزلت اور اس کے فیضان میں کمی اور نقصان کو ظاہر کرتے ہیں جو کہ کھلا کفر ہے۔ لہٰذا وہ احادیث مبارکہ جن کو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے' وہ اپنے عموم کے لحاظ سے نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کو یقینی طور پر شامل ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ماہر اور سنجیدہ قسم کے لوگوں کے علاوہ کسی کو عبرت نہیں۔ ع

ولیس کل خلاف جاء معتبرا
الا خلافا له حظ من النظر

(جو کوئی بھی اس کے خلاف اعتبار کرے تو یقیناً تحقیق اس کے خلاف ہے)

(۲) ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس سے محروم نہیں کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ میں کوئی ایسی دلیل نہ پا سکیں جو حق اور صراط مستقیم کی طرف ہدایت دے اور یقیناً ہر قلب سلیم اس صریح دلیل سے شفا پائے گا جو امام طبرانی نے محمد بن ابو یحییٰ سے روایت کیا:

رایت عبدالله ابن الزبير	میں نے عبداللہ بن زبیر کو دیکھا اور
ورای رجلا رافعا يديه يدعوا	ایک شخص کو نماز سے فراغت سے پہلے ہاتھ
قبل ان تفرغ من صلوته فلما	اٹھا کر دعا کرتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ فارغ
فرغ منها قال له ان رسول الله	ہوا تو آپ نے اسے کہا کہ بے شک رسول
صلى الله عليه وسلم لم يكن	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ نہیں اٹھاتے

یرفع یدیہ حتی یفرغ من صلاتہ۔ تھے یہاں تک کہ وہ نماز سے فارغ ہو جاتے۔

(مجموع الزوائد ومنبع الفوائد للحافظ الہیثمی: ۱۰/ ۱۶۹)

علامہ عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری کا فتویٰ

شیخ علامہ عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری ہندی فرماتے ہیں کہ اس دور میں علماء اہل حدیث کا اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہے کہ امام جب فرضی نماز سے فارغ ہو تو کیا اس کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا اور پیچھے مقتدیوں کا ہاتھ اٹھا کر آمین کہنا جائز ہے؟

بعض تو جواز کے قائل ہیں اور بعض عدم جواز کے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ بدعت ہے اور کہتے ہیں کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح سند کے ساتھ ثابت نہیں بلکہ یہ نیا امر ہے اور ہر نیا امر بدعت ہے۔

اور جواز کے قائلین:

(۱) ان پانچ احادیث سے استدلال کرتے ہیں جن کا ذکر پہلے گزر گیا۔

(۲) اور دعا میں ہاتھ اٹھانے کی احادیث کے عموم سے بھی استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فرضی نماز کے بعد دعا مستحب ہے۔ اور اس میں رغبت ہے اور فرضی نماز کے بعد دعا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور ہاتھ اٹھانا دعا کے آداب میں سے ایک ہے۔

(۳) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کثیر دعاؤں میں ہاتھ اٹھانا ثابت ہے۔

(۴) اور فرضی نماز کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانے سے ممانعت ثابت نہیں بلکہ اس کے ثبوت میں ضعیف احادیث وارد ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ امور اربعہ کے ثبوت اور منع کے عدم ثبوت کے بعد فرضی نماز کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانا بدعت سیئہ نہیں بلکہ جائز ہے اور جو ایسا کرے اس پر کوئی حرج نہیں۔

پھر شیخ محدث مبارک پوری نے مذکورہ امور اربعہ کے اثبات پر استدلال کرتے

ہوئے کلام کیا اور اس مسئلہ میں متعدد احادیث وارد کیں۔

میں (مبارک پوری) کہتا ہوں کہ میرے نزدیک راجح قول یہی ہے کہ نماز کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانا جائز ہے۔ اگر کوئی ایسا کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں 'انشاء اللہ تعالیٰ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(تحفہ الاحوذی شرح جامع الترمذی 'کتاب الصلاۃ' باب مایقول اذا سلم: ۱/ ۲۴۵)

ایک مردود اعتراض کا شافی جواب

اگر یہ کہا جائے کہ صحیح طریق سے ثابت نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھایا کرتے تھے۔ اگر یہی اعتراض ہو تو یہ صحیح نہیں اور بفرض محال صحیح بھی ہو تو یہ فقط آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پر دوام کو مفید نہیں۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ہیشگی نہیں فرمائی۔

اس کا جواب دو وجہ سے ہے:

(۱) بے شک یہ کلام مردود ہے۔ ان نصوص عامہ اور خاصہ کی وجہ سے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

(۲) ہمارے شیخ غماری فرماتے ہیں یہ ضروری اور بدیہی امر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مستحبات کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ بلکہ ایسی آیات واحادیث کے عموم میں ان کی طرف راہنمائی کرنے پر اکتفا کیا ہے جو فعل خیر پر دال ہیں اور جن میں اعمال حسنہ کی ترغیب ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے بڑے واجبات میں مشغول رہے اور وقت کا عظیم حصہ انہیں میں ہی مستغرق رہا۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول' خلیفہ' قاضی اور مفتی ہونے کے واجبات ہیں تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمیع مندوبات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کیسے فارغ ہوتے؟ یہ محال ہے۔ بشری طاقت اس کی استطاعت نہیں رکھتی۔ اب بعض مندوبات کو محض اس لیے ترک کر دینا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تو لامحالہ یہ

بھلائی کے بے شمار دروازوں کو بند کرنا اور ان کے تارک کو ثواب حاصل کرنے سے محروم رکھنا ہے۔ (مقدمہ الغماری لکتاب بنیہ رفع الیدین للسید الاھدل : ۱۳)

امام محدث شیخ محمد انور شاہ کشمیری اس مسئلہ میں طویل کلام کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

جان لو کہ فضائل و رغائب اس امر میں منحصر نہیں کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل ہی ثابت ہو۔ بلاشبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی امور اپنی ذات اقدس کے لیے خاص فرما رکھے تھے جو آپ کی شان کے لائق اور منصب کے مناسب تھے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمیع فضائل کا عملاً اگرچہ احاطہ نہیں کیا لیکن قولاً ان کی ترغیب ضرور دلائی ہے تاکہ امت انہیں اپنا معمول بنائے۔

اور منجملہ نمازوں کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند کرنے کا مسئلہ ہے جس کا ثبوت فعلاً کم ہے اور اس کی فضیلت قولاً اکثر ہے یعنی احادیث عامہ میں تو یہ ہرگز بدعت نہیں۔ اور جس کا یہ خیال ہو کہ فضیلت صرف اسی کام میں ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ثابت ہو تو ایسا شخص راہ راست سے بھٹک چکا ہے اور یہ فاسد بنیاد بنائی ہے باوجودیکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں اذکار پر مشتمل ہیں اور اذکار میں ہاتھ بلند کرنا نہیں ہوتا اور ہم جب اذکار کا التزام نہ کریں تو مناسب ہے کہ دعاؤں سے محروم نہ رہ جائیں اور ان کے لیے ضرور ہاتھ بلند کریں کیونکہ نفلی نماز کے بعد اس کا ثبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے جیسا کہ مطلب بن وداعہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

صلوٰۃ اللیل مثنی مثنی وتشہد فی کل رکعتین و تباءس و تمسکن، و تقنع یدیک، وتقول اللھم اغفرلی،	رات کی نفلی نماز دو دو رکعت ہے اور ہر دو رکعت کے بعد التحیات پڑھے اور عاجزی اور اطمینان کے ساتھ بیٹھے اور اپنے ہاتھ بلند کرتا ہوا یوں عرض گزار ہو: اے اللہ!

فمن لم یفعل ذلک فھو خراج -(رواہ ابوداؤد و ابن ماجہ) مجھے بخش دے اور جو ایسا نہ کرے وہ نقصان پر ہے۔

اگر چہ ان احادیث پر نظر کرنے سے فرضی نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک فعل سے رفع یدین ثابت نہیں جو عموماً مفروضہ نمازوں کے بعد دعا کے سلسلے میں وارد ہیں تو گویا کہ وہ رفع یدین کے ذکر سے خاموش ہیں۔ لیکن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی حدیث فرضی نمازوں کے بعد دعا میں ہاتھ اٹھانے کے ثبوت میں کافی ہے اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت بھی ہے۔ اصول یہ ہے کہ جب ایک امر کی جنس ثابت ہو جائے تو وہ قطعاً بدعت نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اس مسئلہ کی فضیلت میں تو قولی احادیث وارد ہیں۔ (فیض الباری، شرح صحیح البخاری: ۲/۴۳۱)

اس مسئلہ میں اس قدر نصوص کا وارد کرنا ہر اس شخص کے لیے کافی ہے جو اللہ تعالیٰ سے عنایت و بخشش کا طلب گار ہے اور جو حق و صواب کا خواہاں اور عناد و سرکشی کے رستے سے بعید ہے۔ اور جو مزید مطالعہ کا خواہش مند ہو وہ امام احمد کی "مسند" ابن ابی شیبہ کی "مصنف"، بیہقی کی "سنن" اور امام حاکم کی "مستدرک" کا مطالعہ کرے۔ ان میں بے شمار نصوص مرفوعہ اور ایسے آثار موجود ہیں جو صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم اجمعین پر موقوف ہیں۔

اس بحث کا یہ مقصود نہیں کہ اس مسئلہ کو سب پر واجب ٹھہرایا جائے اور نہ ہی یہ کہ ان کو منتشر کیا جائے کہ دعا میں ہاتھ بلند کرنا سنت ہے یا مستحب۔ اور تمام فروعی مسائل میں ایسا کوئی تصور نہیں جن میں فقہائے امت کا اختلاف ہے البتہ ان حضرات کی عزت و احترام اور تقدیم و تکریم ضروری ہے اور ان کے فضل و شرف کا اعتراف اور تمام امور میں ان کے بارے حسن ظن لازمی ہے۔ اور جو امر ان سے درست ثابت ہوا سے ان کے ذکر سے نشر کرنا چاہیے اور جہاں ان سے خطا واقع ہوئی ہے وہاں ان کے لیے عذر تلاش کرنا چاہیے اور ساتھ ساتھ رحمت و رضوان اور مغفرت و

بخشش کی ان کے لیے دعا کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ ان سے احسن طریقے سے راضی ہو اور جنت ان کی منزل اور ٹھکانہ بنائے۔

لیکن مقصود یہ ہے کہ سب کو اس مسئلہ کے حکم کی معرفت ہو جائے اور جو اقوال ونصوص اس میں وارد ہیں ان سے آشنائی ہو جائے۔ اگر کوئی اسے قبول کرلے تو یہی مطلوب ہے اور اگر قبول نہ کرے تو اس پر ضروری ہے کہ جس کو ہاتھ اٹھاتے دیکھے اسے اپنے حال پر چھوڑ دے تاکہ وہ انہیں بلند کرے' پھیلائے' بند کرے یا اپنے پاس اس بے حیا' گستاخ اور بے ادب کو تھپڑ دے مارے جو ائمہ دین کے اقوال کا ادب نہیں کرتا۔

عورتوں کے سونا پہننے کا مسئلہ

عورتوں کے سونا پہننے کی حرمت میں متعدد نصوص وارد ہیں جن سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "ہند بنت ہبیرہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ میں سونے کی بڑی انگوٹھی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ہاتھ کو مارنے لگے۔ وہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی اور اس کی شکایت کی جو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی گردن سے سونے کا ہار اتارا اور کہا: یہ ابو حسن (حضرت علی رضی اللہ عنہ) نے تحفہ دیا ہے۔ ہار ان کے ہاتھ میں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا:

یا فاطمة ایغرک ان یقول الناس: ابنه رسول الله و فی یدک سلسله من نار-	اے فاطمہ! کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ لوگ تجھے اللہ کے رسول کی بیٹی کہیں اور تیرے ہاتھ میں جہنم کا زنجیر ہو۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے بغیر تشریف لے گئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وہ ہار بازار بھیج کر بیچ دیا اور اس کے پیسوں سے ایک غلام خرید لیا اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ غلام کے بارے میں بھی اسی طرح کے کلمات ذکر کیے تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اسے آزاد کردیا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ بیان کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحمدلله الذی انجی فاطمة من النار۔	اللہ کا شکر ہے جس نے فاطمہ کو جہنم سے بچالیا۔

اس کو امام نسائی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(۲) اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایما امراه تقلدت قلاده من ذهب قلدت فی عنقها مثلها من النار یوم القیامة' و ایما امراه جعلت فی اذنها خرصا من ذهب جعل فی اذنها مثله من النار یوم القیامة۔	جس عورت نے سونے کا ہار پہنا قیامت کے دن اسی کی مثل آگ کا ہار اس کی گردن میں ڈالا جائے گا اور جس نے سونے کی بالی کانوں میں ڈالی قیامت کے دن اسی کی مثل آگ کی بالی اس کے کانوں میں ڈالی جائے گی۔

اس کو امام ابوداؤد اور نسائی نے جید سند کے ساتھ روایت کیا۔

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من احب ان یحلق جبینه حلقه من نار فلیحلقه حلقة من ذهب' ومن احب ان یطوق	جسے یہ پسند ہو کہ آگ کا حلقہ (چھلا) اس کی پیشانی پر ڈالا جائے تو وہ سونے کا حلقہ ڈال لے اور جسے یہ پسند ہو کہ اس کی پیشانی

جبینہ' طوقا من نار فلیطوقہ طوقا من ذھب' ومن احب ان یسور جبینہ بسوار من نار فلیسورہ بسوار من ذھب' ولکن علیکم بالفضۃ" فالعبوابھا۔	کو آگ کا طوق پہنایا جائے تو وہ سونے کا طوق پہن لے اور جسے یہ پسند ہو کہ اس کی پیشانی کو آگ کا کنگن پہنایا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ سونے کا کنگن پہن لے' لیکن چاندی تم پر جائز ہے اس سے خوش طبعی کرو۔

امام ابوداؤد نے اس کو صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(الترغیب والترہیب للمنذری' باب الترہیب من منع الزکاۃ وما جاء فی زکاۃ الحلی: ۱/ ۶۰۴-۶۰۵)

بعض حضرات نے ان نصوص سے عورتوں کے سونا پہننے کو مطلقاً حرام سمجھا ہے بغیر کسی قید اور شرط کے۔ اور اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ حالانکہ یہ سمجھ اور سوچ مسلمانوں کے اجماع سے فاسد اور مردود ہے۔ امام منذری "الترغیب" میں اس پر تعلیقا" فرماتے ہیں کہ یہ احادیث جن میں عورتوں کو سونے کا زیور پہننے پر وعید وارد ہے' یہ کئی وجوہ سے تاویل کا احتمال رکھتی ہے۔

(۱) یقیناً یہ حکم منسوخ ہے کیونکہ سونے کا زیور عورتوں کے لیے مباح ہونا ثابت ہے۔

(۲) یہ وعید ان کے حق میں ہے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے نہ کہ ان کے بارے میں جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اس تاویل پر حضرت عمرو بن شعیب' عائشہ اور اسماء رضی اللہ عنہم کی احادیث دلالت کرتی ہیں اور زیور کی زکوٰۃ میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ زیورات میں زکوٰۃ واجب ٹھہراتے تھے اور یہی مذہب ان مندرجہ ذیل گرامی قدر اصحاب کا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس' عبداللہ بن مسعود' عبداللہ بن عمرو' سعید بن

مسیب ' عطاء ' سعید بن جبیر ' عبداللہ بن شداد ' میمون بن مہران ' ابن سیرین ' مجاہد ' جابر بن زید ' زہری ' سفیان ثوری ' امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اور ابن منذر نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے اور جو حضرات کہتے ہیں کہ زیورات سے زکوٰۃ ساقط ہے ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر' جابر بن عبداللہ ' اسماء بنت ابی بکر' سیدہ عائشہ ' شعبی ' قاسم بن محمد ' امام مالک ' امام احمد ' اسحاق اور ابو عبید رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ابن منذر فرماتے ہیں کہ امام شافعی جب عراق میں تھے تو یہی فرماتے تھے ' پھر مصر میں انہوں نے توقیف کی اور فرمایا کہ میں اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہوں۔

خطابی کہتے ہیں کہ آیات کا ظاہر تو وجوب زکوٰۃ کے قول کا شاہد ہے اور اثر بھی اس کی تائید میں ہے اور جس نے زکوٰۃ کو ساقط ٹھہرایا وہ محل نظر ہے اور اس کے پاس اثر (حدیث) کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا احتیاط زکوٰۃ کے ادا کرنے میں ہی ہے۔ واللہ اعلم۔

(الترغیب والترہیب للمنذری ' فصل فی زکوٰۃ الحلی: ۱/ ۶۰۵-۶۰۶)

امام نووی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ عورتوں کے لیے سونے چاندی کے ہر طرح کے زیورات پہننا جائز ہے۔ جیسے طوق ' ہار ' انگوٹھی ' کنگن ' پازیب ' بازو بند اور گلو بند وغیرہ اور ہر وہ زیور جو گردن وغیرہ میں استعمال کیا جائے اور ہر وہ زیور جس کو پہننا معتاد ہو ' اس میں ذرا بھی اختلاف نہیں اور رہا عورتوں کا سونے چاندی کے جوتے پہننا تو اس میں دو وجہ ہیں۔

(المجموع شرح المہذب کتاب الزکاۃ ' باب زکاۃ الذہب والفضۃ: ۵/ ۵۲۲)

خطابی اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں یعنی یہ حدیث "ایما امراہ تقلدت قلادہ"...... کہ اس کی دو وجہ سے تاویل ہوتی ہے۔

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ابتدائی دور میں فرمایا' پھر منسوخ ہو گیا اور عورتوں کے لیے سونے کا زیور مباح ہو گیا۔

(۲) یہ وعید اس کے بارے میں ہے جو زکوٰۃ نہ دے اور اس کے بارے میں نہیں جو زکوٰۃ ادا کرے۔(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح : ۸/ ۱۹۵)

چوتھا باب

بدعت کا بیان

کیا ہر بدعت گمراہی ہے؟

امام مسلم بن حجاج نے صحیح مسلم شریف میں اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ

كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا خَطَبَ احْمَرَّتْ عَيْنَاهُ وَعَلَا صَوْتُهُ وَاشْتَدَّ غَضَبُهُ حَتّٰى كَأَنَّهُ مُنْذِرُ جَيْشٍ يَقُولُ صَبَّحَكُمْ وَمَسَّاكُمْ وَيَقُولُ بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ وَيَقْرُنُ بَيْنَ إِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى وَيَقُولُ أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ دیتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں' آواز بلند ہوتی اور جوش زیادہ ہوتا اور یوں لگتا جیسے آپ کسی ایسے لشکر سے ڈرا رہے ہوں جو صبح و شام میں حملہ کرنے والا ہو اور فرماتے: میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ساتھ ساتھ بھیجے گئے ہیں' پھر آپ انگشت شہادت اور درمیان انگلی

خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَشَرُّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ ---(الحدیث)

کو ملاتے اور حمد و ثنا کے بعد فرماتے: یاد رکھو بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہتر ہدایت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت ہے اور بدترین کام عبادت کے نئے طریقے ہیں اور عبادت کا ہر نیا طریقہ گمراہی ہے۔

(مسلم بالنووی کتاب الجمعہ، باب تخفیف الصلوۃ والخطبۃ: ۶/ ۱۵۳)

اور ابن ماجہ نے بھی اسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے انہی الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (سنن ابن ماجہ باب اجتناب البدع والجدل: ۱/ ۱۷)

اور ابو داؤد کی روایت میں ہے:

وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ۔

عبادت کے نئے طریقوں سے بچو، عبادت کا ہر نیا طریقہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

(سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ: ۵/ ۱۵)

اور نسائی کی روایت میں ہے:

وَشَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ۔

(سنن النسائی کتاب الجمعہ: ۳/ ۱۸۸)

اور بدترین کام عبادت کے نئے طریقے ہیں اور عبادت کا ہر نیا طریقہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہے۔

یہ حدیث اپنی روایات کے ساتھ اصول دین اور قواعد محکمہ میں سے ایک ہے، لیکن اس کا مفہوم اس طرح لینا ضروری ہے کہ اس موضوع میں دیگر نصوص واردہ کی رعایت، شریعت اسلامیہ کی روح اور دیگر قواعد عامہ کا پورا پورا لحاظ باقی رہے۔

بعض نام نہاد اہل علم نے حدیث کا استعمال غلط کیا اور اس سے استدلال کرتے

ہوئے ان تمام امور کارد کیا جو فقہی 'معاشرتی اور علمی تقاضوں سے متعلق ہیں اور ان کی کیفیات اور صورتیں ایسی ہیں جو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرون ثلثہ میں نہیں تھیں۔ اور ہر ایک کے بارے میں یہی کہا کہ یہ نئے امور ہیں اور ہر نیا امر بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے' یہ لفظ عموم اور بدعت کے گمراہی ہونے میں صریح ہیں' پھر اس کے بعد یوں کہتا ہے کہ کیا صاحب رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس فرمان "ہر بدعت گمراہی ہے" کے بعد یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ کوئی مجتہد یا فقیہ آ کر یہ کہہ دے کہ نہیں-- نہیں' ایسا نہیں--- ہر بدعت گمراہی نہیں بلکہ بعض گمراہی' بعض حسنہ اور بعض سیئہ ہیں---؟ اور اس طریقہ سے کثیر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں اور وہ چیختا چلاتا اور انکار کرتا رہتا ہے اور مقاصد شریعت سے ناواقف اور دین اسلام کی روح سے ناآشنا لوگوں کی تعداد بڑھتا رہتا ہے۔

پھر جلد ہی ایک نئی اختراع پر مجبور ہو جاتا ہے جو اس کے درپیش مسائل کا حل اور زندگی کے واقعی امور کی عقد کشائی کرے' اور یقیناً وہ ایک وسیلہ کی اختراع کی طرف پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ اگر وہ اختراع نہ کرے تو وہ کھانے' پینے اور رہنے سہنے کے معاملات سے ہاتھ دھو بیٹھے' بلکہ لباس' سانس لینا اور ازدواجی زندگی اس کے لیے دشوار ہو جائے نیز اہل و عیال' عزیز و اقارب اور معاشرتی معاملات تو درکنار ذاتی معاملات نبھانے سے کنارہ کش ہو جائے اور وہ اختراعی وسیلہ یہ ہے جو وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ:

إِنَّ الْبِدْعَةَ تُنْقَسَمُ إِلَى بِدْعَةٍ دِيْنِيَّةٍ وَّدُنْيَوِيَّةٍ۔ | بے شک بدعت کی دو قسمیں ہیں: دینیہ اور دنیویہ۔

واہ سبحان اللہ--- اس معترض نے اپنی ذات کے لیے صریح لفظ سے کھیلنا اور مذاق کرنا جائز قرار دے لیا اور اس تقسیم کو گھڑ لیا' یقیناً یہ تسمیہ (دینیہ اور دنیویہ) اختراعی ہے' اگر ہم یہ تسلیم کر بھی لیں کہ یہ مفہوم و معنی عہد نبوت سے موجود ہے لیکن

بہر حال یہ تقسیم اور یہ تسمیہ (دینیہ ودنیویہ) عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قطعاً موجود نہیں تھا۔ تو بتاؤ یہ تقسیم کہاں سے نازل ہوئی؟ اور یہ اختراعی تسمیہ کہاں سے ٹپک پڑا؟

اب جو یہ کہے کہ بدعت کی قسمیں حسنہ اور سیئہ شارع علیہ السلام سے منقول نہیں ہیں۔ ہم اسے کہتے ہیں کہ ایسے ہی بدعت کی قسمیں دینیہ اور دنیویہ کا حال ہے جو عین بدعت اور عین اختراع ہے کیونکہ حضرت شارع علیہ الصلوۃ والسلام فرماتے ہیں کہ "ہر بدعت گمراہی ہے۔" اور یہ فرمان عالی شان مطلق ہے' تو یہ فوراً کہے گا کہ نہیں --- نہیں' ایسا نہیں --- ہر بدعت مطلق گمراہی نہیں' بلکہ اس کی دو قسمیں ہیں: ایک دینیہ اور یہ گمراہی ہے' دوسری دنیویہ اور یہ کچھ بھی نہیں۔

جب ایک انصاف پسند اور دانشور شخص دیکھتا ہے کہ بدعت حسنہ اور سیئہ میں تقسیم کرنا بدعت' اختراع یا باطل ہے جس کی کوئی اصل نہیں' یا غیر مقبول اور مردود ہے' تو بلاشک وشبہ وہ بدعت کی دینیہ اور دنیویہ میں تقسیم کو بھی اسے قبیلے سے ٹھہرائے گا' کیونکہ یہ دونوں تقسیمیں ایک مرکز اور ایک ہی نقطہ سے متعلق ہیں اور ایک مشترک سوچ وبچار سے جنم لیتی ہیں اس کے علاوہ مشکل سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں وگرنہ ہم جمود کا شکار ہو جائیں گے اور اس مشکل' تنگی اور نقصان میں مبتلا ہو جائیں گے جس سے ہمیں نکال کر آسانی' کشائش اور نفع کی راہ دکھانے کے لیے شریعت اسلامیہ نازل ہوئی ہے۔

بدعت کا صحیح مفہوم

بدعت کا مسئلہ ایک مشکل مسئلہ ہے لہٰذا ہم اس کی وضاحت کر دیتے ہیں اور انشاء اللہ اس سے ہر طرح کا اشکال دور اور التباس زائل ہو جائے گا' اور زیر بحث کلام اس شارع حکیم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے' جن کی مبارک زبان شریعت کی زبان ہے' اور ایک ایسی مرتب اور متناسب زبان ہے جس میں تناقض ہے نہ تعارض' تو

ضروری ہے کہ شارع علیہ السلام کے کلام کو اس شرعی میزان پر سمجھا جائے جسے وہ خود لے کر تشریف لائے' اور جب تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ بدعت دراصل یہ ہے کہ ہر وہ امر جو ایسا نیا اور اختراعی ہو جس کی وضع کسی مثال پر مبنی نہ ہو' تو بہر صورت یہ بات ذہن سے نکلنے نہ پائے کہ یہاں وہ مذموم بدعت اور اختراع مراد ہے جو امر دین سے زیادتی ہو تاکہ دین کا حصہ بنے اور شریعت میں زیادتی ہو تاکہ شریعت کا ایک نیا رخ دھارا جائے تاکہ وہ صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو کر پیروی کے قابل ہو جائے اور یہی ہے وہ بدعت جس سے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرمان عالی شان سے ڈرایا ہے:

من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد۔ (بخاری و مسلم)	جو شخص ہمارے دین میں کوئی ایسی ایجاد کرے جس کی اصل دین میں نہ ہو تو وہ مردود ہے۔

متعلقہ موضوع میں حد فاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "فی امرنا ھذا" ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے مفہوم میں بدعت کی تقسیم حسنہ اور سیئہ کی طرف لغوی بدعت کی تقسیم ہے جو محض اختراع اور احداث کا نام ہے اور ہمیں شرعی معنی میں بدعت کے گمراہی ہونے میں قطعاً کوئی شک نہیں' وہ جو دین میں زیادتی اور امور شریعت کی طرف منسوب ہو' بے شک فتنہ مردودہ اور مذمومہ ہے' اور اگر وہ منکرین اس معنی کو حسن نیت کے ساتھ سمجھ لیں تو اس پر بھی واضح ہو جائے گا کہ اجتماع کا محل قریب اور افتراق و نزاع کا مقام بعید ہے۔

میں (مولف) نے دیکھا ہے کہ مفاہیم قریب قریب ہیں کیونکہ تقسیم کے منکرین بدعت شرعیہ کی تقسیم کا انکار کرتے ہیں جس کی واضح دلیل ان کی یہ تقسیم ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں: دینیہ اور دنیویہ۔ اور انہوں نے ضرورتاً اس تقسیم کا اعتبار کیا' اور جو بدعت کی تقسیم حسنہ اور سیئہ میں کرتے ہیں وہ تقسیم بدعت لغویہ کی نسبت

سے ہے نہ کہ شرعیہ کے حوالے سے' کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ دین و شریعت میں زیادتی گمراہی اور بہت بڑی برائی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں لہٰذا جو اختلاف اور افتراق سے بالاتر ہو کر اجتماع اور موافقت کی کوشش کرے' اس کے نزدیک یہ اختلاف محض شکلی ہے۔

نوٹ: اس بحث میں مزید تحقیق کے لیے مولف کا رسالہ "حول الاحتفال بمولد النبی ﷺ" ملاحظہ فرمائیے۔

منکرین کی تقسیم بدعت پر تحقیقی نظر

بے شک جو حضرات حسنہ اور سیئہ کی طرف بدعت کی تقسیم کا انکار کرتے ہیں اور دینیہ اور دنیویہ کی تقسیم کے قائل ہیں بلاشبہ ان کو باریک بینی سے کوئی واسطہ نہیں' کیونکہ جب انہوں نے یہ بیان کیا کہ بدعت دینیہ گمراہی ہے--- اور یہ حق ہے--- اور جو یہ کہا کہ بدعت دنیویہ کوئی شے نہیں یہ ان کی فحش غلطی ہے کیونکہ اس سے انہوں نے ہر بدعت دنیویہ پر اباحت کا حکم لگایا ہے' حالانکہ اس میں بہت بڑا نقصان ہے اور اس سے بہت بڑی مصیبت اور فتنہ برپا ہو جاتا ہے' کیونکہ اگر وہ اس قول کو بغیر کسی احتراز یا تقیید کے مطلق رکھیں تو وہ اس غلط مفہوم میں واقع ہونے سے محفوظ نہیں رہ سکتے جب تک وہ اس پر مفصل کلام نہ کریں' اور یہ تفصیل واجب اور ضروری ہے' اور وہ یہ تھی کہ وہ کہتے کہ یہ بدعت دنیویہ' اس میں کچھ خیر ہے اور کچھ شر' جیسا کہ واقع اور مشاہدہ میں موجود ہے جس کا کوئی اندھا اور جاہل بھی انکار نہیں کر سکتا اور اتنی زیادتی اس میں ضروری تھی اور بدعت کی تقسیم دینیہ اور دنیویہ کی طرف کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ تعبیر میں احتیاط کریں اور اسی طرح تقیید کے علاوہ قول کو مطلق نہ رہنے دیں بلکہ ایسی قید کا اضافہ کریں جو بدعت دنیویہ کی حد بندی کرے' وگرنہ وہ لوگوں کو بہت بڑی مصیبت اور عظیم شر سے دو چار کریں گے۔

میں (مولف) کہتا ہوں کہ ان پر واجب ہے کہ اس غلطی پر نظر ثانی کریں اور

اس مصیبت کا ازالہ کریں جس کے سبب لوگ بہت بڑے شر میں گرفتار ہیں اور ہلاکت کے اندھے کنوئیں میں گرتے جا رہے ہیں' اس پر اعتماد کرتے ہوئے کہ ہر بدعت دنیویہ منہیات شرعیہ میں داخل نہیں' اور یہ ان کے اس مطلق قول پر مبنی ہے اور اس سے لازم آتا ہے کہ بدعت دنیویہ حلال ہے اس پر کچھ مواخذہ نہیں' اور ممنوع صرف بدعت دینیہ ہے' باوجود اس کے کہ یہ بدعت دنیویہ جن امور پر مشتمل ہے ان میں بعض ایسے ہیں جن کی خیر کثیر ہے اور بعض ایسے ہیں جن میں شر خطیر (بھاری جرم) ہے۔

لہذا یہ تقسیم اس اطلاق عام کے ساتھ فاسد اور ناقص ہے جو تحریر اور تحقیق کی محتاج ہے تاکہ شر اور مصائب دنیویہ میں واقع ہونے سے بچا جائے اور حفظ اور امن و سلامتی کا دامن ہاتھ میں آئے۔ وہ کیا بہتر تعبیر ہے جو ضلالت و گمراہی سے بچانے والی ہو؟

وہ کیا صحیح تعبیر ہے جو ثقہ تحریر ہو۔

بزرگان دین کی بارگاہ میں

ہمارا خیال ہے کہ اس مسئلہ میں ائمہ کے قول سے بڑھ کر کوئی بھی تعبیر زیادہ صحیح' ٹھوس اور مضبوط نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ دین کے اصول و قواعد کو بہت بہتر جانتے اور پہچانتے ہیں' تو انہوں نے اس بدعت کو دو قسموں میں منقسم کیا ہے یعنی بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ۔ حسنہ ہر قسم کی بھلائی' نفع اور دینی و دنیوی مفاد کو شامل ہے اور اسلام اسے قبول کرتا ہے اور رضامندی کا اظہار کرتا ہے نیز شریعت کے اصول و قواعد اسے شامل ہیں' اور سیئہ وہ قباحت ہے جو ہر قسم کی برائی' نقصان اور مصیبت کو شامل ہے چاہے وہ دینی ہو یا دنیوی' اسلام اس کا قطعا رد کرتا ہے اور اس کے قواعد و اصول اسے قبول نہیں کرتے کیونکہ شرعی اصول تو مفادات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور مصائب و آلام کو دور کرتے ہیں اور بھلائی کو لاتے ہیں برائی کا رد کرتے ہیں اور مفاد

عامہ کو ثابت کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی انصاف پسند شخص اس موضوع میں تحقیق و تدبر سے کام لے تو بلاشک و شبہ وہ محسوس کرے گا کہ اس معنی کی تحقیق میں قائل کا یہی قول کافی ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں' حسنہ اور سیئہ۔ اور معلوم ہوا کہ اس سے مراد بدعت لغویہ ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہوا' رہی وہ بدعت جسے منکرین نے دنیویہ کے نام سے تعبیر کیا ہے تو یقیناً یہ قول بڑی دقت نظر اور احتیاط کا محتاج ہے کیونکہ یہ تو ہر نئے امر ہر حکم شرع اور قواعد دین میں کمی و بیشی کا تقاضا کرتا ہے' اور مسلمانوں پر لازم کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام نئے امور کو شریعت اسلامیہ پر پیش کریں چاہے وہ امور دنیویہ عامہ ہوں یا خاصہ' تاکہ اسلام میں اس کا حکم دیکھا جائے اگر یہ بدعت ہیں تو' اور اس فیصلے کا تحقق بحمدہ تعالیٰ اس امر اور معتبر تقسیم سے ہی ہوگا جو ائمہ اصول سے منقول ہے' اللہ تعالیٰ جل شانہ ائمہ اصول اور ان کی تحریر سے راضی ہو جن کے الفاظ عمدہ اور صحیح ہیں جو ایسے صاف اور روشن معانی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں جو ہر طرح کے نقص' تحریف یا تاویل سے پاک اور منزہ ہیں۔

مقصود کلام

حضور پرنور شافع النشور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی:

كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَّكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (دین میں) ہر نیا امر بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اس کی مراد متعین کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ جو زبانیں ارباب مذاہب فقہیہ میں مختلف مسائل کے بارے بدعت و ضلالت کا فتویٰ لگانے میں مطلق العنان ہیں ان کا ناطقہ بند کیا جائے اور ائمہ مجتہدین کا تحفظ کیا جائے جو محض رائے پر حکم لگانے کی بجائے ماخذ شرعیہ کی تلاش میں ہوتے ہیں تاکہ مسئلہ کی ان کی طرف نسبت کی جاسکے اور ان ماخذ کو وہ نہایت دیانتداری' عدالت' کثرت مطالعہ اور مثبت سوچ کے ساتھ بسیار

تفتیش کے بعد حاصل کرپاتے ہیں' اور بعد والے ان کے طریقے کو اپنا لیتے ہیں کیونکہ وہ ائمہ نظر و تحقیق' استنباط اور ترجیح کے تمام تر پہلوؤں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور بسا اوقات کچھ لوگ ان کے اختلافات کو عقیدہ کا اختلاف سمجھتے ہیں اور نادانی کے سبب شرک اور بدعت و ضلالت تک کا حکم نافذ کر دیتے ہیں' حالانکہ یہ اختلاف ایسے افراط و تفریط کا متحمل نہیں ہوتا' کیونکہ ان کا اختلاف صرف عبادات اور معاملات میں متخالفہ مفاہیم پر مبنی ہوتا ہے جو تکفیر اور تبدیع وغیرہ کی صلاحیت نہیں رکھتا' ایسے لوگوں کو درج ذیل احادیث مبارکہ سے عبرت حاصل کرنی چاہئے اور ایسے فتوؤں سے اپنا دامن سیاہ کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انما اتخوف علیکم رجلا قرء القرآن حتی اذا روی علیہ بھجتہ وکان رد ء الاسلام اعتزل الی ماشاء اللہ وخرج علی جارہ بسیفہ ورماہ بالشرک۔	بے شک مجھے تم پر ایک ایسے شخص کا خدشہ ہے جو قرآن پڑھے گا حتیٰ کہ اس پر قرآن کی رونق محسوس ہوگی اور وہ اسلام سے بایں صورت پھر جائے گا کہ اپنے پڑوسی پر تلوار لے کر نکلے گا اور اسے شرک کا طعنہ دے گا۔

(رواۃ البزار والہیثمی فی مجمع الزوائد: ۱/ ۱۸۸ و کنز العمال: ۱۰/ ۱)

ابن مردویہ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم رؤف رحیم ﷺ نے فرمایا:

اخوف ما اخاف علیکم ثلاثا رجل اتاہ اللہ القرآن حتی اذا رای بھجتہ وتردی الاسلام اعارہ اللہ ما شاء	مجھے تم پر تین آدمیوں کا زیادہ خوف ہے: ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن عطا کیا حتیٰ کہ جب وہ اس کا وقار دیکھ لے اور اسلام کی حمایت میں کھڑا ہے' اللہ اس کو

اخترط سيفه وضرب جاره و رماه بالكفر قالوا: يارسول الله' ايهما اولى بالكفر' الرامي او المرمى به؟ قال: الرامي---(الحدیث)	عار دلائے تو وہ اپنی تلوار سونت کر پڑوسی کو مارے گا اور اسے کفر کا فتویٰ دے گا۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کفر کا زیادہ مستحق کون ہو گا' فتویٰ دینے والا یا جس کے بارے میں فتویٰ دیا گیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: فتویٰ دینے والا---

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا' اور حدیث ذکر کی جس میں یہ الفاظ موجود ہیں:

ومن دعا رجلا بالكفر او قال عدو الله وليس كذلك الاحار عليه۔	جس نے کسی شخص کے کفر کا دعویٰ کیا یا اسے اللہ کا دشمن کہا' وہ ایسا نہیں ہے تو دعویٰ اس کی طرف واپس لوٹ جائے گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ايما امرئ قال لاخيه يا كافر فقد باء بها احدهما ان كان كما قال والا رجعت عليه۔	جس شخص نے اپنے بھائی کو کہا اے کافر' تو یہ کسی ایک کی طرف ضرور لوٹے گا' اگر وہ ایسا ہے جیسے اس نے کہا تو ٹھیک وگرنہ کہنے والے پر حکم لوٹ آئے گا۔

(صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بيان حال من قال لاخيه المسلم يا كافر: ۱/ ۸۰)

ابو القاسم اصفہانی نے "الترغیب والترہیب" میں نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ نے اٹھارہ اصول وضع فرمائے جن میں سے ایک یہ ہے کہ

ما عاقب من عصی اللہ	جو تیرے بارے اللہ کی نافرمانی کرے
فیک بمثل ان تطیع اللہ فیہ'	(برا بھلا کہے) تو اس کے بارے اللہ کی
وضع امر اخیک علی احسنہ	اطاعت کر (اچھے لفظوں میں یاد کر) اور اپنے
حتی یاتیک منہ ما یغلبک'	بھائی کے کام کی اچھی تعبیر کر حتیٰ کہ تجھے
ولا تظنن بکلمہ خرجت من	اس کے بارے میں کوئی غالب یقین آ
مسلم شدا وانت تجد لھا فی	جائے' اور مسلمان کے منہ سے جو بات نکلے
الخیر محملا۔	اسے ہرگز شر خیال نہ کر کہ جب تک تو اس
	میں کوئی بھلائی کا پہلو سمجھ سکتا ہے۔

(الترغیب والترھیب للاصفہانی: ۲/ ۲۹۷' ورواہ الخلیب فی المتفق والمتفرق)

بلاشبہ تبدیع و تضلیل کے فتوؤں میں جلد بازی کرنا دین میں غلو اور مقاصد شریعہ کی سمجھ بوجھ نہ ہونے کا نتیجہ ہے' اور علماء کے نظریات اور افہام اور قواعد تطبیق کی استعداد نہ ہونے کا اثر ہے' جس کی وجہ سے مسلمانوں کے معصوم خون کو مباح قرار دیا جارہا ہے اور اچھی تعبیریں کرنے سے روگردانی کی جارہی ہے۔

علمائے سلف کے نظریات

اب حضور پرنور شافع یوم النشور ﷺ کے فرمان عالیشان "ہر نیا امر بدعت ہے" کے بارے میں علمائے متقدمین کی آراء اور مفاہیم پیش نظر ہیں۔

امام خطابی کا نظریہ

امام ابو سلیمان احمد بن محمد خطابی بستی (متوفی ۳۸۸ھ) اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی: "کل محدثہ بدعہ" بعض امور میں خاص ہے جس سے مراد ہر وہ اختراع ہے جس کی اصل دین میں نہ ہو

اور نہ ہی وہ کسی اصول سے قیاس ہو' اور رہے وہ امور جو قواعد اصول پر مبنی ہیں وہ بدعت نہیں اور نہ ہی ضلالت ہیں۔ " واللہ اعلم بالصواب " اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ۔ تم پر میری اور خلفائے راشدین کی سنت لازم ہے۔

اس امر پر دلیل ہے کہ جب کوئی خلیفہ ایک بات کہہ دے اور کوئی دوسرا صحابی اس کی مخالفت کرے تو خلیفہ کے قول کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔

(معالم السنن شرح سنن ابی داؤد للخطابی: ۴/ ۳۰۱' مکتبہ علمیہ)

حافظ ابن عبدالبر کا تبصرہ

امام حافظ ابو عمر یوسف بن عبدالبر نمری اندلسی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ " یہ بدعت اچھی ہے۔ " عربوں کے محاورے میں بدعت اس اختراع کو کہتے ہیں جس کی ابتدا اور اصل دین میں نہ ہو اور سنت مطہرہ کے خلاف ہو تو یقیناً یہ بدعت ایسی ہے جس میں کوئی بھلائی نہیں' اس کی مذمت کرنا اور اس سے اعراض کرنا ضروری ہے اور دوسروں کو بھی اس سے اجتناب کرنے کی تلقین کرنا اور اس کے بانی سے ترک تعلق لازم ہے جبکہ اس کا برا مقصد واضح ہو جائے' اور جو بدعت اصل شریعت و سنت کے مخالف نہیں تو یہ اچھی بدعت ہے' جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیونکہ جو انہوں نے کیا اس کی اصل سنت ہے۔

اور اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نماز چاشت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کیا چاشت کی نماز ہے؟ اور وہ اسے نہیں جانتے تھے۔

ابن ابی شیبہ نے ابن علیہ سے' جریری سے' حکم سے' اعرج سے نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نماز چاشت کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: " بدعت ہے لیکن اچھی بدعت ہے۔ "

اللہ سبحانہ وتعالیٰ جل شانہ نے اہل کتاب سے حکایتاً فرمایا ہے:

وَرَهْبَانِيَّةَ ِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ۔(الحدید: ۲۷)

انہوں نے گوشہ نشینی اپنی طرف سے نکالی تھی، نہیں لکھا تھا ہم نے اس کو اوپر ان کے مگر واسطے ڈھونڈنے رضا مندی اللہ تعالیٰ کی۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اعمال دنیا سے متعلق اشیاء کی اختراع میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی اس کے فاعل اور بانی پر کوئی عیب اور مواخذہ ہے۔

(الاستذکار شرح الموطا لابن عبدالبر: ۵ / ۱۵۲-۱۵۳)

امام ابن رجب حنبلی کا نفیس کلام

علامہ حجت فقیہ محدث امام زین الدین ابو الفرج عبد الرحمٰن بن احمد المعروف ابن رجب حنبلی اس حدیث "ہر بدعت ضلالت ہے" کی شرح میں فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی:

وایاکم ومحدثات الامور، فان کل بدعه ضلاله۔

(دین میں) نئے نئے امور سے بچو، بیشک ہر بدعت گمراہی ہے۔

امت کو دین میں نئے نئے امور ایجاد کرنے سے ڈرانے کے لیے ہے اور ان امور کی پیروی سے بچانے کے لیے، جس کی تاکید اس ارشاد سے کی کہ "ہر بدعت گمراہی ہے۔" اور اس سے مراد وہ بدعت ہے جس کی اصل شریعت میں نہ ہو، رہی وہ بدعت جس کی بنیاد شرعی قاعدہ پر ہو وہ قطعاً شرعی بدعت نہیں اگرچہ وہ لغوی بدعت ہے، صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبے میں فرمایا کرتے تھے:

ان خیر الحدیث کتاب اللہ، وخیر الھدی ھدی محمد

بے شک بہترین حدیث اللہ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت محمد صلی اللہ علیہ

صلی اللہ علیہ وسلم' وشر الامور محدثاتھا' وکل بدعہ ضلالہ۔	وسلم کی ہدایت ہے اور برے امور (دین میں) نئے نئے امور ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

امام ترمذی اور ابن ماجہ نے کثیر بن عبداللہ (اس میں ضعف ہے) سے' اپنے والد سے' اپنے دادا سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من ابتدع بدعۃ ضلالۃ یرضاھا اللہ ولا رسولہ کان علیہ مثل آثام من عمل بھا لا ینقص ذلک من اوزارھم شیئا۔	جس نے بدعت ضلالہ کو ایجاد کیا جس پر نہ اللہ راضی ہے نہ اس کا رسول' تو اس پر عمل کرنے والوں کے گناہوں کے برابر اس بانی پر وبال ہو گا جو ان کے مصائب میں سے ذرا بھی کمی نہ کرے گا۔

امام احمد نے یہ روایت نقل کی ہے کہ غضیف بن حارث ثمالی فرماتے ہیں کہ خلیفہ عبدالملک بن مروان نے مجھے مکتوب بھیجا اور کہا کہ ہم نے لوگوں کو دو امور پر جمع کر لیا ہے' ایک جمعہ کے دن منبروں پر ہاتھ اٹھانا اور دوسرا صبح اور عصر کی نماز کے بعد درس دینا' اور فرمایا کہ میرے نزدیک یہ دونوں تمہاری بدعت کے مثل ہیں اور میں تمہیں اس کا جواب دہ نہیں ہوں گا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ما احدث قوم بدعۃ الا رفع مثلھا من السنۃ فتمسک بسنۃ خیر من احداث بدعۃ۔	لوگوں نے بدعت پیدا نہیں کی مگر اس کی مثل ہاتھ اٹھانا سنت ہے اور سنت سے تمسک بدعت کی ایجاد سے بہتر ہے۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح کا ہی قول مروی ہے کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی "ہر بدعت گمراہی ہے۔" جوامع الکلم میں سے ہے اس سے کوئی چیز خارج نہیں اور دین کے اصول میں سے یہ ایک عظیم اصل ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان عالیشان کے مشابہ ہے کہ

من احدث فی امرنا ما لیس منه فهو رد۔ — جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو اس سے نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔

لہٰذا ہر وہ شخص جس نے کوئی امر ایجاد کیا اور اسے دین متین کی طرف منسوب کر دیا حالانکہ اس کی اصل دین میں نہیں ہے تو وہ اس کی طرف ہی لوٹے گا اور وہ یقیناً گمراہی ہے' اور دین اس سے بری ہے' چاہے اس کا تعلق مسائل اعتقادیہ سے ہو یا اعمال و اقوال ظاہرہ کے ساتھ یا باطنہ کے ساتھ' پھر فرماتے ہیں کہ حافظ ابو نعیم نے اپنی سند کے ساتھ ابراہیم بن جنید سے روایت کیا ہے کہ ہم سے حرملہ بن یحییٰ نے بیان کیا کہ میں نے امام شافعی کو فرماتے ہوئے سنا کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں: بدعت محمودہ اور بدعت مذمومہ۔ پس جو سنت مطہرہ کے موافق ہو وہ محمودہ اور جو مخالف ہو وہ مذمومہ' اور استدلال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول سے کیا کہ "نعمت البدعه هی" (یہ بدعت اچھی ہے) حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ کی مراد وہی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی کہ بدعت مذمومہ وہ ہے جس کی اصل شریعت میں نہ ہو اور اصطلاح شرع میں یہی بدعت ہے' رہی بدعت محمودہ' وہ جو سنت مطہرہ کے موافق ہو یعنی اس کی اصل سنت میں موجود ہو' اور حکم اسی کی طرف راجع ہو تو یہ محض لغتاً بدعت ہے نہ کہ شرعاً اس لیے کہ وہ سنت کے موافق ہے۔ اور حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ سے اور کلام بھی مروی ہے جو اس کی خوب وضاحت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ نئے امور (محدثات) کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ جو کتاب و سنت اور نقل و اجماع کے خلاف ہو تو یہ بدعت گمراہی ہے اور وہ جس کی ایجاد بھلائی پر مبنی ہو اس میں کسی ایک کا بھی اختلاف نہیں اور یہ نیا امر مذموم نہیں' بیشمار ایسے امور ہیں جو بعد میں ایجاد ہوئے اور بدعت ضلالہ نہیں۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ آیا یہ بدعت حسنہ ہے کہ سنت کی طرف راجع ہو یا نہیں' جن میں ایک کتابت حدیث کا مسئلہ ہے جس سے حضرت عمر اور صحابہ کی ایک جماعت نے منع کیا اور اکثر نے اس میں رخصت دی اور استدلال احادیث سے

کیا' اور اسی طرح ہی قرآن و حدیث کی تفسیر کی کتابت کا مسئلہ ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے اسے مکروہ سمجھا اور اکثر و بیشتر نے رخصت دی۔ اور بالکل اسی طرح ہی حلال و حرام یعنی مسائل فقہیہ میں آراء کی کتابت میں ان کا اختلاف ہے' نیز ایسے ہی ان معاملات اور قلبی اعمال میں اختلاف ہے جو صحابہ اور تابعین سے منقول نہیں اور امام احمد رحمۃ اللہ اکثر کو مکروہ سمجھتے' اور ان ادوار میں اسلاف کے علوم کو ضبط کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے جو ان سے منقول ہیں تاکہ یہ دور علوم سلف سے خالی نہ ہو جائے اور اس لیے کہ اس دور میں یہ امتیاز نہ ہو سکے کہ کون کون سے امور اس وقت موجود تھے اور کیا کیا امور ہیں جنہوں نے بعد میں جنم لیا' تو اس سے بدعت اور سنت کا امتیاز واضح ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ

انکم قد اصبحتم اليوم	بے شک تم آج دن فطرت پر ہو گئے
على الفطره وانكم	اور عنقریب تم پوچھو گے تو تمہیں بیان کر
ستحدثون ويحدث لكم' فاذا	دیا جائے گا اور جب تم کوئی نیا امر دیکھو تو تم
رايتم محدثه فعليكم	پر پہلی ہدایت پکڑنا لازم ہے۔
بالهدى الاول۔	

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے خلفاء راشدین کے دور میں فرمایا:

اور ابن مہدی نے مالک سے روایت کیا' وہ فرماتے ہیں کہ ان ہوا و ہوس کی چیزوں میں نہ کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھی اور نہ ہی ابوبکر' عمر اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور میں' اور ہوا و ہوس کی چیزوں سے امام مالک کا اشارہ ان امور کی طرف ہوتا جنہوں نے اصول دین میں فرقہ واریت کو جنم دیا مثلاً خوارج' روافض اور مرجئہ وغیرہ کے امور' یعنی جو وہ مسلمانوں کی تکفیر' ان کے خون اور اموال کے مباح ٹھہرانے' ان کے جہنم میں ہمیشہ رہنے اور اس امت مرحومہ کے خواص پر فسق و فجور وغیرہ کے فتویٰ میں زبان درازی کرتے' اور خیال کرتے کہ گناہ

گنہگار کو مضر نہیں ہوتے اور اہل توحید میں سے کوئی ایک بھی دوزخ میں نہ جائے گا' اور اس سے بھی زیادہ خطرناک وہ کلام جو انہوں نے اللہ تعالیٰ جل شانہ کی قضاوقدرت میں اس کے افعال کے بارے میں ایجاد کیا اور اس کے ذریعے کئی امور کو جھٹلادیا اور یہ کیا کہ اللہ تعالیٰ اس طرح ظلم وغیرہ سے پاک ہو جاتا ہے اور اس سے بھی زیادہ ہولناک وہ کلام جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں کیا خصوصاً ان امور کے بارے جن کے متعلق صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم نے تو کیا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سکوت فرمایا' تو اس طرح ان لوگوں نے ایسے کثیر امور کا انکار کر دیا جو کتاب و سنت میں صراحت کے ساتھ وارد ہیں' اور بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے یہ کارنامہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کی خاطر سرانجام دیا ہے یعنی جن امور کے بارے میں عقول کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے پاک ہو' اور سمجھتے ہیں کہ اس کالازم اللہ عزوجل پر محال ہے' اور ان لوگوں نے اس کے اثبات پر اکتفانہ کیا حتیٰ کہ انہوں نے اس کے اثبات کے ساتھ ساتھ اپنا یہ خام خیال ثابت کیا کہ یہ مخلوقات کی نسبت اس کے لیے لازم ہے' حالانکہ امت مسلمہ نے ان لوازم کے بارے سکوت اختیار کیا ہے۔ اور وہ امور جو صحابہ اور تابعین کے دور کے بعد امت میں پیدا ہوئے مثلاً حلال وحرام کے بارے میں کلام جو محض رائے پر مبنی ہے ان میں کثیر امور ایسے ہیں جو سنت میں وارد ہیں اور رائے اور اقیسہ عقلیہ اس کے خلاف ہیں' اور اس کلام کے بعد وہ امور جو انہوں نے حقیقت میں ذوق وکشف کے ساتھ ایجاد کئے اور خیال کیا کہ حقیقت شریعت کے منافی ہے اور تنہا معرفت ہی محبت کے ساتھ کافی ہے اور اعمال کی کوئی ضرورت نہیں' یہ حجاب ہیں یا یہ کہ شریعت کی طرف عوام محتاج ہوتے ہیں نہ کہ خواص' اور بسااوقات اس کو ذات وصفات کے بارے کلام کے ساتھ ضم کردیتے ہیں جس سے اس نظریہ کی کتاب وسنت اور اجماع سلف امت سے مخالفت یقینی معلوم ہو جاتی ہے' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ　اور اللہ جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرماتا ہے۔

(جامع العلوم والحکم لابن رجب حنبلی: ۲/ج۱۲۸٬ موسسۃ الرسالہ)

امام نووی کا کلام

شیخ الاسلام امام یحییٰ زکریا ابو زکریا یحییٰ نووی فرماتے ہیں کہ حضور سید دو عالم ﷺ کا ارشاد: "ہر بدعت گمراہی ہے" عام مخصوص ہے اور مراد غالب البدع ہے، جس کو اہل لغت یوں تعبیر کرتے ہیں کہ ہر وہ شے جو مثال سابق کے غیر پر عمل ہو، علماء فرماتے ہیں کہ بدعت کی پانچ اقسام ہیں: (۱) واجبہ، (۲) مندوبہ، (۳) محرمہ، (۴) مکروہہ اور (۵) مباحہ۔

(۱) واجبہ: جیسے ملاحدہ اور مبتدعین کے رد میں متکلمین کے ادلہ کی نظم وغیرہ۔

(۲) مندوبہ: جیسے علمی کتابوں کی تصنیف، مدارس اور پلوں کی تعمیر وغیرہ۔

(۳) مباحہ: طرح طرح کے کھانوں کا دستر خوان بچھانا وغیرہ۔

(۴) محرمہ اور مکروہہ ویسے ہی ظاہر ہیں۔

اور میں نے "تہذیب الاسماء واللغات" میں اس مسئلہ کو مفصل دلائل کے ساتھ واضح کر دیا ہے، اور میرے ذکر کردہ مفصل کلام کے بعد عیاں ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث مبارکہ عام مخصوص ہے اور ایسے وہ دیگر احادیث وارد ہیں جو اس کے مشابہ ہیں، اور ہمارے کلام کی تائید حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے ہوتی ہے جو انہوں نے نماز تراویح کے بارے میں فرمایا: "یہ بدعت اچھی ہے" اور حضور ﷺ کا ارشاد: "كل بدعة" جو لفظ "كل" سے موکد ہے، حدیث کے عام مخصوص ہونے کو مانع نہیں بلکہ اس کے تحت تخصیص ہی داخل ہے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ　(آندھی) ہر چیز کو تباہ کر ڈالتی ہے۔

(الاحقاف: ۲۵)

(شرح النووی علی صحیح مسلم: ۶/ ۱۵۳)

شیخ ابن تیمیہ کا موقف

شیخ ابن تیمیہ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اس فرمان "یہ بدعت اچھی ہے" پر بطور تعلیق ذکر کیا ہے 'کہ پھر ہم کہتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو اسے بدعت کا نام دیا ہے باوجودیکہ یہ اچھا عمل ہے' تو یہ تسمیہ لغویہ ہے نہ کہ شرعیہ 'اور بلاشبہ لغت میں بدعت پر اس فعل کو شامل ہے جس کی ابتدا مثال سابق پر نہ ہو 'اور بدعت شرعیہ ہر وہ امر ہے جس پر دلیل شرعی دلالت نہ کرے۔

تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ایک فعل کے استحباب پر یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اس کے وجوب پر دال ہو یا مطلقاً اس کی دلالت کرے اور اس پر عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ہی کیا گیا ہو جیسے زکوٰۃ کی جبراً وصولی جیسے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے شروع کیا' تو جب کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد یہ عمل کرے گا تو اسے لغوی بدعت کا نام دینا صحیح ہے 'کیونکہ اس عمل نے ابھی ابتدا کی' جیساکہ نفس دین جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لائے' اسے لغوی طور پر بدعت اور محدث کا نام دینا جائز ہے جس کی مثال یہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اصحاب جنہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی' ان کے بارے قریش کے قاصدوں نے نجاشی سے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آباء و اجداد کے دین سے روگرداں ہو گئے اور بادشاہ کے دین میں داخل نہیں ہوئے بلکہ ایک محدث (نیا) دین لے کر آئے جو پہلے معروف نہیں۔

پھر وہ عمل جس پر کتاب و سنت کی دلالت موجود ہے وہ بدعت شرعیہ نہیں اگرچہ اسے بدعتِ لغویہ کا نام دیا جا سکتا ہے اور لغت میں بدعت کا لفظ شریعت میں مستعمل بدعت کے لفظ سے عام ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کہ "ہر بدعت گمراہی ہے۔" اس سے مراد نہیں کہ ہر وہ عمل جو دین اسلام میں ابتدا کیا جائے' بلکہ ہر وہ دین جسے رسل عظام لے کر آئے وہ ابتدائی عمل ہی تھا' اور بلاشبہ اس سے مراد وہ ابتدائی

اعمال ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز نہیں ٹھہرایا۔

حافظ ابن حجر کا تبصرہ

حافظ ابن حجر رحمتہ اللہ علیہ "فتح الباری" میں فرماتے ہیں کہ اصل بدعت وہ ہے جو مثال سابق پر ایجاد نہ ہو' اور شریعت میں جس بدعت کا اطلاق سنت کے مقابلے میں ہوتا ہے' وہ بدعت مذمومہ ہے' اور تحقیق یہ ہے کہ اگر وہ شریعت میں مستحسن امر کے تحت داخل ہو تو وہ حسنہ ہے' اور اگر کسی قبیح امر کے تحت ہو قبیحہ' وگرنہ مباح کی قسم ہوگی' اور بدعت احکام خمسہ کی طرف تقسیم ہوتی ہے۔

(فتح الباری: ۴ / ۳۱۸' کتاب صلوۃ التراویح' باب فضل من قام رمضان)

شیخ صنعانی کا نظریہ

شیخ محمد بن اسماعیل صنعانی "سبل السلام" میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد "ہر بدعت گمراہی ہے۔" کی شرح میں فرماتے ہیں کہ لغت میں بدعت اس عمل کو کہتے ہیں جو مثال سابق پر واقع نہ ہو' اور یہاں اس سے مراد وہ عمل ہے جس پر کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہ ہو۔

اور علماء نے بدعت کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) واجبہ: جیسے تدوین و تالیف سے علوم کی حفاظت اور ملاحدہ کے رد میں دلائل قائم کرنا وغیرہ---اور

(۲) مندوبہ: جیسے مدارس کی تعمیر وغیرہ---اور

(۳) مباحہ: جیسے طرح طرح کے کھانوں میں وسعت اور قابل رشک لباس وغیرہ' اور

(۴) محرمہ اور مکروہہ دونوں ظاہر ہیں۔

لہذا معلوم ہوا کہ حضور سرور کائنات ﷺ کا ارشاد "کل بدعۃ

ضلالہ "عام مخصوص ہے۔ (سبل السلام للامام محمد بن اسماعیل الصنعانی: ۲/۴۸)

امام لکھنوی کی گفتگو

امام ابوالحسنات محمد عبدالحیٰ لکھنوی نے ائمہ سلف کے کلام کی تلخیص کی ہے اور اس حدیث کے بارے میں ان کے موقف کے دو قول ہیں' فرماتے ہیں کہ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے جو دو اقوال پر مبنی ہے:

(ا) بے شک حدیث "کل بدعۃ ضلالہ" عام مخصوص البعض ہے اور اس سے مراد بدعت سیئہ ہے' اور انہوں نے بدعت کو واجبہ' مندوبہ' مکروہہ' محرمہ' اور مباحہ میں تقسیم کیا ہے' اور وہ جو ابو نعیم نے "حلیۃ الاولیاء" میں امام شافعی سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ نئے امور کی دو قسمیں ہیں:

(i) وہ نیا امر جو کتاب و سنت اور نقل و اجماع کے خلاف ہو' تو یہ بدعت واقعی گمراہی ہے۔

(ii) وہ نیا امر جو بھلائی سے جنم لیتا ہے تو وہ مذموم نہیں' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ماہ رمضان کے قیام میں فرمایا کہ "یہ اچھی بدعت ہے۔" یعنی ایسا نیا امر نہیں جو مذموم ہو۔

اور کثیر جلیل القدر ائمہ نے اپنی اپنی کتب میں یہی تصریح فرمائی ہے مثلاً
شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے "القواعد" میں'
امام نووی نے "تہذیب الاسماء واللغات" میں'
ملا علی قاری نے "شرح المشکوۃ" میں'
ابن ملک نے "مبارق الازھار شرح مشارق الانوار" میں'
امام سیوطی نے اپنے رسالہ "حسن المقصد فی عمل المولد" اور "المصابیح فی صلاۃ التراویح" میں'
علامہ قسطلانی نے "ارشاد الساری شرح صحیح البخاری" میں'

علامہ زرقانی نے "شرح الموطا" میں'
حافظ ابو شامہ نے اپنی کتاب "الباعث علی انکار البدع والحوادث" میں'
اور علامہ حلبی نے "انسان العیون فی سیرۃ النبی المامون" میں وغیرہم۔
تو اس قول پر وہ بدعت جو سنت کی ضد ہو وہ بدعت مکروہہ اور محرمہ ہے' اور جو بدعات ان کے علاوہ ہیں وہ سیئہ نہیں ہیں۔

(۲) باریک بینی سے غور و فکر کیا جائے تو زیادہ صحیح یہی مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ حدیث "ہر بدعت گمراہی ہے" اپنے عموم پر باقی ہے اور اس سے مراد بدعت شرعیہ ہے' یہ وہ ہے جو قرون حاضرہ میں نہ پائی گئی ہو اور نہ ہی اصول شرعیہ میں اس کی کوئی اصل موجود ہو' معلوم ہوا کہ ہر وہ امر جو اس صفت سے متصف ہو' وہ قطعاً گمراہی ہے' اور اسی قول کی طرف سید سند نے "شرح المشکوۃ" میں حافظ ابن حجر نے "ھدی الساری مقدمہ فتح الباری" میں اور "فتح الباری" میں اور حافظ ابن حجر ہیتمی مکی نے "الفتح المبین بشرح الاربعین" میں رجوع کیا ہے وغیرہم۔

(تحفہ الاخیار باحیاء سنہ سید الابرار للکنوی: ۱۲۳)

اس حدیث شریف کی یہی وہ صحیح فہم ہے جسے علماء محدثین اور حفاظ نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے' اور اسے ایک حجت مرضیہ اور طریقہ شریعہ معتمدہ اعتبار کیا ہے جسے ہر ایک عقل سلیم اور فہم قویم والا قبول کرتا ہے۔

اور ان حضرات میں سر فہرست شیخ ابو الطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "عون المعبود شرح سنن ابی داؤد" میں ابن رجب حنبلی کا کلام نقل کیا۔ (عون المعبود شرح سنن ابی داؤد: ۱۲/ ۳۶۰)

اور شیخ ابو علی محمد عبد الرحمن مبارک پوری ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "تحفہ الاحوذی بشرح جامع الترمذی" میں ابن رجب کا کلام نقل کیا۔

(تحفہ الاحوذی شرح جامع الترمذی: ۷/ ۴۳۹)

اور شیخ خلیل احمد سہارنپوری بھی ان حضرات میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنی کتاب "بذل المجہود فی حل ابی داؤد" میں علامہ خطابی کا کلام نقل کیا ہے۔

(بذل المجہود فی حل ابی داؤد: ۱۷/۱۴۸)

امام شوکانی کی تصریح

امام محمد بن علی شوکانی نے اپنی کتاب "نیل الاوطار" میں حدیث صلاۃ التراویح کی شرح میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے قول "یہ بدعت اچھی ہے۔" کے تحت بدعت کی تقسیم میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا پورا کلام نقل کیا، اور ذرا بھی کمی نہیں کی۔

(نیل الاوطار، باب صلاۃ التراویح: ۳/۲۵)

حافظ ابن عربی مالکی کی تقریر

امام حافظ قاضی ابو بکر محمد بن عبد اللہ المعروف ابن عربی مالکی فرماتے ہیں کہ جان لو --- اللہ تمہیں علم کی دولت سے نوازے --- کہ نئے امر کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ نیا امر جس کی کوئی اصل نہ ہو، محض شہوت اور ارادہ کے تقاضے سے اس نے جنم لیا ہو تو وہ قطعاً باطل ہے، اور دوسرا وہ نیا امر جس کی نظیر پہلے موجود ہو تو یہ خلفائے راشدین اور ائمہ فضلاء کی سنت ہے، اور محدث اور بدعت کا نہ لفظ مذموم ہے اور نہ ہی اس کا معنی، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ۔ (الانبیاء: ۲)	جب ان کے رب کے پاس سے انہیں کوئی نئی نصیحت آتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "یہ بدعت اچھی ہے۔" تو بلاشبہ مذموم بدعت وہ ہے جو سنت کے مخالف ہو اور وہ نئے امور مذموم میں جو گمراہی کی دعوت دیتے ہوں۔

(عارضہ الاحوذی بشرح صحیح الترمذی لابن العربی: ۱۰/۱۴۷)

امام قاضی باجی کی رائے

امام قاضی ابو الولید سلیمان بن خلف باجی حدیث تراویح کی شرح میں سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول "یہ بدعت اچھی ہے" پر فرماتے ہیں کہ یہ قول اس امر کی تصریح کرتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہی سب سے پہلے لوگوں کو رمضان المبارک میں ایک امام کی اقتدا میں نماز پڑھنے پر جمع کیا اور اس ترتیب کو مساجد میں مستقل طور پر مرتب کیا' کیونکہ بدعت وہی ہے جس کو مبتدع ابتداء" وہ عملی جامہ پہنائے جسے پہلے کسی نے نہ کیا ہو' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس عمل کو ایجاد کیا اور صحابہ کرام و تابعین نے اس کی پیروی کی اور آج تک جمیع مسلمان اسی کی پیروی کر رہے ہیں۔

یہ رائے اور اجتہاد کے قول کے صحیح ہونے میں نہایت واضح ہے' اور آپ رضی اللہ عنہ نے اسے اچھی بدعت کے نام سے موسوم کیا اس لیے کہ اس میں مصلحتوں کے اسباب ہیں جن کو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔(المنتقی شرح الموطا: ۱/ ۲۰۷-۲۰۸)

علامہ زرقانی کا نفیس کلام

علامہ فقیہ شیخ محمد بن عبدالباقی زرقانی "شرح الموطا" میں سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان "یہ اچھی بدعت ہے" کے تحت فرماتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے اچھی بدعت کہا کیونکہ اس فعل کی اصل سنت ہے اور بدعت ممنوعہ سنت کے خلاف ہوتی ہے' اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نماز چاشت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "یہ بدعت اچھی ہے" اور اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے:

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ۔(الحدید: ۲۷)	اور گوشہ نشینی انہوں نے اپنی طرف سے نکالی تھی ہم نے یہ ان پر فرض نہ کی تھی مگر اللہ کی رضامندی کو تلاش کرنے کیلئے۔

اور اعمال دنیا سے متعلق اشیاء کی ایجاد مباح ہے' یہ ابن عبد البر نے کہا ہے' اور امام باجی فرماتے ہیں کہ "نعمت" تاء کے ساتھ بصریوں کے مذہب پر ہے' کیونکہ "نعم" فعل ہے جس سے تاء ہی متصل ہوتی ہے' اور کئی نسخوں میں "نعمہ" ہاء کے ساتھ ہے اور یہ کوفیوں کے اصول پر ہے اور یہ تصریح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہی سب سے پہلے لوگوں کو قیام رمضان میں ایک امام کی اقتداء میں نماز پڑھنے پر جمع کیا' کیونکہ بدعت وہ ہے جسے مبتدع ابتداء" کرے اور اس سے پہلے کسی نے وہ عمل نہ کیا ہو' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ایجاد کیا اور صحابہ سے لے کر آج تک تمام مسلمان اس کی پیروی کر رہے ہیں' اور یہ رائے اور اجتہاد کے صحیح ہونے میں واضح ترین ہے۔ تو اس کو بدعت کے نام سے موسوم کیا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام رمضان کے لیے لوگوں کو جمع نہ کیا اور نہ ہی دور صدیق میں جمع کیا گیا' اور یہ لغوی طور پر ہے یعنی وہ امر جو مثال سابق پر نہ ہو' اور شرعاً بدعت کا اطلاق سنت کے مقابل پر ہوتا ہے' اور یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہ تھی' پھر اس کو احکام خمسہ کی طرف تقسیم کیا جاتا ہے۔

اور حدیث "کل بدعة ضلالة" عام مخصوص ہے' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس قول کے ساتھ کہ "یہ بدعت اچھی ہے۔" اس میں ترغیب دلائی ہے اور یہ کلمہ جمیع محاسن کو شامل ہے جیسا کہ کلمہ تمام قبائح کو شامل ہوتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِقْتَدُوْا بِالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِیْ اَبِیْ بَکْرٍ وَّعُمَرَ: — میرے بعد ابو بکر اور عمر کی اقتداء کرو۔

تو جب بمع حضرت عمر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہو گیا تو اس عمل سے بدعت کا نام زائل ہو گیا۔ (شرح الزرقانی علی الموطا: ۱/ ۳۴۰)

تقسیم بدعت کا مصدر اول

مشرع اعظم

جان لو کہ مشرع اعظم وہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہی بدعت کی تقسیم میں مصدر اول ہیں، یعنی بدعت کی تقسیم حسنہ اور سیئہ میں، یا مقبولہ اور مردودہ میں یا شرعیہ اور لغویہ میں یا دینیہ اور دنیویہ میں، اور یہ حضور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ماخوذ ہے جو صحیح حدیث میں وارد ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

من سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا واجر من عمل بھا بعدہ من غیر ان ینقص من اجورھم شیئی ومن سن فی الاسلام سنۃ سیئۃ کان علیہ وزرھا ووزر من عمل بھا من بعدہ من غیر ان ینقص من اوزارھم شیئی۔ (صحیح مسلم کتاب الزکاۃ ۲/ ۵۸۳، حدیث نمبر ۱۰۱۷)

جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ ایجاد کیا تو اسے اس کا اجر ملے گا اور جو اس کے بعد اس پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی اسے ملے گا اور ان کے اجر و ثواب میں کچھ کمی نہ کی جائے گی اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ ایجاد کیا تو اس پر اس کا وبال ہوگا اور جنہوں نے اس کے بعد اس پر عمل کیا ان کا وبال بھی اس پر ہوگا اور ان کے وبال میں کچھ کمی نہ کی جائے گی۔

اس حدیث شریف میں غیر مثال پر جنم لینے والے نئے امر کی مقبول اور مردود کی طرف تقسیم ہے۔

اور وہ خیر کی ابتدا جس زمانے میں بھی کرے اس کی تقسیم یہی ہے، نہ کہ خلفائے راشدین کے دور کے نئے امور میں اس کا حصہ ہے اور نہ ہی صحابہ و تابعین کے دور کے ساتھ مختص، کیونکہ یہ بلادلیل حدیث کو مقید کرنا ہے۔

اور عوام المسلمین نے ان امور کو قبول کیا ہے جو خلفائے راشدین اور صحابہ کے دور کے بعد رونما ہوئے مثلاً آیات قرآنیہ کی تشکیل' حروف کے نقطے' پاروں' ربعوں اور سجدوں کی نشاندہی' ہر دس آیات پر علامات کا وضع کرنا' قرآنی سورتوں کا شمار' آیات قرآنیہ کے نمبر' ہر سورۃ کے شروع میں مکی اور مدنی کا بیان' ان علامات کی وضع جو وقف جائز اور ممنوع کو واضح کریں' بعض احکام تجوید جیسے ادغام اور تنوین وغیرہ اور دیگر تمام اصطلاحات جو مصاحف میں وضع کی گئی ہیں' اور اسی طرح ہی علوم لغت' اصول فقہ' اصول دین اور ان تمام علوم کی تدوین ہے جو شریعت مطہرہ کے خادم ہیں' ان کو لوگوں نے قبول کیا ہے۔

ایسے تمام امور جو عہد رسول ﷺ کے بعد واقع ہوئے ہیں' کسی نے بھی ان کو محدثات اور بدعت ضلالہ میں شمار نہیں کیا اور نہ ہی یہ کہا کہ حدیث "کل بدعة ضلالة" ان کو شامل ہے' بلکہ یہ مستحسن امور تو اس گمراہی کے دشمن ہیں' کیونکہ یہ نہ کسی نص کے متصادم ہیں اور نہ ہی کسی شرعی اساس کے مقابل' بلکہ ان سے تو مصلحت مفیدہ ثابت ہوتی ہے اور وہ تلاوت قرآن کی آسانی پر محافظت ہے' اور قرآن کا حفظ' حسن ترتیل اور بعض احکام کی معرفت اس سے آسان ہو جاتی ہے' اور حفاظت دین کی خاطر یہ امور ضروری ہیں' لہٰذا یہ امور شریعت عامہ کے تحت داخل ہوئے اور مستحسن ہوئے اور جو امر بھی اس قبیلے سے ہو وہ مذموم نہیں' اور اس پر بدعت کا اطلاق لغوی طور پر ہے' اگر اسے قبول کرنے کے لیے اصول شرعیہ کے تحت داخل ہونے کی شرط لگائیں تو واضح رہے کہ جمہور نے نئے امر کی قسم مقبول کو اصل شرعی کے تحت داخل کیا ہے اور وہ بایں شرط مصلحت مناسبہ ہے کہ وہ کتاب و سنت سے متصادم نہیں اور شریعت نے اسے حسن قرار دیا ہے' اور وہ شرعی قبح کے حکم کے تحت داخل نہیں۔

جمہور علماء کے نزدیک اصول شرعیہ نصوص پر ہی محصور نہیں بلکہ ان جمیع

طرق اور اصول کو شامل ہیں جنہیں علماء نے شارع کی نصوص اور تصرفات سے مستنبط کیا ہے جیساکہ ہم نے پہلے وضاحت کر دی ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ کے کلام کا متناقض ہونا محال ہے کہ کبھی تقریر یوں ہو کہ ہر نیا امر بدعت اور ہر بدعت گمراہی ہے' اسی طرح اطلاق کلی کے ساتھ موجود ہے' پھر تقریر یوں ہو جائے کہ یہ نیا امر حسن و قبح کے درمیان دائر ہے' یا طریقہ حسنہ اور طریقہ سیئہ کے درمیان۔

لہٰذا ہر دو احادیث کا الگ الگ محمل ہے' اور جب محدث اور بدعت کا معنی خاص شرعی ہو اور ایک معنی عام لغوی ہو' تو بدعت کا اطلاق شریعت کی زبان میں ہر اس نئے امر پر ہوتا ہے جو نصوص اور اصول شرعیہ کے خلاف ہو' اور قرون ثلاثہ میں کسی عمل کی طرف منسوب نہ ہو تو عقلاً اور نقلاً واجب ہے کہ اس حدیث "ہر نیا امر بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے" کو اس استعمال شرعی پر محمول کیا جائے اور حدیث میں اس کا کلیہ یہ ہے کہ وہ باعتبار معنی خاص لغوی کے ہو جس کا استعمال شریعت میں ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر وہ نیا امر جو قرون ثلاثہ کے بعد پیدا ہوا ہو' اور نصوص یا اصول شرعیہ کے مخالف ہو۔

رہا محدث اور بدعت جو عام لغوی معنی میں ہے یعنی ہر وہ امر جس کی ایجاد مثال سابق پر نہ ہو تو اس عام لغوی معنی کے اعتبار سے ضروری ہے کہ اسے حدیث "جس نے اسلام میں اچھا طریقہ ایجاد کیا... اور جس نے برا طریقہ ایجاد کیا۔" پر محمول کیا جائے' اور یہ معنی لغوی بدعت ضلالہ سابقہ اور بدعت مقبولہ دونوں کو شامل ہے اور یہ امر نہ کسی نص کے خلاف ہے نہ اصل شرعی کے' اور اس سے شریعت اسلامیہ کی مصلحت مناسبہ ثابت ہو جاتی ہے' اور یہ قسم بدعت مذمومہ سے متعلق نہیں' اگرچہ وہ قرون ثلاثہ اولی کے بعد ہی وقوع پذیر ہو اور نہ شریعت سے خارج ہے اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے امر' طریقہ' سنت منہج تشریعہ سے باہر' اسے تو

حدیث "ہر نیا امر بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے" شامل نہیں اور نہ ہی یہ حدیث "جس نے ہمارے دین میں کوئی نئی بات ایجاد کی جو اس سے نہیں تو وہ مردود ہے" اسے شامل ہے' بلکہ اسے تو یہ حدیث شریف شامل ہے کہ "جس نے اسلام میں نیا اچھا طریقہ ایجاد کیا" تو اس طرح ضروری ہے کہ اس حدیث "ہر بدعت گمراہی ہے" کو استعمال شرعی پر محمول کیا جائے اور یہ وہ نیا امر ہے جو نصوص اور اصول شرعیہ کے خلاف ہو' جس طرح یہ حدیث "جس نے اچھا طریقہ ایجاد کیا" کو استعمال لغوی عام پر محمول کیا جاتا ہے جو ان تمام امور کو شامل ہے جو نصوص و اصول کے خلاف ہیں تو وہ مذموم ہے' جس طرح یہ ان تمام امور کو شامل ہے جو نصوص و اصول کے خلاف نہیں اور وہ مقبول ہے۔

ان ضوابط اور مخالفات میں تطبیق کے قواعد کو وضع کرنا ان جلیل القدر علماء کا ہی کام ہے جو اپنے اقوال کا احتساب کرتے ہیں' اور حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے وہ ضابطہ واضح فرمادیا جو ہر قسم کو دوسری سے ممتاز کردے' اور وہ یہ ہے کہ سیئہ وہ ہے جو نصوص و اصول کے خلاف ہو اور حسنہ وہ ہے جو نصوص و اصول کے کچھ بھی خلاف نہ ہو۔

اس شافی بیان سے ہم پر واضح ہو گیا کہ بدعت اور محدث کی تقسیم جو حسنہ اور سیئہ کی طرف ہے وہ تقسیم اطلاق لغوی سے ہے نہ کہ شرعی سے' اور تقسیم کے انکار کا تکلف بھی زائل ہو گیا جو اس وہم پر تھا کہ بدعت اور محدث کی تقسیم اصطلاح شرعی پر ہے جو اس حدیث میں وارد ہے "ہر بدعت گمراہی ہے۔"

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے بدعت کو اطلاق لغوی کے اعتبار سے تقسیم کیا اور بدعت شرعیہ کو اپنے عموم پر باقی رکھا' یعنی جس نئے امر کو شریعت نے اپنی اصطلاح اور عرف میں بدعت کا نام دیا اور وہ یہی ہے جو نصوص اور اصول شرعیہ کے خلاف ہو۔

جن کا یہ وہم ہے کہ تقسیم بدعت شرعیہ کی ہے تو یہ محض ان کی ہوا و ہوس کا

نتیجہ ہے جو بدعت شرعیہ میں فریقین کا معرکہ گرم رکھنے کے خیال میں ہیں۔ بلا خلاف اس پر اتفاق تام اور قائم ہے کہ بدعت شرعیہ کی تقسیم نہیں جیسا کہ اس پر اتفاق ہے کہ بدعت لغویہ کی تقسیم ہے جیسا کہ اس کا ذکر گزر گیا' اور جو شخص اس کیفیت سے واقف نہیں وہ اس کے استعمال میں ادھر ادھر بھٹکنے پر مجبور ہے اور کبھی کبھی وہ مقصود سے بھی باہر ہو جاتا ہے' حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اس تقسیم کی بانی کافی ہے جیسے حدیث شریف میں ہے کہ "جس نے اچھا طریقہ ایجاد کیا---اور جس نے برا طریقہ ایجاد کیا---" اور اسی کلیہ پر زور دینا جو حدیث میں وارد ہے کہ "ہر نیا امر بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔" تو یہ لوگوں کو گمراہ کرنا ہے بایں صورت کہ حدیث بدعت میں مطلقاً وارد ہے اور حدیث میں اس کے استعمال شرعی سے صرف نظر ہے' کیونکہ شریعت میں اس کا اطلاق ان امور پر ہے جو اصول شرعیہ کے مخالف ہوں' اور شرعاً یہی بدعت ضلالہ ہے جو نصوص و اصول کے خلاف ہے' اور یہ باعتبار استعمال شرعی کے بالکل مذموم ہے' یعنی یہ کلیہ ہر اس محدث پر جاری ہے جسے شریعت کی زبان نے محدث کا نام دیا ہو' اور بدعت لغویہ میں سے مقبول بھی ہے اور بلاشبہ وہ اچھا طریقہ ہے اور اس تسمیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء ہے' اگر اسے بدعت حسنہ کا نام دیں تو وہ بدعت کے اطلاق لغوی سے رکاوٹ نہیں' یعنی وہ امر جو مثال سابق پر ایجاد نہ ہو' اور جو اسے بدعت کا نام دینے سے اجتناب کرے تو وہ اس کی رائے پر مبنی ہے کہ بدعت کا اطلاق صرف بدعت شرعیہ پر ہوگا' اور بدعت مقبول کو اطلاق لغوی سے سنت کا نام دیا جائے گا یا جو اس کے مشابہ ہے۔

واضح نص کی تاویل

حضور پرنور شافع یوم النشور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی:

من سن سنة حسنة--- ومن سن سنة سيئة۔ | جس نے اچھا طریقہ ایجاد کیا---اور جس نے برا طریقہ ایجاد کیا۔

اس امر پر واضح دلالت کرتا ہے کہ امر محدث کی تقسیم مقبول و مردود یا حسنہ و سیئہ کی طرف ہے' لیکن بعض من پرست لوگ اس کی ایسی تفسیر کر کے بہت خوش ہوتے ہیں جو اس کے الفاظ کے مطابق نہیں یعنی کہتے ہیں کہ ارشاد گرامی: "سن فی الاسلام" کا مطلب ہے کہ سنت کو زندہ کرنا اور ظاہر کرنا' جبکہ وہ لوگوں پر مخفی ہو تو اس کی طرف بلایا جائے اور اس کو ظاہر کیا جائے' اور کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث کا مقصود سنت کا احیا اور اظہار ہے۔

لو دیکھو نیا تماشہ کہ اس قول میں حدیث "من سن سنه..." کی واضح تاویل ہے جس میں کوئی شک نہیں اور حدیث کے منطوق و مفہوم پر حکم ہے' اور ان الفاظ و معانی کا صراحتاً انہدام ہے جو ان امور پر دلالت کرنے میں واضح ہیں کہ اچھے طریقوں کی ایجاد' عاملین کو راہ عمل دینا' عادات حسنہ کی بنیاد ڈالنا اور طرق جدیدہ اور مستحسنہ پر برانگیختہ کرنا جو شریعت اسلامیہ کے لواء تلے داخل ہیں اور اس کے قواعد کلیہ کے تحت مندرج ہیں اور ان اصول ثابتہ میں سے کسی کے معارض نہیں جو تاویل کا احتمال نہیں رکھتے۔

احیائے سنت اصل اور مستقل ہے

متروکہ سنت کے احیاء پر برانگیختہ کرنے میں دیگر احادیث وارد ہیں جو اپنے منطوق و مفہوم کے ساتھ اس موضوع پر دال ہیں' جن میں چند ایک یہ ہے:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من دعا الی هدی كان له من الاجر مثل اجور من تبعه لا ينقص ذلك من اجورهم شيئا ومن دعا الى ضلالة كان عليه من الاثم مثل آثام من تبعه	جس نے ہدایت کی طرف بلایا تو اسے اس کی مثل اجر ملے گا جتنا اس کی پیروی کرنے والوں کو ملا ہے اور ان کے اجر میں کمی نہ ہو گی' اور جس نے گمراہی کی طرف بلایا تو اس پر اتنا ہی گناہ ہے جتنا اس کی پیروی

لا ینقص ذلک من آثامھم شیئا۔	کرنے والوں کو ہے اور ان کے گناہوں میں کچھ کمی نہ ہوگی۔

(صحیح مسلم' کتاب العلم' باب من سنہ حسنہ اوسیہ' حدیث نمبر۱۶ : ۸ / ۶۲)

(۲) حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے فرمایا:

من دل علی خیر فلہ مثل اجر فاعلہ۔	جو اچھے کام کی رہنمائی کرے تو اسے بھی فاعل کے برابر ثواب ملے گا۔

(صحیح مسلم کتاب الامارہ' نمبر۱۳۳ : ۶ / ۴۱)

(۳) کثیر بن عبداللہ نے اپنے والد سے' اپنے دادا سے روایت کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

من احیا سنہ من سنتی قد امیتت بعدی فان لہ من الاجر مثل من عمل بھا من غیران ینقص من اجورھم شیئا' ومن ابتدع بدعۃ ضلالۃ لا ترضی اللہ ورسولہ کان علیہ مثل آثام من عمل بھالا ینقص ذلک من اوزار الناس شیئا۔	جس نے میرے بعد میری متروکہ سنت کو زندہ کیا تو اس کے لیے اتنا ہی اجر ہے جتنا اس پر عمل کرنے والوں کو اور ان کے اجر و ثواب میں کچھ کمی نہ کی جائے گی' اور جس نے کوئی گمراہی رائج کی جس پر نہ اللہ راضی ہے نہ اس کا رسول تو اس پر اتنا ہی وبال ہوگا جتنا اس پر عمل کرنے والوں پر اور اس سے ان کے مصائب میں کچھ کمی نہ ہوگی۔

(رواہ الترمذی وحسنہ وابن ماجہ' کتاب العلم' ۵ / ۴۴' باب من احیاء سنہ' ۱ / ۸۶)

تو یہ احادیث مبارکہ اچھے امور کی ایجاد پر دال ہیں' اور سنن کے انشاء اور احیاء میں فرق ظاہر ہے۔

اور بعض دوسروں کا خیال یہ ہے کہ حدیث میں سنت سے مراد رسول اللہ

ﷺ اور خلفائے راشدین کا طریقہ ہے نہ کہ وہ اچھے امور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور میں نہ تھے' اور یہاں حدیث اچھے امور کی ابتدا اور ایجاد میں واضح ہے جس کا قرون اولیٰ میں حصر نہیں' تو محدث (نئے امر) کو خلفائے راشدین کے دور میں محصور کرنا حدیث کو بلادلیل مقید کرنا ہے۔

ایک تیسرے گروہ کا یہ خیال ہے کہ سنت حسنہ سے مراد وہ دنیاوی امور ہیں جن کو اگر منافع کی خاطر اختراع کر لیتے ہیں اور سنت سیئہ سے مراد وہ امور جنہیں وہ تکلیف اور شر کی بنا پر اختراع کر لیتے ہیں' اور ان کا محدث مقبول کو دنیا سے متعلق امور پر محصور کرنا' حدیث کی مخصص کے بغیر تخصیص کرنا ہے' حالانکہ حدیث سے مراد ظاہر ہے کہ وہ بنا امر جو مثال سابق پر نہ ہو اسے حدیث شامل ہے چاہے اس کا تعلق امور دنیا سے ہو یا امور دین سے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ محدث کے قبول نہ کرنے میں یہ اعتبار نہیں کہ یہ فعل پہلے نہیں ہوا' بلکہ اس کے رد میں اعتبار اس بات کا ہے کہ وہ کسی نص' اصل شرعی یا استنباط کے قاعدہ کے خلاف ہو' یہ معارضہ اسی میں ہے جو شریعت نبوی ﷺ میں نہ ہو اور منہج شرعیہ کے خلاف ہو اور یہی وہ بدعت ضلالہ ہے جو شرعی حقیقت کے پیش نظر نصوص واصول سے متصادم ہے اور یہ بالکل استعمال شرعی میں سخت مذموم ہے۔

تاویلات سابقہ کا فساد

حاصل یہ ہے کہ جس نے حدیث "ہر بدعت گمراہی ہے" میں وارد ہونے والے بدعت ضلالہ کے کلمہ کو اور کلیہ واردہ کو تمام نئے امور پر حمل کیا چاہے وہ نصوص واصول سے معارض ہیں یا نہیں' تو اس نے استعمال شرعی اور استعمال لغوی کے وقت کلمہ کو خلط ملط کر دیا اور حدیث شریف میں وارد ہونے والے کلیہ سے جاہل رہا کیونکہ یہ حکم اس محدث (نئے امر) پر وارد ہے جو شرعی استعمال کے ساتھ ہو اور یہ ہر وہ محدث ہے جو نص یا اصل شرعی کے معارض ہو' نہ کہ اس کا ورود محدث کے

لغوی استعمال پر ہے اور یہ ہر وہ امر ہے جو غیر مثال پر واقع ہو جو قسم مردود کو شامل ہے اور وہ نصوص و اصول کے معارض ہے' جبکہ قسم مقبول بھی اسی کی قسم ہے اور یہ جو نص اور اصل شرعی کے خلاف نہ ہو پہلی بدعت ضلالہ ہے اور دوسری مقبول' چاہے وہ قرن اولی میں رونپذیر ہو یا بعد میں۔

اور جو یہ ارادہ کرے کہ وہ محدث جسے نہ صحابہ نے کیا نہ اہل قرون اولی نے' اسے بدعت ضلالت میں شمار کیا جائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ ان نصوص خاصہ وعامہ اور اصول شرعیہ کو بیان کرے جو اس محدث سے متصادم ہیں اور اس امر کی قباحت کو مستلزم ہیں' تاکہ اطلاق لغوی کے ساتھ یہ بدعت مقبول سے خلط ملط نہ ہو جائے' کیونکہ اس بدعت مقبول کا بدعت ضلالہ یعنی تحریمہ میں ادراج صحیح نہیں' کیونکہ کسی چیز کی تحریک حکم شرعی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ کتاب و سنت سے کوئی دلیل ہو یا کوئی معتبر اصل ہو جو مسئلہ متنازعہ پر منطبق ہے' ورنہ وہ تحریم اپنی طرف سے ہو گی اور اپنی طرف سے حلال و حرام کرنے والوں کے بارے میں جو کچھ وارد ہے' وہ اس پر صادق آتا ہے' جیسا کہ حضور سید دوعالم ﷺ نے عدی بن حاتم سے اس ارشاد الٰہی کی تفسیر میں فرمایا' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِتَّخَذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ (التوبہ: ۳۱)	انہوں نے اپنے پادریوں اور جوگیوں کو اللہ کے سوا خدا بنا لیا۔

جدید امر کے قبول میں ہمیں اس قدر احتیاط کافی ہے کہ وہ قرون اولیٰ کے بعد اگرچہ ہو لیکن نصوص و اصول کے خلاف نہ ہو اور مصلحت مناسبہ کے تحت داخل ہو اور شارع علیہ السلام نے اس کا اعتبار لغو نہ کیا ہو' اور جو ہر محدث کو ان احادیث میں داخل کرے مثلاً حدیث:

"جس نے ہمارے دین میں نیا کام ایجاد کیا جو اس سے نہیں تو وہ مردود ہے۔"

اور حدیث: "جس نے میری سنت سے روگردانی کی' وہ مجھ سے نہیں۔"

اور حدیث: "تم پر میری اور خلفائے راشدین کی سنت لازم ہے۔"

اور دیگر احادیث جو اس موضوع سے متعلق ہیں' تو وہ اس امر سے جاہل ہے کہ ان کی سنت سے مراد یہ نہیں کہ جو امر ان کے دور میں واقع نہ ہو وہ بدعت ہے' بلکہ ان کی سنت کا مخالف وہ ہے جو شریعت اسلامیہ میں ان کے طریقہ کے خلاف ہو' چاہے جس دور میں بھی واقع ہو' بلاشبہ جو امور کسی دور میں بھی مصلحت تشریعہ اور معتبرہ کی خدمت کریں ان کے بارے میں یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ ان کا طریقہ نہیں یا ان امر سے خارج ہے اور آپ ﷺ کے طریقہ سنت اور منہج تشریعہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں' کیونکہ اس سے خارج وہ محدث ہے جو قرون ثلاثہ کے بعد ہو اور نصوص و اصول شرعیہ کے خلاف ہو۔

سنت نبوی ﷺ کو تھام لو

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ حدیث "من سن سنه حسنه" سے مراد سنت نبویہ کے ساتھ تمسک ہے جو مسلمان کے دفاع کو شامل ہے' اس طرح لوگوں کا معرکہ استہزائیہ اور معارضہ بھی زائل ہو جاتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ بلاشبہ یہ معنی جلیل اور فہم عظیم ہے' لیکن بحمدہ تعالیٰ اس میں نص صریح وارد ہے جو اس کے ساتھ خاص ہے اور اپنے منطوق و مفہوم اور الفاظ و معانی کے ساتھ اس پر دال ہے' اور یہ پرلے درجے کی جہالت ہے کہ ہم اس تفسیر کو نص آخر کی طرف متعدی کریں اور اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں کی جائیں' بلاشبہ یہ نصوص پر زیادتی اور تجاوز ہے جو نہ اللہ جل شانہ کو پسند ہے نہ اس کے رسول ﷺ کو اور نہ ہی کسی باشعور انسان کو۔

رہی وہ حدیث جو اس موضوع میں بطور نص وارد ہے' جسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المتمسك بسنتي عند میری امت کے فساد کے وقت میری

فسادامتی لہ اجر شہید۔ سنت کو تھامے رکھنے والے کے لیے شہید کا اجر ہے۔

امام طبرانی نے اسے "الاوسط" میں روایت کیا اور کہا کہ اسے عبدالعزیز کے سوا عطاء سے کسی نے روایت نہیں کیا' اور اس میں اس کا بیٹا متفرد ہے۔

(مجمع البحرین فی زوائد المعجمین از حافظ نور الدین ہیثمی: ۱/ ۲۳۴)

اور حافظ ہیثمی نے انہی الفاظ کے ساتھ اسے "مجمع الزوائد" میں نقل کیا اور کہا کہ اسے امام طبرانی نے "الاوسط" میں روایت کیا اور اس میں محمد بن صالح عدوی ہے' جس کے حالات میں نہیں جانتا اور بقیہ رجال ثقہ ہیں۔ (مجمع الزوائد: ۱/ ۱۷۲)

اور امام سیوطی نے اسے "الجامع الصغیر" میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے' اور اس کے حسن ہونے کا اشارہ فرمایا ہے جیسا کہ امام مناوی نے کہا۔

(فیض القدیر: ۱/ ۲۶۱)

ایک اور روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعا مروی ہے کہ

من تمسک بسنتی عند فساد امتی فلہ اجر مائۃ شہید۔ میری امت کے فساد کے وقت جس نے میری سنت کو تھامے رکھا تو اس کے لیے سو شہید کا اجر و ثواب ہے۔

اسے ابن عدی نے روایت کیا اور کہا کہ حسن بن قتیبہ کی یہ احادیث اس کے والد سے حسن مروی ہیں اور مجھے امید ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

(الکامل فی ضعفاء الرجال: ۲/ ۷۳۹)

صحابہ اور لفظ بدعت کا اطلاق

واضح رہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے دور میں بعض نئے امور کے بارے بدعت ہونے کا حکم دیا ہے' اگر ان کے اطلاق کے ساتھ انکار کی کوئی

علامت قولاً یا فعلاً موجود ہو جو ان کے نزدیک اس امر کے قبیح ہونے پر دال ہو' اور اگر اس کے ساتھ یہ بات نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ایسا امر ہو جو اس کی تحسین پر دال ہو تو وہ اس امر پر دلالت ہے کہ ان کی بدعت سے مراد معنی عام (محدث) ہے نہ کہ وہ بدعت جو گمراہی ہے۔

قسم اول کی مثال وہ روایت ہے جو امام ابو داؤد نے مجاہد سے نقل کی ہے کہ

كنت مع ابن عمر فثوب رجل في الظهر او العصر فقال ابن عمر: اخرج بنا فان هذه بدعة:- (رواۃ ابوداؤد: ۱/ ۱۴۸)	میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ہمراہ تھا کہ ایک شخص نے ظہر یا عصر میں تثویب کی تو آپ نے فرمایا چلو ہم نکلیں بے شک یہ بدعت ہے۔

علامہ محقق بدر الدین عینی فرماتے ہیں کہ "المبسوط" میں مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موذن کو عشاء کی اذان میں تثویب کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

اخرجوا هذا المبتدع من المسجد۔	اس بدعتی کو مسجد سے نکال دو۔ (البنایہ شرح الہدایہ: ۱/۵۵۰)

اور اسی طرح ہی وہ روایت ہے جس کو امام ترمذی نے نقل کیا اور حسن کہا نیز امام نسائی' ابن ماجہ اور بیہقی وغیرہم نے اسے نقل کیا یعنی ابو نعامہ حنفی کی حدیث (ان کا نام قیس بن عبایہ ہے) ابن عبداللہ بن مغفل سے مروی ہے کہ

میرے والد نے مجھے نماز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے ہوئے سنا تو کہا: اے بیٹے محدث (بدعتی) ' حدث (بدعت) سے بچ ' اور کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ اسلام میں کوئی نیا امر اس سے بڑھ کر اسے ناگوار گزرا ہو ' نیز فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز پڑھی ہے ' میں نے کسی کو یہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا لہٰذا تم بھی یہ نہ پڑھو اور جب بھی تو نماز پڑھے تو کہہ: "الحمد لله

رب العالمین۔"

(الترمذی: ۲/ ۴۳، النسائی: ۲/ ۱۳۵، ابن ماجہ: ۱/ ۲۶۷، البیہقی: ۲/ ۵۳)

نوٹ: ابو غدہ صفحہ ۴۵ پہ رقمطراز ہیں کہ "محدث" کا لفظ ترمذی کے بعض نسخوں میں موجود ہے جبکہ باقی مصادر مذکورہ میں نہیں۔

علامہ لکھنوی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس امر پر دال ہے کہ نماز میں بسملہ کو جہرا پڑھنا محدث (نیا امر) ہے۔ عبداللہ بن مغفل اس کو قبیح سمجھتے ہیں، اور یہ مسئلہ ائمہ میں اختلافیہ ہے اور احادیث اس میں متعارضہ ہیں، اور حق بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی کبھی بسملہ کی جہر ثابت ہے، اور سر (مخفی پڑھنا) جہر سے اقویٰ ہے جیسا کہ میں نے اپنے رسالہ "احکام القنطرہ فی احکام البسملہ" میں اس مسئلہ کی پوری تحقیق قلمبند کی ہے۔

(اقامۃ الحجۃ علی ان الاکثار فی التعبد لیس ببدعۃ از لکھنوی: ۴۵)

اور قسم ثانی کی مثال وہ روایت ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے نماز تراویح کو بدعت حسنہ سے موصوف کیا۔

سعید بن منصور نے اپنی "سنن" میں ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کیے ہیں اور رمضان کا قیام تم پر فرض نہیں کیا، بلاشبہ اس قیام کو تم نے خود ایجاد کیا، تو تم اس پر ہمیشگی اختیار کرو اور اسے ترک نہ کرو، بے شک بنی اسرائیل کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا تلاش کرنے کے لیے بدعت کو ایجاد کیا پھر ترک کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس ترک کے سبب عتاب نازل فرمایا۔ پھر یہ آیہ مقدسہ تلاوت کی:

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا	انہوں نے گوشہ گیری اللہ کی رضامندی
كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ	تلاش کرنے کے لیے اپنی طرف سے

رِضْوَانِ اللّٰہِ--- الایۃ — نکال لی تھی، ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا۔ (الحدید: ۲۷)

تو یہ امر اس ابتداع پر مداومت کو مفید ہے جو وصف حسن سے موصوف ہو۔

اور اسی طرح ابن ابی شیبہ نے صحیح سند کے ساتھ حکم بن اعرج سے نقل کیا کہ

سالت ابن عمر عن صلاۃ الضحی فقال بدعۃ ونعمت البدعۃ ھی۔ — میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نماز چاشت کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: بدعت ہے اور یہ اچھی بدعت ہے۔

اور امام عبدالرزاق نے صحیح سند کے ساتھ سالم سے، اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ

لقد قتل عثمان وما احد یسبحھا، وما احدث الناس شیئا احب الی منھا۔ — حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے اور لوگوں نے کوئی نیا امر ایجاد نہ کیا اور اس سے بڑھ کر مجھے کوئی چیز پسند نہیں۔

علامہ قسطلانی شارح بخاری فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس پر مداومت نہیں فرمائی یا یہ کہ مساجد وغیرہ میں اس کا اظہار بدعت ہے اور فی جملہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی احادیث میں ایسی کوئی بات نہیں جو نماز چاشت کی مشروعیت کو مانع ہو، کیونکہ اس کی نفی روئیت پر محمول ہے نہ کہ نفس الامر میں عدم وقوف پر، یا وہ جس کی صفت مخصوصہ نفی کرے۔ (المواہب اللدنیہ للقسطلانی: ۲/۲۶۷)

صحابہ کا ایجاد کردہ امر گمراہی نہیں

صحابہ کے ایجاد کردہ امور کے گمراہی نہ ہونے پر دلیل وہ احادیث وارد ہیں جو سیرت صحابہ کی اقتداء پر دال ہیں، جیسے حدیث:

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔ — میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی بھی اقتدا کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

اس روایت کو مندرجہ ذیل ائمہ نے نقل کیا ہے:

امام دار قطنی نے "المو تلف" میں اور "غرائب مالک" میں' قضاعی نے "مسند الشہاب" میں' عبد بن حمید نے' امام بیہقی نے "المدخل" میں' ابن عدی نے "الکامل" میں' دارمی' ابن عبدالبر' ابن عساکر اور امام حاکم وغیرہم سب نے اسے مختلف الفاظ کے ساتھ روایت کیا جن کے معانی باہم قریب قریب ہیں اور یہ متعدد طرق سے مروی ہے اور جمیع طرق ضعیف ہیں' جیسا کہ حافظ ابن حجر نے "الکافی الشاف فی تخریج احادیث الکشاف: ۴ / ۹۴" میں اس پر مبسوط کلام کیا لیکن کثرت طرق کے سبب روایت درجہ حسن کو پہنچ جاتی ہے' اسی لیے شیخ صنعانی نے اسے حسن قرار دیا ہے جیسا کہ سید جرجانی نے اسے حاشیہ "مشکوۃ" میں ذکر کیا' جہاں وہ اس حدیث:

فضل العالم علی العباد--- عالم کی عابد پر فضیلت---

(الحدیث)

کے تحت فرماتے ہیں کہ اس فرمان نبوی ﷺ "اصحابی کالنجوم---" میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو ستاروں سے تشبیہ دی گئی ہے' امام صنعانی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

میں (مالکی) کہتا ہوں کہ بعض نے اس کے علاوہ سمجھا ہے اور ہم یہاں تخریج حدیث کے درپے نہیں' اور قاسم حنفی "شرح مختصر النہار" میں فرماتے ہیں کہ صحابی کی تقلید واجب ہے اور قیاس کو یہاں ترک کیا جائے گا' تقلید کا معنی یہ ہے کہ دلیل میں بغیر کسی تامل کے اس کے قول و فعل کی پیروی کرنا' اور اس کی دلیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے۔

مثل اصحابی فی امتی مثل النجوم بایهم اقتدیتم اهتدیتم — میری امت میں میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی بھی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

دار قطنی اور ابن عبد البر نے اسے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے' اور حدیث انس سے اس کا معنی مروی ہے' اور اس کی اسناد میں کلام ہے لیکن بعض طرق بعض سے قوی ہیں۔

امام حافظ بیہقی "الاعتقاد" میں فرماتے ہیں کہ ہم نے اسے حدیث موصول میں غیر قوی سند کے ساتھ روایت کیا اور دوسری حدیث میں منقطع سند ہے' اور صحیح حدیث اس کا بعض معنی ثابت کرتی ہے اور وہ ابو موسیٰ کی مرفوع حدیث ہے:

النجوم امنہ للسماء فاذا ذھبت النجوم اتی السماء ما توعدون' وانا امنۃ لاصحابی' فاذا ذھبت اتی اصحابی ما یوعدون' واصحابی امنۃ لامتی' فاذا ذھب اصحابی' اتی امتی ما یوعدون۔ (صحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابہ' باب بیان ان بقاء النبی ﷺ امان لاصحابہ:۱۶/ ۸۳' کتاب "الاعتقاد" لبیہقی:۱۶۰)	ستارے آسمانوں کے لیے امان ہیں اور جب ستارے ختم ہو جائیں گے تو آسمان پر وہ چیز آجائے گی جس سے تم کو ڈرایا گیا ہے (یعنی قیامت) اور میں اپنے اصحاب کے لیے امان ہوں اور جب میں چلا جاؤں گا تو میرے اصحاب پر وہ (فتنے) آجائیں گے جن سے ان کو ڈرایا گیا ہے اور میرے اصحاب میری امت کے لیے امان ہیں اور جب وہ چلے جائیں گے تو میری امت پر وہ (فتنے) آجائیں گے جن سے اس کو ڈرایا گیا ہے۔

اور ایسے ہی یہ حدیث:

علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین۔	تم پر میری اور خلفائے راشدین کی سنت لازم ہے۔

اسے امام ابو داؤد اور ترمذی وغیرہما نے نقل کیا ہے۔

اور ایسے ہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کہ

"اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں کو دیکھا تو محمد ﷺ کو پسند کیا اور انہیں اپنی

رسالت کے ساتھ مبعوث کیا' پھر بندوں کے دلوں میں نظر کی تو صحابہ کو پسند کیا تو انہیں اپنے دین کے مددگار اور اپنے نبی ﷺ کے وزراء بنادیا' اور جس کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک اچھا ہے اور جسے مسلمان برا سمجھیں تو وہ اللہ کے نزدیک بھی قبیح ہے۔"

اسے بزار' طبرانی اور امام احمد نے اپنی "سند" میں نقل کیا وغیرہم۔

نوٹ: مسند امام احمد (۱/ ۳۷۹)' مجمع الزوائد ہیثمی (۱/ ۱۷۷) حافظ ہیثمی کہتے ہیں کہ اس کے رجال ثقہ ہیں' امام طبرانی کی یہ روایت "الکبیر" میں ہے اور شیخ احمد شاکر مسند پر اپنی تعلیق (۵/ ۲۱۱) میں فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔

امور محدثہ کے نمونے

ابھی ہم ان بعض مسائل محدثہ کے نمونے پیش کرتے ہیں جو عہد نبوی ﷺ میں اپنی جدید کیفیات اور صورتوں کے ساتھ موجود نہیں تھے' اور اگر ان کا اصول موجود ہو تو وہ اس کے ساتھ بدعت حسنہ میں شمار ہوتے ہیں۔

۱- دور ابوبکر رضی اللہ عنہ میں تدوین قرآن

امام ابن رجب فرماتے ہیں کہ صحیفوں کو ایک کتاب میں جمع کرنے کے مسئلے میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے توقف کیا اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو کہا کہ تم دونوں وہ کام کیسے کرتے ہو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟ پھر انہیں معلوم ہوا کہ یہ مصلحت ہے تو قرآن کی جمع و تدوین پر اتفاق کیا' اور نبی کریم ﷺ وحی کی کتابت کا حکم فرمایا کرتے تھے' لہٰذا اس میں کوئی فرق نہیں کہ الگ الگ اجزاء پر لکھا جائے یا سارا ایک جگہ پر' بلکہ اس کا جمع کرنا زیادہ مصلحت آمیز ہے' اور اسی طرح حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے امت کو ایک مصحف پر جمع کیا اور امت کے تفرقہ کے ڈر

سے مخالفت کرنے والے کو خبردار کیا' اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو مستحسن (اچھا) سمجھا ہے اور یہ عین مصلحت ہے۔

(جامع العلوم لابن رجب: ۲۶۹)

اعتراض: اگر کوئی یہ کہے کہ مصحف (قرآن) کی کتابت اور جمع کو امور محدثہ میں شمار کرنا خطا ہے کیونکہ قرآن حکیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری زمانہ میں ہی مجموعاً محفوظ تھا۔

جواب: تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کہنا ہی خطا ہے کیونکہ مصحف کبھی بھی اس موجودہ ترتیب و شکل اور تنقیط و تکوین اور تحزیب و تجزی کی کیفیت و صورت میں نہ تھا' اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر انکار نہ فرماتے اور نہ ہی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ شیخین پر انکار کرتے کہ یہ وہ کام ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا' شیخین نے مصحف کو اس کیفیت میں لانے کا ارادہ کیا' جو عہد نبوی میں نہ تھی' بلکہ یہ صورت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں حاصل ہوئی۔

مروی ہے کہ سب سے پہلے جس نے ہر دسویں اور پانچویں آیت پر نشانیاں وضع کیں اور سورتوں کے اوائل میں علامات رقم کرائیں' وہ حجاج بن یوسف ثقفی ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ مصحف میں اعشار وغیرہ کی سرخ علامت کو مکروہ جانتے تھے۔

اور انہی سے ہی مروی ہے کہ آپ قرآن کو مصاحف میں چھ چھ اور سات سات اجزا میں لکھنے کو مکروہ سمجھتے اور اسے سخت مکروہ اور عیب جانتے' اور فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو جمع کیا ہے اور یہ لوگ متفرق کرتے ہیں۔

امام مالک رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا سورت میں آیات کے نمبر لکھے جائیں؟ تو آپ نے اصل المصاحف میں اس عمل کو مکروہ کہا اور تشکیل و تنقیط کو بھی

مکروہ کہا' اور بچوں کو تعلیم دینے کے لیے تختیوں میں ایسے لکھنے کی رخصت دی' حالانکہ آپ دیکھتے ہیں کہ آج کس طرح شکل' نقطے اور تقسیم سازی ہے نیز قرآن میں آیات کے نمبر بھی درج ہیں۔ (الحوادث والبدع لامام الطرطوشی : ۲۱۴-۲۱۶)

بسا اوقات قائل یہ کہتا ہے کہ گزشتہ کلام کا مقصود یہ ہے کہ در اصل قرآن عہد نبوی میں ہی مکتوب اور محفوظ تھا کہ وہ تختیوں' چمڑوں اور پتوں پر لکھا ہوا تھا اور سطور رد قلوب میں محفوظ تھا' مگر ایک مقام پر جمع نہیں تھا یا سورتیں ایسے مرتب نہ تھیں جیسا کہ بعد میں کیا گیا' اور جب اس طرح ہے تو اس وقت اسے ایک جگہ پر جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ صورت اور ہیئت اس سے مختلف ہے جو عہد نبوی میں تھی' کیونکہ وہ حقیقت میں اصل کے منافی نہیں اور نہ ہی اس میں کوئی حرج ہے اور لا محالہ اس عمل کا مقصد قرآن پاک کی حفاظت ہے۔

تو ہم اسے کہتے ہیں کہ ہم مطلوبہ نتیجہ تک پہنچ گئے' وہ یہ ہے کہ جس امر کی اصل عہد نبوی میں مشروع ہو اور تقریر محمدی ﷺ سے معروف اور ماذون ہو پھر اس اصل کی صورت یا ہیئت بدل جائے چاہے حفاظت کی غرض سے ہو جیسا کہ جمع قرآن' سنت مطہرہ کی تدوین' احادیث و سنن کی کتابت اور اس کی ابواب بندی کا حال ہے یعنی اس طرز پر جو عہد نبوی میں نہ تھی' یا لوگوں پر آسانی کی خاطر ہو جیسا کہ ایک شہر میں متعدد نماز جمعہ کی اقامت کا حال ہے' یا امر عادی کی وجہ سے کہ اس سے مخالفت مقصود نہ ہو جیسا کہ کھلے میدان کی بجائے حرمین شریفین میں نماز عید کا قائم کرنا' اور بالکل اسی طرح ہی ان اجتماعات کی صورت ہے جو لوگوں کو وعظ و ارشاد کرنے کی خاطر منعقد ہوتے ہیں' چاہے وہ خاص مجالس ہوں یا مناسبات اور اجتماعات عامہ جن میں لوگوں کے لیے وعظ و ارشاد کی فرصت نکل سکے' اور آج وہ مجلس بھی اسی قبیلے سے ہے جسے "محفل میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کا نام دیا جاتا ہے۔ بے شک اس کی اصل عہد نبوی میں معروف ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دیکھا

کہ وہ اجتماعی شکل میں ایک دوسرے کو وعظ و نصیحت کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے انہیں اس فعل پر برقرار رکھا اور بشارت سے نوازا اور ان کو منتشر نہ کیا۔

اور حضور پر نور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

ما اجتمع قوم فی بیت من بیوت اللہ---(الحدیث) کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی ایک گھر میں جمع نہیں ہوتی---

پس جب اصل معروف اور شروع ہو تو امر کی صورت اگر مختلف بھی جائے تو وہ اصل میں نقصان پیدا نہیں کرتی' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت شریفہ کی قرات اگرچہ ان کی مجالس میں نہیں کی گئی تو لامحالہ وہ آپ ﷺ پر درود شریف پڑھنے کے استحباب کے عموم تلے داخل ہے کیونکہ وہ اس کا ذریعہ ہے۔

اور وعظ و ارشاد کی محافل و مجالس ایسے امور ہیں جو معروف اور مشہور ہیں' خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اس کی اجازت دی ہے' اور اس کے بعد کھانا پیش کرنا کھانا کھلانے کے استحباب کے عموم میں داخل ہے' نیز مہمان کی عزت افزائی کے استحباب کے عموم میں شامل ہے۔

۲- دور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں نماز تراویح

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور خلافت میں نماز تراویح ایسے ہی ادا کی جاتی تھی جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھی جیسا کہ امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ لوگ نماز تراویح کو الگ الگ پڑھا کرتے تھے اور ہر شخص تنہا نماز پڑھتا' اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں قرات طویل ہوتی تھی' جیسا کہ امام مالک نے عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ "میں نے اپنے والد کو یہ کہتے سنا کہ ہم ماہ رمضان میں قیام سے فارغ ہوتے تو طلوع فجر کے خوف سے کھانے میں جلدی کرتے۔"

حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دور کی خبر کو امام بیہقی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ "ہم خدام سے اپنے بچے لے لیا کرتے تھے تاکہ وہ ماہ رمضان میں ہمارے ساتھ قیام کر سکیں۔"

۳۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور میں تراویح

حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور خلافت کے بعد حال تبدیل ہو گیا اور طریقہ جدیدہ حاصل ہوا جو پہلے نہ تھا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جو کبار صحابہ اس دور میں موجود تھے انہوں نے اس طریقہ کو پسند کیا اور جاری رکھا' یہ حضرات ائمہ سلف' میزان شریعت اور سنت مطہرہ کے علمبردار تھے' کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو یہ قدم اٹھایا ہے' وہ اصول کے مناقض ہے نہ قواعد کے معارض' بلکہ اصول و ضوابط کے تحت مکمل طور پر داخل ہے' اسی طرح جو بھی جدید کیفیات' ہیئات' صورتیں اور طریقے وقوع پذیر ہوں جو اسی طریقے اور اسی مقصود سے متعلق ہوں تو وہ بلا معارض اس کے تحت داخل ہیں' اور معترض کا یہ کہنا صحیح نہ ہو گا کہ یہ باطل ہے کیونکہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا---اور یہ فروع واصول میں بغیر کسی تفریق یا تقیید کے مطلق ہے' اس کے موافق ہو یا معارض' اس کی تاویل ممکن ہو یا نہ ہو۔

امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں یہ واقعہ ابن شہاب سے' عروہ بن زبیر سے' عبدالرحمٰن بن عبدالقاری سے ذکر کیا ہے کہ

میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہمراہ رمضان کی ایک رات مسجد میں گیا تو لوگ الگ الگ نماز پڑھ رہے تھے' ہر شخص نماز میں منفرد تھا اور کوئی اپنے خاص قبیلے کو نماز پڑھا رہا تھا' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ ان کو ایک قاری کی اقتداء میں جمع کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے' پھر آپ نے عزم کر لیا اور انہیں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر جمع کر دیا' پھر میں آپ کے ہمراہ دوسری رات نکلا تو

لوگ ایک قاری کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تھے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

نعم البدعة هذه۔ یہ اچھی بدعت ہے۔

اور رات کا یہ حصہ جس میں وہ سوتے تھے اس سے افضل ہے جس میں وہ قیام کرتے تھے (یعنی آخر رات) اور لوگ شروع رات میں قیام کرتے تھے۔

(صحیح بخاری' کتاب صلوۃ التراویح)

حافظ ابن حجر "فتح الباری" میں فرماتے ہیں کہ ان کا یہ فرمانا "آپ دوسری رات نکلے تو لوگ ایک قاری کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے تھے۔" یعنی مذکور امام کے پیچھے' تو اس میں یہ خبر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ نماز پر ہمیشگی نہیں فرمایا کرتے تھے اور گویا کہ آپ گھر میں نماز پڑھنے کو بہتر سمجھتے تھے اور لامحالہ رات کا آخری حصہ افضل ہے۔

محمد بن نصر نے "قیام اللیل" میں طاؤس کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ "میں مسجد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تھا تو انہوں نے لوگوں کی دھیمی دھیمی آواز سنی تو فرمایا یہ کیا ہے؟ کہا گیا کہ لوگ مسجد سے نکلے ہیں اور یہ رمضان کا واقعہ ہے' تو آپ نے فرمایا کہ بقیہ رات مجھے گزشتہ رات سے زیادہ محبوب ہے۔"

اور عکرمہ کے طریق سے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول اسی طرح مروی ہے۔

راوی کا قول کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "نعم البدعه" اور بعض روایات میں "نعمت البدعة" تاء کی زیادتی سے ہے' اور بدعت کی اصل یہ ہے کہ جو مثال سابق پر نہ ہو' اور شریعت میں اس کا اطلاق سنت کے مقابلہ میں ہوتا ہے اور وہ مذموم ہے' تحقیق اس بارے میں یہ ہے کہ اگر وہ شریعت میں مستحسن امر کے تحت داخل ہو تو حسنہ ہے' اور اگر قبیح کے امر کے تحت داخل ہو تو سیئہ' وگرنہ مباح کی

قسم ہے 'اور یہ احکام خمسہ کی طرف منقسم ہے۔ (فتح الباری: ۴/ ۳۱۹)

علامہ بدرالدین عینی شرح صحیح بخاری میں فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بدعت کہا کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لوگوں کے لیے سنت نہیں ٹھہرایا اور نہ زمانہ ابوبکر رضی اللہ عنہ میں ایسا تھا' اور اپنے قول "نعم" سے اس عمل میں ترغیب دلائی تاکہ اس کی فضیلت پر دال ہو اور یہ لقب (کلمہ بدعت) اس فعل سے مانع نہ ہو۔

بدعت دراصل ایک امر کو نیا عملی جامہ پہنانا ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہ ہو' پھر بدعت کی دو قسمیں ہیں' اگر وہ شریعت میں مستحسن امر کے تحت داخل ہے تو بدعت حسنہ' اور اگر شریعت میں کسی قبیح امر کے تحت مندرج ہو تو بدعت سیئہ۔ (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری: ۱۱/ ۱۲۶)

امام قسطلانی شرح صحیح بخاری میں فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب انہیں دیکھا تو فرمایا:

نعم البدعۃ ھذہ۔ یہ بدعت اچھی ہے۔

یعنی اسے بدعت کا نام دیا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے تراویح کا اجتماع مسنون نہیں ٹھہرایا تھا اور نہ ہی دور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں تھا' نہ شروع رات میں نہ کل رات میں اور نہ ہی یہ تعداد' اور بدعت کی پانچ قسمیں ہیں: واجبہ' مندوبہ' محرمہ' مکروہہ اور مباحہ۔ اور حدیث "ہر بدعت گمراہی ہے" عام مخصوص ہے' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس فعل کو "نعم البدعۃ" کہہ کر اس میں ترغیب دلائی اور یہ کلمہ جمیع محاسن کو شامل ہے جیسے بئس تمام قبائح کو شامل ہے اور رمضان کا قیام بدعت نہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اقتدوا بالذین من بعدی ابی بکر و عمر۔ میرے بعد ابوبکر و عمر کی اقتداء کرو۔

اور جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس پر اجماع

ہو گیا تو بدعت کا نام اس سے زائل ہو گیا۔(ارشاد الساری شرح صحیح البخاری : ۴/ ۶۵۷)

۴- دور فاروقی میں ترتیب تراویح

مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مردوں کے لیے دو امام مقرر کیے: ایک ابی بن کعب اور دوسرے تمیم داری' جو ایک دوسرے کی نیابت کا کام دیتے' جہاں ایک ختم کرتا دوسرا وہیں سے شروع کر لیتا' اور آپ رضی اللہ عنہ نے ایک عورتوں کا امام مقرر کیا: وہ سلیمان بن ابو حثمہ تھے' مردوں اور عورتوں کے امام ایک ہی وقت میں نماز پڑھاتے' ایک مردوں کو اور ایک عورتوں کو۔

نماز تراویح کی رکعات کی تعداد تدریجاً واقع ہوئی ہے' پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قراء کو حکم دیا کہ لوگوں کو وتر سمیت گیارہ رکعت پڑھائیں پھر تیرہ رکعت ہوئیں' پھر تراویح اٹھارہ رکعت اور وتر تین یا پانچ رکعت' پھر بیس رکعت تراویح پر امر مستقل ہو گیا اور اس کے بعد نماز وتر تین رکعت پڑھتے۔

اور قرات میں بھی ایسے ہی تدریج واقع ہوئی' ابتدا میں نماز تراویح کی قرات خاصی طویل ہوتی جو قرآن حکیم کی دو سو آیات پر مشتمل ہوتی' پھر قاری ہر رکعت میں پچاس یا ساٹھ آیات تلاوت کرتا' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ زیادہ سے زیادہ قرات تیس آیات' متوسط پچیس اور کم از کم بیس آیات ہو' لوگ مسجد سے نکلتے تو صبح ہونے کو ہوتی اور لوگ لاٹھیوں پر سہارا لیتے' لوگ جو تہائی رات سوتے اور پھر چھ تہائی رات قیام کرتے پھر سحری اور حوائج بشریہ میں مصروف ہو جاتے اور نماز جفت ہوتی' ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے' اور قاری آٹھ یا بارہ رکعت میں سورہ بقرہ کی تلاوت کیا کرتا تھا۔

نوٹ : مزید تحقیق کے لیے فضیلۃ الشیخ علامہ قاضی عطیہ سالم درنی کی کتاب "التراویح فی مسجد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم" ملاحظہ ہو۔

۵- تراویح میں ختم قرآن پر دعا کی ہیشگی

نماز تراویح میں پورا قرآن حکیم ختم کرنا اس کے بعد دعا کرنا بھی ایسا ہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا اور نہ پورا مہینہ جماعت کے ساتھ نماز تراویح پڑھی ہے اور نہ ہی اول رات میں نماز میں پورا قرآن پڑھا یعنی نماز تراویح میں اور نہ ہی آخر رات کی نماز میں پورا قرآن پڑھا یعنی تہجد میں' اور نہ ہی آپ ﷺ سے قرات قرآن کی اجزا میں اسی طرح تقسیم مروی ہے کہ تھوڑا تھوڑا قرآن اسی طرح پڑھا جائے کہ آخر ماہ میں قرآن ختم ہو جائے' یہ سب کچھ نہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے اور نہ ہی خلفائے راشدین سے' چہ جائیکہ انہوں نے اس پر ہیشگی اختیار کی ہو' یہی وجہ ہے کہ ان حضرات سے ختم کے وقت کوئی معتاد دعا منقول نہیں' لیکن بوقت قرآن دعا کی تائید میں بے شمار آثار وارد ہیں جو مطلقاً ختم قرآن کے بعد دعا کے جواز پر دال ہیں- چاہے ختم قرآن تراویح میں ہو یا کہیں اور' کوئی قید نہیں لہذا اصل دعا مشروع ہے اور اس کا ختم قرآن کی صورت سے متصف ہونا دعا کے جواز کی نفی نہیں کرتا۔

نوٹ: مزید تحقیق کے لیے شیخ عطیہ محمد سالم مدنی کی کتاب ''التراویح فی مسجد الرسول ﷺ'' ملاحظہ ہو- میں (مالکی) کہتا ہوں کہ ختم قرآن کے وقت اصل دعا جائز بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاقید ثابت ہے' نماز تراویح میں قرآن پر آخری رات دعا کا ہونا یا ۲۹ ویں یا ۲۷ ویں رات کو مواظبت کے ساتھ' اور دعائے نبی ﷺ پر الفاظ کا اضافہ کرنا' اور اسی طرح رکوع و قیام کو طویل کرنا اصل میں مشروعیت میں داخل ہے اور اس پر وہی حکم نافذ ہوتا ہے اگرچہ اس کی ہیئت' کیفیت اور صورت نئی ہو اس کو مبتدعہ کہیں یا محدثہ۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ کا بڑا شکر ہے کہ اس نے امور میں گنجائش رکھی ورنہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پاسبان علماء ان امور پر اسی بدعت کا حکم لگانے پر مجبور ہو جاتے جو ان کی نظر میں گمراہی ہے' والعیاذ باللہ- اور لامحالہ یہ امر اسی طرح

ہی ہے خصوصاً یہ کہ حرمین شریفین میں اسی پر عمل ہے' اور کبار ائمہ اس میں شریک ہوتے ہیں اور دور دراز گوشوں سے علمائے امت مسافت بعید عبور کر کے یہاں حاضر ہوتے ہیں۔

۶- جمعہ کی اذان اول

امام ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ جمعہ کی پہلی اذان بھی اسی موضوع سے متعلق ہے' لوگوں کی ضرورت کے پیش نظر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے زیادہ فرمایا اور قائم رکھا حتیٰ کہ تمام مسلمانوں کا عمل اسی پر جاری ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ "یہ بدعت ہے۔" اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی مراد وہی ہو جو ماہ رمضان کے قیام میں آپ کے والد کی مراد تھی۔ (جامع العلوم والحکم لابن رجب : ۵۸)

ہم کہتے ہیں کہ اس موضوع میں اصل وہ ہے جو امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں سائب بن یزید سے روایت کیا کہ

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ادوار میں جمعہ کی پہلی اذان اس وقت شروع ہوتی جب امام منبر پر بیٹھ جاتا' جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو لوگ زیادہ ہو گئے تو انہوں نے "زوراء"(۱) والوں کے لیے تیسری ندا زیادہ کر دی۔ اس کو تیسری اذان کا نام دیا گیا کیونکہ یہ اذان اول اور اقامت کی طرف منسوب ہے' اسے اول اس لیے کہا گیا کہ اس کا وقت اذان جمعہ سے پہلے ہے اور ثانی اس لیے کہ اقامت کا اعتبار ساقط ہو گیا۔"

ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ "جمعہ کی پہلی اذان بدعت ہے۔"

حافظ ابن حجر "فتح الباری" میں فرماتے ہیں: ہو سکتا ہے کہ آپ نے یہ انکار کے طور پر فرمایا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی مراد یہ ہو کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) زوراء مدینہ کے بازار میں ایک دار ہے۔

کے دور میں نہ تھی اور ہر امر جو نبی ﷺ کے دور میں نہ ہو' وہ بدعت سے موسوم ہے' لیکن اس میں سے بعض حسن ہیں اور بعض اس کے خلاف۔

(فتح الباری کتاب الجمعہ باب الاذان یوم الجمعہ: ۲/ ۵۰۱)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے قول "بدعہ" کی یہ توجیہ نہایت نفیس اور مخارج حسنہ سے متعلق ہے نیز نصوص شرعیہ کی روح کو لازم ہے' اور بہت مناسب ہے کہ نئے نئے جنم لینے والے ان کثیر امور پر یہی اصول جاری کیا جائے جو نافع اور مفید مصلحتوں کو عام طور پر شامل ہیں۔

۷- مقام ابراہیم علیہ السلام

رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں مقام ابراہیم بیت اللہ شریف سے متصل تھا حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پیچھے ہٹا دیا' امام بیہقی نے قوی سند کے ساتھ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ

ان المقام کان فی زمن النبی ﷺ وفی زمن ابی بکر ملتصقا بالبیت' ثم اخره عمر۔

مقام بیت اللہ سے متصل تھا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پیچھے ہٹا دیا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فعل کا نہ صحابہ نے انکار کیا اور نہ ہی بعد والوں نے تو یہ اجماع ہو گیا۔ نیز فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ اگرچہ یہ اپنی جگہ پر باقی رہے تو طواف کرنے اور نماز پڑھنے والوں پر اس سے تنگی اور حرج لازم آئے گا' تو اس کو ایسی جگہ پر رکھ دیا کہ حرج ختم ہو گیا اور اس کا وقار بحال رہا' کیونکہ یہ وہی مقام ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جائے نماز بنانے کا حکم فرمایا' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہی سب سے پہلے اس پر موجودہ حجرہ بنایا۔

(فتح الباری: ۸/ ۲۱۴-۲۱۵' دار الکتب العلمیہ)

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقام کو اس جگہ سے منتقل کیا جہاں وہ ابراہیم علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھا' کیونکہ اس کی تحویل میں انہوں نے مصلحت دیکھی اور اس پر حجرہ تعمیر کر دیا' اور کسی صحابی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فعل کا انکار نہیں کیا کیونکہ انہوں نے آپ کی طرح مصلحت کو جان لیا۔

۸- ایک شہر میں متعدد نماز جمعہ

ایک شہر میں نماز جمعہ کا متعدد مقامات پر ادا ہونا نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھا اور نہ ہی صحابہ کرام و تابعین رضی اللہ عنھم کے دور میں' اور بلاشبہ یہ بدعت حسنہ ہے جو حاجت اور ضرورت کے پیش نظر عمل میں آئی' کیونکہ تعمیرات کی وسعت اور آبادی کی کثرت کی وجہ سے ایک مسجد میں سب کا اجتماع مشکل ہو گیا اس لیے یہ بدعت حسنہ رائج ہوئی' اثرم کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے پوچھا: کیا ایک شہر میں دو جمعے ہو سکتے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے ایسا کرتے نہیں دیکھا اور امام بیہقی نے "المعرفہ" میں ابو داؤد کے طریق سے بکیر بن اشج رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ

مدینہ منورہ میں مسجد نبوی سمیت نو مساجد تھیں' اہل مدینہ بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سنتے تو اپنی اپنی مساجد میں نماز ادا کرتے' یحییٰ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ نماز جمعہ اپنی مساجد میں بالکل نہ پڑھتے تھے بلکہ فقط نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں پڑھتے تھے۔

یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے مگر "صحیح" کی یہ روایت اس کی شاہد ہے کہ گرد و نواح والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے' اور اسی طرح قبا والے' جیسا کہ اسے ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے روایت کیا۔ اور امام بیہقی نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ ذوالحلیفہ والے مدینہ منورہ میں جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ امام بیہقی کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ کی مساجد میں اقامت جمعہ کے لیے کسی کا کبھی بھی اذان دینا منقول نہیں اور نہ ہی ان بستیوں میں جو شہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہیں۔

ابن منذر کہتے ہیں کہ اس میں اختلاف نہیں کہ نماز جمعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کے دور میں اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں کہیں بھی ادا نہ ہوتی تھی مگر فقط مسجد نبوی ﷺ میں ادا ہوتی' اور جمعہ کے دن لوگوں کی مساجد فارغ رہتیں اور لوگ ایک مسجد میں جمع ہوتے' جو اس امر کو واضح کرتا ہے کہ جمعہ دیگر تمام نمازوں سے امتیازی اہتمام کا حامل ہے' اور اس کی ادائیگی صرف ایک جگہ پر ہوتی ہے' نیز کہتے ہیں کہ میں عطاء (ابن ابی رباح) کے سوا کسی کو نہیں جانتا جس نے ایک شہر میں متعدد جمعہ کا قول کیا ہو۔

اور داؤد ظاہری' ابن حزم اور ابن عربی معافری کا بھی متعدد جمعہ کے بارے قول ملتا ہے' اور بلاد اسلامیہ میں تعدد جمع کا مستقل عمل ہے' کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ بدعت اور گمراہی ہے اور جنہوں نے اسے جائز قرار دیا ہے وہ مبتدع اور گمراہ ہیں (والعیاذ باللہ) کیونکہ یہ ایک فقہی فرع ہے اور اس میں اپنے اپنے پیش نظر دلائل کی رو سے علماء کی تحقیقات مختلف ہیں۔

۹- یوم عرفہ کو شہر سے باہر نکلنا

یہ وہ اجتماع ہے جو عرفات کے بغیر "تعریف" کے نام سے موسوم ہے جیسا کہ بعض شہروں والے یوم عرفہ کو عصر کے بعد کرتے ہیں اور اسے اہل عرفہ سے مشابہ بناتے ہیں' تلاوت قرآن کرتے ہیں اور اللہ جل شانہ سے دعا کرتے ہیں' حالانکہ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اور نہ ہی آپ ﷺ کے دور میں کسی صحابی نے ایسا کیا اور نہ ہی بعد میں کسی صحابی نے' مگر وہ جو حافظ بیہقی نے "السنن الکبریٰ" میں قتادہ کے طریق سے حسن روایت کیا کہ

اول من صنع ذلک ابن عباس۔	سب سے پہلے اسے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کیا۔

اور بیہقی نے ابو عوانہ سے روایت کیا ہے کہ

رایت الحسن البصری یوم	میں نے حسن بصری کو دیکھا کہ آپ

عرفة بعد العصر جلس فدعا وذكر الله عز و جل فاجتمع الناس-	عرفہ کے دن عصر کے بعد بیٹھ جاتے' دعا کرتے اور اللہ عزوجل کاذکر کرتے تو لوگ اکٹھے ہو جاتے۔

اور ایک روایت میں یوں ہے کہ

رايت الحسن خرج يوم عرفة من المقصوره بعد العصر فعرف-	میں نے حسن کو دیکھا کہ وہ عرفہ کے دن عصر کے بعد حجرہ سے نکلتے اور "تعریف" کرتے۔

اثرم فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

ارجوانه لاباس به-	مجھے امید ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔

اس کو بیشتر لوگ کرتے ہیں "حسن' بکر' ثابت اور محمد بن واسع' عرفہ کے دن مسجد میں حاضر ہوا کرتے تھے۔"

امام نووی رحمتہ اللہ علیہ "المجموع" میں فرماتے ہیں کہ اس میں اسلاف کا اختلاف ہے۔ کئی لوگوں نے مکروہ سمجھا ہے جن میں ابن عمر کے غلام نافع' ابراہیم نخعی' حکم' حماد اور مالک بن انس وغیرہم کے اسماء سرفہرست ہیں۔

امام ابو بکر طرطوشی مالکی زاہد نے "بدعت منکرہ" کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے اس "تعریف" پر ایک فصل لکھی اور اس کے انکار میں بہت مبالغہ کیا' اور اس بارے میں علماء کے اقوال نقل کیے' بلاشبہ جس کسی نے اسے بدعت بتایا ہے اس نے بدعت کے فاحشات اس سے لاحق نہیں کیے بلکہ مسئلہ میں تخفیف کی ہے۔ (المجموع شرح المہذب : ۸/ ۱۳۹-۱۴۰)

۱۰- مساجد میں نماز عید

مساجد میں نماز عید کا مسئلہ ' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عید کی نماز صحراء میں پڑھتے تھے نہ کہ مسجد میں جیسا کہ آج حال ہے ' سب سے پہلے جس نے مسجد میں نماز عید پڑھائی وہ حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ ہیں ' مروی ہے کہ انہوں نے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا کہ کمزور لوگوں کو وہ مسجد میں نماز پڑھائیں۔

ابن مفلح کہتے ہیں کہ صحراء افضل ہے ' حنبل سے منقول ہے کہ عید میں صحراء کی طرف نکلنا افضل ہے مگر ضعیف یا مریض۔ ابو عبد اللہ ہمیشہ صحراء کی طرف نکلتے ' حتیٰ کہ ضعیف ہو گئے ' اور اکثر نے بلا عذر نکلنے کو مکروہ سمجھا ہے اور افضل نہیں جانا اگرچہ ان کی مسجد میں گنجائش ہو بلکہ اہل مکہ کعبہ کے معاینہ کے لیے مستثنیٰ ہیں۔

۱۱- قبر کے پاس میت پر قرات

قبر پر اور مقبرہ میں قرات کا مسئلہ ' کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں کیا اور نہ ہی خلفائے راشدین میں سے کسی سے منقول ہے۔

ابن مفلح کہتے ہیں کہ قبر پر اور مقبرہ میں قرات مکروہ نہیں ' اس پر نص ہے اور اسے ابو بکر ' قاضی اور ایک جماعت نے اختیار کیا ' یہی مذہب ہے اور اسی پر مشائخ حنفیہ کا عمل ہے ' البتہ بعض نے مباح اور بعض نے مستحب کہا۔ ابن تمیم نے کہا کہ اس پر نص ہے جیسے سلام ' ذکر ' دعا اور استغفار۔۔۔

یہاں تک کہ کہا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح ثابت ہے کہ انہوں نے وصیت کی جب دفن کر لیں تو ان کے پاس سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی آخرت آیات کی قرات کی جائے ' یہی وجہ ہے کہ امام احمد نے کراہت سے رجوع کر لیا ' خلال اور ان کے صاحب نے کہا کہ ایک روایت ہی مذہب ہے کہ یہ مکروہ نہیں۔

(الفروع: ۲/ ۳۰۴)

نوٹ: ہم نے اس بحث میں ایک مستقل رسالہ بعنوان "تحقیق الامال" لکھا ہے، تحقیق کے لیے اسے ملاحظہ کیجئے۔

محفل میلاد النبی ﷺ

مولد نبوی شریف کے ذکر کی نورانی محفل ایک ایسا موضوع ہے جو بحث کا بہت وسیع محل ہے اور قبول ورد کا بہت بڑا میدان ہے جو ہر سال مستقل اور متجدد ہے۔

ماہ ربیع الاول کا ہلال مسعود نظر آتے ہی بعض منبروں سے حرارت و غضب سے بھرپور چیخ و پکار سنائی دینے لگتی ہے اور کئی جرائد و رسالے دین کی حمایت اور غیرت کی آگ سے مشتعل ہو جاتے ہیں اور اعلان یہ ہوتا ہے کہ میلاد اور محفل میلاد قبیح بدعت ہے اور بہت بڑی برائی ہے۔ اس دعویٰ سے کہ سلف صالحین نے یہ عمل نہیں کیا، اگر اس میں کوئی بھلائی ہوتی تو وہ اسے ترک نہ کرتے، لہذا یہ بدعت گراہی ہے۔ (اسی طرح کے کلمات کہتے رہتے ہیں)

اور بعض حضرات ان مخالفات اور منکرات کو اس موضوع میں شامل کر لیتے ہیں جو بعض اجتماعات میں واقع ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ مولد شریف کا ہی خاصہ نہیں بلکہ اجتماع اور محفل میں عوام کی جہالت کے سبب واقع ہوتے ہیں اور یہ حضرات انہیں اس طرح متعلقہ موضوع میں شامل کر لیتے ہیں کہ نیک اور صالح عمل کو فاسد اور ردی عمل کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں تاکہ اس پر انکار کی وجہ صحیح ہو سکے۔

قبل ازیں کہ ہم اس مسئلہ کو واضح کریں اور اس کے حکم کی حقیقت میں نظر کریں، ضروری ہے کہ ہم دانشور منصفین سے یہ دریافت کرلیں کہ یہ محافل اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ کیونکہ شے کا حکم شے کے تصور کی فرع ہے۔

جواب وہی ہے واقعہ اور مشاہدہ جس کا گواہ ہے۔ وہ یہ کہ بقدر آسانی قرات قرآن کے سماع پر اجتماع، امر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبداء میں اخبار واردہ کی قرات

اور ان علامات کی جو بوقت ولادت باسعادت وقوع پذیر ہوئیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و شان کی تعظیم کے لیے شمائل کریمہ کی قرات' مولد شریف پر مبارک باد اور خوشی و مسرت کا اظہار' پھر واعظ کو سننا جو لوگوں کو وعظ و ہدایت کی تعلیم دے اور انہیں دیگر خیر و بھلائی کے امور کی نصیحت کرے' یا اس کا بیان علمی اور نفع بخش درس پر مبنی ہو یا مفید اسلامی شہریت کے اصولوں پر' یا نہایت عمدہ قصیدہ شعریہ ہو جو اسلام اور نبی اسلام اور محاسن دین کی مدح میں ہو' پھر لوگوں کو کھانا پیش کرنا ہو کہ وہ کھائیں اور چلے جائیں۔ حالانکہ یہ شرط نہیں بلکہ کھانا کھلانے میں محض آنے والوں کا اکرام و احترام ہے جو کہ اسلام کی بہترین خصلت اور ایمان کا اعلیٰ شعبہ ہے جس پر سب کا اتفاق ہے۔

اللہ کی قسم دے کر پوچھتے ہیں کہ اس میں کیا برائی ہے؟ اس میں کون سی گمراہی ہے؟

ہاں' جو منکرات اور مخالفات اس عمل میں داخل ہو جائیں' وہ مولد شریف کے خاص نہیں بلکہ ہر دینی اور روحانی اجتماع میں جہلاء سے عادتاً واقع ہوتی ہیں۔ مثلاً جمعہ' عید' طواف' سعی' عرفات اور رمی جمار کے وقت اجتماعات میں جو امور ایسے رونما ہوتے ہیں جو کثرت ہجوم اور وقت و جگہ کی تنگی کا تقاضا ہیں۔ پس جو مخالفات عوام کی جہالت کے سبب سے واقع ہوں چاہے قصداً ہوں یا بغیر قصد کے تو وہ بہر صورت باطل اور مردود ہیں جس کا انکار ضروری ہے' اور یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں داخل ہے۔ اس حیثیت سے کہ اس کا مولد سے کوئی تعلق نہیں نہ احتفال سے۔

لہذا یہ الگ موضوع ہے اور وہ الگ۔ اب ہمارا کلام محفل میلاد کے بارے میں ہے۔ محض اس حیثیت سے کہ وہ سیرت نبویہ پر احتفال اور اجتماع ہے۔ اور ہر حالت کا اپنا اعتبار ہے اور منکر کا انکار بھی اسی قدر ہی ہونا چاہیے جو غلو یا جھگڑا اور فساد یا

حقائق کو خلط ملط کرنا یا عوام پر مسئلہ کو مشتبہ کر دینے سے پاک ہو۔

اب اس مقدمہ کے بعد ہمارا یہ کہنا صحیح ہو گا کہ جو مولد نبوی کی محفل و اجتماع کا انکار کرے یا مولد اور سیرت نبویہ کے اجتماع کا انکار کرے' چاہے ربیع الاول میں ہو یا غیر میں' تو جو بھی یہ انکار اس دعویٰ سے کرے کہ اسلاف نے اسے نہیں کیا تو لامحالہ وہ صحرائے جہالت کا جاسوس ہے۔ کیونکہ سلف صالحین کا یہ نہ کرنا دلیل نہیں بلکہ یہ عدم دلیل ہے اور یہ آنکھوں میں مٹی ڈالنے کے مترادف ہے۔ ہاں البتہ اس کے ممنوع یا منکر پر دلیل تب قائم ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں اس سے منع فرمایا ہو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت صحیحہ میں اس سے ممانعت فرمائی ہو۔

شیخ الاسلام حافظ العصر ابو الفضل ابن حجر سے محفل میلاد کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ دراصل عمل مولد بدعت ہے۔ یہ قرون ثلاثہ کے سلف صالحین میں سے کسی سے بھی منقول نہیں لیکن اس کے باوجود یہ محاسن اور قبائح پر مشتمل ہے۔ جو اس عمل میں محاسن کی کوشش کرے اور قبائح سے اجتناب کرے' تو یہ بدعت حسنہ ہے۔ پھر حافظ فرماتے ہیں کہ اس عمل کی تخریج کی ایک اصل میرے سامنے آئی ہے جو صحیحین میں ثابت ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودیوں کو دیکھا کہ وہ یوم عاشورا کا روزہ رکھتے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی۔ تو ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ تو اس سے یہ مسئلہ حاصل ہوتا ہے کہ جس معین دن میں اللہ تعالیٰ کوئی نعمت عطا فرمائے یا مصیبت دور کرے تو اس دن اللہ تعالیٰ کا عملاً شکر ادا کیا جائے۔ اور یہی مثال ہر سال لوٹ آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر طرح طرح کی عبادات سے ہو سکتا ہے۔ جیسے سجدہ' روزہ' صدقہ اور تلاوت اور اس دن نبی کریم جناب رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی نعمت سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہو

سکتی ہے؟ اور اس قاعدہ پر تو ضروری ہے کہ اس دن خوب کوشش کی جائے حتی کہ یوم عاشورا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے مطابقت ہو جائے اور جو اس کا لحاظ نہ کرے تو اسے مہینے کے کسی دن بھی عمل مولد سے واسطہ نہیں' بلکہ لوگ انتظار کرتے ہیں اور انہوں نے سال کے ایک دن میں اس عمل کو متعین کیا ہے اور اس میں حسب استطاعت عمل خیر کرتے ہیں تو یہ بحث اس عمل کی اصل سے متعلق ہے۔

(حافظ ابن حجر' امام جلال الدین سیوطی فی حسن المقصد)

حافظ ابن حجر کا یہ کہنا کہ "عمل مولد دراصل بدعت ہے....." اس کا معنی بدعت لغویہ ہے یعنی نیا امر ہے اور قواعد شرعیہ سے خارج نہیں۔ جس پر واضح دلیل ان کا یہ بعد والا قول ہے کہ "یہ بدعت حسنہ ہے" بے شک محققین نے بدعت کو حسنہ اور سیئہ میں تقسیم کیا ہے۔

رہی بدعت شرعیہ تو اس کی تقسیم نہیں۔ وہ سیئہ ہی ہے۔ عمل مولد کے ساتھ ایسے امور ملا دینا جو شرع شریف کے مخالف ہوں تو اس کی ممانعت غیر کے سبب ہو گی نہ کہ ذات کے سبب۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر کے آخری کلام سے واضح ہے۔

محفل میلاد النبی ﷺ کے جواز پر دلائل

محفل میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواز پر مندرجہ ذیل دلائل ہیں:

(ا) میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل دراصل مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر خوشی و مسرت سے تعبیر ہے۔ جس سے کافر کو بھی نفع ہوا۔

عنقریب دلیل نمبر۹ میں اس مسئلہ کا مزید بیان آئے گا کیونکہ دلیل کی اصل ایک ہے۔ اگرچہ استدلال کی کیفیت مختلف ہے۔ ہم نے اسی طریقے پر یہ بحث شروع کی ہے لہٰذا تکرار نہیں۔

صحیح بخاری میں وارد ہے کہ ہر پیر کو ابو لہب سے عذاب ہلکا کر دیا جاتا ہے کیونکہ اس نے اپنی لونڈی ثویبہ کو آزاد کر دیا تھا جب اس نے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی

ولادت باسعادت کی اسے خوشخبری سنائی۔

اس بارے میں حافظ شمس الدین محمد بن ناصرالدین دمشقی کا یہ کلام قابل توجہ ہے۔

اذا کان ھذا کافرا جاء ذمه
بتبت یداه فی الجحیم مخلدا

"جب یہ کافر ہمیشہ جہنمی ہے جس کی مذمت میں تبت یداہ (اس کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوں) نازل ہوئی۔"

اتی انه فی یوم الاثنین دائما
یخفف عنه للسرور باحمدا

"وارد ہے کہ ہمیشہ پیر کے دن اس کے عذاب میں تخفیف کی جاتی ہے اس لیے کہ اس نے حضرت محمد ﷺ کی تشریف آوری پر خوشی کا اظہار کیا۔"

فما الظن بالعبد الذی طول عمده
باحمد مسرورا و مات موحدا

"تو کیا خیال ہے اس شخص کے بارے میں جو اپنی تمام عمر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر خوشی و مسرت کا اظہار کرتا رہا اور عقیدہ توحید پر ہی اس کی زندگی کا اختتام ہوا۔"

اس واقعہ کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب النکاح میں بطور تعلیق روایت کیا ہے اور ان ائمہ نے بھی اسے نقل کیا۔

حافظ ابن حجر "الفتح" میں، امام عبدالرزاق صنعانی نے "المصنف: ۷/ ۴۷۸" میں، حافظ بیہقی نے "الدلائل" میں، ابن کثیر نے "السیرۃ النبویہ من البدایہ: ۱/ ۲۲۴" میں، ابن دیبع شیبانی نے "حدائق الانوار: ۱/ ۱۳۴" میں، حافظ

بغوی نے "شرح السنہ: ۹/ ۷۶" میں 'ابن ہشام اور سہیلی نے "الروض الانف: ۵/ ۱۹۲" میں اور عامری نے "بجہ المحافل: ۱/ ۴۱" میں۔

یہ روایت اگرچہ مرسل ہے مگر مقبول اس لیے ہے کہ امام بخاری نے اسے نقل کیا اور حفاظ علماء نے اس پر اعتماد کیا۔ اور اس لیے بھی کہ یہ مناقب و محاسن میں ہے نہ کہ حلال و حرام میں۔ اور طالب علم بھی مناقب اور احکام کے درمیان حدیث کے استدلال میں جو فرق ہوتا ہے اسے خوب جانتے ہیں۔ رہا کفار کو اپنے اعمال کا نفع حاصل ہونا تو اس میں علماء کے درمیان طویل گفتگو ہے' جس کا یہ محل نہیں۔ اور اس مسئلہ میں اصل وہ ہے جو صحیح بخاری میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی استدعاء سے ابو طالب کے عذاب میں تخفیف ہوئی۔

(۲) حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اپنے یوم ولادت کی تعظیم کیا کرتے تھے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کبریٰ کا شکریہ ادا کرتے تھے کہ اس نے اس وجود مسعود سے یہ شان بخشی کہ ہر موجود باسعادت ہوا۔ اور اس تعظیم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزے سے تعبیر کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیر کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فیه ولدت وفیه انزل علی۔ — اسی دن میری ولادت ہوئی اور اسی دن مجھ پر وحی نازل ہوئی۔

(صحیح مسلم 'کتاب الصیام)

محفل میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معنیٰ ہے مگر صورت مختلف ہے۔ لیکن معنی موجود ہے۔ چاہے وہ روزے کی شکل میں ہو یا کھانا کھلانے کی صورت میں یا ذکر کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کی صورت میں یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل شریفہ سننے کی صورت میں۔

حضور پر نور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر اظہار

مسرت امر قرآن سے مطلوب ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (یونس: ۵۸)

تم فرماؤ اللہ ہی کے فضل اور اسی کی رحمت اور اس پر چاہیے کہ خوشی کریں۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم رحمت پر اظہار مسرت کریں اور لامحالہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سب سے بڑی رحمت ہے۔ جیساکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء: ۱۰۷)

اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے۔

حبر الامہ ترجمان القرآن امام ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔ چنانچہ اس آیت کے بارے میں ابو الشیخ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کا فضل علم ہے اور اس کی رحمت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔(الدر المنثور: ۳/۳۰۸)

تو اس سے فرح و شادمانی ہر وقت اور ہر نعمت و فضل کے وقت مطلوب ہے لیکن ہر پیر کے دن اس کی زیادہ تاکید ہے اور ہر سال ماہ ربیع الاول میں اس سے بھی بڑھ کر تاکید ہے کیونکہ مناسبت کی قوت اور وقت کے لحاظ کا تقاضا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس عظیم مناسبت اور وقت کے لحاظ سے کوئی بھی غافل نہیں رہتا مگر نادان اور احمق۔

(۴) بے شک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان حوادث دینیہ عظمٰی کے ساتھ وقت کے ارتباط کا لحاظ فرمایا کرتے تھے۔ جو حوادثات گزر گئے تو جب ان کا وہ وقت آتا جس میں وہ وقوع پذیر ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں یاد دلاتے اور اس دن کی تعظیم کرتے کیونکہ وہ اس واقعہ کا ظرف ہے۔

خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس اس قاعدہ کی بنیاد رکھی

جیساکہ صحیح حدیث میں صراحت کے ساتھ وارد ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودیوں کو دیکھا کہ وہ یوم عاشورا کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وجہ دریافت کی تو عرض کیا گیا کہ وہ اس دن روزہ رکھتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی کو نجات دی اور ان کے دشمن کو غرق کیا تو وہ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے روزہ رکھتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

نحن اولی بموسی منکم۔ — ہم تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام کے حق دار ہیں۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس دن کا روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

(۵) بلاشبہ میلاد شریف مسلمانوں کو درود و سلام پر برانگیختہ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اس فرمان سے مطلوب ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ — بے شک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس غیب بتانے والے (نبی) پر اے ایمان والو ان پر درود اور خوب سلام بھیجو۔ (الاحزاب: ۵٦)

اور جو چیز ایک مطلوب شرعی پر ابھارے تو وہ خود شرعاً مطلوب ہوتی ہے۔ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے سے کس قدر فوائد نبویہ اور امدادات محمدیہ حاصل ہوتی ہیں کہ جن کے آثار اور مظاہر انوار کی تعداد سے عاجز ہو کر قلم بھی محراب بیان میں سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔

(٦) بلاشبہ میلاد شریف کی محفل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت، معجزات اور سیرت کے ذکر پر مشتمل ہوتی ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ

میں تعریفی کلمات پیش کرنا ہوتے ہیں۔ کیا ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت پر مامور نہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کا ہم سے مطالبہ نہیں کیا گیا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال شریفہ کو بنیاد بنانا' معجزات پر ایمان لانا اور علامات کی تصدیق کرنا مقصود ہوتا ہے اور میلاد کی تمام کتابیں اسی معنی مقصود کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔

(۷) ہمیں ان امور کو ضرور سرانجام دینا چاہیے جو ہم پر واجب ہیں۔ مثلاً اس سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کاملہ اور اخلاق فاضلہ کا بیان اور شعراء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں قصائد لکھتے اور پڑھتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس عمل سے راضی ہوتے اور انہیں تحائف عطا فرماتے تو جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مدح کرنے والے سے راضی ہوتے ہیں تو اس پر کیونکر نہ راضی ہوتے ہوں گے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل شریفہ کو جمع کرتا ہے۔ اس عمل میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ قرب ہے اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و رضا کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔

(۸) بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل اور معجزات کی معرفت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل ایمان اور زیادہ محبت کی داعی ہے۔ کیونکہ انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ صورت و سیرت' علم و عمل اور حال و اعتقاد کے اعتبار سے خوب سے خوب تر سے محبت کرتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و شمائل سے بڑھ کر کوئی افضل اور اکمل ہے نہ اجمل۔ زیادہ محبت اور کمال ایمان دونوں امر شرعاً مطلوب ہیں اور محفل میلاد ان دونوں کی علمبردار ہے جو کہ مطلوب ہے۔

(۹) بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم مشروع ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم میلاد کی خوشی و مسرت کا اظہار' دعوتوں کا اہتمام' ذکر کا اجتماع اور فقراء کا احترام تعظیم اور فرحت و شادمانی کے واضح مظہر ہیں اور اللہ تعالیٰ کے شکر کی بجا آوری

ہے۔ اس بات پر کہ اس نے ہمیں اپنے دین متین کی ہدایت دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کی نعمت عظمیٰ کا ہم پر احسان کیا۔

(۱۰) حضور سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم جمعہ کی فضیلت میں اس کی ایک خصوصیت یہ بیان فرمائی کہ:

وفیہ خلق آدم۔ اس میں آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔

معلوم ہوا کہ جس وقت میں کسی نبی کی بھی ولادت ہوا سے شرافت و عظمت حاصل ہے۔ تو اس دن کے شرف و قدر کا کیا اندازہ ہو گا جس میں افضل النبیین اشرف المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔

یاد رہے کہ یہ تعظیم اس دن سے خاص نہیں بلکہ اس معین دن کی خصوصیت ہے۔ ویسے یہ عام ہے کہ جتنا بھی اس کا تکرار ہو' جیسا کہ یوم جمعہ کا حال ہے' جو نعمت کا شکر' خاصہ نبوت کا اظہار' اور ان عظیم تاریخی واقعات کو زندہ کرنا ہے جو تاریخ انسانی میں اہم ہیں اور زمانے کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ جیسا کہ کسی بھی نبی کی جائے ولادت کی تعظیم اس حدیث سے ماخوذ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت لحم میں دو رکعت نماز پڑھنے کو کہا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ:

اتدری این صلیت؟ قال: لا۔ کیا تم جانتے ہو کہ کہاں تم نے نماز پڑھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔

تو جبریل علیہ السلام نے کہا کہ:

صلیت ببیت لحم حیث ولد عیسی۔ آپ نے بیت لحم میں نماز پڑھی جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی۔

جیسا کہ شداد بن اوس کی حدیث میں وارد ہے۔ جسے بزار' ابو یعلی اور امام طبرانی نے روایت کیا ہے۔ حافظ ہیثمی کہتے ہیں کہ اس حدیث کے رجال صحیح کے

رجال ہیں۔(مجمع الزوائد: ۱/ ۴۷)

اور اس روایت کو شیخ الاسلام حافظ ابن حجر نے (فتح الباری: ۷/ ۱۹۹) میں نقل کیا ہے اور اس سے سکوت فرمایا۔

(۱۱) بلاشبہ محفل میلاد ایک مستحسن امر ہے۔ جسے تمام بلاد اسلامیہ میں علماء اور مسلمان استحسان کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہر خطے میں اس پر عمل جاری ہے اور یہی شرعاً مطلوب ہے' اس کی اصل اور بنیاد وہ قاعدہ ہے جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ماخوذ ہے کہ:

ماراہ المسلمون حسنا فھو عند اللّٰہ حسن وما راہ المسلمون قبیحا فھو عند اللہ قبیح۔	جسے مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے اور جسے مسلمان برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی برا ہے۔ (رواہ احمد فی مسندہ:۳۷۹/۱)

(۱۲) بے شک میلاد شریف جن امور پر مشتمل ہے وہ سنت ہیں۔ مثلاً اجتماع' ذکر' صدقہ' نعت گوئی اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم۔ اور یہ امور شرعاً مطلوب اور قابل قدر ہیں۔ جن پر ترغیب دلانے کے لیے آثار صحیحہ وارد ہیں۔

(۱۳) اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد گرامی ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ۔	اور سب کچھ ہم تمہیں رسولوں کی خبریں سناتے ہیں جس سے تمہارا دل ٹھہرائیں۔ (ھود: ۱۲۰)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسل عظام علیہم السلام کی اخبار بیان کرنے میں حکمت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب انور کو اطمینان اور پختگی حاصل رہے تو بلاشبہ ہم آج آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہیں زیادہ اس امر کے محتاج ہیں کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات وواقعات سے اپنے دلوں کو ثابت رکھیں۔

(۱۴) معاملہ ایسا نہیں کہ ہر وہ کام جسے سلف نے نہیں کیا اور نہ ہی وہ قرن اول میں تھا تو وہ بدعت منکرہ اور سیئہ ہو' اور اس کا انکار واجب ہو بلکہ ایسے امر کو ادلہ شرعیہ پر پرکھنا ضروری ہے' پھر دیکھا جائے جو امر کسی مصلحت پر مشتمل ہے تو وہ واجب ہے' اور جو محرم ہو تو وہ حرام اور جو مکروہ ہو تو وہ مکروہ اور جو مباح ہو تو وہ مباح۔ اور جو مندوب ہو تو وہ مندوب۔ اور مقاصد کا حکم ہی وسائل وذرائع کا حکم ہوتا ہے۔ پھر علماء نے بدعت کی پانچ اقسام بیان کی ہیں:

۱- واجبہ: جیسے کج رو لوگوں کا رد اور علم نحو کا حصول۔

۲- مندوبہ: جیسے پلوں اور مدارس کی تعمیر۔ میناروں پر اذان اور وہ نیکی کرنا جو قرن اول میں نہ تھی۔

۳- مکروہ حصہ: جیسے مساجد اور قرآن پاک کا مزین کرنا۔

۴- مباحہ: جیسے چھلنی کا استعمال اور کھانے پینے میں وسعت۔

۵- وہ نئے امور جو سنت مطہرہ کے خلاف ہوں اور ادلہ شرعیہ عامہ اسے شامل نہ ہو۔ نیز وہ کسی شرعی مصلحت پر مشتمل نہ ہو۔

(۱۵) ہر بدعت محرمہ نہیں۔ کیونکہ اگر واقعی امر ایسا ہو تو حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا قرآن جمع کرنا اور مصاحف میں لکھنا بھی حرام ٹھہرے گا جو انہوں نے قراء صحابہ رضی اللہ عنہم کی موت کے سبب ضیاع قرآن کے خدشہ سے اقدام کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا لوگوں کو نماز تراویح میں ایک امام کی اقتداء میں جمع کرنا بھی حرام ٹھہرے گا باوجودیکہ ان کا فرمان ہے: نعمت البدعة هذه (یہ اچھی بدعت ہے)' نیز جمیع علوم نافعہ کی تصنیف بھی حرام ہونے سے بچ نہیں سکے گی اور ہم پر واجب ہے کہ ہم کفار سے نیزوں اور تیروں سے جنگ کریں حالانکہ ہمارے پاس بندوقیں' توپیں' ٹینک' فضائی جنگی طیارے اور بحری بیڑے ہیں جو بالکل جدید آلات

ہیں اور اسی طرح میناروں پر اذان' پلوں اور مدارس کی تعمیر' ہسپتال' یتیم خانہ اور قید خانہ کی تعمیریں بھی اس حد سے خارج نہ ہوں گی۔ اس لیے علمائے اسلام رضی اللہ عنہم نے حدیث کل بدعۃ ضلالۃ (ہر بدعت گمراہی ہے) میں بدعت کو بدعت سیئہ سے مقید کیا ہے اور اس قید کی تصریح اکابر صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم سے ان نئے امور کے بارے وارد ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھے اور آج ہم نے بھی بیشتر ایسے نئے مسائل پیدا کر لیے ہیں جن کو اسلاف نے نہیں کیا۔ مثلاً پچھلی رات نماز تراویح کے بعد نماز تہجد باجماعت ادا کرنا' اس میں قرآن پاک ختم کرنا' اس میں ختم قرآن کی دعا پڑھنا اور ستائیسویں کی رات امام کا نماز تہجد میں خطبہ (۱) دینا اور اسی طرح ہی منادی کا یہ آواز دینا کہ نماز قائم ہونے والی ہے' اللہ تعالیٰ اجر دے' یہ تمام امور ایسے ہیں جن کو نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور نہ ہی اسلاف میں سے کسی نے۔ تو کیا ہمارا یہ فعل بدعت ہو گا......؟ ہرگز نہیں' اس لیے کہ وہ ادلہ شرعیہ کے تحت داخل ہے جیسا کہ بحث پہلے گزر گئی۔

(۱۶) محفل میلاد اگرچہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ ہونے کی وجہ سے بدعت ہے' لیکن بدعت حسنہ ہے اس لیے کہ یہ ادلہ شرعیہ اور قواعد کلیہ کے تحت داخل ہے۔ یاد رہے کہ یہ ہیئت اجتماعیہ کے اعتبار سے بدعت ہے نہ کہ اپنے افراد کے اعتبار سے۔ کیونکہ اس کے افراد عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھے۔ جیسا کہ دلیل نمبر ۱۲ میں واضح ہوا۔

(۱۷) تمام وہ امور جو ہیئت اجتماعیہ کے ساتھ قرن اول میں نہ تھے' لیکن ان کے افراد موجود تھے تو وہ شرعاً مطلوب ہوتے ہیں کیونکہ جو امر مشروع سے مرکب ہو تو اس

(۱) یہ عمل حرمین شریفین میں چند سال جاری رہا پھر انہوں نے اسے ترک کر دیا۔ اگرچہ انہوں نے اسے ترک کر دیا لیکن یہ متصور نہ ہو گا کہ جب انہوں نے کیا اس وقت اچھا کام تھا پھر وہ گمراہی بن گیا۔ جب انہوں نے ترک کر دیا' یا پہلے وہ معروف تھا پھر منکر ہو گیا۔ عقلاء کے نزدیک ایسے فلسفے کا نہ کبھی امکان ہو سکتا ہے اور نہ ہی تصور۔

کا بھی مشروع ہونا مخفی نہ رہا۔

(۱۸) حضرت امام شافعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو نیا امر کتاب و سنت اور اجماع و نقل کے خلاف ہو تو وہ بدعت ضالہ ہے اور جو نیا امر بھلائی پر مبنی ہے اور اصول شرعیہ کے خلاف نہ ہو تو وہ محمودہ ہے۔

امام عزبن عبد السلام' امام نووی اور علامہ ابن اثیر نے بھی بدعت کی یہی تقسیم کی ہے جیساکہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔

(۱۹) ہر وہ نیکی جسے ادلہ شرعیہ شامل ہوں اور اس کی ایجاد سے شریعت کی مخالفت لازم نہ آئے اور نہ ہی وہ کسی برائی کو شامل ہو تو بلاشبہ وہ دین سے ہے۔

اور کسی متعصب کا یہ کہنا کہ اسے سلف نے نہیں کیا تو یہ اس کی دلیل نہیں بلکہ یہ عدم دلیل ہے۔ جیساکہ علم اصول کے ماہر پر مخفی نہیں۔ لہٰذا حضرت شارع علیہ السلام نے بدعت ہدیٰ کو سنت کا نام دیا اور اس کے فاعل سے اجر کا وعدہ کیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من سن فی الاسلام سنۃ حسنۃ فعمل بھا بعدہ کتب لہ مثل اجر من عمل بھا ولا ینقص من اجورھم شیئی۔

جس نے اسلام میں اچھا طریقہ رائج کیا' اور اس کے بعد اس پر عمل کیا گیا تو اس کے لیے اتنا ہی اجر لکھا جائے گا جتنا اس پر عمل کرنے والوں کے لیے اور ان کے اجر و ثواب میں کچھ کمی نہ کی جائے گی۔

(۲۰) محفل میلاد دراصل مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر اور پند و نصائح کو زندہ کرنا ہے جو ہمارے نزدیک اسلام میں جائز ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ اکثر اعمال حج واقعات مشہورہ اور مقامات محمودہ کا زندہ کرنا ہی ہے۔ مثلاً صفا و مروہ کے درمیان سعی' رمی جمار اور منیٰ میں ذبح' یہ سارے سابقہ واقعات ہیں لیکن مسلمان ان کی یاد کو فی الواقع نئی صورتوں کے ساتھ زندہ کرتے ہیں اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ جل شانہ کا یہ

ارشاد گرامی ہے:

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ۔　اور لوگوں میں حج کی عام ندا کر دے۔

(الحج: ۲۷)

اور اللہ تعالیٰ و سبحانہ کا یہ ارشاد جو حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما الاسلام سے حکایت ہے:

وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا۔(البقرۃ: ۱۲۸)　اور ہمیں اپنی عبادت کے قاعدے بتا۔

(۲۱) وہ جمیع وجوہات جو ہم نے محافل میلاد شریف کے جواز میں پہلے پیش کی ہیں' بلاشبہ وہ ان محافل کے بارے میں ہیں جو ایسی منکرات مذمومہ سے خالی ہوں جن پر انکار واجب ہے۔ اور جب مولد شریف ایسے امر پر مشتمل ہو جس پر انکار ضروری ہے مثلاً مردوں کا عورتوں سے اختلاط' محرمات کا ارتکاب اور فضول خرچی کی ایسی کثرت جس پر صاحب میلاد شریف صلی اللہ علیہ وسلم راضی نہ ہوں تو اس وقت ان محرمات اور منکرات پر انکار ضروری ہے۔ جیسے دیگر منکرات پر جو ہر دینی جائز اجتماع میں رونما ہوتی ہیں اور اس وقت انکار اصل اجتماع پر نہ ہو گا بلکہ فقط اسی محرم امر پر ہو گا اور اس کی تحریم عارضی ہو گی نہ کہ ذاتی۔ جیسا کہ کسی بھی دانشور پر مخفی نہیں۔

میلاد شریف میں ابن تیمیہ کا موقف

شیخ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کو فعل میلاد پر ثواب دیا جاتا ہے اور اسی طرح ان امور پر جو بعض لوگ ایجاد کر لیتے ہیں۔ میلاد عیسیٰ علیہ السلام میں نصاریٰ سے مشابہت کے لیے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور تعظیم کے لیے اور اللہ تعالیٰ انہیں اس محبت اور اجتہاد پر ثواب عطا فرماتا ہے نہ کہ بدعت پر' پھر کہتے ہیں کہ

جان لو کہ بلاشبہ بعض وہ اعمال ہیں جن میں نیکی ہے اس لیے کہ وہ مشروع کی قسم پر مشتمل ہیں اور بعض نئے اعمال میں شر ہے۔ تو یہ عمل اس وقت شر ہوتا ہے جب کلی طور پر دین متین سے اعراض ہو۔ جیسے منافقین اور فاسقین کا حال ہے۔

ادوار متاخرہ میں اکثر امت اس میں مبتلا ہوئی ہے اور تم پر یہاں دو امر ملحوظ رکھنا لازم ہیں:

(۱) ظاہری اور باطنی طور پر تمہیں تمسک بالسنہ پر حریص رہنا چاہیے۔ یہ تمہارا اور تمہارے پیروکاروں کا خاصہ ہو اور معروف کو معروف سمجھا جائے اور منکر کا انکار کیا جائے۔

(۲) لوگوں کو ممکن طریقہ سے سنت کی طرف بلاؤ۔ جب تم اس کے عامل دیکھو کہ وہ یہ ترک نہیں کرے گا' اگر کرے تو کسی اور شر میں مبتلا ہو جائے گا تو اسے ترک منکر کی کسی ایسے فعل سے دعوت نہ دو جو اس سے زیادہ منکر ہو اور نہ ہی واجب اور مندوب کے ترک سے دعوت دو کہ اس کا ترک اس مکروہ فعل سے زیادہ نقصان دہ ہو۔ لیکن جب بدعت میں بھلائی کی بھی نوع ہے تو جہاں تک ممکن ہو اسے بھلائی اور نیکی سے ہی تعبیر کیا جائے۔ کیونکہ لوگ عموماً ایک عمل کو ترک کریں تو دوسرے کو اپنا لیتے ہیں اور کسی کے لیے یہ روا نہیں کہ وہ نیکی کو ترک کرے مگر اس کی مثل اختیار کرے یا اس سے بہتر۔ پھر کہتے ہیں کہ میلاد شریف کی تعظیم اور اسے شعار بنا لینا یہ بعض لوگوں کا فعل ہے اور اس میں ان کے لیے اجر بھی ہے کیونکہ اس کی نیت اچھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک ایک امر اچھا ہوتا ہے اور بعض اسے قبیح سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت امام احمد رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ بعض امراء مصحف پر ہزار دینار اور اس سے زیادہ بھی خرچ کر دیتے ہیں تو آپ نے فرمایا انہیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ پس یہ ان مقامات سے افضل ہے جن میں سونا خرچ ہوتا ہے۔ یا جیسے آپ نے فرمایا' باوجود اس کے کہ آپ رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ مصاحف کو سونے سے آراستہ کرنا مکروہ ہے۔ حالانکہ بعض اصحاب نے یہ تاویل کی ہے کہ وہ کاغذ اور تحریر کی تجدید میں خرچ کرتے ہیں اور یہ امام احمد رحمتہ اللہ علیہ کا مقصود نہیں بلکہ ان کا مقصود

یہ ہے کہ اس عمل میں مصلحت بھی ہے اور فساد بھی۔ اور فساد کے سبب سے یہ عمل مکروہ ہے۔

ذکر معراج رسول ﷺ

محفل معراج مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا شد و مد سے انکار اور رد ہوتا ہے اور اس کا اہتمام کرنے اور شمولیت کرنے والوں پر نیز اس کی دعوت دینے والوں پر گمراہی اور سرکشی کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں منکرین کی دلیل بعینہ وہی ہے جو وہ محفل میلاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کرتے ہیں۔

اس کا جواب اصول کی روشنی میں تو پہلے گزر گیا۔ رہا جواب واقعیہ مشاہدہ کے حوالے سے تو منکر معترض پر ضروری ہے کہ وہ کلام کرنے یا رد کرنے یا کوئی حکم لگانے سے قبل اس مسئلہ میں انصاف و عقل کی نظر سے غور کرے یا ثقہ اور مامون ائمہ سے ان اجتماعات کی حقیقت کے بارے میں دریافت کرے کہ یہ کیا ہیں؟ اور کیسے ہوتی ہیں؟ کب منعقد ہوتی ہیں؟ کون ان میں حاضر ہوتا ہے اور کیا کچھ اس میں ہوتا ہے؟ اور جب بھی کوئی انصاف پسند حق بات کا ارادہ رکھنے والا اس مسئلہ میں اس طرح غور کرتا ہے کہ ہوا و ہوس، تعصب، تنگدلی اور طرف داری کی اس میں مداخلت نہ ہو تو وہ لوگوں کو ان مناسبات سعیدہ کی دعوت دینے اور اہتمام پر برانگیختہ کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے یا کم از کم اس بیہودہ گفتگو سے حیاء کرتا ہے جس کو ہم ایسے مناسبات میں عموماً سنتے رہتے ہیں جب ان کا وقت آتا ہے۔

بے شک لوگ ایک مبارک مجلس میں جمع ہوتے ہیں جو انتہائی باوقار اور صاف ستھرا ماحول ہوتا ہے۔ لوگ وہاں کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں، جتنی بھی آسانی سے ہو سکے۔ پھر جو کوئی عالم دین موجود ہو، جو وعظ و ارشاد کا متحمل ہو وہ کھڑا ہو کر لوگوں کو رشد و ہدایت اور پند و نصائح کا درس دیتا ہے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام

اور فضل و رحمت یاد دلاتا ہے۔ نیز انہیں اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری چیزوں سے روکتا ہے۔ پھر وہ اجتماع کی مناسبت سے سیرت نبویہ کی قرات کرتے ہیں۔ اگر اجتماع ذکر مولد شریف کی غرض سے ہو تو وہ اسی کے مناسبات پڑھتے ہیں۔ اگر اجتماع ذکر ہجرت کی مناسبت سے ہو تو ہجرت کی مناسبت سے واقعات پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور اگر اجتماع اسراء اور معراج کی مناسبت سے ہو تو وہ اس کی مناسبت سے اسراء اور معراج کے معجزہ کی احادیث اور واقعات پیش کرتے ہیں جو صحیح اور معتمد کتابوں میں موجود ہیں اور ان مقبول کتابوں میں جنہیں حفاظ علماء وغیرہم نے اس سلسلے میں تصنیف فرمایا۔ جیسے حافظ شامی' سیوطی' دردیر اور غیطی وغیرہم۔ ان سب ائمہ کی اس باب میں مستقل تصانیف ہیں اور یہ سیرت نبویہ میں داخل ہے بلکہ اس کا ایک رکن اور اصل ہے۔

(نوٹ: سید محمد بن علوی مالکی کا اسراء اور معراج کے بیان میں ایک خاص رسالہ ہے جس کا نام "الانوار البہیہ" ہے اور اس میں وھو بالافق الاعلی کے عنوان سے ایک مفصل مضمون ہے۔

محفل کے اختتام پر طعام' شربت یا حلوہ جو میسر ہو' پیش کیا جاتا ہے اور یہ سنت نبویہ ہے۔ جیساکہ شمائل محمدیہ میں وارد ہے:

انهم كانوا لا يتفرقون الا عن ذواق۔ وہ کچھ کھائے پئے بغیر جدا جدا نہیں ہوا کرتے تھے۔

تو اس مجلس میں کون سی بدعت یا ضلالت ہے یا اس اجتماع میں جو ان مسائل پر مشتمل ہو۔

اسلاف کا یہ عمل نہ کرنا اس عمل کے مذموم ہونے پر دلیل نہیں چہ جائیکہ اسے منکر ہونے کی دلیل سمجھا جائے۔

منکرین کی دلیل کا دارومدار محض ان کی اپنی سوچ و بچار پر ہے لیکن اللہ تعالی

نے اپنی کتاب عزیز میں تعظیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ طریقے سے منع کیا اور نہ ہی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اپنی تعظیم سے منع فرمایا ہے اور منکر کبھی بھی قرآن و سنت سے انکار پر دلیل پیش نہیں کر سکتا اور نہ ہی وہاں موجود ہے۔ لہٰذا ان کی دلیل باطل اور خیال فاسد ہے۔

کیا اذکار میں تعداد مقرر کرنا بدعت ہے؟

سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے اور میرے سامنے چار ہزار گٹھلی پڑی تھی جن سے میں تسبیح پڑھ رہی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یابنت حیی ماھذا؟ — اے بنت حیی یہ کیا ہے؟

میں نے عرض کیا کہ میں ان کے ساتھ تسبیح پڑھ رہی ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قد سبحت منذ قمت علی راسک اکثر من ھذا۔ — جب سے میں تیرے سر پر کھڑا ہوں' میں نے اس سے زیادہ تسبیح پڑھ لی ہے۔

تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے بھی تعلیم دیجئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو یوں کہہ لے:

سبحان اللہ عدد ما خلق من شیئی۔ — جمیع مخلوقات کی تعداد کے مطابق اللہ پاک ہے۔

اور ایک روایت میں یوں ہے:

سبحان اللہ عدد خلقہ۔ — اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی تعداد کے مطابق پاک ہے۔

امام ترمذی' حاکم اور ابن حبان نے اسے نقل کیا ہے اور امام حاکم اور ابن حبان

نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے۔ سیدہ جویریہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی اسی طرح ہے۔

اس حدیث سے بعض نادان یہ استدلال کرتے ہیں کہ ذکر میں تعداد مقرر کرنا بدعت ہے حالانکہ قائل کا یہ قول فحش غلط اور مردود ہے۔ کیونکہ یہ اس حدیث سے معارض ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

احب الاعمال الی اللہ ادومہا وان قل۔(بخاری ومسلم)	اللہ تعالیٰ کو وہ عمل زیادہ پسند ہے جو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو۔

جس کو لغت کی ادنیٰ سی بھی سوجھ بوجھ ہے اس کے لیے یہ بدیہی امر ہے کہ جو شخص عبادت پر ہمیشگی اختیار کرے گا تو لامحالہ اس کی عبادت معلوم اور محدود ہوگی۔ اور یہ حد بندی اور تقرر ہر انسان کی اپنی طاقت کے مطابق ہوتی ہے۔

امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس عورت کا ذکر کیا گیا جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک زوجہ محترمہ کو اپنی عبادت کا حال سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

علیکم ما تطیقون من الاعمال۔(صحیح بخاری)	تمہیں اتنے ہی اعمال کرنے چاہئیں جتنی تم میں طاقت ہے۔

امام بخاری ومسلم نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی عبادت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انی اطیق افضل من ذلک۔	میں اس سے افضل عبادت کی طاقت رکھتا ہوں۔

مگر مشقت کا خدشہ ہے۔ یہ فرمان عالیشان حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی عبادت سے موافقت کو ظاہر کرتا ہے۔ لہٰذا یہ قول نص کے ساتھ ساتھ عملی نص

ہوئی۔ (متفق علیہ)

امام ابو داؤد نے نقل کیا ہے کہ "حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک تھیلی ہوتی جس میں گٹھلیاں ہوتیں اور ان پر وہ تسبیح پڑھتے رہتے۔" حافظ ابن رجب حنبلی نے نقل کیا ہے کہ ان گٹھلیوں یا کنکریوں کی تعداد بارہ ہزار تھی۔

نوٹ: اس روایت کو ابو داؤد نے کتاب النکاح 'باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابتہ اھلہ میں ذکر کیا ہے اور امام ترمذی اور نسائی نے بھی اسے نقل کیا۔ نیز امام ترمذی نے اسے حسن کہا۔

ہمارے شیخ علامہ عارف باللہ شیخ محمد حافظ تیجانی اپنی کتاب "اہل الحق" میں فرماتے ہیں کہ حدیث صفیہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس امر پر دلالت ہے جو افضل ہے۔ تو اس کا معنی یہ ہوا کہ یہ عمل بھی ٹھیک ہے اور اسے فضیلت حاصل ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ انہیں منع فرمایا اور نہ کسی اور کو۔ اگر یہ عمل حرام ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے منع فرماتے۔

یہ کون سی دانائی ہے کہ کوئی شخص اس عمل سے منع کرے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا؟ تعجب ہے کہ یہ لوگ اپنی غلط فہمیاں امت پر لازم قرار دیتے ہیں۔

ہم نے کسی امام کو نہیں پایا جس نے امت پر اپنا مذہب فرض قرار دیا ہو۔ ذرا دیکھیں اس دار ہجرت کے امام کو کہ خلیفہ نے ان سے مطالبہ کیا کہ لوگوں کو اپنے مذہب پر برانگیختہ کرو تو انہوں نے صاف انکار کر دیا کیونکہ آپ رضی اللہ علیہ کی عادت انصاف کرنا تھی تو کیا یہ لوگ اسلاف کے اخلاق کو برا سمجھتے ہیں؟ یا انصاف کی معرفت رکھتے ہیں؟

صحیح روایت میں وارد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان ہو یا غیر رمضان گیارہ رکعت سے زائد نہ پڑھتے اور امت کا عملی اجماع اس امر پر منعقد ہے کہ

مسلمان رات کو اس سے زائد یا کم قیام کر سکتا ہے اور یہ اس کی طاقت پر منحصر ہے اور صحابہ کا عمل بھی معروف ہے۔ اگر امت مسلمہ اسی تعداد پر مقید ہوتی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبادت کیا کرتے تھے تو اس کی مخالفت امت پر حرام ہوتی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے زائد عبادت قبول نہ کرتے۔ حالانکہ خلیفہ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ اضافہ مسلم ہے کہ انہوں نے بیس رکعت نماز پڑھی اور اسی طرح صحابہ نے بھی۔ اور حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اسے چھتیس رکعت کر دیا اور اس مسئلہ میں علماء کے درمیان اختلاف نہیں۔

ہر مسلمان اپنی طاقت کو جانتا ہے۔ جب وہ اپنی طاقت کے مطابق کوئی بھی عبادت مقرر کر لے جو اس پر گراں نہ ہو اور اس پر ہمیشہ عمل جاری رکھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق وہ عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ اور ہم پر ضروری ہے کہ کہ اس مسئلہ میں جھگڑنے والے کا قول ہم اس حدیث سے مسترد کر دیں۔

اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی حدیث معروف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ:

انی اکثر الصلوۃ علیک فکم اجعل لک من صلوتی فقال ماشئت قلت الربع؟ قال ماشئت فان زدت فھو خیرلک قلت النصف؟ قال ما شئت فان زدت فھو خیرلک قلت اجعل لک صلوتی کلھا؟ قال	بیشک میں آپ پر درود شریف کی کثرت کرتا ہوں۔ میں آپ پر کتنا درود پڑھوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو تو چاہتا ہے۔ میں نے عرض کیا: چوتھائی حصہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو تو چاہتا ہے اگر زیادہ کر لے تو تیرے لیے بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آدھا حصہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جتنا تو

اذن تکفی ھمک ویغفرلک ذنبک۔ | چاہتا ہے اگر زیادہ کرلے تو تیرے لیے بہتر ہے۔میں نے عرض کیا:میں تمام وقت آپ پر درود پڑھوں گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری ہمت کافی ہے اور تیرے لیے تیرے گناہوں کی بخشش ہوگی۔

امام ترمذی نے اس کو باب "صفۃ القیامہ" میں ذکر کیا اور اسے حسن صحیح کہا۔ امام حاکم نے اسے مستدرک میں نقل کیا اور فرمایا کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے اور شیخین نے اسے روایت نہیں کیا۔ امام احمد نے اسے "مسند: ۵/ ۱۳۶" میں روایت کیا۔ حافظ ہیثمی "مجمع الزوائد: ۰/ ۱۶۰" میں فرماتے ہیں کہ اس کی سند جید ہے اور امام طبرانی نے اسے "الکبیر: ۴/ ۳۵" میں روایت کیا۔

پس غور کرو کہ ربع اور نصف کا کیا معنی ہے اور "ماشئت" کے معنی پر غور کرو۔ تو کہنا پڑتا ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ عبادت کی حد بندی کرنا بدعت ہے تو سب سے زیادہ بدعتی ہونے کا وہی مستحق ہے اور وہ اللہ جل شانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے والا ہے۔ کیونکہ وہ اس امر کو حرام قرار دے رہا ہے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے اور اس کی ترغیب دلائی ہے اور بعد میں اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل بھی جاری رہا۔

اس کی حکمت امت پر تخفیف اور عبادت کو منظم کرنا ہے اور جو شخص کسی قدر عبادت کا عادی ہو گیا (جب تک اس پر گراں نہ ہو) تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مذکورہ فرمان کے عین مطابق ہے اور نیکی کی عادت کی طرف ہی لے جاتی ہے۔

کن الفاظ میں دعا کرنی چاہیے؟

جس کا یہ خیال ہے کہ دعا صرف انہی الفاظ میں ہو جن سے رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے دعا کی اور ان کے علاوہ دیگر الفاظ میں دعا کرنا بدعت ہے تو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شریعت غرا پر افتراء باندھا۔ بلاشبہ مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے ایسا کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے برقرار رکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا برقرار رکھنا شریعت ہے۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں دعا کرتے ہوئے سنا:

اللھم انی اسئلک بانی اشھد انک انت الاحد الصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفوا احد۔	اے اللہ میں تجھ سے (ان کلمات کے ساتھ) سوال کرتا ہوں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو ایک ہے اور ایسا بے نیاز ہے جس کا نہ بیٹا ہے نہ باپ اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لقد سال اللہ باسمه الاعظم الذی اذا دعی به اجاب واذا سئل به اعطی۔	قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے اس اسم اعظم کے ساتھ سوال کیا جس سے جب دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے اور جب اس سے کچھ مانگا جائے تو عطا فرماتا ہے۔

اس روایت کو سنن اربعہ کے ائمہ نے نقل کیا اور امام ترمذی نے اسے حسن کہا اور ابن حبان نے اسے صحیح کہا۔ نیز حافظ مقدسی فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی طعن نہیں۔ اور امام طبرانی نے اسے "الصغیر" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے جس میں دعا کرنے والے شخص کے نام کی تصریح بھی ہے کہ وہ ابو عیاش زید بن صامت زرقی ہیں۔ البتہ یہ یاد رہے کہ مختلف کتابوں میں الفاظ کا ذرا سا اختلاف ہے۔

امام طبرانی نے "الاوسط" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک اعرابی کے پاس سے گزرے جو نماز میں دعا کر رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا:

یامن لا تراہ العیون' ولا تخالطہ الظنون' ولا یصفہ الواصفون ولا تغیرہ الحوادث' ولا یخشی الدوائر' یعلم مثاقیل الجبال' ومکاییل البحار' وعدد قطر الامطار' وعدد ورق الاشجار' وعدد ما اظلم علیہ اللیل واشرق علیہ النہار' لا تواری منہ سماء سماء' ولا ارض ارضا' ولا بحر ما فی قعرہ' ولا جبل ما فی وعرہ' اجعل خیر عمری آخرہ و خیر عملی خواتمہ و خیر ایامی یوم القاک فیہ۔

اے وہ ذات جسے نہ آنکھیں دیکھ سکتی ہیں اور نہ خیالات لاحق ہو سکتے ہیں اور نہ ہی بیان کرنے والے اس کی صفت و ثناء بیان کر سکتے ہیں اور نہ ہی حوادث اسے بدل سکتے ہیں اور نہ ہی اسے مصائب کا کوئی خدشہ ہے' وہ پہاڑوں کے ذرات تک کو جانتا ہے اور دریاؤں کی بوندوں کو جانتا ہے' بارش کے قطروں اور درخت کے پتوں کی تعداد کو جانتا ہے اور ان کی تعداد سے خوب واقف ہے جن پر رات کا اندھیرا اور دن کی روشنی ہوتی ہے۔ اس سے کوئی آسمان دوسرے آسمان کو چھپا سکتا ہے نہ کوئی زمین دوسری زمین کو اور نہ دریا اپنی گہرائی کو اور نہ پہاڑ اپنے اندرون کو چھپا سکتا ہے' (اے وہ ذات) تو میری آخری عمر کو بہتر بنا اور میرا خاتمہ اچھے عمل پر فرما اور میرے لیے وہ دن بہتر بنا جس دن میں تجھ سے ملوں۔

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی اس اعرابی کے پاس ٹھہرایا اور کہا:

اذا صلی فاتنی به۔ جب یہ نماز پڑھ لے تو اسے میرے پاس لے آ۔

جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو یہ شخص اعرابی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں لے آیا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک معدن کا سونا بطور ہدیہ پیش کیا گیا تھا۔ جب اعرابی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے وہ سونا ہبہ کر دیا اور پوچھا:

ممن انت یااعرابی؟ اے اعرابی تو کس قبیلے سے ہے؟

تو اس نے عرض کی یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم) میرا تعلق بنو عامر بن صعصعہ کے قبیلہ سے ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یااعرابی هل تدری لم وهبت لک الذهب؟ اے اعرابی کیا تو جانتا ہے کہ میں نے یہ سونا تجھے کیوں عطا کیا ہے؟

تو اس نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیک وسلم) اس لیے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان رحم کا رشتہ ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان للرحم حقا ولکن وهبت لک الذهب لحسن ثناءک علی الله عزوجل۔ بے شک رحم کا بھی حق ہے لیکن میں نے تجھے یہ سونا اس لیے دیا ہے کہ تو نے اللہ عزوجل کی بڑی اچھی تعریف کی ہے۔

اس روایت کو امام طبرانی نے "الاوسط: ۱۰/ ۲۰۳" میں روایت کیا ہے اور حافظ ہیثمی نے اسے صحیح کہا ہے۔ گویا (مجمع الزوائد: ۱۰/ ۱۵۸) میں فرمایا کہ عبداللہ بن محمد ابی عبدالرحمٰن کے علاوہ اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں اور عبداللہ بھی ثقہ ہیں۔ اور علامہ شوکانی نے اس کی تائید کی اور ثابت رکھا۔

امام بخاری نے کتاب المغازی' باب غزوۃ الخندق میں روایت کیا ہے کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ

خندق کے دن مٹی منتقل کر رہے تھے۔ حتی کہ مٹی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شکم مبارک کو چھپا رکھا تھا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بطن مبارک غبار آلود ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زبان پر یہ الفاظ تھے:

والله لو لا الله ما اهتدينا
ولا تصدقنا ولا صلينا

"اللہ کی قسم! اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو نہ ہم تصدیق کرتے اور نہ ہی ہم نماز پڑھتے۔"

فانزلن سكينة علينا
وثبت الاقدام ان لاقينا

"(اے اللہ!) تو ضرور ہم پر سکینہ نازل فرما اور دشمنوں کے مقابلے میں ہمیں ثابت قدمی عطا فرما۔"

ان الالى قد بغوا علينا
اذا ارادوا فتنة ابينا

"بے شک انہوں (اہل مکہ) نے ہم پر بغاوت کی ہے جب وہ فتنہ (شرک و قتال) کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم انکار کرتے ہیں اور آپ ﷺ "ابینا ابینا" بلند آواز سے فرماتے۔" (صحیح بخاری کتاب المغازی)

لہذا حضور پر نور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلام سے دعا کی جسے عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے مرتب کیا۔

اور کسی کا ان کلمات سے دعا کرنا جو اللہ تعالیٰ نے اسے الہام فرمائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے برقرار رکھنا، سنت مطہرہ میں کثیر وارد ہے اور ہم نے اس کی مثال پیش کر دی۔ اور ہدایت دراصل اللہ کی ہی ہدایت ہے۔

جب رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء

کرنے کی اجازت دی اور ان کی دعا کو برقرار رکھا بلکہ ان کی دعا کی مثال رکھی تو یہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ترین اجازت ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے ایک فرد کو جس امر کی اجازت دے دیں تو وہ امر تمام امت کے لیے جائز ہوتا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کی امت کے نبی اور رسول ہیں نہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایک زمانے کے نبی ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرمان عالیشان سے ممنوع دعا کی نشاندہی فرمادی:

ما علی الارض مسلم یدعوا اللہ بدعوۃ الا اتاہ اللہ ایاھا او صرف عنہ من السوء مثلھا ما لم یدع باثم او قطیعہ رحم۔ (الترمذی)

روئے زمین پر کوئی مسلمان جب اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے وہی عطا کر دیتا ہے یا اس کی مثل اس سے کوئی مصیبت دور کر دیتا ہے' جب تک کہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔

امام ترمذی نے "الدعوات" میں اسے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اور کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اور یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا بیان ہے کہ:

سیکون قوم یعتدون فی الدعاء۔

عنقریب ایک قوم ہوگی جو دعا میں حد سے بڑھ جائے گی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ قوم ان کلمات سے دعا کرے گا جن سے میں نے دعا نہیں کی۔ البتہ فضول کلام سے دعا کرنا وقت کا ضیاع ہے' اگرچہ وہ گناہ نہ ہی ہو۔

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی ایسے کلمات سے دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے انہیں الہام فرمائے اور فقط آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک الفاظ پر اقتصار نہ کیا۔ باوجود اس کے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ افضل دعا ہے اگر یہ حرام ہوتا تو وہ اکابر صحابہ ایسا کبھی نہ کرتے۔

یاد رہے کہ کسی میں یہ جرات نہیں کہ وہ خصوصاً اس مسئلے کی ممانعت پر کوئی دلیل پیش کرے۔ نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے اور نہ ہی صحابہ اور تابعین کے قول سے اور تمام مذاہب کی کتب فقہ اس مسئلہ کے جواز پر دلائل و نصوص سے مزین ہیں اور ان کلمات سے آراستہ ہیں جن سے صالحین نے دعائیں کیں۔

علامہ شوکانی "تحفۃ الذاکرین" میں یہ حدیث نقل کرتے ہیں:

ثم لیتخیر من الدعاء اعجبه الیه فیدعوا۔	پھر وہ ایسی دعا اختیار کرے جو اسے زیادہ پسند ہو اور وہ دعا کرے۔

اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا جیسا کہ مصنف رحمتہ اللہ علیہ نے کہا۔ اور یہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کا ایک جزء ہے جو پہلے تشہد میں گزر گئی۔ امام مسلم اور ابو داؤد نے اسے انہی الفاظ سے نقل کیا۔ یہاں علامہ شوکانی لکھتے ہیں کہ اس میں دعا کرنے والے نمازی کو اختیار دیا گیا ہے کہ جو دعا اسے زیادہ پسند ہے' اس کا انتخاب کرے' چاہے وہ کلام نبوت سے ہو یا اس کے اپنے کلام سے۔

اور مزید فرماتے ہیں کہ کیا خوب ہے جو خلیفہ عادل عمر بن عبدالعزیزؒ رحمتہ اللہ علیہ نے بایں الفاظ دعا کی:

یامن وسعت رحمته کل شیئی وانا شیئی فلتسعنی رحمتک یا ارحم الراحمین اللھم انک خلقت قوما فاطاعوک فیما امرتھم وعملوا فی الذی خلقتھم له'	اے وہ ذات جس کی رحمت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے' میں بھی شے ہوں' لہٰذا تیری رحمت مجھے بھی اپنے دامن میں لے لے۔ اے بہت زیادہ رحم فرمانے والے' اے اللہ! تو نے ایک قوم کو پیدا کیا پس انہوں نے تیری اطاعت کی جو تو نے

رحمتک ایاھم کانت قبل طاعتھم لک یاارحم الراحمین۔
(اخرجہ ابونعیم فی الحلیہ: ۲/۹۹)

انہیں حکم دیا اور انہوں نے وہ عمل کیا جس کے لیے تو نے انہیں پیدا کیا' گویا کہ تیری رحمت ان پر اس سے پہلے ہے کہ انہوں نے تیری اطاعت کی اے بہت زیادہ رحم فرمانے والے!

اور میں (شوکانی) کہتا ہوں کہ:

یامن کتب علی نفسہ الرحمۃ لعبادۃ' انی من عبادک فارحمنی یا ارحم الراحمین۔ (تحفۃ الذاکرین للشوکانی)

اے وہ ذات جس نے اپنے بندوں پر رحمت کو ضروری ٹھہرایا' بے شک میں بھی تیرا بندہ ہوں' لہٰذا مجھ پر رحم فرما اے بہت زیادہ رحم فرمانے والے۔

لطیفہ: ایک مدعی نے ایک رسالہ لکھا جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعا کنندہ الفاظ کے علاوہ دیگر الفاظ میں دعا کرنا حرام ہے۔ پھر اس نے اپنی تالیف کا اختتام اپنی ذاتی اختراعی دعا پر کیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لیسال احدکم ربہ حاجتہ کلھا حتی یسال شسع نعلہ اذا انقطع۔

چاہیے کہ تم میں سے ہر ایک اپنے پروردگار سے اپنی جمیع حاجات کا سوال کرے' حتیٰ کہ جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اسی سے سوال کرے۔ (الترمذی)

لہٰذا جب لوگوں کی عادات اور مقاصد مختلف ہیں تو خواہ مخواہ ضروری ہے کہ ان کی دعائیں بھی مختلف ہوں گی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت بخشی ہے کہ اپنی مختلف حاجات کی اللہ تعالیٰ سے دعا کرو' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا

اذن شرع ہے' اور ان امور کو نوافل کے قبیلے سے تعبیر کیا جائے گا اور جس امر کی پیارے مصطفیٰ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہو اسے بدعت کہنا فحش خطا ہے جس کی طرف التفات تو کیا بلکہ رد کیا جائے گا۔ اور ایسا کہنے والا بھی محفوظ نہیں رہے گا۔

امام بخاری نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یوں دعا کی:

اللھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلک واجعل موتی فی بلد رسولک۔	اے اللہ! مجھے اپنے رستے میں شہادت کی دولت عطا فرما اور اپنے پیارے رسول کے شہر میں میری موت مقدر فرما۔

حفصہ نے عرض کیا: یہ کہاں ہو گا؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب چاہے گا مجھے یہ عطا فرمائے گا۔ (صحیح بخاری' فضائل مدینہ: ۲/۲۲۵)

حضرت عبداللہ بن سبرہ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ صبح کے وقت یوں دعا کرتے:

اللھم اجعلنی من اعظم عبادک نصیبا فی کل خیر تقسمه الغداۃ' ونورا تھدی ورحمة تنشرھا' ورزقا تبسطه وضرا تکشفه' وبلاء ترفعه' وفتنه تصرفھا۔ (رواہ الطبرانی)	اے اللہ! مجھے اپنے عظیم بندوں میں شمار فرما اور ہر بھلائی میں حظ وافر عطا فرما جسے صبح تقسیم کرتی ہے اور نور سے ہدایت دیتی ہے اور رحمت بکھیرتی ہے اور رزق کھولتی ہے اور تکلیف دفع کرتی ہے اور مصیبت اور فتنہ کو پلٹ دیتی ہے۔

امام طبرانی نے (الکبیر: ۱۲/ ۲۰۸) میں اسے روایت کیا ہے اور حافظ ہیثمی نے (المجمع: ۱۰/ ۱۸۴) میں کہا کہ اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

حضرت سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یوں دعا

کیا کرتے تھے:

اللهم انی اسئلک بنور وجهک الذی اشرقت له السموات والارض ان تجعلنی فی حرزک وحفظک وجوارک وتحت کنفک۔ (رواہ البزار)	اے اللہ! میں تجھ سے تیرے ذاتی نور کے ساتھ سوال کرتا ہوں جس کے لیے زمین و آسمان روشن ہیں کہ تو مجھے اپنی حفظ و امان میں رکھ اور جوار رحمت میں جگہ عطا فرما۔

اس روایت کو امام طبرانی نے (الکبیر: ۹ / ۱۸۶) میں نقل کیا اور حافظ ہیثمی (المجمع: ۱۰ / ۱۸۴) میں کہتے ہیں کہ اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں۔

حضرت ابو احوص سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو بایں الفاظ دعا کرتے ہوئے سنا:

اللهم انی اسئلک بنعمتک السابغة التی انعمت علی' وبلائک الذی ابتلیتنی' وفضلک الذی افضلت علی ان تدخلنی الجنه' اللهم ادخلنی الجنة بفضلک ومنک ورحمتک۔ (رواہ الطبرانی ورجالہ رجال الصحیح)	اے اللہ! میں تجھ سے تیری اس وافر نعمت کے ساتھ سوال کرتا ہوں جو تو نے مجھ پر انعام کی اور اس بلاء کے ساتھ جس میں تو نے مجھے مبتلا کیا اور تیرے اس فضل کے ساتھ جو تو نے مجھ پر کیا کہ مجھے جنت میں داخل فرمائے گا۔ اے اللہ! مجھے اپنے فضل و احسان اور رحمت کے ساتھ جنت میں داخل فرما۔

کنز العمال میں مذکور ہے کہ اس روایت کو دیلمی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا۔

عبد اللہ بن عکیم سے مروی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ یوں دعا کیا کرتے تھے:

اللھم زدنی ایمانا ویقینا وفھما۔ اے اللہ! میرے ایمان، یقین اور سمجھ میں اضافہ فرما۔

یا فھما کی جگہ علما فرمایا۔ اس کو امام طبرانی نے کبیر میں روایت کیا ہے اور اس کی سند جید ہے۔

قبیلہ بنو نجار کی ایک عورت سے مروی ہے کہ میرا گھر مسجد کے ارد گرد گھروں میں سے اونچا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس پر فجر کی اذان دیا کرتے تھے۔ وہ سحری تشریف لاتے اور گھر پر بیٹھ کر وقت کا انتظار کرتے اور جب وقت ہوتا دیکھتے تو یوں دعا کرتے:

اللھم انی احمدک واستعینک علی قریش ان یقیموا دینک ثم یؤذن۔ اے اللہ! میں تیری حمد کرتا ہوں اور قریش پر تجھ سے ہی مدد چاہتا ہوں کہ وہ تیرے دین کو قائم کریں، پھر اذان پڑھتے۔

راویہ کہتی ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ ایک رات بھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات ترک کیے ہوں۔ (رواہ ابوداؤد، کتاب الصلوۃ، باب الاذان فوق المنارۃ)

نیز اور بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی دعائیں مشہور ہیں۔

فعل کا ثابت نہ ہونا حجت نہیں

عدم ثبوت فعل کا قاعدہ ایک بنیادی اصول اور جامع قاعدہ کی حیثیت رکھتا ہے جسے اصولیوں کے نزدیک ترک عدمی کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ قاعدہ کثیر لوگوں کی نظر سے مخفی ہے جس کی وجہ سے منکرین عدم ثبوت فعل کا سہارا لیتے ہیں اور اس کو نئے فعل کے رد کی دلیل بناتے ہیں اور اس کے بطلان پر اس سے حکم لگا دیتے ہیں۔ نہ قواعد کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نہ ہی نظر و قیاس کے اصول و ضوابط کا اجراء کرتے ہیں۔ پس ان کی آخری اور مضبوط دلیل یہی ہے کہ وہ کہہ دیتے ہیں کہ "اے رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا اور نہ ہی سلف نے کیا' لہٰذا یہ حرام' بدعت یا گمراہی ہے۔ کیونکہ یہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے''۔ اسی طرح وہ بغیر فکر و تدبر کے دین اور اس کے احکام پر جسارت کرتے رہتے ہیں اور ان کا یہ جو کلام ہے جس کا پہلا حصہ حق ہے اور دوسرا باطل' یا پہلا صحیح اور دوسرا فاسد' حق اور صحیح یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین نے اسے نہیں کیا اور باطل و فاسد وہ ہے جو انہوں نے اس پر حرمت' بدعت یا فسق کا حکم لگایا۔ یہ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کا ایک فعل کو نہ کرنا دلیل نہیں بلکہ وہ عدم دلیل ہے اور حرمت کی دلیل نص کے وارد ہونے سے ہوتی ہے جو مشرع اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک فعل کے وقت نہی کو یا اس فعل کے انکار کو مفید ہو۔ یا ان حضرات سے نص وارد ہو جن کی سنت اور طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریقہ کے قائم مقام ہو اور جب یہ سمجھ میں آجائے تو کسی متکلم کا کلام باقی نہیں رہتا اور نہ ہی کوئی مسلمان اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کو نافذ کرنے میں توقف کرتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ محض ترک ہو یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل نہ ہو یا سلف صالحین کا عمل نہ ہو تو اسے منکر لوگوں پر انکار کی دلیل بنالے اور اس فعل پر حرمت صریحہ یا نہی شنیع یا بدعت و فسق کا حکم لگائے تو یہ اس کی قواعد احکام اور ان اصول فقہ سے صریح جہالت ہے جن پر اکابر مجتہدین ائمہ اسلام متفق ہیں۔ کیونکہ سلف صالحین کا نہ کرنا دلیل نہیں۔ بلکہ وہ عدم دلیل ہے۔ ایک فعل کے ممنوع یا منکر ہونے پر دلیل تب قائم ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ اپنی کتاب عزیز میں اس سے منع فرمائے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سنت صریحہ صحیحہ میں اس سے منع فرما دیں۔

لہٰذا یقیناً یہ منکر جو اس دلیل عدمی سے استدلال کرتا ہے وہ عدم کے میدان میں سرگرداں ہے اور اس کا تمسک سلف کے عدم فعل سے ہے جو کہ دلیل نہیں بلکہ وہ

عدم دلیل ہے۔

یہی مسئلہ ہے جس کو ترک سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ترک کیا یعنی نہ کیا اور سلف صالحین نے اسے ترک کیا۔ لہٰذا یہ اس فعل کی حرمت یا کراہت کا تقاضا کرتا ہے' بغیر کسی ایسی حدیث یا اثر وارد ہونے کے جس میں اس متروک شے کی نہی یا تحذیر وارد ہو۔

اس دہمی دلیل سے استدلال کرنے میں کثیر متاخرین کا دامن داغدار ہے جنہوں نے اس سے اشیاء کی حرمت پر حکم لگا دیا یا ان کی مذمت کی یا بدعت و تحریم سے متصف قرار دیا۔ صرف اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح نہیں کیا.....اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فعل ثابت نہیں۔

ابو سعید بن لب اس شخص کے بارے میں فرماتے ہیں جو نماز کے بعد دعا کو مکروہ جانتا ہے کہ منکر دعا کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ سلف کا یہ عمل نہیں لہٰذا نمازوں کے بعد دعا کرنا مکروہ ہے' بر تقدیر صحت نقل ترک اس متروک میں صرف یہ حکم واجب کرتا ہے کہ ترک جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ رہا یہ کہ متروک پر حرمت یا کراہت کا حکم لگایا جائے تو یہ صحیح نہیں۔ خصوصا ان امور کے بارے میں جن کی اصل شرع میں موجود ہے۔ اور بقول بعض ع

التركُ ليس بحجةٍ في شرعنا
لا يقتضي منعا ولا ايجابا

"ترک ہماری شرع میں حجت نہیں' نہ وہ منع کا تقاضا کرتا ہے نہ ایجاب کا"۔

فمن ابتغى حظرا لترك نبينا
ورآه حكما صادقا و صوابا

"جس نے ہمارے نبی کے ترک سے ممانعت اخذ کی اور اسے سچا اور درست حکم سمجھا"۔

قد ضل عن نهج الادلة كلها
بل اخطاء الحكم الصحيح وخابا
"وہ تمام دلائل کے راستے سے بھٹک گیا بلکہ اس نے صحیح حکم میں غلطی کی اور رسوا ہوا"۔
(التحذير من الاغترار بما جاء في كتاب الحوار للشيخ عبدالحئى العمروى والشيخ عبدالكريم مراد: ص۷۵)

مسئلہ ترک

مسئلہ ترک سے مراد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی امر کو ترک فرمایا ہو تو اس کا حکم اور مفہوم کیا ہے اور ترک کی کتنی اقسام ہیں۔
جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کو ترک کیا ہو یعنی اسے نہ کیا ہو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قول سے صراحتاً نص وارد ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کو ترک کیا اور عمل نہ کیا یا اس موضوع میں مطلقاً کوئی نص وارد نہ ہو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو ثابت کرے یا ترک کو' تو اس سے شے کی حرمت کے علاوہ متعدد وجوہات کا احتمال ہے جو درج ذیل ہیں:
(ا) ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کا ترک فرمانا عادتاً ہو جیسے گوہ کا مسئلہ مشہور ہے کہ آپ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں بھنی ہوئی گوہ پیش کی گئی اور آپ ﷺ نے کھانے کے لیے اپنے مبارک ہاتھ کو بڑھایا تو عرض کیا گیا یہ گوہ ہے تو آپ ﷺ نے اس سے ہاتھ روک لیا۔ سوال کیا گیا کیا یہ حرام ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

لاولكنه لم يكن بارض قومي فاجدني اعافه......
نہیں' لیکن یہ میری قوم کے علاقے میں نہیں پائی جاتی لہذا میں اس سے اجتناب کرتا ہوں......
(صحیح بخاری' کتاب الذبائح' باب الضب)

اس حدیث شریف سے دو امور ثابت ہوتے ہیں:

۱- حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی چیز کو ترک فرمانا اگرچہ ترک چیز پیش کرنے کے بعد ہی ہو' تو اس سے شے کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

۲- ایک چیز کے ناپسند کرنے سے بھی اس کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

(۲) ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی امر کو ترک فرمانا نسیاناً ہو جیسا کہ نماز میں ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سہو ہو گیا اور کچھ ترک کر دیا۔ سوال کیا گیا کہ کیا نماز میں کوئی چیز آئی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انما انا بشر مثلکم انسی کما تنسون فاذا نسیت فذکرونی۔	بے شک میں (ظاہری طور پر) تمہاری طرح بشر ہوں' میں بھی بھلایا جاتا ہوں جیسے تم بھول جاتے ہو تو جب مجھے بھلا دیا جائے تو تم مجھے یاد دلا دیا کرو۔
(صحیح بخاری' کتاب الصلوۃ)	

(۳) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی امر کو ترک فرمانا اس خوف سے بھی ہوتا ہے کہ کہیں یہ امر امت پر فرض نہ ہو جائے۔ جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تراویح کو باجماعت پڑھانا ترک فرمایا جبکہ صحابہ جمع ہو گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا:

خشیت ان تفرض علیکم۔	مجھے تم پر اس کے فرض ہونے کا خدشہ ہے۔
(صحیح بخاری' کتاب صلوۃ التراویح)	

(۴) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی امر کو ترک فرمانا اس لیے بھی ہو سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں غور و فکر ہی نہ کیا ہو اور نہ ہی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب انور پر گراں ہو' جیسے منبر کا مسئلہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے ایک تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرسی وغیرہ کے بنانے میں غور و فکر ہی نہ کیا کہ خطبہ کے وقت اس پر

کھڑا ہوا جائے تو جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے منبر بنانے کی تجویز دی کہ اس پر خطبہ دیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجویز سے موافقت کی اور درست قرار دیا کیونکہ یہ عمل سامعین کے لیے زیادہ مفید ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھنے کے لیے مٹی کا ایک چبوترہ بنانے کی تجویز دی تاکہ باہر سے آنے والے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسانی سے پہچان سکیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس تجویز سے موافقت کی۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے بارے میں ایسا کبھی نہ سوچا۔

(۵) حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ترک اس لیے بھی ہو سکتا ہے کہ وہ امر آیات و احادیث کے عموم میں داخل ہو، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز چاشت کو ترک فرمانا۔

یہ تمام تر دلائل اس شخص کے مذہب پر ہیں جو یہ کہتا ہے کہ ایک امر جو خصوصیت کے ساتھ سنت مرفوعہ میں ثابت نہیں یعنی اس فعل کا سنت ہونا وارد نہیں۔ تو یہ فعل دیگران مستحبات کی طرح مستحب ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت داخل ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔(الحج: ۷۷) اور بھلے کام کرو اس امید پر کہ تمہیں چھٹکارا ہو۔

لیکن اکثر محققین کا یہ کہنا ہے کہ جس فعل کا سنت ہونا خصوصیت سے وارد ہو وہ سنت موکدہ ہے اور اس موقف پر انہوں نے دلائل قائم کیے ہیں جنہیں امام نووی نے شرح صحیح مسلم (۵/ ۲۳۰) میں درج کیا ہے۔

ہمارے شیخ علامہ محدث شیخ عبداللہ بن صدیق غماری فرماتے ہیں کہ محض ترک حجت نہیں ہوتا جب تک کہ متروک کی ممانعت پر نص نہ وارد ہو بلکہ وہ اس امر کو مفید ہے کہ اس فعل کا ترک جائز ہے اور رہی یہ بات کہ وہ فعل متروک ممنوع ہے

تو یہ محض ترک سے مستفاد نہیں ہوتا۔ البتہ کسی اور دلیل سے مستفاد ہو سکتا ہے جو اس پر دال ہو' پھر میں نے دیکھا ہے کہ امام ابو سعید بن لب نے بھی یہی قاعدہ ذکر کیا ہے۔ انہوں نے نماز کے بعد دعا کو مکروہ سمجھنے والے کا رد کرتے ہوئے کہا:

"نمازوں کے بعد دعا کے منکر کی آخری با اعتماد دلیل یہ ہے کہ یہ سلف کا عمل نہیں۔ اگر اس کا یہ کہنا صحیح بھی ہو تو ترک محض اس متروک میں صرف یہی حکم واجب کر سکتا ہے کہ اس عمل کا ترک جائز ہے اور کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ رہا اس متروک پر حرمت یا کراہت کا حکم لگانا تو یہ ہرگز جائز نہیں۔ بالخصوص ان امور کے بارے میں جن کی اصل شریعت میں موجود ہے' جیسے دعا"۔

اور (المحلی: ۲ / ۲۵۴) میں امام ابن حزم نے مالکیہ اور حنفیہ کا یہ احتجاج ذکر کیا ہے کہ مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھنا مکروہ ہے۔ جس کی دلیل ابراہیم نخعی کا یہ قول ہے کہ حضرت ابو بکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم یہ دو رکعت نہیں پڑھا کرتے تھے اور ابن حزم اس قول سے ان کا رد کرتے ہیں کہ "اگر یہ صحیح بھی ہے تو اس میں حجت نہیں کیونکہ اس میں یہ نہیں ہے کہ خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم نے ان دو رکعت سے منع کیا ہو"۔

(٦) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک کام کو ترک فرمانا اس لیے بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خوف ہو کہ کہیں بعض صحابہ کے دل متغیر نہ ہو جائیں۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ سے فرمایا:

لولا حداثة قومك بالكفر لنقضت البيت ثم لبنيته على اساس ابراهيم عليه السلام فان قريشا استقصرت بناءه (بخاری و مسلم)	اگر تیری قوم کا زمانہ کفر سے قریب نہ ہوتا تو میں بیت اللہ کو منہدم کر کے اسے ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر تعمیر کرتا' بے شک قریش نے اس کی بنیاد کو مختصر کیا ہے۔

لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی نومسلموں کے دلوں کی رعایت کرتے ہوئے بیت اللہ کا انہدام اور بناء کا اعادہ ترک فرمادیا اور ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر کچھ اور وجوہات بھی ہوں جو کتب سنت کے مطالعہ سے سامنے آتی ہیں اور کسی حدیث اور اثر میں یہ تصریح وارد نہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک امر کو ترک فرمادیں تو وہ حرام یا مکروہ ہو جاتا ہے۔

مناسب ہے کہ ہم یہاں مسئلہ ترک کو لغوی اور شرعی طور پر تفصیل سے ذکر کر دیں اور اس کی اقسام کو بھی وضاحت سے نقل کر دیں اور ان امور کو بھی جو اس باب میں ملحوظ ہوتے ہیں۔

ترک کا معنی' اقسام اور دلالت

ترک کا لغوی معنی ہے فھو ودع الشئی و تخلیتہ (شے کو چھوڑنا اور اس سے اعراض کرنا) اور اصولیوں کے نزدیک ترک مقدور علیہ کے فعل کے نہ ہونے کو کہتے ہیں چاہے تارک کا قصد ہو یا نہ ہو جیسا کہ نیند میں' اور چاہے اس کی ضد کا خیال ہو یا نہ ہو(۱)۔ اور اس کی دو قسمیں ہیں: ترک مقصود اور ترک غیر مقصود۔

۱۔ ترک مقصود وہ ہے جسے اہل اصول ترک وجودی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس سے مقصود وہ ترک ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیش آنے پر فعلاً ترک فرما دیں۔ یا اس کے وقوع اور حصول کے بعد اس سے باز رہیں یا دوسرا معنی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل کو ترک کرنا یا شے پر حکم لگانے کو ترک کرنا بعد اس کے کہ وہ واقع ہو اور فعل کا مقتضی موجود ہو یا قول کو ترک کرنا' اس تقسیم پر مفصل بحث کتب اصول میں موجود ہے اور قول اس میں مشہور ہے اور ہم نے اس مفصل کلام کا قصد نہیں کیا کیونکہ اس میں اختلاف نہیں۔

(۱) یہ معنی شرح المواقف میں مذکور ہے اور تھانوی نے اسے کشاف الاصطلاحات (۱/ ۱۶۸) میں نقل کیا ہے۔

۲- رہا ترک غیر مقصود تو یہ وہ ہے جسے اہل اصول ترک عدمی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس سے مقصود وہ امر ہے جس کی طرف فعلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے توجہ نہیں کی اور نہ ہی اس میں کوئی حکم دیا اور نہ ہی اس کا حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا اس لیے کہ اس کا مقتضی موجود نہیں جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد پیش آنے والے واقعات اور اس قسم میں علماء کا اختلاف ہے اور وہ اصول کی روشنی میں نظر و استدلال اور قیاس سے کام لیتے ہیں جس کی بنا پر ان کی تحقیقات مختلف ہیں۔(۱)

دلالت ترک

خصوصاً ترک غیر مقصود در اصل دلیل بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا' نہ شرعاً اور نہ عقلاً۔ شرعاً اس لیے کہ فیصلہ کن نص اس موضوع میں وارد ہے' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ (الحشر: ۷)	اور جو کچھ تمہیں رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) عطا فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

دعونی ما ترکتم انما ھلک من کان قبلکم بسوالھم	مجھے اس وقت تک چھوڑے رہو جب تک میں تمہیں چھوڑے رہوں' کیونکہ تم

(۱) ترک کی یہی وہ قسم ہے جس سے تمسک کرتے ہوئے بعض منکرین نئے امور پر بدعت ضلالہ اور ان کے فاعل پر مبتدع ہونے کا حکم لگاتے ہیں۔ ان کا ایسا کرنا اس تقسیم سے جہالت کی بنا پر ہے۔ نوع اول تو ترک وجودی کے نام سے معروف ہے اور اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارے بعض مشائخ نے خصوصاً اسی نوع کے بارے میں فرمایا کہ "اس کا ترک جائز ہے۔" یہ خلاصہ کلام ہے ورنہ تحقیق کے لیے اصولیوں کے کلام کا مطالعہ کریں۔ انشاء اللہ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے۔

واختلافهم على انبياءهم فاذا نهيتكم عن شئى فاجتنبوه واذا امرتكم بامر فاتوا منه ما استطعتم۔
(بخاری کتاب الاعتصام' مسلم کتاب الفضائل)

سے پہلے لوگ کثرت سوال اور اپنے انبیاء سے اختلاف کرنے کے باعث ہی ہلاک ہوئے' پس جب میں تمہیں کسی بات سے روکوں تو اس سے رک جاؤ اور جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو حسب استطاعت اس کو بجالاؤ۔

اور حضور پرنور شافع یوم النشور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی' جسے دار قطنی نے (السنن 'کتاب الرضاع: ۴/ ۱۸۴) میں روایت کیا اور حافظ بیہقی نے اسے سنن (۱۰/ ۱۲) میں ابو ثعلبہ پر موقوف روایت کیا اور امام حاکم نے اسے مستدرک (۴/ ۱۲۹) میں روایت کیا۔ چنانچہ ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

ان الله فرض فرائض فلا تضيعوها وحد حدودا فلا تعتدوها وسكت عن اشياء رحمة بكم غير نسيان فلا تبحثوا عنه۔

بیشک اللہ تعالیٰ نے فرائض فرض کیے تو تم انہیں ضائع نہ کرو اور اس نے حدود مقرر فرمائیں تو تم ان سے تجاوز نہ کرو اور بعض اشیاء سے خاموشی فرمائی جو محض تم پر رحمت کی وجہ سے ہے نہ کہ نسیان کی وجہ سے۔ لہٰذا تم اس کے بارے میں بحث نہ کرو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

الحلال ما احل الله في كتابه' والحرام ما حرم الله في كتابه' وما سكت عنه فهو مما عفا عنه۔
(رواہ الترمذی 'کتاب اللباس)

حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال بتایا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام ٹھہرایا اور جس سے خاموشی فرمائی اس کے بارے میں معافی ہے۔

اب دیکھیں کہ لوگوں کے احوال جو فعل' عدم فعل اور اخذ و ترک سے متعلق ہیں وہ انہی دو عظیم قاعدوں کی طرف راجع ہیں اور وہ امر اور نہی ہیں۔ پس جو موضوع سے متعلق ایک فعل کا امر یا فعل سے ممانعت وارد نہ ہو تو اس پر ممانعت کا حکم لگانا صحیح نہیں بلکہ حکم اس کے مباح اور مسکوت عنہ ہونے کے درمیان دائر رہے گا۔ یہ حکم اس امر میں ہے کہ اگر وہ مشرع اعظم صلی اللہ علیہ وسلم پر پیش کیا جائے جو حلال و حرام کی خبر دیتے ہیں بلکہ حلال و حرام کا حکم دیتے ہیں تو ان امور کی ممانعت کیسے ہو سکتی ہے جو بالکل آپ ﷺ پر پیش ہی نہیں کیے گئے یا جن کا وجود بالکلیہ آپ ﷺ کے سامنے آیا ہی نہیں جنہیں ترک عدمی کا نام دیا جاتا ہے۔ البتہ اسے ترک کا نام دینا مجازاً ہے یا اس لیے کہ اس نام میں وسعت ہے' ورنہ وہ اصلاً موجود نہیں حتیٰ کہ کہا جائے کہ وہ متروک ہے۔ اگر میرا اجتہاد صحیح ہو تو میں اس پر "ترک موہوم" کا اطلاق کروں' پس ایک طالب کے لیے کیسے صحیح ہو سکتا ہے چہ جائیکہ ایک عالم اسے رد' اعتراض اور انکار میں حجت اور دلیل بنائے؟ بلاشبہ یہ صریح جہالت ہے۔

رہا عقلاً تو یہ ظاہر ہونے کے بعد کہ یہ نوع اصلاً موجود نہیں۔ صحیح اور سلیم عقل کا تقاضا ہے کہ وہ امور کو ترازو پر رکھے اور مصلحہ و مفسدہ اور تحسین و تقبیح کو واضح کرے تو عقل کا فیصلہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے زمین کو اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا تاکہ وہ اس کے اندر مخفی تمام منافعوں سے فائدہ اٹھائیں اور دنیا میں اپنی زندگی اور معیشت کے تقاضا کے مطابق انہیں استعمال کریں اور جب امر مضر اور مفسد آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی شریعت اس سے خبردار کرنے میں غفلت نہیں برتتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسل عظام کی زبانوں پر اور کتب سماویہ میں اس کی ممانعت کا ڈنکا بجا دیتی ہے۔

شیخ ابن تیمیہ کا فتویٰ

شیخ امام ابن تیمیہ کا اپنے فتاویٰ میں کلام موجود ہے جو ہمارے اس موضوع کے قریب ہے' جو انہوں نے اپنے کلام کے دوران ان لوگوں کا رد کرتے ہوئے ذکر کیا جو

کہتے ہیں کہ حمام میں داخل ہونا مکروہ ہے یا مستحب نہیں ہے۔ اس لیے کہ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حمام میں داخل ہوئے ہیں اور نہ ہی ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما۔ چنانچہ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ:

کسی کے لیے روا نہیں کہ وہ اس بناء پر دخول حمام کو مکروہ یا عدم مستحب کہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حمام میں داخل نہیں ہوئے اور نہ ہی ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما۔ کیونکہ اس کا حجت ہونا تب صحیح تھا اگر وہ دخول حمام سے منع کرتے یا قصداً اس سے اجتناب کرتے یا حمام میں داخل ہونے کا امکان ہوتا اور وہ داخل نہ ہوتے۔ اور یہ معلوم ہے کہ اس وقت ان کے شہروں میں حمام نہیں تھا۔ لہٰذا عدم دخول کی وجہ سے اس عمل کو مکروہ یا عدم مستحب کہنا صحیح نہیں۔ البتہ یہ کہہ لیں کہ اس وقت دخول حمام کی شرط مفقود تھی جو کہ قدرت اور امکان ہے۔

یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ساری زمین میں جو طرح طرح کی خوراک' لباس' سواریاں اور مکانات پیدا فرمائے' ان میں سے ہر ایک نوع حجاز مقدس میں موجود نہ تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نوع کا طعام اور پھل تناول نہیں فرمایا اور نہ ہی ہر قسم کا لباس زیب تن فرمایا۔ پھر وہ مسلمان جو دیگر ممالک میں سکونت پذیر تھے' مثلاً شام' مصر' عراق' یمن' خراسان' ارمینیہ' آذربائیجان اور مغرب وغیرہ تو ان کے پاس طرح طرح کے طعام اور لباس تھے جو اندرون ملک تیار ہوتے تھے یا بیرون ممالک سے منگوایا کرتے اور انہوں نے یہ گمان تک بھی نہیں کیا کہ اس طعام اور لباس سے نفع لینا سنت نہیں اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مثل نہ کھایا اور نہ پہنا۔ کیونکہ عدم نقل دراصل عدم دلیل ہے۔ اسے ایک دلیل شرعی قرار دینا ضعیف ترین قول ہے۔ اس پر علماء کا اتفاق ہے اور وہ تمام دلائل جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے متعلق ہیں۔ جیسے امر' نہی اور اذن جو اللہ تعالیٰ کے فرمان سے ثابت ہیں۔ بلاشبہ وہ اقویٰ اور اکبر ہیں اور ایک

معین دلیل کے عدم سے تمام ادلہ شرعیہ کا عدم لازم نہیں آتا۔

اور اسی طرح صحابہ کا اجماع ایک قوی شرعی دلیل ہے اور صرف دلیل معین کے نہ ہونے کی وجہ سے استحباب کے حکم کی نفی کرنا اور باقی ادلہ میں غور و خوض نہ کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا۔ (حم السجدہ: ۱۰)
اور اس میں اس کے بسنے والوں کی روزیاں مقرر کیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ (البقرہ: ۲۹)
وہی ہے جس نے تمہارے لیے بنایا جو کچھ زمین میں ہے۔

اور ارشاد پروردگار ہے:

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ۔ (الجاثیہ: ۱۳)
اور تمہارے لیے کام میں لگائے جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں۔

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ (النحل: ۸)
اور گھوڑے اور خچر اور گدھے کہ ان پر سوار ہو اور زینت کے لیے اور وہ پیدا کرے گا جس کی تمہیں خبر نہیں۔

حالانکہ بغال (خچر) سرزمین عرب پہ موجود نہیں تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خچر پر سواری نہ فرمائی مگر اس خچر پر جو صلح حدیبیہ کے بعد مقوقس نے مصر کی سرزمین سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بطور ہدیہ بھیجا اور یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اور اسی طرح قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ان نعمتوں کا احسان جتایا جو زمین حجاز میں نہ تھیں۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلٰى طَعَامِهٖ	تو آدمی کو چاہیے اپنے کھانوں کو دیکھے
اِنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا	کہ ہم نے اچھی طرح پانی ڈالا پھر زمین کو
الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا	خوب چیرا تو اس میں اگایا اناج اور انگور اور
وَّعِنَبًا وَّ قَضْبًا وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا	چارہ اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغیچے اور
وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا۔	میوے اور دوب۔

(عبس: ۲۴-۳۱)

حالانکہ حجاز مقدس کی سرزمین میں زیتون نہیں تھا اور نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیتون تناول فرمایا لیکن ممکن ہے کہ باہر سے منگوایا جاتا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جل شانہ نے فرمایا:

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ۔ (التین: ۱) انجیر کی قسم اور زیتون کی۔

حالانکہ زمین حجاز میں نہ انجیر تھی نہ زیتون۔ اور نہ ہی یہ منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے کسی ایک کو تناول فرمایا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی:

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ	اور وہ پیڑ پیدا کیا کہ طور سینا سے نکلتا
سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ	ہے، لے کر اگتا ہے تیل اور کھانے والوں
لِّلْاٰكِلِيْنَ۔ (المومنون: ۲۰)	کے لیے سالن۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کلوا الزیت وادھنوا بہ فانہ	زیتون کھاؤ اور اس کا تیل لگاؤ۔ بے
من شجرہ مبارکہ۔	شک یہ بڑی برکت والا درخت ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ	وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے موتی سا
دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ	چمکتا روشن ہوتا ہے برکت والے پیڑ زیتون

زَيْتُونَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ۔ (النور: ۳۵)

سے جو نہ پورب کا نہ پچھم کا، قریب ہے کہ اس کا تیل بھڑک اٹھے اگرچہ اسے آگ نہ چھوئے۔

اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

حَدَآئِقَ غُلْبًا۔ (عبس: ۳۰)

گھنے باغیچے۔

اور اسی طرح دریا کے متعلق ارشاد خداوندی ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا۔ (النحل: ۱۴)

اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے دریا مسخر کیا کہ اس میں سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور اس میں سے گہنا نکالتے ہو جسے پہنتے ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحَانَ الَّذِىْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ۔

(الزخرف: ۱۲-۱۴)

اور تمہارے لیے کشتیوں اور چوپایوں سے سواریاں بنائیں کہ تم ان کی پیٹھوں پر ٹھیک بیٹھو پھر اپنے رب کی نعمت یاد کرو جب اس پر ٹھیک بیٹھ لو اور یوں کہو پاکی ہے اسے جس نے اس سواری کو ہمارے بس میں کر دیا اور یہ ہمارے بوتے نہ تھی۔

حالانکہ نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریائی سفر کیا اور نہ ہی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے۔ البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام حرام بنت ملحان اپنی امت کے ان افراد کی خبر دی جو فی سبیل اللہ لڑنے کے لیے بحری سفر کریں گے اور ام حرام نے

عرض کیا: اللہ سے دعا کرو کہ میں بھی ان میں سے ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انت منهم۔ تو بھی ان میں سے ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ وہ کھائے جو اسے اپنی زمین میں میسر آئے اور وہ پہن لے جو اسے ملے اور اس پر سواری کرے جو اسے اپنے علاقے میں دستیاب ہو تو وہ سنت مطہرہ کا پیروکار ہے۔ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شہر (مدینہ منورہ) سے بیت اللہ کا حج کیا تو جو شخص اپنے شہر سے بیت اللہ کا حج کرے گا وہ ضرور سنت کا متبع ہو گا اگرچہ یہ وہ شہر نہیں جہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصد فرمایا تھا۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار' مشرکین اور اہل کتاب سے جہاد کیا کرتے اور جو شخص آج ان سے جہاد کرے گا وہ متبع سنت ہو گا اگرچہ ان کی نوع ان سے الگ ہے۔ کیونکہ ان میں اکثر عربی تھے اور وہ شرک کی ایک نوع پر ڈٹے ہوئے تھے اور اب جو ترکی' ہندی وغیرہ سارے مشرکین سے جہاد کرے گا گویا کہ اس نے وہی کیا جو اللہ تعالیٰ کا حکم تھا اگرچہ ان کے بت وہ نہیں جو پہلے مشرکوں کے تھے۔

اور آج جو بھی یہود و نصاریٰ سے جہاد کرے گا گویا اس نے سنت کی پیروی کی۔ اگرچہ ان یہود و نصاریٰ کی نوع ان سے مختلف ہے جن سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود مدینہ سے جہاد فرمایا جیسے قریظہ' نضیر' بنو قینقاع اور یہود خیبر اور نجران کے نصاریٰ پر جزیہ مقرر کیا اور غزوۂ تبوک میں شام کے نصاریٰ سے جہاد کیا جن میں عربی بھی تھے اور رومی بھی اور وہاں قتال نہ ہوا اور زید' جعفر اور عبداللہ بن رواحہ کی قیادت میں ان کے خلاف لشکر بھیجا جنہوں نے غزوۂ موتہ میں ان سے قتال کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

امیر کم زید فان قتل فجعفر — تمہارا امیر زید ہے اگر وہ شہید ہو جائیں

فان قتل فعبداللہ بن رواحۃ۔ تو جعفر' اگر وہ شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ۔

اور اہل بحرین (مجوسی) سے جزیہ پر صلح کی اور وہ لوگ اہل ہجر ہیں۔ اور صحیح میں ہے کہ بحرین سے مال آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں رکھ کر تقسیم کیا اور یہ باب بڑا وسیع ہے جس کو ہم نے اور مقام پر خوب بسط سے بیان کیا ہے اور ہم نے سنت اور بدعت میں امتیاز واضح کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ سنت وہ ہے جس پر دلیل شرعی قائم ہو بایں صورت کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہو۔ چاہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کیا گیا ہو یا اس وجہ سے نہ کیا گیا ہو کہ اس وقت اس فعل کا کوئی مقتضی نہ ہو یا اس سے کوئی مانع موجود ہو۔

پس جب یہ ثابت ہو جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے یا اسے پسند کیا ہے تو وہ سنت ہے۔ جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دو اور جس طرح صحابہ نے قرآن کو مصحف میں جمع کیا' اور جس طرح مسلمانوں نے مسجد میں رمضان کے باجماعت قیام پر ہیشگی کی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا تکتبوا عنی غیر القرآن' ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ۔ مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہے تو اسے مٹادے۔

گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی کتابت کو جائز قرار دیا اور حدیث کی کتابت سے اولاً منع فرمایا اور یہ جمہور علماء کے نزدیک منسوخ ہے اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمرو کو اجازت دی کہ وہ جو سنے اسے لکھ لے چاہے غصہ کی حالت میں ہو یا خوشی کی حالت میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو شاہ کو

اجازت دی کہ وہ یوم فتح کا خطبہ لکھ لے اور عمرو بن حزم کو جب نجران پر عامل بنایا تو ان کے لیے ایک بڑا تحریر نامہ لکھا گیا۔ اور بھی ایسے شواہد ملتے ہیں۔

یہاں مقصود یہ ہے کہ قرآن کی کتابت جائز ہے لیکن اسے ایک مصحف میں دور رسالت میں جمع نہیں کیا گیا کیونکہ اس کا نزول یکبارگی تام نہیں ہوا؟ اور کبھی ایک آیت نزول کے بعد منسوخ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی اور زیادتی کے باعث قرآن ایک مصحف میں جمع نہ ہو سکا یہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور اسی طرح قیام رمضان، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الرجل اذا قام مع الامام	جو شخص امام کے ساتھ قیام کرے حتیٰ
حتی ینصرف کتب له قیام	کہ چلا جائے تو اس کے لیے رات بھر کا قیام
لیلة.	لکھ دیا جاتا ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہینے کے شروع میں صحابہ کے ساتھ دو رات قیام کیا اور مہینہ کے آخر میں چند راتیں قیام کیا اور لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تنہا تنہا اور جماعت کے ساتھ بھی نماز پڑھا کرتے تھے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ جماعت پر ہمیشگی اختیار نہیں کی۔ محض اس خوف سے کہ کہیں یہ ان پر فرض نہ ہو جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد یہ خوف ختم ہو گیا۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے جسے اہل سنن نے روایت کیا اور ترمذی وغیرہ نے اسے صحیح کہا:

علیکم بسنتی وسنة	تم پر میری اور خلفائے راشدین کی
الخلفاء الراشدین	سنت لازم ہے۔ وہ میرے بعد ہدایت یافتہ
المهدیین من بعدی'	ہیں۔ اس کے ساتھ چمٹے رہو اور اس پر
تمسکوا بها وعضوا علیها	داڑھیں گاڑ لو اور نئے نئے امور سے بچو'

بالنواجذ' وایاکم ومحدثات الامور' فان کل بدعة ضلالة۔ بے شک ہر بدعت گمراہی ہے۔

لہذا جو خلفائے راشدین کی سنت ہو وہ بدعت شرعیہ نہیں کہ اس سے منع کیا جائے۔ اگرچہ لغتاً اسے بدعت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی ابتداء ہوئی ہے' جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

نعمت البدعة ھذہ۔ یہ اچھی بدعت ہے۔

اور یہ اچھی چیز ہے جس سے پہلے وہ غافل تھے اور ہم نے "قاعدہ" میں اس پر بسط سے بحث کی ہے۔ (مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ: ۲۱/ ۳۱۳-۳۱۹)

دلیل عدمی کے استعمال میں افراط

بعض متاخرین نے عدم اور ترک سے اشیاء پر حرمت یا مذمت کا اکثر استدلال کیا ہے اور ان ہٹ دھرموں نے دلیل عدمی کے استعمال میں اس دلیل سے افراط کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں کیا یا یہ دلیل کہ خلفائے راشدین نے یہ نہیں کیا۔ یہ ان کی کھلی جہالت ہے اور مریض عقل کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ ان حضرات کا ترک کسی عذر کی وجہ سے ہوتا ہے جو ان کو اس وقت لاحق تھا یا اس سے افضل عمل کی خاطر یا ہو سکتا ہے کہ سب کو اس کا علم نہ پہنچا ہو اور اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) اصولیوں نے سنت کی تعریف یہ کی ہے کہ سنت وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول' فعل اور تقریر ہو اور انہوں نے تعریف میں اسے شمار نہیں کیا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک فرمایا ہو کیونکہ وہ دلیل نہیں۔

(۲) بے شک حکم اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے اور اصولیوں نے ذکر کیا ہے کہ یہ وہ ہے جس پر قرآن نے سنت' اجماع یا قیاس دلالت کرے اور ترک ان میں سے کسی کا بھی مدلول نہیں لہذا یہ دلیل نہیں۔

(۳) ترک عدم فعل کا نام ہے اور عدم فعل دلیل کا تقاضا کرتا ہے۔ لہذا ترک

تحریم کا تقاضا نہیں کرتا مگر قرآن و سنت یا اجماع وقیاس کی دلیل یا قرینہ کے ساتھ۔

محض ترک کی وجہ سے تحریم یا کراہت کے حکم پر علماء کی گرفت

جس نے محض ترک کی بناء پر شے کی تحریم یا کراہت پر استدلال کیا' علماء نے اس کا تعاقب کیا جس کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

(۱) جس نے حمام میں داخل ہونے کو حرام یا مکروہ اس بنیاد پر کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں داخل نہیں ہوئے تو شیخ ابن تیمیہ نے اس کا تعاقب کیا جیسا کہ بالتفصیل پہلے گزر گیا۔

(۲) بعض نے یہ کہا کہ نمازوں کے بعد دعا مکروہ ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا اور نہ ہی خلفائے راشدین میں سے کسی نے کیا۔ تو ابو سعید بن لب اس قول کا تعاقب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نمازوں کے بعد دعا کے منکر کی حتمی دلیل یہ ہے کہ اس طریقے کا التزام سلف نے نہیں کیا۔ فرض کریں کہ یہ بات صحیح ہے تو ترک اس متروک میں اس حکم کو ثابت نہیں کرتا مگر اس کا تقاضا یہ ہے کہ ترک جائز ہے اور کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ رہا اس پر تحریم یا کراہت کا قول کرنا تو یہ صحیح نہیں۔ خصوصاً ان مسائل میں جن کی اجمالی اصل شرع میں موجود ہے' جیسے دعا۔

(حسن التفهم والدرک: ۱۴۱)

عقد نکاح کے بعد قرات فاتحہ کا مسئلہ

اکثر اسلامی ریاستوں میں یہ رواج ہے کہ وہ عقد نکاح کے بعد صلاح و توفیق کی نیت سے تبرکاً فاتحہ کی قرات کرتے ہیں یا فوت شدگان کے ذکر اور ان کے لیے دعا کے وقت یہ عمل کرتے ہیں تو یہ جائز ہے اس میں کوئی حرج نہیں اور منکر کی دلیل یہ ہے کہ

اسے نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور نہ ہی سلف صالحین نے۔

ایک منکر سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو وہ بہت پیچ و تاب کھاتا ہوا اس کے انکار پر اتنی شدت سے ڈٹ گیا کہ گویا یہ ان محرکات میں سے ہے جن کی حرمت قطعی ہے اور جن پر نص وارد ہوئی ہے اور اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ کے زمرے میں داخل کیا اور کبیرہ گناہ قرار دیا اور مزید یہ کہ اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے تحت داخل کیا:

من كذب علي متعمدا فليتبوا مقعده من النار۔	جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت:

وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا۔ (الاعراف: ۳۳)	اور یہ کہ اللہ کا شریک کرو جس کی اس نے سند نہ اتاری۔

نوٹ: اس منکر کا قول جریدۃ المسلمون عدد ۵۱۱، الجمعہ ۱۵/ ۶/ ۱۴۱۵ھ میں ملاحظہ ہو۔

تو ایسا رسوا کن اور روح فرسا کلام جو فکر جامد اور فہم سقیم کا نتیجہ ہے قرآن و سنت کی روشنی میں کہاں ملتا ہے۔ میں (مالکی) کہتا ہوں علمائے سابقین رحمہم اللہ تعالیٰ کے کلام میں یہ عبارت کہاں ہے اور کہاں ہیں ایسے جملے جن میں انہوں نے شریعت اسلامیہ کی وسعت کے باوجود تسامح اور تساہل سے کام لیا۔ حالانکہ گزشتہ اور آئندہ امور میں ان کی نصوص آپ کے سامنے ہیں۔

(۳) مالکیہ اور حنفیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھنا مکروہ ہے۔ جس کی دلیل ابراہیم نخعی کا یہ قول ہے کہ حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم یہ نہیں پڑھا کرتے تھے تو علامہ ابن حزم نے (المحلی: ۲/ ۲۵۴) میں ان کا بایں الفاظ تعاقب کیا کہ اگر یہ صحیح بھی ہے تو حجت نہیں کیونکہ اس میں یہ نہیں کہ ان اصحاب

رضی اللہ عنہم نے ان دو رکعت سے منع کیا ہو۔

(۴) اور اسی طرح ہی عصر کے بعد دو رکعت پڑھنے پر بھی کلام ہے جس کے بارے علامہ ابن حزم نے کہا کہ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث قطعاً حجت نہیں۔ کیونکہ اس میں انہوں نے صرف اپنے علم کی خبر دی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دو رکعت پڑھتے نہیں دیکھا۔ اور اس میں یہ نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہو۔ لہٰذا ان میں کراہت نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے علاوہ کبھی کوئی پورا مہینہ روزے نہیں رکھے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پورے مہینہ کے نفلی روزے رکھنا مکروہ ہے۔

دعا میں ہاتھ اٹھانے کا مسئلہ

(اس کی پوری بحث پہلے گزر گئی ہے۔)

سید عبداللہ بن صدیق غماری دعا میں ہاتھ اٹھانے کے منکر کا تعاقب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کا خیال ہے کہ یہ بدعت ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں کیا۔ فرماتے ہیں کہ ایک شے کا ترک اس کی ممانعت پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ وہ نہی نہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ	اور جو کچھ تمہیں رسول عطا فرمائیں وہ لو
وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔(الحشر:۷)	اور جس سے منع فرمائیں باز رہو۔

اللہ تعالیٰ نے "وما نھکم عنہ" فرمایا ہے یہ نہیں فرمایا کہ "وما ترکہ فانتھوا عنہ" (جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترک فرمایا اس سے باز رہو)

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا امرتکم بامر فاتوا منہ ما استطعتم واذا نھیتکم عن شئی فاجتنبوہ۔	جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو حسب استطاعت اسے بجلاؤ اور جب میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں تو اس سے باز رہو۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی واذا نھیتکم اوراذا ترکت شیئا نہیں فرمایا کہ جب میں کوئی چیز ترک کروں تو تم اس سے باز رہو۔ پس معلوم ہوا کہ ترک شے اس کی ممانعت پر دال نہیں ہوتا بلکہ اس کے جواز ترک پر دال ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نماز چاشت کو ترک فرمایا تو اس کا ترک صرف اس امر پر دال ہے کہ اس کا ترک جائز ہے۔ اگر واجب ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ترک نہ فرماتے۔ اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کبھی کبھی دعا میں رفع یدین کو ترک فرمانا اس کے جواز ترک پر دال ہے نہ کہ اس امر پر کہ وہ ممنوع ہے۔

(مقدمہ منیہ رفع الیدین فی الدعاء بتعلیق شیخنا السید عبداللہ بن الصدیق الغماری)

اور ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ وہ بدعت جو فروع سے متعلق ہے' وہ گمراہی نہیں۔ کیونکہ جملہ حوادث جو مرور زمانہ کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں' ان کا حکم شریعت کے ان عام دلائل و قواعد سے اخذ کیا جاتا ہے جو مصلحتوں کی ترویج اور مفاسد کی روک تھام پر مبنی ہیں۔ اور ان کا وجود عہد نبوی میں نہ ہونے یا آپ ﷺ کا وہ فعل نہ ہونے کا یہ تقاضا نہیں کہ وہ حرام ہو چہ جائیکہ وہ گمراہی ہو۔

(حسن التفہم والدرک)

شریعت اسلامیہ کے دو اصول

شریعت اسلامیہ جو قواعد کلیہ جامعہ سے عبارت ہے اس کے دو جامع قاعدے یہاں بیان کرنا مقصود ہے۔

یاد رہے کہ شریعت اسلامیہ مضبوط کلیات اور جامع قواعد کی حامل ہے اور ہر کلیہ پر الگ الگ اصول و احکام مرتب ہوتے ہیں۔ جنہیں ایک عارف باللہ عالم دین پیش آنے والے امور کے پیش نظر بنیادی اصولوں سے استخراج کرتا ہے جو شارع کے مقصد کے عین مطابق ہوتے ہیں اور ان قواعد جامعہ میں سے ایک قاعدہ عبادات کا ہے

جو درج ذیل ہے:

عبادات کا قاعدہ

عبادات کا قاعدہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عبادت نہ کی جائے مگر جائز طریقے سے۔ اور اسی لیے عبادات تمام کی تمام توقیفی ہیں۔ ان کا علم صرف بارگاہ ایزدی کی طرف سے ہوتا ہے۔ کیونکہ وہی جانتا ہے جس سے وہ راضی ہوتا ہے اور جس سے راضی نہیں ہوتا اور اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر اپنی کتاب میں اس کے تمام تر متعلقات بیان کر دیے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی عبادت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اور سلف صالحین کی اتباع میں ہوگی۔

معاملات کا قاعدہ

قاعدہ یہ ہے کہ "معاملات مطلق ہیں یعنی مطلقاً جائز ہیں حتیٰ کہ منع معلوم ہو جائے۔" اس قاعدہ کی روشنی میں وہ امور محل نظر ہیں جن سے شارع علیہ السلام نے خاموشی فرمائی اور جن کے بارے میں یہ وارد نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا یا منع فرمایا یا اختیار دیا۔ اس موضوع میں گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ جن معاملات کے بارے میں شارع علیہ السلام نے سکوت فرمایا اور وہ ضرر پر مشتمل نہیں تو اس میں اصل صحت (صحیح ہونا) ہے۔ اور اس وجہ کی دلیل یہ ہے کہ عقود اور معاملات لوگوں کی عادات اور عرف پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس قاعدہ پر جاری ہیں جن کے بارے نہی وارد نہیں۔ اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (الانعام: ۱۴۰)

وہ تم سے مفصل بیان کر چکا جو کچھ تم پر حرام ہوا۔

اس فرمان عالیشان کا تقاضا ہے کہ ہر شے حلال ہے مگر جس کی حرمت کتاب و

سنت میں بیان کر دی گئی ہے۔ لہٰذا ہر شرط' عقد یا معاملہ جس سے شارع علیہ السلام کا سکوت ہو اس پر حرمت کا فتویٰ دینا جائز نہیں جب تک اس کی ممانعت پر دلیل نہ وارد ہو یا اس کا ضرر پر مشتمل ہونا واضح نہ ہو جائے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سے سکوت رحمت ہے نسیان نہیں۔ جیسا کہ امام ترمذی نے "السنن' کتاب اللباس" میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الحلال ما احل الله فی كتابه والحرام ما حرم الله فی كتابه وما سكت عنه فهو مما عفا عنه۔ (ترمذی)

حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال ٹھہرایا اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام ٹھہرایا اور جس سے سکوت فرمایا اس کی معافی ہے۔

اور اس کی مثل ہی جو امام دار قطنی نے ابو ثعلبہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الله فرض فرائض فلا تضيعوها وحد حدودا فلا تعتدوها وسكت عن اشياء رحمه بكم غير نسيان فلا تبحثوا عنها۔
(سنن دار قطنی' کتاب الرضاع: ۴ / ۱۸۴)

بے شک اللہ نے فرائض کو فرض کیا تم انہیں ضائع مت کرو اور حدود کو مقرر کیا تم ان سے تجاوز نہ کرو اور بعض اشیاء سے سکوت فرمایا جو تم پر رحمت ہے نسیان نہیں۔ لہٰذا تم ان کے بارے میں بحث نہ کرو۔

ان احادیث و آیات سے معلوم ہوا کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے۔ جب تک کوئی خاص دلیل وارد نہ ہو جو اس کے خلاف پر دلالت کرے۔ علمائے شریعت کے اس قول کا یہی معنی و مفہوم ہے کہ "معاملات مطلقاً صحیح ہیں جب تک منع معلوم نہ ہو جائے۔"

اجتماعی فقہی اسلامی پارلیمنٹ کا فیصلہ

الحمد للہ وحدہ والصلوۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ سیدنا ونبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اما بعد!

عالم اسلام کے ساتھ دسویں دورہ میں مکہ مکرمہ کی مقدس سرزمین پر اجتماعی فقہی اسلامی کنونشن منعقد ہوا جو بروز ہفتہ ۲۴ صفر المظفر ۱۴۰۸ھ بہ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۷ء سے بروز بدھ ۲۸ صفر ۱۴۰۸ھ بہ مطابق ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۷ء تک جاری رہا جس کا موضوع لائق اتباع مذاہب کے درمیان فقہی اختلاف میں غور و فکر کرنا تھا۔ اور اس قابل مذمت تعصب کے بارے میں سوچنا تھا جو بعض پیروکار اپنے مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں کو اس قدر تعصب کا نشانہ بناتے ہیں کہ اعتدال کی حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور دوسرے مذاہب اور اس کے علماء کو طعن و تشنیع کا اعزاز دینے تک زبان دراز ہو جاتے ہیں۔ اس کنونشن میں وہ تمام تر مسائل سامنے رکھے گئے جو نئی عقول عصریہ میں واقع ہوتے ہیں اور ان کے تصورات میں جنم لیتے ہیں اور یہ مشکلات مذاہب کے اختلاف کے اردگرد گھومتی ہیں اور وہ لوگ ان کی بنیاد اور معنی سے ناواقف ہوتے ہیں اور گمراہ کرنے والے ان پر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ جب شرع اسلامی ایک ہے اور اس کے اصول بھی قرآن وسنت سے متحد ہیں تو مذاہب کا اختلاف کیونکر ہے؟ اور یہ اتحاد کیوں ممکن نہیں کہ مسلمان احکام شرعیہ کے لیے ایک مذہب اور ایک سوچ پر متحد ہو جائیں؟ جس طرح کنونشن میں مذہبی تعصب اور جدید مشکلات کا مسئلہ اٹھایا گیا' وہاں ایک نیا عصری فتنہ بھی سامنے آیا کہ بعض حضرات ایک نئے اجتہادی رخ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور ان مذاہب ثابتہ میں طعن کرتے ہیں جنہیں قدیم ادوار اسلامیہ سے امت نے قبول کر رکھا ہے اور ان مذاہب کے ائمہ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں یا بعض کو گمراہ ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اور اس طرح وہ

لوگوں میں فتنہ اور انتشار برپا کرتے ہیں۔

اس موضوع پر بسیار بحث و تمحیص کے بعد اور خیر خواہی کے جذبے سے سرشار ہو کر غور و فکر کرنے کے بعد اس موضوع کی تمام تر مشکلات ' ملابسات اور نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے اس فقہی پارلیمنٹ نے ان دو متعصب اور گمراہ کن فریقین کی نسبت جو فیصلہ کیا ' وہ دو اجزاء پر مشتمل ہے۔

(ا) مذاہب کا اختلاف:

بے شک مذاہب کا فکری اختلاف جو بلاد اسلامیہ میں جاری ہے ' اس کی دو قسمیں ہیں:

۱- مذاہب اعتقادیہ میں اختلاف۔

۲- مذاہب فقہیہ میں اختلاف۔

جہاں تک اعتقادی اختلاف کا تعلق ہے تو لامحالہ یہ فی الواقع ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔ اس نے بلاد اسلامیہ کی یکجہتی کو تباہ کر دیا ہے اور مسلمانوں کی صفوں کو منتشر اور ان کے کلام کو جدا جدا کر دیا ہے۔ اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے اور اس کا نہ ہونا ضروری ہے اور امت مذہب اہل السنہ والجماعہ کے پلیٹ فارم پر جمع ہو جو فکر اسلامی کا صحیح ترجمان ہے۔ جو فکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں تھی جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں الفاظ اعلان فرمایا:

علیکم بسنتی وسنہ الخلفاء الراشدین من بعدی تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ۔	تم پر میری اور خلفائے راشدین کی سنت لازم ہے میرے بعد ان کی سنت سے تمسک کرو اور ان پر داڑھیں گاڑ دو۔ (یعنی مضبوطی سے قائم رہو)

رہا بعض مسائل میں مذاہب فقہیہ کا اختلاف ' تو اس کے علمی اسباب ہیں جو اس

کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کی حکمت بالغہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کے لیے ہے اور اس سے اللہ کے بندوں پر رحمت ہے اور نصوص سے احکام مستنبط کرنے کا میدان وسیع ہے۔ پھر اس کے بعد یہ نعمت ہے اور فقہی شرعی دولت ہے جس نے امت اسلامیہ کو امر دین اور شریعت میں وسعت دی ہے کہ ایک شرعی تطبیق میں حصر نہیں کہ اس کے علاوہ کسی اور تطبیق کی گنجائش نہ ہو بلکہ جب کسی وقت اور کسی معاملہ میں امت پر کسی ایک فقہی امام کا مذہب تنگ ہو جائے تو وہ گنجائش، نرمی اور آسانی کے پیش نظر دوسرے مذہب سے لے لے۔ چاہے عبادات کا مسئلہ ہو یا معاملات کا۔ خاندانی معاملات ہو یا معاشرتی اور چاہے جنایات کا مسئلہ ہو۔ اسے ادلہ شرعیہ کی روشنی میں قبول کرے۔

یہ اختلاف مذاہب کی دوسری قسم ہے اور یہ فقہی اختلاف ہے۔ جو نہ نقص ہے اور نہ ہی ہمارے دین میں تناقض ہے اور اس کا نہ ہونا ممکن بھی نہیں۔ اور اس سلسلے میں کوئی کامل شرعی نظام ایسا موجود نہیں جس میں اجتہاد کا دروازہ بند ہو اور یہ فقہی اختلاف نہ ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ اس اختلاف کا نہ ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ نصوص اصلیہ کثیر ہیں جو اکثر معانی کا احتمال رکھتی ہیں۔ جیسا کہ یہ ممکن نہیں کہ نص جمیع وقائع محتملہ کو محیط ہو کیونکہ نصوص محدود ہیں اور وقائع غیر محدود ہیں۔ جیسا کہ علماء رحمہم اللہ تعالیٰ کی ایک جماعت کا قول ہے۔ تو ضروری ہے کہ قیاس و نظر کے ساتھ احکام کی علتوں، شارع کی غرض اور شریعت کے مقاصد عامہ کی طرف توجہ کی جائے اور وقائع اور نئے پیش آنے والے امور پر مناسب حکم لگایا جائے اور اس میں علماء کی سوچیں مختلف ہوتی ہیں اور متعدد احتمالات میں سے اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں تو ایک موضوع میں ان کے احکام مختلف ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک حق کا طالب ہوتا ہے اور اس سے بحث کرتا ہے تو جس کا اجتہاد درست ہو اس کے لیے دو اجر ہوتے ہیں اور جو غلطی پر ہو، اسے ایک اجر ملتا ہے۔ اور یہاں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور حرج ختم ہو جاتا ہے۔

لہٰذا اس مذہبی اختلاف میں کوئی نقص نہیں بلکہ اس میں خیر و رحمت ہے جو ہم نے واضح کر دیا اور فی الواقع یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے ایمان والے بندوں پر رحمت ہے۔ اور کبھی کبھی یہ عظیم شرعی دولت کی بنا پر عظیم نعمت ثابت ہوتی ہے کہ اس سے امت اسلامیہ اجاگر ہوتی ہے لیکن ہر طرف سے کچھ گمراہ کرنے والے ثقافت اسلامیہ کو کمزور کرنے کے لیے نوجوان مسلمانوں کے در پے ہیں اور غلو سے کام لیتے ہیں۔ اور دوران تعلیم وہ اپنے ہاں انہیں اختلاف مذاہب فقہیہ کا کچھ اس طرح تصور دیتے ہیں جیسے یہ اعتقادی اختلاف ہے تاکہ ان کے ضمیر میں ظلمت اور جھوٹ کو منتقل کیا جائے جو شریعت اسلامیہ کے تناقض پر دلالت کرے۔ نہ یہ کہ انہیں ان دونوں قسموں کے درمیان فرق اور امتیاز سے آگاہ کیا جائے۔

(۲) اور ایک دوسرا گروہ ہے جو جمیع مذاہب کو چھوڑنے کی دعوت دیتا ہے اور ایک جدید خط اجتہادی پر لوگوں کو ابھارتا ہے۔ اور پہلے سے ثابتہ مذاہب فقہیہ میں طعن کرتا ہے اور ان کے ائمہ کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ ہمارے آج کے اس بیان میں جو مذاہب فقہیہ کی خصوصیات اور ان کے ائمہ کے بارے میں ہے' یہ ضروری قرار دینا ہے کہ وہ لوگ اس قابل مذمت طریقے سے باز آئیں جس کے ذریعے وہ لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہیں اور مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رہے ہین اور کبھی ان کے کلام میں تفریق کرتے ہیں۔ اس وقت ہمیں مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اسلام دشمنوں کے مقابلے میں بھاری قوت حاصل ہو نہ کہ ایسی دعوت کی جو تفریق پیدا کرے' اس کی کوئی حاجت نہیں۔

وصلى الله على سيدنا محمد وعلى آله وصحبه وسلم تسليما كثيرا والحمد لله رب العالمين۔

اس فیصلے پر مندرجہ ذیل علماء اسلامیہ کی مہریں اور دستخط موجود ہیں۔

اجتماعی پارلیمنٹ کے سربراہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز اور نائب سربراہ

عبداللہ بن نصیف محمد بن جبیر ' بکر عبداللہ ابو زید ' عبداللہ العبد الرحمٰن البسام ' صالح بن فوزان الفوازن ' محمد بن عبداللہ بن سبیل ' مصطفیٰ احمد الزرقاء ' محمد محمود الصواف ' ابوالحسن علی الندوی ' محمد رشید راغب قبانی ' محمد شاذلی النیفر ' ابوبکر جومی ' احمد فہمی ابو سنہ ' محمد حبیب بن الخوجہ ' محمد سالم بن عبدالودود ' طلال عمر بافقیہ۔

(اجتماعی فقہی اسلامی پارلیمنٹ کا فیصلہ)

جو حضرات اس دورہ میں شریک ہونے سے معذور رہے ان کے اسماء یہ ہیں:
ڈاکٹر یوسف قرضاوی ' شیخ صالح بن عثیمین ' شیخ عبدالقدوس ہاشمی ' لواء رکن محمود شیت خطاب ' شیخ حسنین محمد مخلوف اور شیخ مبروک مسعود عوادی۔

(قرارات المجمع ' الدورۃ العاشرۃ ' رابطہ العالم الاسلامی: ۱۴۰۸ھ)

اجتہاد کا دعویٰ اور مذاہب کی پیروی

آج اس دور میں ایک بدعت رائج ہے جسے ہم بعض متعلمین اور علم کی طرف منسوب(۱) حضرات سے سنتے ہیں کہ وہ اجتہاد اور ائمہ مجتہدین کے اقوال کی طرف رجوع کیے بغیر کتاب و سنت سے احکام اخذ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ فی الواقع یہ دعویٰ باطل ' مردود ' مکذوب اور غیر صادق ہے۔ کیونکہ یہ دعویٰ کرنے والوں میں یہ ہمت نہیں کہ وہ اپنے الفاظ اور اپنے منہ سے نکلے ہوئے گراں کلام کو حقیقت ثابت کر سکیں یا اس پر قائم رہیں۔ اس لیے کہ تم انہیں دیکھو گے کہ وہ نصوص کی فہم ' شرح ' استنباط اور اس پر عمل کرنے میں ائمہ سلف سابق یا معاصرین کے کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں لیکن اس کا اعتراف نہیں کرتے اور ہم اس کے لیے اجتہاد کا دروازہ

(۱) حق یہی ہے کہ انہیں علم کی طرف منسوب ہی کہا جائے ' یہی زیادہ مناسب ہے کیونکہ اگر وہ حق و صدق کے متعلم ہوتے تو وہ اپنی حیثیت اور علم کی قدر و قیمت اور ان ائمہ کے مقام کی حقیقت سے واقف ہوتے ' جس کا وہ خود دعویٰ کرتے ہیں۔

بند نہیں کرتے جو اس کا اہل ہے۔ بلکہ ہمارے ہاں مقرر ہے کہ اجتہاد اصول میں سے اول اور اعظم ہے اور وہ پہلا معدن ہے جس کے ذریعے شریعت اسلامیہ نکھر کر سامنے آتی ہے اور شرع اسلامی اجتہاد پر قائم ہے کیونکہ وہ نصوص جو احکام کے بارے میں کتاب و سنت میں موجود ہیں وہ معدود اور محدود ہیں۔ علماء رضی اللہ عنہم نے ذکر کیا ہے کہ وہ آیات جو قرآن میں احکام کے اصول کی حیثیت رکھتی ہیں' ان کی تعداد پانچ سو سے زائد نہیں اور وہ احادیث جو احکام کی اصول ہیں ان کی تعداد بھی پانچ سو ہے جو ہزاروں احادیث میں منتشر ہیں(۱) لہٰذا اس شریعت میں احکام کے اصول قرآن و سنت سے ایک ہزار نص ہے جو اس ضخیم شریعت اسلامیہ کی اساس ہیں' وہ شریعت اسلامیہ جو آج تک باقی ہے اور اس کے منافع اس ملت کے پروانوں کو حاصل ہیں۔

بلاشبہ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ اجتہاد اور استنباط کریں اور اپنے علماء اور مفکرین سے راہنمائی حاصل کریں' چنانچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ایک محکم آیت میں فرماتے ہیں:

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِۦ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُولِى الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهُۥ مِنْهُمْ۔ (النساء: ۸۳)	اور جب ان کے پاس کوئی بات اطمینان یا ڈر کی آتی ہے اس کا چرچا کر بیٹھتے ہیں اور اگر اس میں رسول اور اپنے ذی اختیار لوگوں کی طرف رجوع لاتے تو ضرور ان سے اس کی حقیقت جان لیتے یہ جو بعد میں کاوش کرتے ہیں۔

یہ بالکل صراحت کے ساتھ استنباط اور اجتہاد کی دعوت ہے۔ اسی لیے تاریخ ان فقہاء صحابہ کی نشاندہی کرتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: علامہ ابن قیم کی "اعلام الموقعین" امام سیوطی کی "الاکلیل" اور خطیب شربینی کی "مغنی المحتاج۔"

میں بھی احکام اور فیصلوں میں اجتہاد سے معروف تھے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی واضح کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو کس طرح فیصلوں اور احکام کی تعلیم دیتے تھے اور انہیں فکر و اجتہاد کی آزادی پر ابھارتے' اور اجتہادی خطا کے خوف کے وقت ان کے دلوں کو اطمینان بخشتے۔

مجتہد کا اجتہاد صحیح ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور خطا کرنے والے کے لیے ایک اجر ہے۔ چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا۔	اور تم پر اس میں کچھ گناہ نہیں جو نادانستہ تم سے صادر ہوا' ہاں وہ گناہ ہے جو دل کے قصد سے کرو اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (الاحزاب: ۵)

اور ان واضح دلائل کی روشنی میں اجتہاد کا میدان بڑا وسیع ہے جس پر مسلمانوں کی زندگی فجر اول سے قائم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجتہاد کیا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد پر انہیں ابھارا کرتے اور اس کی برکات سے آگاہ فرماتے اور وہ اس آزادی کو قبول کرتے اور فیصلوں اور نئے امور کو سمجھنے میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے' لیکن وہ اختلاف ان شریف لوگوں کا تھا جو لجاجت اور خصومت سے کوسوں دور تھے۔ نہ ایک دوسرے کو نازیبا القاب سے پکارتے اور نہ ہی تہمت کا نشانہ بناتے اور نہ ہی اپنی رائے کو حرف آخر بتاتے اور نہ ہی فکر کو مقید کرتے۔

اس کی سب سے بڑی ناطق دلیل یہ حدیث بنو قریظہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظہ۔ "کوئی بھی عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ میں۔" تو راستے میں عصر کا وقت ہو گیا۔ بعض نے کہا کہ ہم عصر نہیں پڑھیں گے' جب تک وہاں نہ پہنچ جائیں اور بعض نے کہا بلکہ ہم نماز پڑھیں گے تو یہ واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ذکر کیا گیا تو آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کو بھی غلط قرار نہیں دیا اور ابن عبدالبر نے اس پر تعلیقاً کہا ہے کہ فقہاء کی جماعت کے نزدیک یہ اصول پر اجتہاد کی راہ ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف شہروں میں مقرر کردہ اپنے قاضیوں کو اجتہاد کی اجازت دی اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بہت بڑی نعمت ہے کہ اس نے انہیں قرآن وسنت کی فہم عطا فرمائی نیز اپنے فیصلوں میں غور و فکر کی صلاحیت بخشی۔

روح اسلام کی اسی کامل فہم اور متصل اجتہاد کو شریعت اسلامیہ کی وسعت میں مسلمانوں نے جزیرہ عرب سے لے کر تمام روئے زمین تک پہنچایا بلکہ پہاڑوں کی چوٹیوں تک جہاں کہیں بھی زندگی کا تصور ہے' اور مسلمانوں نے کبھی شریعت کی کمی کو محسوس نہیں کیا اور نہ ہی ایک لمحہ بھی وہ اپنی شریعت کے علاوہ کسی اور قانون کے محتاج ہوئے اور نہ ہی اپنے فقہاء کے علاوہ دوسرے قانون سازوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بلکہ وہ خود اپنے لیے قانون ساز ہیں اور انسانیت کی تکمیل ہے۔ حتیٰ کہ "ویلز" اپنی کتاب "ملامح تاریخ الانسانیہ" میں کہتا ہے کہ "ادریا اوارتی اور تجارتی قوانین کے اعتبار سے اسلام کا بہت بڑا شہر ہے۔"

مسلمانوں کی زندگی پاکیزہ اور صاف ستھری تھی جو صحیح انسانی خطوط پر استوار تھی اور آزادانہ اجتہادی تعلیمات کی فضیلت بھی اسے حاصل تھی جو عالم اسلام کی علامت ہے۔ حتیٰ کہ لوگ اس ربانی راستے سے منحرف ہو گئے اور ان کی سواریوں کے رخ مختلف ہو گئے جو کبھی غرق ہوتیں اور کبھی نجات پاتیں جیسے ڈوبنے والا عریاں نجات پاتا ہے۔

مجتہد کون ہے؟

جب یہ مقرر ہو گیا کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے اور اس کا رستہ آسان اور واضح ہے تو ضروری ہے کہ ہم یہ مقرر کر دیں کہ یہ اس کے لیے ہے جو اس کا اہل اور مستحق

ہے اور اس کو مجتہد کا نام دیا جاتا ہے۔

علامہ شیخ محمد خزرجی اس باب میں فرماتے ہیں کہ جان لو کہ مجتہد میں ان شرائط کا ہونا ضروری ہے کہ وہ لغت کے مفردات اور مشترک الفاظ کا عالم ہو۔ حروف جر کے معانی کو جانتا ہو' استفہام کے اسماء و حروف اور حروف شرط کے معانی سے خوب واقف ہو اور کتاب اللہ کا عالم ہو۔ اسباب نزول آیات' ناسخ و منسوخ' محکم و متشابہ' عام و خاص اور مطلق و مقید کا علم رکھتا ہو' نیز روش خطاب' خطاب تکلیف' خطاب وضع' مفہوم موافق اور مفہوم مخالف سے آشنا ہو اور اسی طرح روایت و درایت کے علم میں سنت نبویہ کا عالم ہو اور مصالح عامہ اور رفاہ عامہ کے امور میں نیز مفادات کے حصول اور فسادات کے رد میں نظر رکھتا ہو۔ پھر اجماع اور قیاس کا عالم ہو' تو جب تو اس کا عالم ہو جائے تو تیرے لیے اجتہاد جائز ہے ورنہ نہیں۔

(القول البدیع فی الرد علی القائلین بالتبدیع از شیخ محمد خزرجی)

اجتہاد کے معنی کی حد

اسلام میں اجتہاد کے معنی کی حد تنگ نہیں بلکہ وہ اس کے قواعد کو ضبط اور اس کی حمایت کرنے کا نام ہے۔ اور اس سے اسلامی طرق کو منظم کرنا' اصول کو مرتب کرنا اور اس کے افراد کو تمیز دینا ضروری ہے۔ نیز ان بے شعور مدعیین کو نکالنا بھی ضروری ہے جن کی مثال ایسے ہے جیسے ایک پیاسا گمان کرتا ہے کہ وہ پانی ہے اور جب پاس آتا ہے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے ائمہ اصول نے ضابطہ مقرر کیا ہے کہ اجتہاد جب ایک عظیم شرعی مرتبہ ہے اور بہت بڑا درجہ ہے تو یہ انتہائی وسعت علمی' پختگی اور ادلہ شرعیہ کی انواع سے معرفت تامہ کا محتاج ہے۔ اور آج جو ان ادوار متاخرہ میں مطلق اجتہاد کا مدعی ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے ضمیر کو جھنجھوڑے اور اپنے دعویٰ میں غور و خوض کرے تو یقیناً وہ صحیح سوچ و بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچ جائے گا کہ وہ اپنے دعویٰ کردہ رتبے کی مقدار سے جاہل ہے یا اپنی ذات کی مقدار سے ہی جاہل ہے

اور یہ سب کچھ ہونے میں وہ معذور نہیں ہو گا۔ اور ایک شخص اجتہاد کے دعوئی میں بڑے فخر سے باچھیں کھولتا ہوا آتا ہے اور کتاب وسنت (دونوں عربی ہیں) سے استنباط کا ارادہ رکھتا ہے حالانکہ صحیح لحن میں وہ عبارت کی قرات نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ علم نحو سے بالکل ناواقف ہوتا ہے جو عربی کی کنجی ہے تو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کا دعوئی استنباط سلف صالحین کے استنباط کی طرح کیسے صحیح ہو سکتا ہے یا یہ لوگ مجتہدین میں شمار ہو سکتے ہیں......؟

ہم یہ دعوئی نہیں کرتے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے بلکہ وہ قیامت تک کھلا ہے۔ لیکن ان شخصیات کے لیے جو اس کے اہل ہیں اور استنباط کی اہلیت محقق ہو اور یہ امور اس کے لیے معروف ہوں کہ وہ ناسخ و منسوخ وغیرہ کو جانتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کا فضل وسیع اور عنایات غیر محدود ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل کا مالک ہے۔ ہاں البتہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو قرآن میں شرح صدر رہبہ فرمادیتا ہے اور سنت نبویہ کی کامل فہم عطا فرمادیتا ہے اور اسے اس کا اہل بنادیتا ہے کہ وہ بعض مسائل میں تحقیق کرے یا بعض قضایا میں بحث کرے اور ایک نئی سوچ منظر عام پر لائے یا بعض حقائق کی معرفت تک رسائی حاصل کرے یا بعض نوازل' وقائع اور ان کی اصل کے حکم کی معرفت حاصل کرے مگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اسے مطلق اجتہاد کے درجہ تک رسائی کا اعزاز حاصل نہیں۔ بلکہ وہ باحث یا صاحب نظر اور صاحب رائے کہلائے گا۔ لہٰذا ایسے شخص سے اجتہاد کا دعوئی جو اس کا اہل ہی نہیں 'کلمہ حق ہے اور اس سے مراد باطل ہے اور یہ حق وصداقت کا حلیہ تبدیل کرنے کے مترادف ہے اور حق کی تدلیس ہے اور "السنہ والجماعہ" کی پیروی سے نفرت دلانا اور جمہور کی مخالفت ہے۔

اور کتنے ہی ہم نے ایسے جہلاء دیکھے ہیں جو کلمہ دین کی تفریق چاہتے ہیں اور ائمہ متقدمین کو الزام دیتے ہیں اور فتنوں کی آگ بھڑکاتے ہیں اور علماء کی گفتگو کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر شئے میں مخالفت کرتے ہیں۔ جس کے پس پردہ کچھ مصلحتیں

کار فرما ہوتی ہیں۔ نیز شیطان کی اطاعت' مادیت سے محبت' عہدے کی طلب اور عوام میں تشویش اور تفریق ان کا اصل مقصود ہوتا ہے۔ اور وہ لوگوں کو نظر و بحث پر ابھارتے ہیں اور ہر مسئلہ کے لیے طلب دلیل کا دروازہ کھولتے ہیں تاکہ انہیں باور کرایا جا سکے کہ اجتہاد واجب ہے اور تقلید حرام ہے۔ تو اس طرح وہ اس مسئلہ کو لوگوں پر جاری کرتے ہیں کہ ایک عام آدمی بدحواس ہو کر علم موہوم اور بحث مذعوم میں کھو جاتا ہے۔ اس طرح وہ نہ اپنی پہلی بنیاد پر قائم رہتا ہے اور نہ وہ اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ اجتہاد تمام لوگوں پر واجب ہے۔ حالانکہ ان میں عوام' جہلاء اور صنعت کار بھی ہیں۔ اگر اس کا انکار کریں تو محسوس کے خلاف اور مشاہدہ کا انکار ہے۔ اور اگر یہ اعتراف کرے کہ عوام تقلید کی محتاج ہے تو بلاشبہ عوام کا اہل قرون ثلاثہ سابقین کے اکابر ائمہ کی تقلید کرنا ہی زیادہ افضل اور مناسب ہے۔ اور دیگر ائمہ سے وہ اکابر زیادہ مستحق ہیں کہ ان کی تقلید کی جائے۔ کیونکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بایں الفاظ ان کے بہتر ہونے کے شاہد ہیں:

خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم۔

بہترین لوگ میرے دور کے ہیں پھر جو ان سے ملے ہوئے ہیں پھر جو ان سے ملے ہوئے ہیں۔

لہٰذا قرون اولیٰ کے اکابر ائمہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ شہادت صادقہ ہے جن کے مذاہب کو ضبط کیا گیا' مشارب کو بیان کیا گیا اور پیروکاروں نے ان کے اقوال اور فتاویٰ کو تحریر کیا۔ بعد والوں نے پہلوں سے صحیح یا متواتر طور پر نقل کیا تو ان علماء کے پیروکار انہیں چھوڑ کر اس کی تقلید کیسے کر سکتے ہیں جو اجماع کے مواقع سے ہی واقف نہیں اور نہ شریعت کے اسرار کو جانتا ہے اور نہ ہی استنباط کی کیفیت سے آگاہ ہے۔

اس سے ہمارا مقصد کسی شخصیت ذاتیہ کو نشانہ بنانا نہیں اور نہ ہی کسی معین

شخص کی تحقیر مقصود ہے بلکہ یہ ایک ایسا امر ہے جس کو ایک عقلمند آدمی نظرانداز نہیں کر سکتا اور جاہل کو اس سے کوئی رنج نہیں کیونکہ:

مالجرح بمیت ایلام۔ میت کو زخم دینے سے درد نہیں ہوتا۔

لہٰذا ہمارا مقصود صرف اور صرف مسلمانوں کو ہدایت کرنا اور طالب علموں کو تنبیہ کرنا ہے کہ وہ سلف صالحین کی قدر و منزلت کا لحاظ رکھیں اور سب کو کلمہ توحید پر اکٹھا ہونے کے لیے برانگیختہ کرنا ہے۔ بلاشبہ یہی کام اکمل' اہم اور احق ہے کہ اس کے لیے کوششیں صرف کی جائیں اور ہمیں امت کو فرقہ واریت سے نکال کر اتحاد کی طرف لانے کی ضرورت ہے کیونکہ تفرقہ سے قوت اور استعداد ختم ہو جاتی ہے۔ امتیں ہمارے بارے میں دعویٰ کرتی ہیں کہ یہ ایک دسترخوان پر کھانے کے داعی ہیں اور ہم بے ہوشی میں بھٹک رہے ہیں۔

(مفہوم التطور والتجدید فی الشریعہ الاسلامیہ از مولف سید محمد علوی مالکی حسنی: ص ۳۳-۳۶)

اجتہاد کے دعویدار اور بدترین بدعت

شریعت اسلامیہ کو منہدم کرنے والی بدترین بدعت 'بھاری فساد اور بہت بڑی برائی یہ ہے کہ نااہل کے لیے اجتہاد کا دعویٰ کرنا' مذاہب سابقہ کا انکار اور ائمہ مجتہدین کی اقتداء کا ترک کرنا اور اپنے مسلک کو شریعت کے مقابلے میں مستقل اعتبار کرنا۔ بلاشبہ ایسے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اور ان کا مقصود یہ ہے کہ لوگوں کی نظروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت سے پھیر کر اپنے من گھڑت مذاہب کی طرف متوجہ کیا جائے۔

ہم نے مذاہب اربعہ کے بارے میں بعض کو یہاں تک کہتے سنا ہے کہ یہ (تقلید ائمہ) بدعت ہے جو دین پر چھا چکی ہے اور اس کا دین سے کوئی سروکار نہیں۔ اور بعض نے تو ان ائمہ کی کتب کے بارے میں بیان کیا ہے کہ یہ کتابیں کتاب و سنت تک کی رسائی کو مانع ہیں اور دین کی حقیقت اور مسلمانوں کے درمیان یہ بہت بڑا حجاب ہیں

اور یہی پسماندگی اور جہالت کا سبب ہیں جس سے پورا عالم اسلام آج متاثر ہے۔

ہمارے شیخ عارف باللہ سیدی شیخ رمضان بوطی دمشقی کے صاحبزادے علامہ محقق شیخ محمد سعید رمضان فرماتے ہیں کہ میں نے بعض کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی مذاہب کے مقلدین پر چسپاں ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا	ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا
عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔	اور ہم ان کی لکیر کے پیچھے ہیں۔

(الزخرف: ۲۳)

پھر فرماتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے ایک رسالہ شائع کیا (اس نے اپنا نام نہیں لکھا اور نہ ہی خود کو ظاہر کیا) جس کا عنوان تھا: "کیا مسلمان مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک معین مذہب کی پیروی کرنے سے ملزم ہے؟" (هل المسلم ملزم باتباع مذهب معين من المذاهب الاربعه) اور اس تالیف کو شیخ خجندی کی طرف منسوب کیا۔ اس کا مضمون مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک معین مذہب کا التزام کرنے والے کی تکفیر پر مشتمل تھا اور ائمہ مجتہدین کو احمق، جاہل اور گمراہ کے القاب سے نوازا گیا اور یہ باور کرایا گیا کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین کو پارہ پارہ کیا اور خود بھی گروہ در گروہ منقسم ہو گئے اور انہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد عالیہ کا مصداق بتایا گیا کہ:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	انہوں نے اپنے پادریوں اور جوگیوں کو
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (التوبہ: ۳۱)	اللہ کے سوا خدا بنالیا۔

اور یہ تصور دیا گیا کہ وہ لوگ عملاً خسارہ میں ہیں اور ان کی کاوشیں دنیاوی زندگی میں گمراہ کن ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ بلاشبہ یہ کام فقہ اسلامی کی سوء فہم اور ائمہ اسلام کے اجتہاد سے

جہالت کا بہت بڑا سبب ہے کیونکہ انہوں نے اس بارے میں کہا کہ فقہ اور تشریع اسلامی فقط مذاہب قانونیہ کے ائمہ کی افکار کا نتیجہ ہے اور انہوں نے اس کا ربط کتاب و سنت سے قائم کیا ہے یہ بالکل بعینہٖ وہی سوچ ہے جس کی مستشرقین اور ملحدین یعنی دشمنان اسلام دعوت دیتے ہیں لیکن ہمارے مسلمان بھائی اس کی برائی اور فساد سے واقف نہیں اور ہمارا یہ کلام پھر بھی حسن ظن پر مبنی ہے کیونکہ اسلامی سربلندی ایک بہت بڑا اعزاز ہے جو مسلمانوں کے بارے سوء ظن کے کثیر امور کو دفع کرتی ہے لیکن ہم ان استشراقیہ پرستوں کے بڑے بڑے جھوٹوں کو سنتے ہیں، جنہیں انہوں نے بڑی بے باکی سے گھڑ رکھا ہے مثلاً ایک انتہائی اسلام دشمن مستشرق "شاخت" کا کہنا ہے کہ فقہ اسلامی کو ایک قانون ہونے کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں جس کے نتائج بڑے مجروح اور انوکھے ہیں جو اس فقہ کو کتاب و سنت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں بلکہ "شاخت" اس سے اس موہوم طریقہ پر استدلال کرنا چاہتا ہے جو ان لوگوں کے تصور میں ہے اور اس سے بیشتر عوام المسلمین ان لوگوں کے زیر اثر مذاہب اربعہ اور ان کے ثقات ائمہ کی طرف نسبت کو برا سمجھنے لگتے ہیں اور کئی لوگ اس دھوکے کا شکار ہیں اور ان کے پاس اتنی علمی طاقت نہیں کہ وہ ان افکار کے دھوکہ کو پہچان سکیں اگرچہ انہیں فطرت اسلامیہ کی سلامتی اور عقل انسانی کی صفائی حاصل ہے لیکن انہیں یہ خبر نہیں کہ یہ دعویٰ قلب سلیم پر گراں، حق سے بعید اور باطل میں کھویا ہوا ہے حالانکہ ان دعویداروں کو یہ علم نہیں کہ ان کا یہ کلام اس حقیقت کو بدل نہیں سکتا جس کو ہر دور میں لوگ پہچانتے آئے ہیں اور اس کی خوب معرفت رکھتے ہیں اور ہر دور میں اس پر مسلمانوں کا اجماع منعقد رہا ہے کہ یہ مذاہب اسلام کا لب لباب اور جوہر ہیں اور انہوں نے ہر دور میں مسلمانوں کو احکام دینیہ سے آگاہ کیا ہے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے تمسک کی راہ کو آسان کیا ہے۔

بے شک ائمہ کے مذاہب صحیح اور سلیم ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

ہدایات تک رسائی کے لیے یہ ضروری ہیں اور حاشا وکلا ہر گز یہ حاجز (حجاب) اور مقابل نہیں۔(اللامذھبیۃ قنطرۃ اللادینیۃ از ڈاکٹر محمد سعید رمضان بوطی)

تقلید کرنا اور اعتراف نہ کرنا

فضیلۃ العلامہ محقق شیخ محمد سعید رمضان بوطی نے ان دعویداروں کی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ یہ لوگ ائمہ سابقین کی تقلید کرتے ہیں اگرچہ اس کا اعتراف نہیں کرتے بلکہ ان کی آراء بڑی عاجزی سے قبول کرتے ہیں۔(خاک آلود ہوں یہ) پس کہتے ہیں کہ:

"مذہبیت یہ ہے کہ ایک عام آدمی یا جو رتبہ اجتہاد پر فائز نہیں' وہ کسی مجتہد امام کے مذہب کی تقلید کرے' چاہے کسی ایک معین امام کا التزام کرے یا ایک سے دوسرے امام کی طرف پھرتا رہے' اور لامذہبیت یہ ہے کہ ایک عام شخص یا جو مرتبہ اجتہاد پر فائز نہیں' وہ کسی مجتہد امام کی تقلید نہ کرے۔نہ التزاماً اور بغیر التزام کے۔پھر کہتے ہیں کہ ہم نے اس امر کو نہایت آسان کر دیا ہے کہ وہ تمام لوگ اپنے مذہب کی نسبت اسلاف کی طرف کرتے ہیں کہ وہ حق ہے یعنی وہ ان ائمہ مجتہدین میں سے کسی نہ کسی کی تقلید سے باہر نہیں جن کی آراء اور مذاہب منقول ہو کر ہم تک پہنچے اور وہ امانت کی طرح ہمارے پاس محفوظ ہیں۔چاہے وہ کسی ایک معین امام کا التزام کریں یا ایک سے دوسرے امام کی طرف پھرتے رہیں اور چاہے وہ اس کا اعتراف کریں یا نہ کریں۔"

میں (مالکی) کہتا ہوں کہ ان کے اس اجتہاد کے موقف میں غرابت نہیں البتہ ان کا یہ امر قابل مذمت ہے اور ایک سطحی نظر کا محتاج ہے کہ وہ اس باب میں بعض شاذہ آراء کے حامی ہیں۔مثلاً خجندی کی رائے جو وہ اپنے رسالہ میں نقل کرتا ہے کہ یہ مرتبہ اجتہاد حاصل کرنا آسان ہے جس کے لیے موطا' صحیحین' سنن ابی داؤد' جامع ترمذی' اور نسائی سے زیادہ کی معرفت ضروری نہیں اور یہ کتب مشہور و معروف ہیں

اور ان کے علم کا حصول تھوڑے وقت میں ممکن ہے۔ پس تم پر ان کی معرفت لازم ہے اور جب تو اس سے واقف نہیں اور تیرا کوئی اور دوست تجھ سے سبقت لے گیا اور اس زبان میں تیری فہم سے آگے نکل گیا جسے تو جانتا ہے تو اس کے بعد تیرے لیے کوئی عذر نہیں" اور اس کا یہ کہنا کہ

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایات متعدد ہو جائیں جو کسی ایک امر سے متعلق ہوں اور تو متقدم اور متاخر کو نہیں جانتا اور تاریخ واضح نہیں کرتی تو تجھ پر لازم ہے کہ ان سب پر عمل کر۔ کبھی اس پر اور کبھی اس پر۔"

علامہ بوطی فرماتے ہیں کہ کیا ائمہ اور ان کے مذاہب کی پیروی کا دروازہ اس ذریعے سب پر بند نہیں کر دیا گیا کہ ان کے سامنے موطا، صحیحین، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور نسائی رکھ دی اور کہا کہ یہ سب کتابیں مشہور و معروف ہیں۔ ان کی تحصیل تھوڑے وقت میں ممکن ہے۔ پس اللہ مومنوں کو لڑنے کے لیے کافی ہے اور کسی مذہب کی تقلید کی کوئی حاجت باقی نہیں رہی۔ نہ التزامی طور پر اور نہ بغیر التزام کے۔

شاید استاذ (.........) جانتے ہوں کہ جمیع ائمہ جن میں ابن تیمیہ، ابن قیم اور شوکانی بھی شمار ہیں، وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ ان کتابوں کا علم حاصل کر لینے والا مجتہد نہیں بنتا اور نہ ہی اس کے لیے روا ہے کہ وہ فتویٰ اور استنباط احکام میں فقط ان پر اعتماد کرے بلکہ ضروری ہے کہ اس کے پاس ہر وہ ملکہ علمیہ وافر ہو جس سے درجہ اجتہاد کی طرف ترقی ہوتی ہے۔ نہ کہ یہی کافی ہے جو فقط مجندی نے اپنے رسالہ میں بیان کیا جس کے بارے میں شیخ (.........) کہتے ہیں کہ یہ بڑا مفید ہے۔

والد گرامی امام سید علوی مالکی کا فتویٰ

قبلہ والد محترم سید علوی بن عباس مالکی حسنی سے مسئلہ اجتہاد اور مذہب کی تقلید کے بارے میں استفسار ہوا تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔ جان لو! کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْآ إِلَيْهِمْ. (التوبہ: ۱۲۲)

تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آکر اپنی قوم کو ڈر سنائیں۔

یہ آیہ مقدسہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ طلب علم اور دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرنے کی خاطر نکلنے والے بعض مسلمان ہیں اور جب وہ دین کو سمجھ لیں تو واپس اپنی قوم کے پاس لوٹ آئیں۔ انہیں مسائل بتائیں اور ڈر سنائیں۔ کیونکہ جو طلب علم اور حصول فقہ کے لیے شہروں سے نہیں نکلا اس پر لازم ہے کہ وہ ان دین سمجھنے والے حضرات کی طرف رجوع کرے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَسْئَلُوْآ أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (النحل: ۴۳)

تو اے لوگو علم والوں سے پوچھو اگر تمہیں علم نہیں۔

جو نہیں جانتا وہ پوچھتا ہے اور ایک مجتہد دوسرے مجتہد کی تقلید نہیں کرتا۔

بے شک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عوام کو مسائل بتاتے تھے۔ یہ نہیں کہ وہ ان سے اجتہاد کرنے کا مطالبہ کرتے تھے بلکہ کمان' تیر پھینکنے والے کو اور نیزہ' نیزہ باز کو دیا جاتا ہے۔ اگر عوام اجتہاد کی مکلف ہو تو صنعت و حرفت کا سلسلہ ختم ہو جائے اور استنباط کو نہ جاننے والا دین سے محروم رہ جائے۔ بلاشبہ اس میں بہت زیادہ افراط و تفریط ہے اور عوام قطعاً احکام کے مکلف ہیں اور ان کے لیے ائمہ مجتہدین کاملین کی تقلید کیے بغیر کوئی چارہ نہیں اور نہ ہی اہل ذکر عارفین سے سوال کیے بغیر ان کے لیے کوئی راہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا حکم دیا ہے۔

پھر اجتہاد اور تقلید مجتہد کی شرائط ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس سے ظاہر ہوا کہ ان ادوار متاخرہ میں مطلق اجتہاد کا مدعی یا تو مطلق اجتہاد کی شرائط سے جاہل ہے یا نفس اجتہاد کی مقدار سے جاہل ہے اور وہ اس میں غیر معذور بلکہ گمراہ اور

گمراہ کن مغرور ہے۔ کون کہتا ہے کہ اجتہاد تمام لوگوں پر واجب ہے جس میں عوام اور جہلاء بھی شامل ہیں اور ارباب صنعت و حرفت بھی۔ اور اگر امت میں ان کے وجود کا انکار کرے تو یہ محسوس کے خلاف اور مشاہدہ کا انکار ہے نیز حق کی تدلیس ہے۔ اور اگر یہ کہے کہ ان میں سے عوام تقلید کے محتاج ہیں تو بلاشبہ عوام کا ان ائمہ اربعہ مجتہدین سابقین کی تقلید کرنا ضروری ہے جن کی خیریت اور افضلیت کے خود حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم بایں الفاظ شاہد ہیں:

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم۔ — سب سے بہترین دور میرا دور ہے پھر وہ لوگ جو ان سے ملے ہوئے ہیں پھر وہ جو ان سے ملے ہوئے ہیں۔

اور یہ معصوم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت ہے جو ردو تکذیب اور شک و تبدیل کو قبول نہیں کرتی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان ائمہ کے مذاہب ضبط ہیں' مشارب واضح ہیں' مسائل مرقوم ہیں اور پیروکاروں نے ان کے اقوال کو نقل متواتر سے محفوظ کیا ہے اور ہر بعد والے پہلوں کو نقل کرتے آرہے ہیں اور لامحالہ ان کی تقلید ان متاخرین اجتہاد کے دعویداروں سے اولیٰ اور اکمل ہے جن کا دعویٰ محض جھوٹ' عناد' سرکشی اور زمین میں فساد پر مبنی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اجماع کے مواقع سے بھی ناواقف ہیں جو اس حدیث سے ثابت ہیں:

لا تجتمع امتی علی الضلالة: — میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔

بلکہ یہاں تک کہ وہ قیاس' احکام اور ادلہ کی شرائط سے بھی آگاہ نہیں اور اس سے بھی تعجب خیز امر یہ ہے کہ میں نے ایک عصری مجتہد کو دیکھا جو قرآن میں ناسخ و منسوخ کا انکار کرتا ہے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ علم میں قطعاً پختہ نہیں ہے اور ان میں بعض ایسے ہیں جن کی عقل کا کوئی معیار ہی نہیں۔ اسی لیے وہ شریعت میں قیاس کے

وجود کا انکار کرتے ہیں۔ اور میں نے تو اکثر کو نااہل اور مدہوش ہی دیکھا ہے۔ میں ایک مجتہد سے ملا وہ عربی کی جودت کو ہی نہیں سمجھتا تھا اور نہ ہی لحن سے محفوظ عبارت کی قرات سے واقف تھا بلکہ لغت عربیہ کے کثیر الفاظ کا مفہوم ہی نہیں جانتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اجتہاد کے دعویٰ میں بڑے فخر سے باچھیں کھولتا تھا اور قرآن و سنت سے استنباط کا ارادہ رکھتا تھا حالانکہ یہ دونوں عربی ہیں' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ۔ (النحل: ۱۰۳)

جس کی طرف ڈھالتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے اور یہ روشن عربی زبان۔

اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ مجھے بتاؤ کہ کیا ان لوگوں کا مجتہدین میں شمار ہونا صحیح ہے اور کتاب و سنت سے سلف صالحین کی طرح ان کا استنباط کرنا صحیح ہے......؟ اجتہاد کا دعویٰ حق بات ہے لیکن اس سے مراد باطل ہے اور حق کا حلیہ تبدیل کرنا اور حق کی تدلیس ہے نیز "السنہ والجماعہ" کی پیروی سے نفرت دلانا اور جمہور کی مخالفت کرنا ہے جو محض تدلیس و غرور ہے۔

پھر ائمہ اربعہ کے ساتھ مذاہب کو مقید کرنے کے مسئلہ کے بارے میں کلام فرماتے ہیں اور اس بارے میں فقہ کا ان ائمہ میں حصر نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ امید ہے کہ میری فکر انہیں حق بات کی تنبیہ کرے گی اور وہ یہ ہے کہ مجتہدین کا ائمہ اربعہ میں حصر استقرائی ہے نہ کہ طبعی۔ بایں معنی کہ ہم نے دیگر مجتہدین کے اقوال کو بھی تلاش کیا لیکن ہم ان کے اقوال تحریری شکل میں نہ پا سکے اور نہ ہی مضبوط مذہب مل سکا جو تواتر سے منقول ہو۔ جیسے ائمہ اربعہ کا مذہب ہے متبعین نے ان کے مذاہب کو نقل کرنے کا حق ادا کیا اور مجتہد کا مذہب قبول کرنے کی شرط یہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہے تو اس سے بلاواسطہ سماع کیا جائے اور اگر دار فانی سے رخصت ہو چکا ہے تو اس کے مذہب کی باوثوق اور صحیح متواتر نقل کا ہونا ضروری ہے اور سابقین ائمہ اجتہاد

کے اقوال مدون نہیں اور نہ ہی ان کی کوئی ایسی نقل ہے جس پر اعتماد کیا جائے اور نہ ہی ان مسائل کی معرفت ہے جو ان کے خلاف ثابت ہیں اور جن سے انہوں نے رجوع کیا' لہٰذا ان کی تقلید جائز نہیں کیونکہ اس قول کو قبول کرنا جائز نہیں جس کی قائل کی طرف نسبت مشکوک ہو یا اس کے راوی اور ناقل میں شک ہو۔ اور ہم اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کرتے بلکہ وہ قیامت تک کھلا ہے لیکن اس کے لیے جس کی درجہ استنباط تک رسائی ہو اور اس کا اجتہاد کا اہل ہونا متحقق ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ کا فضل بہت وسیع ہے اور عنایات بے شمار ہیں۔ ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض علماء بندوں کو قرآن و سنت کی فہم میں شرح صدر عطا فرما دیتا ہے اور وہ اس وقت موجود ہے مگر اسے مطلق اجتہاد کے درجہ کا نام نہیں دیا جاتا جس پر ہم ابھی کلام کر چکے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ متاخرین میں سے کسی کو ان ائمہ متقدمین میں کسی کے بارے میں کلام کرنا مناسب نہیں۔ جنہوں نے شریعت کو تحریر کیا اور اس کی تدوین کی اور اسے ہم تک منتقل کیا اور حجتہ الوداع کے خطبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس امر کی تعمیل کرتے ہوئے اسے بیان کیا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالیہ ہے:

الا لیبلغ الشاهد منکم الغائب۔	سنو جو موجود ہیں وہ (ان احکام کو) ان تک پہنچادیں جو تم میں سے موجود نہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خیریت کی شہادت دی اور انہوں نے سنت نبویہ کی تدوین کی تو ہم ان کے تدوین کردہ اور استنباط کردہ مسائل پر اعتماد کیونکر نہ کریں جبکہ وہ ہم سے فہم کے اعتبار سے اقویٰ ہیں اور ان کی یادداشت اور علم ہم سے قوی اور زیادہ ہے۔ اور ان جدید مجتہدین کی تدوین کا یہ حال ہے کہ جب ان کے استنباط میں خلل واقع ہو تو ضرورت کی بنا پر ائمہ متقدمین کی روایت تلاش کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے روایت کیا ہے اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ تو یہ دین کا انہدام

اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا خلاف ہے اور یہ دین سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

پھر جو آج اجتہاد کا مدعی ہے اس کی حالت بیان کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ یہ جو اب احادیث نبویہ سے اجتہاد کا ارادہ رکھتا ہے' وہ احادیث کے رجال کے طبقات' مقبول و مردود' طبقات رجال اور اسانید کے اوصاف کو جانتا ہے یا تعدیل و تجریح میں بخاری و مسلم جیسوں کی تقلید کرتا ہے......؟ اگر اس میں تقلید کرتا ہے تو وہ ایسا ہی ہے کہ پانی سے بھاگا اور پانی میں گر گیا اور اگر بزعم خود بلا تقلید اجتہاد سے یہ جانتا ہے تو آیات متعارضہ اور احادیث متعارضہ میں اس کا قول اور استنباط کیسا ہوگا؟ کیا وہ اس میں اپنی رائے داخل کرے گا یا اہل قرون ثلاثہ کے کلام کی طرف رجوع کرے گا یا گمراہی کے بیابانوں میں بھٹکتا پھرے گا......؟ تو بلاشبہ یہ حماقت اور عقل کی قلت ہے۔

یہ کلام معنی خیز ہے۔ اس کا مقصد کسی معین شخص کی تحقیر یا اس پر غلبہ ظاہر کرنا یا کسی شخصیت ذاتیہ کو مجروح کرنا نہیں' کوئی عقلمند بھی اس کا یہ معنی نہیں لے سکتا اور ایک سرکش جاہل کو اس سے رنج نہیں ہوتا کیونکہ مردے کو زخم دینے سے تکلیف نہیں ہوتی' البتہ اس کا مقصد مسلمانوں کو متنبہ کرنا اور متعلمین کو سلف صالحین کی قدر و منزل سے آگاہ کرنا ہے۔ اور لوگوں کو اتحاد پر ابھارنا ہے کہ ایک کلام پر متحد ہو جائیں۔ یہی مشن اکمل' احق اور اہم ہے کہ جس کے لیے سرگرمیاں صرف کی جائیں' اور ہمیں فرقہ واریت سے نکال کر امت کو اتحاد کی طرف لانے کی ضرورت ہے تاکہ مال اطراف میں نہ جائے اور لوگ قوت و استعداد میں ہم سے سبقت نہ کر جائیں۔ اور امتیں ہمارے بارے میں خیال کرتی ہیں کہ یہ ایک دسترخوان پر کھانے کے داعی ہیں جبکہ ہم بے ہوشی میں بھٹک رہے ہیں اور ہم اس مشن کو ترک کر چکے ہیں جس کے لیے ہمیں ہمہ وقت چاق و چوبند رہنا چاہیے۔ نیز ہم اس فتنہ کے اثرات سے غافل ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی اصلاح فرمائے اور آپس میں اتحاد کی

دولت سے مالا مال فرمائے اور وہی ذات انہیں متحد کرنے پر قادر اور دعا قبول کرنے کے لائق ہے۔

(مجموع فتاویٰ ورسائل از امام سید علوی مالکی از ترتیب مولف سید محمد مالکی: ص ۵۴)

خطباتِ علماءِ اہلسنت

مُرتّبین

طلبہ مدرسہ بدر العلوم جسپور نینی تال

یو۔پی

ناشر

فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔اُردو بازار لاہور

يثبت الله الذين آمنوا بالقول الثابت في الحيوة الدنيا وفي الآخرة

اللہ ثابت رکھتا ہے ایمان والوں کو حق بات پر دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں

(القرآن)

کتاب البرزخ

اہلِ قبور کے سننے، اولیاء اللہ سے استمداد، ایصالِ ثواب
اور دیگر ضروری مسائل کی تحقیق

علامہ نور بخش توکلی رحمہ اللہ تعالیٰ

(مصنف سیرت رسولِ عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

فرید بک سٹال ۳۸۔ اردو بازار لاہور

فتح الرحمٰن فی اثبات مذہب النعمان (عربی)

تائید مذہب حنفی (اردو ترجمہ)

ثبت عبدہٗ

احادیث مبارکہ کی روشنی میں

— تصنیف —

شیخ محقق امام اہل سنت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ

— ترجمہ —

مولانا محمد محی الدین زید مجدہٗ

ناشر

فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اسلامی عقائد اور اہل سنت کے نظریات کی
تحقیق پر قرآن و حدیث صحابہ و اہلبیت رسول اور ائمہ دین کے اقوال کی روشنی میں مدلل اور مختصر کتاب

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور عقائدِ اہلِ سنت

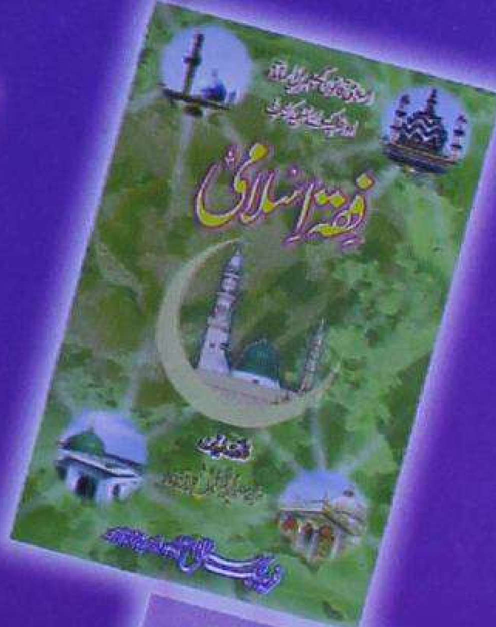
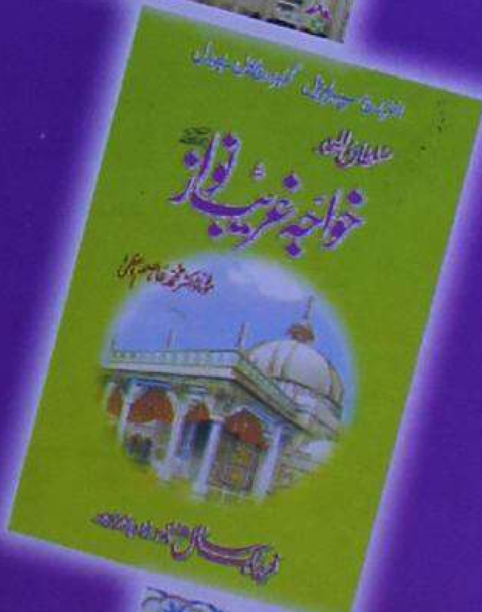
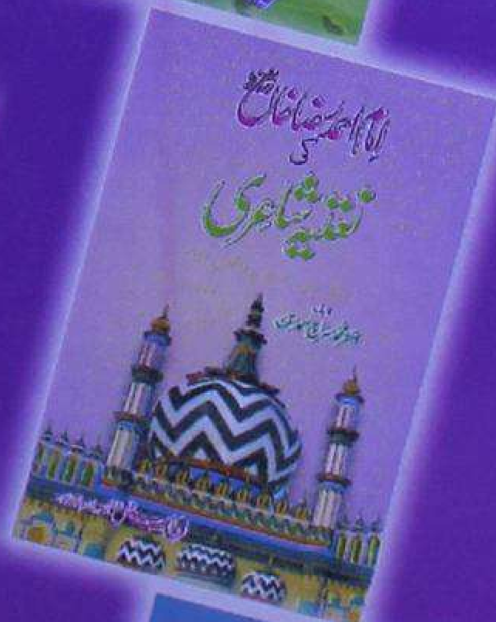
تصنیف

علامہ قاری محمد طیب نقشبندی

مانچسٹر۔ انگلینڈ

ناشر

فرید بک سٹال (رجسٹرڈ) ۳۸۔ اردو بازار لاہور



فقہ اسلامی

خواجہ غریب نواز

امام احمد رضا خاں کی
نعتیہ شاعری

حیات صدر الافاضل
